فریب ناتمام

(یادیں اور یادداشتیں)

جمعہ خان صوفی

فریب ناتمام

(یادیں اور یادداشتیں)

جمعہ خان صوفی

پاک بک ایمپائر

38 غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

انتساب:

والدہ محترمہ کے نام

نام کتاب	فریب ناتمام
مصنف	جمعہ خان صوفی (0300-9330724)
فون نمبر	0322-4708691
پبلشر	پاک بک ایمپائر لاہور
اشاعت اوّل	مارچ 2015ء
تعداد	1000
پرنٹر	پرنٹ یارڈ ریٹی گن روڈ لاہور
قیمت	1500/-
ملنے کا پتہ	پاک بک ایمپائر 38 غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور
ای میل	tariq0712@yahoo.com
آئی ایس بی این	978-969-8238-28-3

ضروری وضاحت

یہ کتاب معروف معنوں میں خودنوشت سوانح نہیں ہے۔ قلم کاغذ سے میری محبت پرانی ہے، اس لیے عادت سی رہی ہے کہ زندگی میں جب کبھی فرصت اور تنہائی میسر آئی، ان سے اپنے دل کی بات کہتا رہا۔ انہی بکھرے ہوئے خیالات پر مبنی بہت سے اوراقِ پریشاں مسودات اور ڈائریوں کی شکل میں میرے پاس جمع ہو گئے۔ ایک دن نہ جانے کس رو میں، ان تمام ڈائریوں سے جان چھڑانے کا خیال مجھ پہ طاری ہو گیا۔ مگر پھر سوچا کہ بے شک میری زندگی ناکام رہی، میں اپنے متعین کردہ مقاصد حاصل نہ کر پایا اور ان ڈایئریوں میں محض ایک ناکام شخص کی ناکامیوں کی داستان ہے، لیکن ان میں کچھ ایسے حقائق ضرور ہیں، جو تاریخ کی امانت ہیں۔ شائد کوئی عقل مند ایسا ہو جو میری غلطیوں سے سبق سیکھے۔ یہ بھی بتاتا چلوں، کہ میری کچھ ضروری یادداشتیں میری کتب اور دوسرے گھریلو ساز وسامان کے ساتھ اس وقت لوٹ لی گئیں۔ جب نجیب اللہ کے عہد حکومت کے خاتمہ کے بعد مجاہدین حضرات اقتدار میں آئے اور کابل میں متعدد دیگر افراد کی طرح میرے مکان کو بھی لوٹا گیا۔

یہ ۲۰۰۸ء کی بات ہے۔ میں لندن میں لنڈن سکول آف اکنامکس والوں نے مجھے ایک پراجیکٹ پر کام کرنے کے انتظار میں بٹھایا تھا۔ مالی بدحالی کی وجہ سے وہ پراجیکٹ دوسرے اہم امور کی طرح عین وقت پر ختم کیا گیا۔ موقع غنیمت جان کر میں نے اپنی سوانح عمری پر کام کا آغاز کیا جسے واپس پاکستان آکر پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

میری جلاوطنی نیپ لیڈران کے فیصلے کے نتیجے میں اور اجمل خٹک سے قریبی روابط کے بعد ہوئی۔ اس جلاوطنی کے دوران میں بھارت، سوویت یونین، افغانستان سے داؤد خان، حفیظ اللہ امین، ترہ کئی، کارمل اور ڈاکٹر نجیب تک، سب کے ساتھ براہ راست رابطہ میں رہا۔ اس دوران پاکستان میں ولی خان اور بلوچستان کی آزادی کے داعیوں کے ساتھ بھی مسلسل رابطہ رہا۔ میں نے دیکھا کہ کیسے سیاسی مقصد کے نام پر یہ بڑے بڑے لوگ اور خاندان پیسے کماتے اور نام بناتے ہیں۔ چنانچہ اس نتیجے پر پہنچا کہ نظریہ کیسے محض غریب اور مخلص کارکن کا مسئلہ رہ جاتا ہے اور ہر صورت میں فائدہ صرف لیڈروں کو ہوتا ہے۔ اس خطے میں سرد جنگ سے پیدا ہونے والی

پیچیدگیوں کی ایک اہم قسط سے متعلق میری ڈائریاں کچھ ایسے حقائق ریکارڈ پر لاسکتی ہیں جو شائد اور کہیں درج نہ ہوں۔ اس لیے میں نے اپنی ڈائریوں کی تحاریر کو اس کتاب کی صورت میں مرتب کرنے کا منصوبہ بنایا۔

تاہم یہ کام آسان ہرگز نہ تھا۔ میری ڈائریاں پشتو زبان میں تھیں جس پر افغانی طرزِ تحریر کا اثر غالب تھا۔ ان ڈائریوں اور یادداشتوں کو پہلے پشتو میں ہی کمپیوٹر پر منتقل کیا۔ بعد میں احساس ہوا کہ پشتو زبان سے زیادہ ان حقائق کو اردو زبان میں محفوظ کرنے کی ضرورت اور اہمیت ہے۔ افغانستان میں اس کی اشاعت محض تاریخی اہمیت رکھتی ہے، جبکہ پاکستان میں ان ڈائریوں میں درج کردار وہ ہیں جو ''پاکستان دشمنی'' میں بھی ہمارے قائد تھے اور آج پاکستان میں ''حب الوطنی'' میں بھی اتنے آگے بڑھ چکے ہیں کہ ان کی نظر میں ہم جیسے لوگ محض غدار ہیں اور وہ بزعم خود ریاست پاکستان کے سب سے بڑے وفادار۔ ہمیں خدا ملا اور نہ ہی صنم نے منہ لگایا۔ وہ خدا کے بندوں کے بھی محبوب ہیں، حالانکہ ان کے آستینوں میں ہمہ وقت کئی بت موجود رہتے ہیں۔

ذاتی ڈائریوں کے مفاہیم سے کتاب مرتب کرتے ہوئے ابواب کی تقسیم بڑی حد تک میری من مانی کا نتیجہ ہے۔ جو مناسب محسوس ہوا، اُسے متعلقہ باب کا حصہ بنادیا۔ ڈائریاں، ظاہر ہے کہ ماہ وسال کے حساب سے لکھی گئیں اور روزمرہ پیش آنے والے واقعات کا تعلق بہت مختلف اور متنوع موضوعات سے ہوتا ہے، سوانہیں قابل استفادہ مواد کی صورت دینے کے لیے میں نے حتیٰ الوسع کوشش کی کہ تکرار کم سے کم ہو۔ تاہم بعض ابواب میں آپ کو یہ تکرار برداشت کرنا ہوگی، کہ ایک ہی موضوع متعدد جگہ بیان کرنا بات کے سمجھانے کو ضروری تھا۔ چوں کہ ڈائریوں کے مندرجات میں میرا سوانحی اور سیاسی بیانیہ ہرجگہ ملا ہوا ہے، اس لیے کتاب میں ان دونوں میں امتیاز کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ ڈائری کے سوا جو متن ہے، اس کے آغاز میں تاریخ درج نہیں کی گئی اور اس کا طرزِ تحریر بھی قاری کے ذرا سے غور سے یہ واضح کرسکتا ہے کہ یہ زمانہ حال کی تحریر ہے۔ یہ اہتمام اور احتیاط بنیادی طور پر اس لیے برتی گئی ہے کہ کتاب کی اشاعت کے بعد مخالفین اور معترضین اگر کسی بات کو جھوٹ یا بہتان قرار دینا چاہیں تو اسی زمانے کی ڈائری بطور ثبوت پیش کی جاسکے۔ کتاب کی ایک ایک سطر اور مندرج معلومات کی ذمہ داری میرے کاندھوں پہ ہے اور اس کے ثبوت مہیا کرنے کو ہمہ وقت تیار ہوں۔ البتہ آراء، تجزیے اور تبصرے تب بھی اور

اب بھی محض میری ذاتی رائے کی حیثیت رکھتے ہیں، جو ضروری نہیں کہ غلط ہی ہوں۔

کتاب زیادہ تر جلاوطنی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتحال پر ذاتی تاثرات اور سیاسی کیریر میں پیش آمد، واقعات پر مشتمل ہے۔ ان میں کئی ایسے واقعات اور معلومات ہیں، جن پر ابھی تک شاید کہیں اور نہیں لکھا گیا۔ دراصل پختون زیادہ تر لکھت پڑھت سے بے نیاز رہتے ہیں، خود کچھ لکھتے نہیں اور دوسروں کی تحاریر پر اعتراض کرتے ہیں کہ انھوں نے پختون تاریخ اور کلچر کو غلط انداز میں پیش کیا ہے۔ میں نے اس عام روایت سے بغاوت کی ہے اور بعض حقائق ایسے بیان کیے ہیں جن پر مخصوص ذہن کے حامل سیاسی عناصر تنقید سے زیادہ مجھے گالیاں دیں گے، لیکن وہ جو کہا گیا ہے کہ ''حقائق حقائق ہیں، ان سے منہ نہیں موڑا جاسکتا''۔

کتاب کو اردو میں پیش کرنے کے لیے ایسے افراد کا ڈھونڈنا جو مشکل پشتو کو بامحاورہ اور قابل فہم اردو میں منتقل کرسکیں، ایک ایسی مہم ثابت ہوا جس میں کئی برس کا عرصہ ضائع ہوگیا۔ یہ کتاب آج سے پانچ برس پہلے شائع ہوچکی ہوتی اگر مجھے کوئی قابل مترجم میسر آجاتا یا میں خود یہ بیڑا اٹھالیتا۔ لیکن میں اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہوں کہ اس میں معاملہ صرف قابلیت کا نہ تھا۔ یہ صرف ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمے کا معاملہ نہ تھا۔ کیونکہ اس مخصوص دور اور اس کے سیاسی، نظریاتی اور سماجی حالات کو سمجھے بغیر یہ ترجمہ ممکن نہ تھا۔ یوں تو اس سلسلے میں کئی مہربانوں نے میری مدد کی کوشش کی، لیکن پھر ترجمہ کا بھاری پتھر چوم کر واپس رکھ دیا۔ مجھے گلہ یہی رہا کہ انھوں نے اسے چومنے اور واپس رکھنے میں کافی وقت ضائع کیا۔ اگر انکار کا عمل جلد ہوجاتا تب بھی وقت ضائع نہ ہوتا۔ ایک مہربان تو ایسے بھی تھے جنھوں نے کتاب کو ترجمہ کی غرض سے لیا اور پھر اس کے شائع ہونے کی صورت میں اے این پی اور کتاب میں مذکور دیگر پارٹیوں اور افراد پر پڑنے والے ممکنہ اثرات سے انھیں ڈرایا اور اس کے بدلے کتاب روکے رکھنے اور ترجمہ نہ کرنے کے صلے میں مراعات حاصل کرنے کی کوشش کی۔

میری خوش قسمتی تھی کہ ترجمے اور تدوین کا مشکل مرحلہ بالآخر اردو زبان کے ہمارے صوبے کے دو قابل فخر اور نامور اردو اساتذہ کی مدد سے مکمل ہوا۔ میری مراد ڈاکٹر تاج الدین تاجور اور پروفیسر رئیس احمد مغل سے ہے۔ ان دونوں نے اس بھاری پتھر کو اٹھایا، کئی بار چوما لیکن اسے واپس رکھنے نہ دیا۔ کتاب کے اولین سوسوا سو صفحات کا ترجمہ تاجور صاحب کی محنت کا نتیجہ ہے

اس سلسلہ میں پروفیسر رئیس احمد مغل کا کردار محض ترجمے تک محدود نہ تھا بلکہ اردو ادارت میں ان کے وسیع تجربہ اور عالمی سیاسیات میں ان کے گولڈ میڈل نے بہت کام دیا۔ یعنی مواد کی ترتیب سے لے کر اس کی تدوین اور مشمولات پر تنقید سے لے کر اس پر جرح تک انھوں نے ہر طرح سے اس کتاب کو اردو قارئین کے لیے مفید بنانے کی کوشش کی۔ کئی مرتبہ انھوں نے واضح طور پر کہا کہ وہ مجھ سے زیادہ قارئین کی وکالت کر رہے ہیں۔ ہر مرحلے پر واقعی انھوں نے یہ ثابت بھی کیا۔ کئی مرتبہ مجھے محسوس ہوا گویا وہ میرے لیے نہیں، کتاب کے لیے کام کر رہے ہیں۔ یہ بات مجھے اچھی تو نہ لگی لیکن ظاہر ہے، آپ کو ضرور اچھی لگے گی۔

یہ سوانح بھی ہے اور یادداشتیں بھی۔ حتیٰ الوسع کوشش رہی کہ جس نے بھی میری زندگی میں میرے ساتھ اچھائی کی، اس کا ذکر یہاں محفوظ ہو جائے۔ البتہ کئی دوستوں کا ذکر یہاں نہیں کیا گیا، جس میں بے وفائی اور بھول جانے کے بجائے کچھ رازوں کا اخفا مدنظر رہا۔ ایسے تمام مہربانوں سے جن کا ذکر میں نہیں کر پایا، یہی عرض کرنا ہے کہ حسابِ دوستاں در دل! البتہ زندگی کی داستان کے ان چند سو صفحات سے نکل کر، اس دنیا میں کچھ گنے چنے لوگ وہ بھی ہیں جنھیں میری ان غلطیوں کی سزا مجھ سے زیادہ ملی اور شائد جب تک وہ زندہ ہیں، ملتی رہے گی۔ میری مراد میرا خاندان، میرے بیوی بچے ہیں۔

یاد رہے کہ تحریر میں خیبر پختوا کو صوبہ سرحد کی بجائے پختونستان کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ یہی نام افغانستان اور ولی باغ والوں نے رائج کیا تھا۔ بلکہ افغانستان میں صوبہ سرحد کے لئے محکوم پختونستان، قبائلی علاقہ یعنی فاٹا کو آزاد پختونستان اور بلوچستان کے پختون علاقہ بلکہ سارے بلوچستان کے لئے جنوبی پختونستان استعمال کرتے تھے۔

جمعہ خان صوفی

۱۵ اپریل ۲۰۱۳ء، پشاور۔

فہرست

حصہ اول

حصہ دوم

حصہ سوم

حصہ چہارم

(انقلابِ ثور)

حصہ پنجم

حصہ ششم:

حصہ اول

جلد ہی وفات پا گئے۔ میری اپنی والدہ رزڑ تپہ کے گاؤں شیخ جانہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ میرے نانا ''الیاس''، نکوخیل تھے۔ میری والدہ کے دو بھائی اور ایک بہن تھی۔ جس طرح جینیات کے اصولوں میں حیوانات کا سلسلہءنسب مادری گردانا جاتا ہے، اسی طرح خود اسلام بھی مادری سلسلے کو اہمیت دیتا ہے اور یہود بھی قدیم زمانے سے مادری سلسلہءنسب کو اہمیت دیتے ہیں۔ چنانچہ اس اصول کے مطابق میں بھی رزڑ ہوں۔ کیونکہ نکوخیل، بوباخیل کی جبکہ بوباخیل، ماموزئی (محمودزئی) کی ذیلی شاخ ہے اور ماموزئی تپہ رزڑ کی ذیلی شاخ قرار پاتے ہیں۔

ہماری سب سے بڑی بہن 'زرمہالہ' ہے، جن کی شادی 'چم' میں ہوئی ہے۔ بہن کے بعد بڑے بھائی زیارت خان، اور ان کے بعد میں 'جمعہ خان' ہوں۔ میرے چھوٹے بہن بھائیوں میں بالترتیب رسول خان، محمد افضل، ماہِ رحلت (بہن)، بختیار علی، اور فریدہ (بہن) شامل ہیں۔ میرے دو بڑے بھائی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد فوت ہو گئے تھے۔ میرے والد سے شادی کے وقت میری والدہ کم عمر تھیں اور میری والدہ میری دادی اور پانچ پھوپھیوں سے بوجوہ نالاں رہتی تھیں۔ دراصل ہر کوئی والدہ محترمہ پر حکم چلاتا تھا، تاہم جب ہم جوان ہوئے تو ہماری والدہ بااختیار ہو گئیں۔ والدہ صاحبہ دوسری خواتین کے برعکس چغلی، غیبت اور لڑائی جھگڑے جیسی بری عادتوں سے پاک ایک باحوصلہ خاتون تھیں۔

اکثر لوگ پوچھتے ہیں کہ میرے بھائی کا نام زیارت خان (زیارت بمعنی جمعرات) اور میرا نام جمعہ خان کیونکر ایامِ ہفتہ کے حساب سے رکھے گئے۔ تو صاحبو! یہ ہماری پیدائش سے پہلے کا واقعہ ہے، کہ ہماری بڑی پھوپھی ''رحمت نور'' جو برہ مانیرئی (مانیری بالا) میں بیاہی گئی تھیں، انہوں نے خواب دیکھا کہ وہ مانیری بالا سے مانیری پایان میکے آرہی تھیں، کہ دو بچے گاؤں کے عین مغرب میں موجود برساتی پانی کے تالاب میں کھیل رہے تھے۔ انہوں نے کسی سے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ کسی نے جواب دیا کہ تم اپنے بھتیجوں کو بھی نہیں پہچانتیں؟ یہ زیارت خان اور جمعہ خان ہیں، تمھارے بھتیجے۔ خواب دیکھنے کے کچھ دن بعد وہ ہمارے ہاں آئیں اور میرے والد سے اپنے خواب اور خواہش کا اظہار کیا کہ اللہ نے اگر آپ کو بیٹے دیے تو اولین دو بیٹوں کے نام بالترتیب زیارت خان اور جمعہ خان رکھے جائیں۔ چنانچہ ہم دونوں بھائیوں کی پیدائش پر ہمارے والد نے اپنی بہن کی خواہش کے احترام میں ہمارے نام بالترتیب زیارت خان اور جمعہ خان ہی رکھ

غنی خان کے ساتھ مرحوم کے گھر میں، سال 1990ء

اپریل 1977ء: (بائیں سے) صوفی، نجیب کی بہن کوکئی، سفیر کی بیگم، اجمل خٹک عراقی سفیر اور جمال۔ (کھڑے ہوئے) تورلالی، سفیر کے بچے، اجمل خٹک کا بھانجا، غلام حبیب۔ صدر حسن البکر کے سفیر کی ضیافت۔

قرغہ، کابل: (بائیں سے) صوفی، ڈاکٹر ضمیر، عبدالخالق خان
بیگم خالق خان، ہوسئی صوفی۔
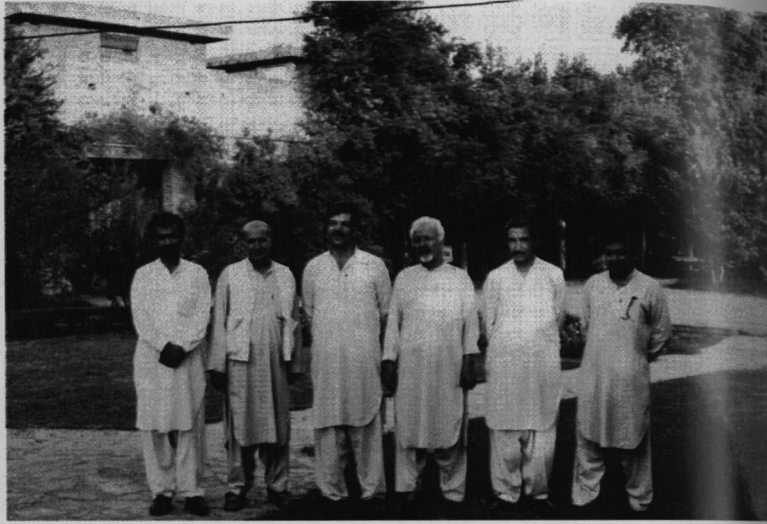
1992ء، چارسدہ، ولی باغ: (بائیں سے) ارباب مجیب، عبدالہادی مکمل
جنرل رفیع، سلیمان لائق، اسداللہ پیام، صوفی۔

نتھاگلی: امان اللہ بارکزئی کے ساتھ۔

1986ء، میکروریان، کابل: (بائیں سے) صوفی، سلیمان لائق، نازش، افراسیاب۔

1986ء، میکروریان، کابل، نجیب کے گھر: ولی خان، صوفی، افراسیاب، ڈاکٹر نجیب، اور فتانہ نجیب۔

1990ء، پشاور: صوفی اور الیاسی اپنے گھر میں۔

افغانستان سے واپسی پر گاؤں کے راستے میں استقبال۔

1986ء، نجیب کے گھر ضیافت: (بائیں سے) ولی خان، صوفی، افراسیاب خٹک، اور نجیب۔
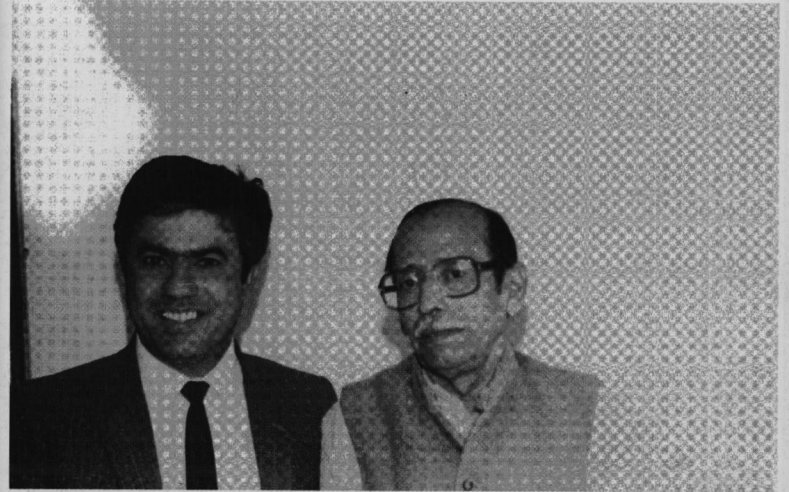
1985ء، میرا گھر: امام علی نازش کے ساتھ۔

افغانستان سے واپسی پر پشاور ائرپورٹ پر استقبال۔

1989ء میں ہماری واپسی براستہ بھارت: دہلی میں گاندھی جی کی سمادھی پر۔

1991ء، آگرہ، تاج محل: صوفی اور میر ہزار رحمکانی اور اس کے ساتھی، افغان سفارتی عملے کے ہمراہ۔

افغانستان سے واپسی کے موقع پر پشاور ائر پورٹ (اب باچا خان انٹرنیشنل ائر پورٹ) پر استقبال۔

فروری 2003ء، پشاور: صوفی، اجمل خٹک اور پکتیا وال۔

1992ء، ولی باغ، چارسدہ: (دائیں سے) صوفی، اسد اللہ پیام
سلیمان لائق، جنرل رفیع، عبدالہادی مکمل، عبدالمنان۔

صوفی اور ارباب مجیب۔

ستمبر1986ء، کابل: (دائیں سے) صوفی، عبدالودود قامل، سرفراز محمود، افراسیاب۔

1996ء، لندن: آئرلینڈ کے دوست کے ہمراہ۔

1977ء، کابل: میاں افسر شاہ، کوثر علی شاہ اور صوفی۔

اگست 1987ء، کابل: بھارت کے 40 ویں جشن آزادی کی ضیافت میں صوفی اور ہوسئی۔

ستمبر 1983ء، لندن: نجم بیگ چغتائی کے ہمراہ۔

1986ء میکروریان، کابل میں نجیب کے گھر: اجمل، بیگم نسیم ولی، فتانہ نجیب اور نجیب اللہ۔

اپریل 1977ء، عراقی سفیر کی ضیافت: صوفی، اجمل اور تورلالی
سفیر اور اجمل صاحب، سفیر کے اہل خانہ کے ساتھ۔

ستمبر 1983ء: صوفی اور افغان نائب صدر گل آقا پیرس میں 'لی ہیومنٹے' کے جشن کے موقع پر۔

ستمبر 1986: سرفراز محمود اور افراسیاب کے درمیان
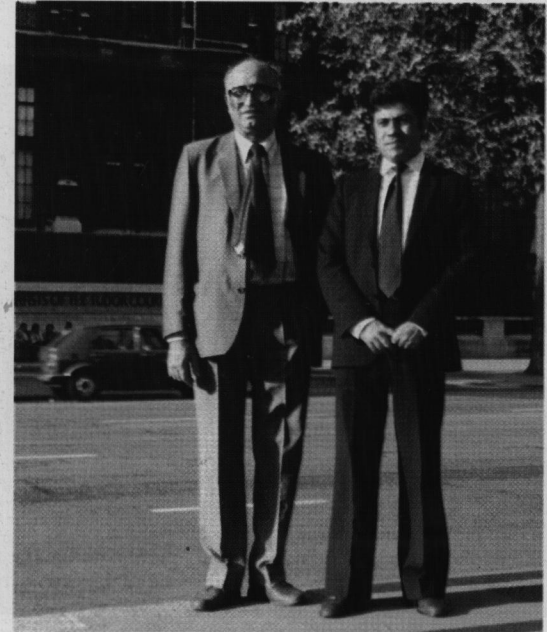
24 دسمبر ماسکو: (دائیں سے) کاملوف، صوفی، میاں افتخار حسین، نوراللہ، وارث وزیری، آرمنستانی ماہر تعلیم۔
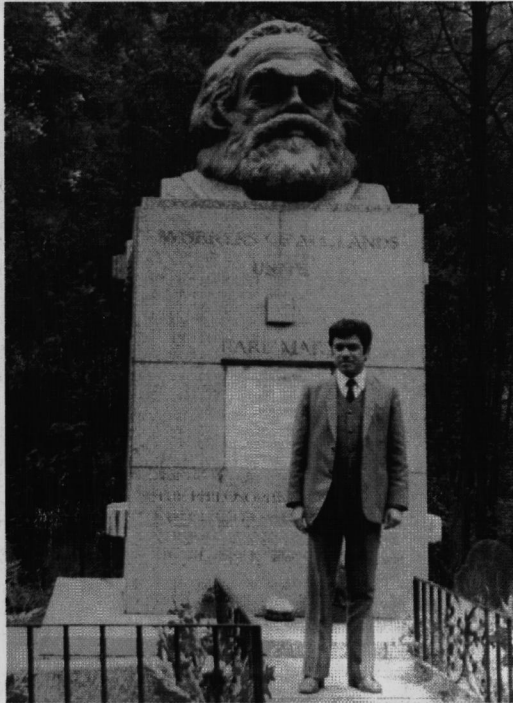
ستمبر 1983ء، ہائی گیٹ، لندن: کارل مارکس کی قبر پر

دیے۔

ہمارے اکثر ''کرم خیل'' خوانین مسلم لیگی تھے اور خاصا رعب داب رکھتے تھے۔ان میں اکرم خان بابا اور صحبت بابا مشہور مسلم لیگی تھے، جبکہ میرے والد صاحب باچا خان کے ساتھی اور کانگرسی (خدائی خدمت گار) تھے۔ بہ ایں سبب رشتہ داروں اور تربورانو (شریکوں) سے ہمارے تعلقات زیادہ بہتر نہ تھے، چنانچہ ہماری غمی خوشی اور کھیتی باڑی میں شراکت اپنے رشتہ داروں کے بجائے دوسروں لوگوں سے تھی۔ علاقے کی مسجد تو سپین کرم خیل، تور کرم خیل اور شیر داد خیلوں کی مشترکہ تھی مگر حجرے جدا جدا تھے۔ میرے والد صاحب کردار بھی تھے اور ہٹ کے پکے بھی۔ سیاسی اختلاف کی وجہ سے اپنی موت تک کبھی بھی سپین کرم خیل کے حجرے میں نہیں بیٹھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد جب کانگرس حکومت برطرف کر دی گئی اور خان عبدالقیوم خان برسرِ اقتدار آ گئے تو مسلم لیگیوں کی گواہیوں پر پرانے کانگرسیوں پر زمین تنگ کر دی گئی اور بہت سے لوگوں کو جیل ڈال دیا گیا۔ اس زمانے میں میرے والد صاحب جیل جانے سے، فقط اپنے سوتیلے ماموں ''شیر داد بابا'' کی بدولت بچے رہے۔ شیر داد بابا خدائی خدمت گار تحریک کے ہمدرد اور پورے علاقے میں طاقتور اور جنگجو آدمی کی شہرت رکھتے تھے۔ انہوں نے دھمکی دی تھی، کہ اگر کسی نے میرے بھانجے کے خلاف گواہی دی تو میں اسے دیکھ لوں گا۔ اُن کی یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی، کوئی بھی اُن کی دشمنی مول نہیں لے سکتا تھا، نہ کسی نے گواہی دی اور نہ میرے بابا جیل گئے۔

والد صاحب کا کوئی بھائی نہیں تھا۔ قریبی عزیزوں میں ہماری زمین شاید زیادہ تھی اور والد صاحب اپنی زمین کاشت بھی خود ہی کرتے تھے، البتہ بڑھاپے میں زمین بٹائی پر دینے لگے تھے۔ ہماری جوز مین گاؤں کے قریب بہتی ندی کے پاس 'ڈبونو' نامی جگہ میں تھی، والد صاحب نے علاقہ تو تالئی اور ترہ کئی میں اِس کا تبادلہ اپنے کزن کی ملکیت بنجر زمین کے ایک بڑے قطعے کے ساتھ کیا تھا۔ والد صاحب نے بڑی محنت سے یہ بنجر زمین آباد کی اور قابلِ کاشت بنایا اور اسی زمین کی بدولت شریکوں اور رشتہ داروں میں ہماری زمین زیادہ تھی۔

موضع مانیرئی دو گاؤں، برہ مانیرئی (مانیری بالا) اور کوزہ مانیرئی (مانیری پایان) پر مشتمل ہے۔ عام طور سے انہیں ہم بر کلے اور کوز کلے کہتے ہیں۔ مانیری ہمارے زمانے میں تحصیل کا سب سے بڑا اور مرکزی گاؤں تھا۔ اس کے علاوہ یار حسین، صوابی اور چھوٹا لاہور وغیرہ دوسرے بڑے
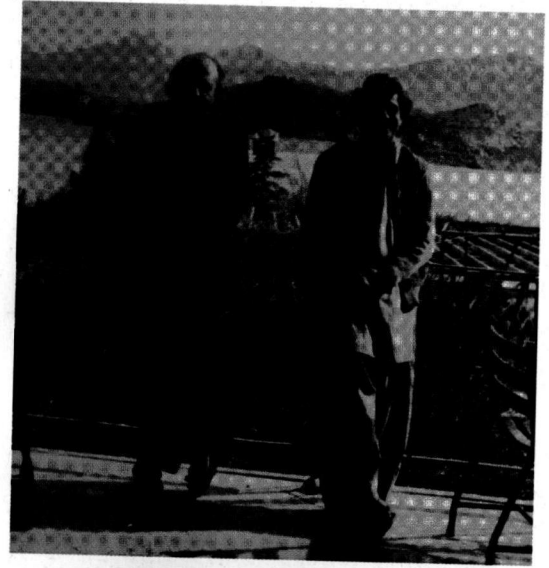
1976ء، قرغہ، کابل: صوفی اور مہراللہ مینگل۔
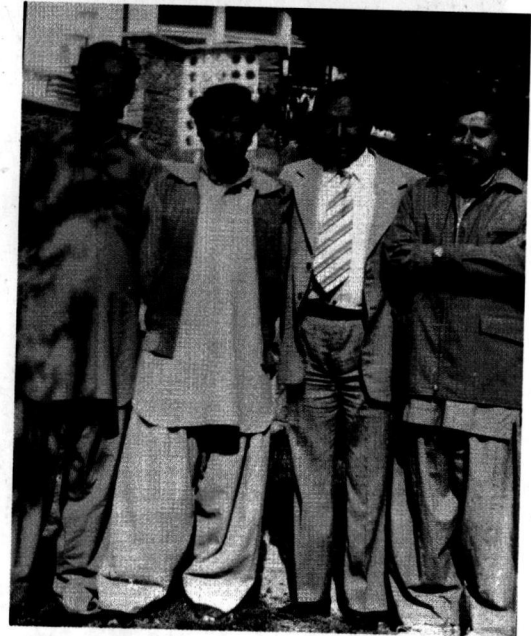
1976ء، کابل: (اپنے گھر میں، بائیں سے) میر اکرم بلوچ، صوفی، سرزمین کیمور، اسلم گچکی۔

گاؤں تھے۔ ضلع صوابی کے تمام انتظامی دفاتر اور دیگر ادارے مانیری میں ہی تھے، تاہم وقت کے ساتھ تبدیلیوں اور آبادی میں اضافے کی بنا پر اب زیادہ تر دفاتر شاہ منصور منتقل ہو چکے ہیں۔ صوابی اور مانیری دراصل ''دلہ زاک'' کے آباد کیے ہوئے گاؤں تھے، جہاں بعد میں ''عمر خیل'' آباد ہو گئے۔ آج قریب میں جتنے چھوٹے بڑے گاؤں نظر آتے ہیں وہ تمام صوابی، مانیری کی توسیع ہیں۔ تاہم اب مانیری کو وہ مرکزی مقام حاصل نہیں رہا۔ تحصیل اور پورے ضلعے کے لیے صوابی نام رکھنے کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ صوابی کے لوگ ہمارے لوگوں کے مقابلے میں میدانی علاقے میں بستے ہیں جبکہ حکومت اور قانون کی بھی پاسداری کرنے والے ہیں۔ مانیری پہاڑوں کے دامن میں آباد ہے اور طویل عرصے سے یاغی اور باغی مشہور ہے۔ پولیس بھی بوجوہ مانیری سے گریزاں رہتی اور لوگ باگ بھی مرنے مارنے پر آمادہ رہتے تھے۔ اسی گاؤں کے بدمعاش ''جمروز'' نے بڑا نام پیدا کیا تھا۔ ایک مرتبہ اس کے حجرے میں رقص و موسیقی کی محفل آراستہ تھی، اسی وقت تھانیدار میر واحد آن پہنچے، معمولی تکرار پر جمروز نے اُسے وہیں قتل کر دیا اور فرار ہو گیا، کچھ عرصہ افغانستان کے سرحدی علاقوں میں مفرور رہا، واپس آیا اور کچھ عرصہ جیل میں گزارا، نشے کا عادی ہو گیا تھا۔ آخرِ عمر میں لوگوں سے مانگ تانگ کر گزارا کرتا تھا، قریب دو سال قبل داعی اجل کو لبیک کہا۔ میں نے جس علاقے اور معاشرے میں جنم لیا، وہ مفلوک الحال، سپاٹ اور ہر حوالے سے پسماندہ تھا۔ ایسے معاشرے میں ''جمروزے'' جیسا بدمعاش اور لوفر ہی دوسروں کے لیے قابلِ عمل نمونہ ہو سکتا تھا، جسے اپنی جان کی پروا تھی اور نہ ہی کسی اور کی۔ اِس وقت پورے مانیری میں ایک پرائمری سکول تھا جبکہ ہائی سکول صوابی میں تھا۔ چند افراد ہی پرائمری پاس تھے، صرف ملک محمد جان موتی خیل کے تین بیٹے زیادہ تعلیم یافتہ تھے یا پھر ہمارے رشتہ دار اکرم خان بابا کے فرزند محمد سردار خان کراچی گئے تھے اور وہاں سے وکیل بن کر آ گئے، لیکن وکالت میں ناکام رہے، لہٰذا اُسے اپنی زمینیں اور دوکانیں سنبھالنا پڑیں۔ لڑکیوں کی تعلیم سرے سے ندارد تھی، اور جب گاؤں میں لڑکیوں کے پرائمری سکول کا افتتاح ہونے والا تھا تو دیگر قبائلی علاقوں کی طرح یہاں بھی شدید مخالفت ہوئی مگر عبدالقیوم خان کی حکومت اسے بنانے میں کامیاب رہی۔

ہمارے گاؤں میں بجلی اس وقت آئی تھی، جب میں نے ابھی باقاعدگی سے شلوار پہننا بھی شروع نہیں کیا تھا۔ بجلی کی آمد سے پہلے لوگ دیے اور شونٹیء (چیڑھ کے درخت کا چکنا حصہ) روشن

کرتے تھے۔ ہمارا گھرانہ اس لیے خوش قسمت تھا کہ ہم لالٹین استعمال کر رہے تھے۔ لالٹین اُس دور میں سٹیٹس سمبل سمجھا جاتا تھا۔ ہمارا گھر بھی دیگر رشتہ داروں کے مقابلے میں بڑا تھا، سات آٹھ مرلے کا یہ گھر پتھر اور چونے سے بنا ہوا تھا، جبکہ گاؤں کے اکثر گھر اُس زمانے میں مٹی کے بنے ہوتے، تاہم مسجد ضرور پکی بنائی گئی تھی۔ اس گھر میں ایک بڑا کمرا تھا، جس میں ہم سب سوتے تھے۔ مالدار لوگوں کے گھروں میں الماریوں کا رواج ہو چلا تھا، البتہ ہمارے گھر میں مٹی کے شیلف یعنی 'چیتیاں' تھیں، جن میں گھر کے تمام برتن رکھے جاتے تھے۔ بڑے کمرے میں ایک طرف کھاٹ کی پیٹی 'تو نڑی' تھی، جس میں کپڑے اور دیگر قیمتی اشیاء رکھی جاتی تھیں، ان کے علاوہ ٹین کے دو تین صندوق بھی تھے۔ گھر میں ایک بڑا کندو (بھڑولا) تھا جس میں گندم یا مکئی ذخیرہ کی جاتیں۔ کمرے کے ساتھ ایک پکا دالان تھا جس میں روئی، گڑ اور کھانے پینے کی دیگر اشیاء مٹی کے برتنوں میں رکھے ہوتے، علاوہ ازیں کھیتی باڑی کا سامان بھی پڑا رہتا۔ دالان میں چولہا بھی بنایا گیا تھا، جہاں سردیوں یا بارشوں میں کھانا پکتا تھا۔ عام طور پر کھانا پکانے کے لیے صحن میں بنا ہوا چولہا استعمال ہوتا تھا۔ صحن کے ایک طرف مال مویشیوں کا باڑہ تھا، جہاں بھینس اور گدھی بندھے رہتے تھے۔ بھینس دودھ کے لیے اور گدھی گھاس، چارہ، بھوسا اور ایندھن وغیرہ لانے کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ اِسی باڑے میں ہمارے ہندو ہمسائے ''گوکل'' کی چارپائی، کرسی، اُس کے بیٹوں مدن لال اور کندن لال کے جیومیٹری بکس، رنگدار پنسلوں کا ڈبہ اور دیگر سامان امانتاً رکھا ہوا تھا۔ ۱۹۵۶ء میں جب گوکل سامان لینے گاؤں آیا تو باقی سب سامان اُس کے حوالے کر دیا، البتہ رنگدار پنسلیں ہم بچے استعمال کر چکے تھے۔ زیورات اور قیمتی چیزوں سمیت اپنا باقی سامان گوکل نے گاؤں کے جس آدمی کے پاس رکھوایا تھا، وہ اُس سے مکر گیا۔ گوکل نے والد صاحب کے سامنے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا، کہ کاش وہ سونا بھی اپنے ہی پاس رکھ لیتے۔ دراصل والد صاحب نے خود ہی سونا امانتاً رکھنے سے انکار کیا تھا۔

میں بچپن ہی سے یاغی اور باغی تھا اور والد صاحب کے ساتھ بحث مباحثہ کرتا رہتا تھا۔ والد کے ساتھ میرا آزادانہ مباحثہ اور بحث و تکرار کا یہ سلسلہ ان کی زندگی بھر چلتا رہا۔ اگرچہ والد صاحب تند خو تھے، مگر میری بحث و تکرار پر کبھی تو غصہ ہوتے اور کبھی ہنس دیتے، اور جب کبھی غصے میں مجھ پر ہاتھ اٹھاتے تو دادی اماں بچا لیتیں۔ دادی اماں مجھ سے بہت محبت کرتی تھی اور

بہت مہربان تھی، میں شوخی میں انہیں اُن کے نام سے پکارتا۔اپنے بڑے بھائی زیارت خان کے برعکس میں اپنے ہمجولیوں کے ساتھ تمام علاقائی، ثقافتی کھیل تماشوں اور لڑائی جھگڑوں میں شریک رہتا۔اکثر رات گئے گھر آتا۔دن بھر ہم زیادہ تر گاؤں کے قریب 'خوڑ' (ندی) کے ریتلے پاٹ میں کبڈی اور 'مرگینڑہ' کھیلتے۔کچھ عرصہ بعد خود ساختہ ہاکیوں سے ہاکی کھیلتے، گوپھن چلاتے اور نشانہ بازی کرتے۔مانیری بالا اور مانیری پایان میں اکثر اسی ریتلے پاٹ میں مرچغنو (گوپھن) کی لڑائی ہوتی، جس میں ہم بھی شریک ہوتے تھے۔یہ ایک خطرناک کھیل تھا، جس میں لوگ زخمی بھی ہوجاتے تھے۔ایک دن تو ہمارے ایک رشتہ دار عبدالحمید نے میرا سر گوپھن کے ایک ہی وار سے پھاڑ دیا تھا اور میں تقریباً بے ہوش ہوگیا تھا۔کبھی کبھار ہاکی اور فٹبال بھی کھیل لے لیتے، ہاں ابھی کرکٹ متعارف نہیں تھا۔رات کو کھیلی جانے والے آنکھ مچولی اور اسی جیسے دیگر کھیل میرے بچپن اور لڑکپن کی یادگار ہیں۔

میرے والد مالدار آدمی نہیں تھے، تھوڑی سی زمین تھی، جو والد صاحب کسانوں کو بٹائی پر دے دیتے تھے، تاہم کبھی کبھار کچھ حصہ خود بھی کاشت کرتے، ہم بھی کبھار اس میں نلائی وغیرہ کر لیتے۔اسی طرح کھیتوں سے گھاس، چارہ، ایندھن، گندم، جوار، کپاس، شفتل، گنا، تربوز اور سبزی وغیرہ ہم خود لاتے تھے، کبھی گدھی پر لاد لیتے اور کبھی اپنے سر پر۔ہم اپنے سروں پر سردیوں میں بوچڑ اور بہار میں کامبوری کے بڑے بڑے گٹھڑ لاد کر لاتے۔میں اپنے دوستوں رشید، تاج محمد اور، جمید کے ساتھ ضد ہی ضد میں زیادہ بھاری بوجھ اُٹھایا کرتا تھا۔اس مقصد کے لیے میں گاؤں سے دور مضافاتی علاقوں میرہ، شگئی، کودرو، اور داڑسنگ بھی چلا جاتا۔برسات یا زیادہ بارشوں میں جب ندی چڑھ آتی تو اپنے ساتھ بہت سی لکڑیاں اور خاشاک لے کر آتی، ہم اُسے بھی جمع کرتے اور گھر لے آتے تھے۔جلنے کے قابل لکڑی اور گھاس پھونس کے لیے ہم داڑسنگ پہاڑی بھی جاتے اور وہاں سے غوڑاسکی اور باکڑ لے آتے۔میں اپنی بھینس کے لیے خود اپنے ہاتھ سے شفتل اور دوسرا خودرو چارا درانتی سے کاٹ کر لاتا۔اسی طرح کاشت کردہ اور خودرو ساگ کی مختلف قسمیں مثلاً سرسوں، کچھاچو، گندل اور پنیرک وغیرہ بھی چُنتا یا کاٹ کر گھر لاتا۔ایک مرتبہ میں اور میرے پھوپھی زاد ''اقبال'' گھاس کاٹ رہے تھے، کہ ناگاہ اقبال کی درانتی سے میرا پاؤں بُری طرح زخمی ہوگیا، اُس زخم کا نشان آج بھی موجود ہے۔

والد صاحب نے مجھے کم عمری میں ہی پڑھنے کے لیے مسجد بٹھا دیا تھا۔وہیں میں نے نماز سیکھی، پھر ابتدائی قاعدہ شروع کیا، قرآن ختم کیا، اور وہیں پنج گنج پڑھا۔اُس زمانے میں باقاعدہ مدارس کم ہی تھے، روایتی طور پر مساجد ہی میں درس کا اہتمام ہوتا تھا۔مجھے یاد ہے ایک مرتبہ ہماری مسجد میں کچھ عالم لوگ آئے ہوئے تھے، اُس وقت میں پہلا پارہ پڑھتا تھا، میرے سامنے تیسواں پارہ رکھ دیا گیا اور میں نے اس کی درست خواندگی کی، انہیں میرا اس طرح پڑھنا ایسا پسند آیا کہ اُنہوں نے والد صاحب سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں ان سے مزید پڑھوں اور یوں میں بڑا عالم بن سکتا ہوں، مگر میرے والد راضی نہ ہوئے۔والد چاہتے تھے کہ میں سکول جاؤں اور عصری تعلیم حاصل کروں۔اس کی بنیادی وجوہات یہ تھیں کہ ایک طرف والد صاحب کچھ سیاست سے آشنا تھے اور دوسری طرف ہمارے بعض عزیز، خان خوانین اور اپنے علاقے کے معتبر لوگ تھے۔والد صاحب کا کوئی بھائی بھی نہ تھا، گویا ایک طرح سے کمزور تھے، علاوہ ازیں آپ ماموندو اُستاد سے گہرا تعلق رکھتے تھے، جو عصری تعلیم کے قائل تھے۔ممندو استاد یا ماموندو استاد کا اصل نام عبدالرحیم تھا، جن کے اصل نام سے بہت کم لوگ واقف تھے، یہاں تک کہ میرے والد بھی صحیح نام سے آشنا نہ تھے کیونکہ ایک مرتبہ ایک مقدمے میں والد صاحب نے ان کا نام غلط ہی لیا تھا۔عبدالرحیم بنیادی طور باجوڑ کے باشندے اور قبیلہ ''ماموند'' سے متعلق تھے۔باجوڑ سے ہمارے گاؤں آ گئے تھے، یہاں سلائی کا کام کرتے تھے۔ماموند استاد، لکھے پڑھے آدمی اور فارسی جاننے والے تھے۔اِن کے بڑے بھائی افغانستان حکومت کی ناقلین سکیم میں قندوز (افغانستان) چلے گئے تھے جہاں انھیں تھوڑی بہت زمین دی گئی، جن کا ایک بیٹا نظیف اللہ نہضت، حفیظ اللہ امین نے ''خلق'' پارٹی میں شامل کیا، جو ثور انقلاب کے بعد پہلے ہرات اور پھر غزنی کے والی (گورنر) بنے، پھر کیوبا میں افغان سفیر مقرر ہوئے۔خود ماموند استاد کا بیٹا مختار احمد پروفیسر بنا۔والد صاحب پر ماموند استاد کا بہت اثر تھا اور وہ ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔والد صاحب اپنی زمینوں سے آنے والے اناج، سبزیاں اور سوختنی لکڑی میں سے سب سے پہلا حصہ انہی کا نکال کر بھجواتے تھے۔ماموندو استاد ہمارے لیے چچا کے برابر تھے۔والد صاحب کے ساتھ ان کا تعلق اتنا گہرا تھا کہ میری افغانستان موجودگی میں میرے والد کی ۱۹۷۵ء میں وفات سے لے کر اپنی وفات ۱۹۹۳ء تک ماموند استاد ہر صبح ان کی قبر پر تلاوتِ قرآن کی غرض سے جاتے رہے۔محترم ماموندو

استاد اپنے جاہل اور غیر تعلیم یافتہ عزیزوں اور شریکوں سے ناچاقی کے سبب تمام جائداد اور زمینیں چھوڑ کر یہاں آ گئے تھے اور تمام عمر ان سے لاتعلق رہے۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کے مہربان دوست کی اولاد (ہم) تعلیم حاصل کریں۔

مجھے اپنا ختنہ اچھی طرح یاد ہے، اس زمانے میں ڈاکٹر نہیں ہوتے تھے اور نہ ہی لوگ ڈاکٹروں سے زیادہ واقف تھے۔ ختنے حجام سے کروائے جاتے اور اس موقع پہ خوشی منائی جاتی تھی۔ زیارت خان اور میرا ختنہ ایک ہی دن ہوا تھا، والد صاحب نے اس تقریب میں دو بھینسیں ذبح کی تھیں۔ حجام کا طریقِ کار یہ ہوتا ہے کہ بچے کو لگن پر بٹھاتا، پھر بچے سے کہتا کہ وہ دیکھو آسمان میں سونے کی چڑیا یا وہ جہاز دیکھو، جیسے ہی بچہ اوپر دیکھتا، حجام اس کا ختنہ کر دیتا اور اس کے ساتھ ہی مبارک مبارک کا شور اٹھتا۔ اس زمانے میں حجام زخم پر راکھ یا بچے کا پیشاب ڈال دیتا تھا، پھر کوئی بچے کو ہاتھوں میں اٹھا کر گھر لے جاتا۔ مجھے اپنا ختنہ کچھ اس لیے بھی یاد ہے کہ حجام کی بے احتیاطی نے مجھے کافی زخمی کر دیا تھا، اور یہ زخم ٹھیک ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ چنانچہ مجھے ایک اور تکلیف دہ مرحلے سے گزارا گیا، وہ یوں کہ مجھے ندی میں بٹھایا جاتا اور چھوٹی چھوٹی مچھلیاں اس بگڑے زخم سے گندگی کھاتی۔

گھر سے باہر ہمارے کھیل کود کے میدان، حجرے ہوا کرتے تھے۔ سپین کرم خیل کا حجرہ ہمارے گھر کے نزدیک تھا، وہاں بڑ (Bunyan) کا درخت تھا اس لیے "بڑ حجرہ" کے نام سے مشہور تھا۔ جبکہ تور کرم خیل کا حجرہ "ڈگر" (میدان) کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ یہ حجرہ باڑی اور ندی کے نزدیک تھا۔ اس حجرے کی دیواریں نہ تھیں، اس لیے ہم بچے اسی حجرے میں زیادہ کھیلتے، ہم یہاں بچپن اور لڑکپن کے تمام کھیل کھیلتے۔ میں نہ صرف ان دو حجروں بلکہ شیرزاد خیلوں کے حجرے بھی جاتا تھا۔ حجرے غمی شادی کے مرکز تھے۔ حجروں میں طوائفوں کا ناچ گانا، مجلسیں (روایتی موسیقی کے روایتی مجالس) اور تماشے بھی ہوتے تھے۔ تاہم ڈگر حجرہ خوار سا تھا، کم ہی پروگرام ہوتے۔ ہم بچے ستار منگے (مٹکا) سنتے، بڑے بوڑھوں کے قصے سنتے، بڑوں کے ہنسی مذاق کو برداشت کرتے اور مہمانوں کی خدمت کرتے۔۔ بعض اوقات کوئی ریڈیو لے آتا، ریڈیو سے گانے وغیرہ سنتے۔ ریڈیو سیلون (سری لنکا) اور ریڈیو پاکستان پشاور سے موسیقی اور پشتو کے ایک مشہور پروگرام کے کرداروں توکل خان اور پائندہ خان کی مسالہ دار باتیں سنتے۔ اس زمانے کے

ریڈیو سائز میں بڑے بڑے ہوتے تھے۔ یہ ریڈیو اکثر فلپس اور پائی (Pye) برانڈ کے ہوتے۔ شب قدر میں ہم تیل میں ڈبوئے کپڑوں سے بنے گیند آگ لگا کر اچھالتے، کھیلتے۔ اسی طرح ان راتوں کے لیے خریدے گئے پٹاخے اور آتشبازی کی دیگر اشیاء سے کھیلتے۔ رمضان کے مہینے میں افطاری سے کچھ پہلے ہم چھوٹے بچے بچیاں مسجد کے ساتھ جمع ہوتے، مستیاں کرتے، جیسے ہی موذن اذان دینے کھڑا ہوتا، اور "اللہ اکبر" کہتا، ہم تمام بچے چیختے چلاتے گھروں کی طرف دوڑتے اور یہ کہتے "روژے کوژے ماتے، پہ لاونڑ کی سلور نیمے ڈوڈئی ماتے" (روزے کوزے ٹوٹ گئے، سالن میں ساڑھے چار روٹیاں توڑی گئیں)۔ چونکہ اس زمانے میں لاؤڈ سپیکر نہیں تھے اس لیے ہمارے اس شور پر لوگ روزہ کھولتے۔ شب قدر اور رمضان میں دوسرے علاقوں سے علماء اور نعت خوانوں کو بلایا جاتا تھا۔ علاقے میں بجلی آنے کے بعد لاؤڈ سپیکر بھی ایک نزاعی مسئلہ بن گیا۔ بعض علماء کے نزدیک یہ اس لیے جائز نہیں تھا کہ حضور ﷺ منبر پر کھڑے ہوتے اور وعظ دیتے تھے اور اس طرح لاؤڈ سپیکر سے وعظ ونصیحت اور نعت پڑھنا مکروہ ہے، جبکہ دوسرا فریق اسے جائز سمجھتا تھا۔

میرے کھیل کود کا اہم مرکز ندی کے ساتھ ریتلا میدان تھا۔ چونکہ ہمارا گھر گاؤں کے مغرب میں تھا اور کرم خیل ندی کے ساتھ آباد تھے اس لیے ہمارے سارے روایتی کھیل، ثقافت اور لوک باس ندی سے وابستہ تھی۔ اس زمانے میں ہماری مسجد آخری حد تھی۔ مسجد کے مغربی جانب کرم خیلوں کی زمینیں اور کھیت تھے۔ جبکہ اس سے آگے ندی کا وسیع ریتلا پاٹ تھا۔ یہی میدان ہمارے کھیل کود اور ہنسی مذاق کی آماجگاہ تھا۔ برسات میں جب ندی چڑھ آتی تو ہم اس میں تیرتے نہاتے، بہہ کر آنے والے سانپ مارتے، لکڑبالن جمع کرتے اور جب پانی زیادہ گہرا ہو جاتا تو مچھلی اور مارماہی کا شکار کنڈوں، جال اور جال ٹوکری کے ذریعے کھیلتے اور جب مچھلیاں زیادہ ہوتیں تو پھر چادر سے اسے پکڑتے۔ ان دنوں ہمارے کھیل کود، شکار اور دوسری سرگرمیوں کے مراکز میں گاؤں کے مغربی سمت والا حجرہ، مسجد، باڑی، ندی، پیر تیپ، زندئ، میرہ، شگہ، کودرے، بارکے، جبکہ گاؤں کے مشرقی سمت لختے، موضع توتالئ ہماری زمین، ترکئ اور داڑسنگ کے علاقے شامل تھے۔ مینا اور بلبل پالنا بھی میرے مشاغل میں شامل تھا۔ ان کی خوراک کے لیے سردیوں میں قریبی مسجد اور خصوصی طور پر ببر بابا مسجد سے آف سیزن میں خوابیدہ بھڑ اور زنبوریاں لاتا۔ ببر بابا

کرم خیل اور صاحب حیثیت آدمی تھے،ان کا حجرہ، مسجد اور باڑی (زیرکاشت زمین) الگ تھی، اُن کے پوتے 'محمد امین' میرے ہم جماعت تھے۔اس مسجد میں نہ صرف ہم زنبور پکڑتے بلکہ مرحوم استاد محمود شاہ کے درس میں ہم درس بھی تھے، یہ اُن دنوں کی بات تھی جب مرحوم استاد کو کرم خیل مسجد سے بوجوہ فارغ کیا گیا تھا اور اخوند خیل قبیت شاہ استاد کو امام مقرر کیا گیا تھا۔قبیت شاہ صاحب امامت کے ساتھ ساتھ اپنی زمین بھی کاشت کرتے تھے۔قبیت شاہ صاحب انتہائی میٹھی آواز میں قراءت فرماتے تھے۔محمود شاہ صاحب کی وفات کے بعد ان کے صاحب زادے عبدالودود صاحب پیش امام بنا دیے گئے۔محمود شاہ صاحب ہمارے ہمسائے تھے۔اخوند خیلوں نے طویل عرصے تک علاقے میں مذہبی خدمات انجام دی ہیں۔

میں موسمِ سرما میں اکثر اپنے ہم عمر شیر (شیرین خان کاکا کے فرزند) اور رشید (سجاول کاکا کے فرزند) اور دیگر ساتھیوں کے ساتھ بلبل کے شکار کے لیے پنی ڈنڈ اور برگی ڈنڈ کے کنارے داڑسنگ جاتا تھا۔ہم اس غرض کے لیے کوڑکے رکھتے اور جب کوئی بلبل پھنس جاتا تو ہم اُسے فوراً زندہ پکڑ لیتے،اس کے پر باندھ لیتے اور پھر اس کی ایسی تربیت کرتے تھے کہ آزاد چھوڑ کر کندھے پر بٹھا کر چلتے۔بعض اوقات یہ بلبلیں ایسی رام ہو جاتیں کہ ہم انھیں آزاد بھی کر دیتے تو واپس آ جاتیں۔ہم لوگ زرد دم والے بلبل کو 'بلبلہ' (مونث) اور سرخ دم کو بلبل کہتے تھے، حالانکہ یہ دونوں ایک دوسرے کے نر مادہ کے بجائے الگ الگ نسلیں ہیں اور دونوں میں اپنے اپنے نر مادہ پائے جاتے ہیں۔

لڑکپن میں مجھے غلیل چلانے کا بڑا شوق تھا اور اس میں مہارت بھی پیدا کی تھی۔میں غلیل سے چڑیا، مولوں، سیسیوں، بگلوں، اور پدی جیسے پرندوں کا شکار کھیلتا اور بہار کے بعد فاختاؤں اور توت خور پرندوں کا شکار کرتا۔غلیل سے شکار میں عالم دین دھوبی بڑا ماہر تھا۔جب میں اپنے ماموں کے ہاں 'شیخ جانہ' جاتا تو وہاں شکار کے لیے ہم قبرستان کا رخ کرتے،کیوں کہ یہاں فاختائیں اور 'گوگشتو' زیادہ ہوتیں۔شیخ جانہ، ہمارے گاؤں سے مغرب کی جانب دس بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔اُس زمانے میں یہ فاصلہ ہمیں بہت زیادہ محسوس ہوتا،ہم تانگے یا بس میں بیٹھ کر جاتے۔بس سے یہ سفر آدھے دن پر محیط ہوتا۔میں یہاں کئی کئی دن گزارتا۔میرے نانا الیاس بابا اور ماموں سید رحمان اور گل رحمان زیادہ مالدار نہ تھے۔ان کی اپنی زمین کم ہی تھی،وہ

بٹائی پر دوسروں کی زمین کاشت کرتے تھے۔مجھ پر بہت مہربان تھے۔

ندی کے دوسری جانب محمد شریف بابا کا ناشپاتی، خوبانی اور مالٹے کا وسیع باغ تھا جہاں کرم خیل کے لڑکے پھل چوری کرتے تھے۔محمد شریف کے پوتے اور صابر کاکا کے بھائی اس وقت کافی چھوٹے تھے۔جب ہم اِس باغ میں چوری کی غرض سے جاتے،تو یہ چھوٹے یعنی محمد اسلام اور محمد جسیم ہمیں دیکھتے تو گالیاں دیتے۔ہمیں یہاں سے چوری میں بڑا مزا آتا۔اصلاً یہ چوری نہ تھی، بلکہ بچپن اور لڑکپن کی شرارتوں میں سے ایک معروف شرارت تھی۔میں اپنی پھوپھی (جن کے شوہر یعقوب خان گرداور تھے) کے گھر واقع صوابی بھی جایا کرتا تھا،تاہم کچھ عرصے بعد ہمارے تعلقات ایسے خراب ہو گئے کہ پھوپھو کی موت تک ہمارا آنا جانا اور غمی شادی موقوف تھی،اگرچہ پھوپھی زاد فدا محمد کے ساتھ علیک سلیک بدستور قائم رہی۔جبکہ اپنے دوسری پھوپھیوں مغل باز اور ورید خان کی والدہ اور کامل خان کی والدہ کے گھروں میں جاتا رہتا تھا۔مجھے کامل خان کے گھر کی بیری آج بھی یاد ہے۔مغل باز تمباکو کے کاروبار کے سلسلے میں زیادہ تر لاہور میں ہوتے تھے۔ سب سے چھوٹی پھوپھی،جن کی شادی صوابی میں ہوئی تھی،انکے بیٹے خورشید اور شوہر نوشاد کاکا بھی لاہور میں کاروبار کرتے تھے۔

میں لڑائی،کھیل کود اور شکار کے اوزار خود ہی بناتا تھا۔لڑائی جھگڑے کے لیے گوپھن،بلبلوں کو پکڑنے کے لیے کوڑکی،پرندوں کے شکار کے لیے غلیل اور مچھلیوں کے لیے کنڈے وغیرہ اپنے ہاتھوں تیار کرتا تھا۔گاؤں سے ملحقہ پہاڑی میں سنگِ مرمر، شامقصود اور دوسرے کے پتھر مختلف رنگوں میں ملتے تھے۔میں اکثر پہاڑ چڑھتا اور مختلف پتھر ساتھ لاتا۔ہم نے لوہار سے چھوٹی چھوٹی ہتھوڑیاں خریدی ہوئی تھیں،جن سے ہم لائے ہوئے پتھروں سے کانچے بناتے،پھر ان کی گولائی کو زیادہ ہموار بنانے کے لیے ممی خیل اور ببر بابا مساجد کی دہلیز کے ساتھ پتھر کی سلوں سے رگڑتے۔اسی طرح شیرداد خیل حجرے میں موجود پتھر کی بڑے سل کو بھی استعمال کرتے تھے۔میں نے نہ صرف پتھر کے کانچے بنانے میں مہارت حاصل کی، بلکہ اس کھیل میں کافی ماہر بھی تھا۔بازی اکثر شرط بد پہ ہوتی تھی،اور جو ہار جاتا وہ رات کو جیتنے والے کو چینی والی چائے پلاتا (اس زمانے میں عموماً گڑ کی بنی چائے استعمال ہوتی تھی،یہ گویا عیاشی تھی) یا بھٹ سے بھنے دانے دلاتا۔بعض لوگ شرط میں پیسے بھی لگاتے،تاہم میں نے کبھی کسی طرح کا جوا نہیں کھیلا۔ہمارے گھر کے

پچھواڑے میں ہندوؤں کا ''دھرم شالہ'' تھا، جو تقسیم ہند کے بعد اعظم کاکا (زمو) کی ملکیت بنا۔ زمو کاکا کے چھوٹے بیٹے معظم خاں کے ساتھ میری بڑی بہن بیاہ دی گئی تھی، چنانچہ اس دھرم شالے کا ایک حصہ ان کو دیا گیا تھا، جب کہ باقی حصہ ان کے بڑے بیٹے مدار خان کو ملا۔ مدار خان نابینا تھے، اُنہوں نے اپنے حصے میں ''مدکخانہ'' بنایا تھا۔ اس زمانے میں صرف چرس ہوتی تھی، افیون سے مدک بناتے اور چلم سے پی جاتی۔ مدار خان کے دوسرے بیٹے جمید (جمید ادخان) میرے ہم عمر اور کھیل کود کے ساتھی تھے۔ میں اکثر مدک خانے جایا کرتا تھا اور مدک بنانے کا طریقہ بھی جان چکا تھا۔ میں بھی کبھی کبھار جمید کے ساتھ مدک بناتا، بعد میں جمید خود بھی مدکی ہو گیا تھا۔ اللہ کا کرم ہے کہ میں نے کبھی کوئی نشہ، نسوار، چلم، سگریٹ، مدک وغیرہ استعمال نہیں کیا۔ اس مدک خانے میں دور دور سے نشئی آتے تھے۔ میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ ہمارے گاؤں میں پولیس آنے کی جراءت نہیں کرتی تھی، اس لیے مدک خانے اور قمار خانے آزادانہ کھلے تھے۔ مدکخانے میں امیر اور غریب، دونوں طبقات کے نشئی ایک ساتھ بیٹھتے اور مدک پیتے۔ مدکخانے کی وجہ سے گاؤں میں ملنگ زیادہ ہوتے۔ ہمارے پڑوسی پیر خان بابا کے ایک بھائی ملنگ اور چرسی بن گئے تھے، جن کے ہاں ایک اور ملنگ چمن علی نے ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔ چمن علی اکثر کہتا تھا، کہ ہم ملنگ (نعوذ باللہ) اللہ کے دربار میں اللہ کے نزدیک تھے، اللہ نے فرمایا کہ ''بنگ بوزہ'' اُس وقت ملا لوگ چونکہ دور کھڑے تھے چنانچہ اُنہوں نے صحیح طور سے نہیں سنا اور 'بنگ بوزہ' کو 'لموز روژہ' (نماز و روزہ) بنا دیا۔ ایک مرتبہ چند بڑوں نے ہم لڑکوں کو بھڑکایا کہ چمن علی کفریہ باتیں کرتا ہے چنانچہ ہم نے بڑوں کے کہنے پر اس پر پتھر برسا برسا کر گاؤں چھوڑنے پر مجبور کیا۔

مانیری کے واحد پرائمری سکول کے ہیڈ ماسٹر سڑہ خان استاد تھے، آپ ہیڈ ماسٹری کے ساتھ پوسٹ ماسٹر کے فرائض بھی سرانجام دیتے تھے۔ اُس زمانے میں اصل ڈاکخانہ صرف صوابی میں تھا جبکہ مانیری سکول ضمنی طور پر ڈاکخانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اُس زمانے میں ڈاک کا انتظام کافی بہتر تھا، ڈاکیا خاکی رنگ کی وردی میں ملبوس ہوتا تھا اور لوگوں کے خطوط متعلقہ افراد کے گھروں اور حجروں میں بروقت پہنچاتا رہتا۔

مجھے غالباً ۱۹۵۳ء میں گورنمنٹ پرائمری سکول مانیری میں داخل کروا دیا گیا، اُس زمانے میں پرائمری سکولز چوتھی جماعت تک ہوتے تھے۔ مجھے تھوڑا سا یاد ہے کہ مجھے گلی کی طرف کے

کمرے میں بٹھایا گیا تھا۔ مجھے زیادہ یاد نہیں کہ اس کمرے میں کچی پکی یا اول ادنیٰ اور اوّل اعلیٰ جماعت کے طلباء ایک دوسرے کو پشت کر کے ایک ساتھ بیٹھتے تھے۔ میں کچھ زیادہ چالاک تھا، اکثر دوسری جماعت کی طرف منہ کر کے بیٹھا رہتا۔ اس زمانے میں میرے ساتھ میرے چم (محلے) کے لڑکے پڑھتے تھے ان میں علی حیدر کاکا کے صاحبزادے انور، پیر داد خان کاکا کے بیٹے بختے (بخت زمین)، شیرین خان کاکا کے بیٹے شیر یاد ہیں۔ بختے اور انور نے جلد ہی سکول چھوڑ دیا، جبکہ باقی ہم جماعتوں میں بعض ہائی سکول تک ساتھ رہے اور بعض نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ میر قادر اور عبدالقادر (موتی خیل) مڈل تک سکول میں رہے، انزرگل (غنچہ گل کاکا کے صاحبزادے) اور میر زمان خان نے میٹرک کیا اور سرکاری نوکری حاصل کی، میاں جان (مزید خیل) اور شیر نے کالج میں تعلیم کو خیرباد کہا، محمد صابر (خامل خیل) پروفیسر بنے، غلام سرور کاکا کے صاحبزادے نادرا میں افسر ہو گئے۔

میں فطری طور پر ذہین تھا۔ سکول میں ہم تختیاں استعمال کرتے تھے۔ تختی پر امباری مٹی ملتے اور پھر اس پر نل یا سرکنڈے کے قلم سے لکھتے۔ بچپن ہی سے مجھے خوشخط لکھنے (خوشخطی) کا شوق تھا اور میری لکھائی بھی اچھی تھی۔ پاکستان کا موجودہ قومی ترانہ ۱۹۵۶ء میں لازم کیا گیا، اس سے پہلے جگن ناتھ آزاد کا لکھا ہوا ترانہ ''سارے جہاں سے اچھا پاکستان ہمارا'' پڑھا اور گایا جاتا تھا، جو اصلاً علامہ محمد اقبال کی نظم کے مصرعے ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' میں ترمیم کر کے بنایا گیا تھا۔ سکول میں ہم بچے سویرے سویرے تلاوت، ترانے اور صفائی کی انسپکشن کے لیے ''فال ان'' ہوتے تھے۔ ہر استاد کے پاس ڈنڈا ہوتا تھا اور مار پیٹ عام سی بات تھی۔ پرائمری سکول میں جناب سڑہ خان، ولی اللہ، نور کمال، وحید اللہ اور اسیم خان صاحبان ہمارے اساتذہ تھے۔

سکول کی تعلیم کے ساتھ ساتھ میں اپنے والد کے ساتھ کھیتوں میں بھی کام کرتا تھا۔ گھاس کاٹتا، کھیت میں نلائی کرتا، گھاس اور سبزی کے گٹھر لاتا۔ پینے کے لیے گندم اور جوار مشین پہ لے جایا کرتا، کبھی کبھار ندی کنارے بھینس چرانے لے جاتا، ہم عمروں کے ساتھ مضافات سے سوختہ لکڑی بالن لاتا، کھیتوں میں حیوانی کھاد پہنچاتا اور حشر (اجتماعی کٹائی) یعنی کھیت میں کام کرنے والوں کے لیے کھانا لے جایا کرتا تھا۔

میں جب پہلی مرتبہ لندن گیا تو قہوہ (سبز چائے کی پتی) سپر مارکیٹ اور عام دکانوں سے

دستیاب نہ تھی، بلکہ پنساریوں اور طب یعنی ہربل میڈیسن (Herbal Medicine) کی دکانوں پہ ملتی تھی، اب تو یہ عام ہو گئی ہے۔اسی طرح ہمارے بچپن میں قہوہ نزلہ زکام میں پلایا جاتا تھا۔رات کو جب ہمیں قہوہ دیا جاتا تو پیشاب کے لیے چارپائی کے نیچے خالی برتن رکھا جاتا تا کہ ہمیں سردی میں باہر نہ جانا پڑے، یوں ہمیں صبح دیر سے باہر آنے کی اجازت ہوتی۔ایک مرتبہ میں بہت بیمار پڑ گیا، جو بھی کھاتا، معدے میں نہ رکتا۔ہمارے علاقے میں ڈاکٹر نہیں تھے، والد صاحب کندھے پر بٹھا کر مجھے حکیم اور پنساریوں کے ہاں لے جاتے رہے۔بام خیل کے باچایان (سیّدزادے) چار بھائی تھے، روحانی علاج کے ساتھ ساتھ حکمت بھی کرتے تھے۔پورے صوابی، بلکہ دور دراز سے لوگ ان کے پاس آیا کرتے تھے۔ہمارا تعلق منجھلے بھائی عبدالوارث باچا کے ساتھ تھا اور وہی ہمارا علاج کیا کرتا تھا، مجھے بھی وہیں لے جایا گیا۔ہم لوگ وہاں تانگے میں جایا کرتے تھے۔بچپن میں ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ گلی میں فقیر نے خیرات کے لیے صدا لگائی، میں اس کے لیے روٹی باہر لایا، پیچھے سے چھوٹے بھائی رسول خان نے شرارتاً کنڈی چڑھالی، میں باہر رہ گیا، والدہ نے درواز کھولا تو میں غصّے میں رسول خان کو مارنے کے لیے لپکا، اُس نے کمرے کی طرف دوڑ لگائی، میں پیچھے بھاگا اور دروازے کی دہلیز کے ساتھ ٹھوکر کھا کر گر پڑا اور میرے ہاتھ پر زخم آیا اور کافی سوجن ہو گئی۔والد صاحب مجھے صوابی ہسپتال لے گئے، جہاں ایک بنگالی ڈاکٹر موجود تھا۔معائنے پر پتہ چلا کہ کلائی اتر گئی ہے۔والد صاحب مجھے دم درود اور اُتری ہوئی کلائی پر چانچر باندھنے کے لیے ٹانکوئی (ٹھنڈ کوئی گاؤں) لے گئے، مگر کلائی ٹھیک نہ ہو سکی۔پھر ماموندو استاد کے کہنے پر والد صاحب مجھے پشاور کے نزدیک گاؤں ''بھالو'' دم درود کے لیے لے آیا، کلائی ڑتو گئی تاہم جوڑ صحیح نہیں بیٹھا اور کجی اب تک ہے یہاں تک کہ وہ ہاتھ میں اپنے کاندھے پر نہیں کھ پاتا۔علاوہ ازیں مجھے پیٹ کی بیماری بچپن سے ہے اور جس کے اثرات آج بھی محسوس ہوتے ں، اس کی بنیادی وجہ میری بداحتیاطی اور الم غلم چیزیں کھانا ہے۔بچپن میں امباری مٹّی (گھاچی) ی کھانے کے ساتھ ٹھنڈے تندور سے روٹی کے باقیات کھرچ کر شوق سے کھایا کرتا تھا، بلکہ جو لجھ ملتا کھا لیتا۔میری اس عادت سے نہ صرف میرا پیٹ ہر وقت خراب رہتا بلکہ آنتڑیوں کو ایسی اری لاحق رہی کہ اب بھی نقص تکلیف دیتا ہے۔ایک اور نقص، جو میرے وجود کے ساتھ وابستہ ہے، اسے انگریزی میں sacrlisation کہتے ہیں، جس میں کولہے کی ہڈی ایک طرف سے بڑھ

جاتی ہے اور اس کا دباؤ دوسری طرف پڑنے لگتا ہے، مجھے یہ تکلیف چالیس سال کی عمر کے بعد زیادہ محسوس ہونے لگی ہے۔یہ نقص بھی دراصل بچپن سے ہے کیونکہ جب میں بچپن میں دوستوں کے ساتھ زیادہ دوڑتا یا زیادہ چلتا تو مجھے پاؤں اور ٹانگوں میں تکلیف محسوس ہوتی تھی، جس کی وجہ سے ساری رات نیند نہ آتی تھی۔

چم کے میرے ہم عمر ساتھیوں میں شیر ولد شیرین خان، انور ولد علی حیدر، بختے ولد پیرداد، سرور ولد خان غالب، فرزند ولد شاد محمد، شیر آدم ولد خان شیر، جناب ولد محمد جان (پھوپھی زاد)، میرزمان خان ولد ملک سکندر، فیض ولی خان (پیدے)، جمید، تاج محمد (شیر دادخیل)، رشید اور امان اللہ وغیرہ تھے۔ان کے علاوہ میرے وہ ساتھی جو اگرچہ عمر میں مجھ سے کچھ بڑے تھے، لیکن میرے ہم جماعت یا کھیل کود کے ساتھی تھے، ان میں مہردل خان، خادم، نقش بند (بندے) وغیرہ تھے۔ان سے بھی بڑے وہ لڑکے جن کے ساتھ ہم کھیلتے یا شکار پر جاتے، گو یہ ہمیں منع کرتے، لیکن ہم شریک رہتے، ان میں ولی محمد (شیر دادخیل)، گل زمان، میرزا غیاث، مشر، سبز علی، مستعمر شاہ، محمد امین، غزن، صاحبداد، قیصر، شیخ سعید، فدا، میر امان، شفیع (شیر دادخیل) وغیرہ شامل تھے۔ ولی محمد کے ساتھ تو ہم اکثر جایا کرتے۔

شیخ سعید (شیخ لالا) عجیب آدمی تھے، کتوں سے سخت ڈرتے تھے، اگر کوئی کتّا کھیت کی کسی پگڈنڈی پر دیکھ لیتے تو شیخ لالا رستہ بدل دیتے۔ایک مرتبہ میں نے ان سے پوچھا بھی کہ لالا آپ کتوں سے اتنا کیوں ڈرتے ہیں؟ تو انہوں کہا کہ، نہ تو آپ کتّے کے کاٹنے کے خلاف پولیس میں رپورٹ درج کر سکتے ہیں اور نہ ہی آپ ان سے بدلہ لے سکتے ہیں۔ایک دفعہ ہم نے کہا کہ شیخ لالا! جوان بنو! کچھ تو غیرت سے کام لو! تو اُنہوں نے قبرستان کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ جوانوں کی جگہ وہ ہے اور مجھے وہاں جانے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔

بڑے بزرگ، جن کے ساتھ مسجد و حجرہ کی وجہ سے تعلق تھا، ان میں اسلم کاکا، محمد شاہ، زینور شاہ، سردار، دیار خان، مدد خان، مدار شاہ ترکھان، فردوس ترکھان، جانس خان ترکھان، ماصل خان ترکھان، شیرین خان، پیرداد خان، شیرداد بابا، قیبت شاہ، مدار خان، فضل خان، افضل خان، علی گل خان، گوہر علی، شمشو، محمد سردار، آزاد خان، بہادر شیر، زرداد خان (مفرور رہنے

شاد علیخان، پیر خان، زین خان، وزیر محمد، گلاب، محمد حسین کاکا شامل تھے۔ محمد حسین کاکا سردی کے زمانے میں رات کو قصّے کہانیاں سناتے تھے، مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ میں بھی ان کا بہت خیال رکھتا تھا۔ گھر سے ان کے لیے حجرے میں چائے لاتا اور جب میں ہائی سکول داخل ہوا تو صوابی اڈے سے ان کے لیے نسوار ساتھ لاتا۔ چونکہ اس زمانے میں گاؤں میں ریڈیو خال خال اور صرف پیسے والوں کے پاس تھے۔ ٹیپ ریکارڈر ابھی نہیں آیا تھا جبکہ ٹیلی ویژن کو تو لوگ جانتے تک نہیں تھے۔ ایسے میں محمد حسین کاکا شہزادوں، پریوں، دیوؤں اور لوک قصے کہانیاں دل لگا کے سناتے اور ہم بھی بہت شوق سے سنتے۔

گاؤں کے بازار کا تذکرہ بھی لازمی تصور کرتا ہوں۔ بچپن میں میں زیادہ تر سودا محمد دین کاکا (دھوبی) سے خریدتا تھا۔ یہ خریداری چائے، گڑ، نمک، دال اور مٹی کے تیل پر مشتمل ہوتی۔ محمد دین کاکا انتہائی ایماندار آدمی تھے، ان کے نرخ کم اور تول پورا تھا۔ یہ سودا زیادہ تر گندم اور مکئی کے تبادلے میں ہوتا تھا، تاہم کبھی کبھار پیسوں کی ادائیگی بھی ہو جاتی۔ میٹھا گوہر علی خان اور بلے ماما (بلال حیدر) سے خریدتے۔ او بلے ماما 'جوا' بھی کھیلتے تھے۔ ایک دن انہوں نے مانیری بالا کے حضرت شاہ سے جوئے میں خاصی رقم ہاری تھی، انتہائی غمگین تھے، انھی دنوں انھوں نے دکان میں موٹی سویاں نئی نئی بیچنی شروع کی تھیں، ہم نے پوچھا کہ ماما اسے کیا کہتے ہیں؟ انھوں نے بے ساختگی سے کہا کہ یہ حضرت شاہ کی سویاں ہیں، تب سے پورے چم میں ان سویّوں کا نام حضرت شاہ بیچی (بیچی بمعنی سویاں) پڑ گیا۔ ویسے اُن دنوں گندم کی کٹائی کے بعد گھروں میں ہی تیلی سویّوں کے بنانے ساتھ مرونڈے، درویش اور غوزاخی (گھریلو مٹھائیاں) بھی پکائے جاتے تھے۔

ہمارے مشاغل میں دکانوں کے قریب مٹرگشت بھی داخل تھا۔ اس زمانے میں زندگی زیادہ تر قبیلوی اور کھیتی باڑی سے وابستہ تھی۔ لوگ بازاروں میں وقت گزاری کے مشغلے سے آشنا نہیں تھے۔ اکثر بزرگ، گاؤں کے بڑے بازار تک ہی جاتے، صوابی اڈہ کے بازار کا رخ کرنا عام نہ تھا، صرف وہی افراد جایا کرتے تھے جن کا اس بازار میں کاروبار یا روزگار وابستہ تھا۔ ہم لڑکوں کی اڈے سے متعلق واقعات اور کہانیوں میں بڑی دلچسپی تھی۔ میرا ایک ساتھی گل رسول ہمارے سکول ہی میں پڑھتے تھے، اس کے والد جمعہ خان کاکا تانگہ چلاتے تھے۔ گل رسول والد کے ساتھ نہ

صرف اڈے پہ جایا کرتا تھا، بلکہ دوسری جگہوں کی سیر سے بھی لطف اندوز ہوتا تھا۔ اُس زمانے میں بسیں کم کم ہی تھیں۔ مردان کے لیے سارے دن میں چار پانچ بسیں چلتی تھیں، گل رسول کو ان تمام بسوں کے نمبر کچھ اس طرح یاد تھے کہ دور سے کوئی بس ہارن بجاتی، تو گل رسول فوراً کہہ دیتا کہ ۴۴۸۸ آ گئی۔ اُس کا اس طرح کہنا مجھے بہت بھاتا تھا۔ ہم جب بھی ندی کی طرف نکلتے تو ضرور ''فرش'' کی سیر بھی کر لیتے۔ فرش سے مراد مانیری ندی پر انگریزوں کا بنایا ہوا پل تھا جو مردان صوابی ٹریفک کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ ایک دن، جب کہ سکول گرمیوں کی چھٹیوں کی وجہ سے بند تھے، ساون یا بھادوں کا مہینہ تھا، بارش ہو چکی تھی، آسمان پر ابھی بدلیاں تیر رہی تھیں اور نہایت خوشگوار ہوا بھی چل رہی تھی۔ گل رسول اور میں نے بھاگ کر مردان جانے کا ارادہ کیا اور سڑک کے ساتھ مردان کی طرف پیدل روانہ ہوئے۔ میرے پاس کھیل کود کا گڈ گڈاری تھی اور گل رسول کے پاس پہیہ تھا، اسی سے کھیلتے لڑھکاتے ہوئے جا رہے تھے۔ چلتے چلتے تھک گئے اور سر پر رات آ گئی، اس وقت ہم شہباز گڑھی پہنچ چکے تھے، چنانچہ ہم گاؤں کے ایک محلے کی مسجد میں گئے، مسجد کے امام یا خادم بڑی شفقت سے پیش آئے اور پوچھا کہ ہم کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ اور کہاں جا رہے ہیں؟

ہمارے جواب پر اُنھوں نے ہمیں گھر جانے کی نصیحت کی، کھانا کھلایا اور رات گزارنے کے لیے مسجد میں ٹھہرا لیا، بہرحال رات کو ہمیں گھر کی یاد ستانے لگی، صبح کو چائے بھی پلائی۔ ہم نے ردان جانے کا ارادہ تبدیل کیا اور اپنے گاؤں کی راہ لی۔ رستے میں ایک بیل گاڑی کے پیچھے ولیے جو 'نوی کلی' (نواں کلے) کے ہفتہ وار میلے کے لیے تربوز لے جا رہی تھی۔ ہم چلتے چلتے استے میں لوگوں کے کھائے تربوز کی قاشوں کو اُٹھاتے اور باقی ماندہ گودہ کھاتے۔ چلتے چلتے شام کو گھر پہنچ گئے۔ یہ میری پہلی مہم جوئی تھی۔ گل رسول بعد میں ڈرائیور بنے اور مردان صوابی روٹ پر س چلاتے رہے۔

ہمارے لڑکپن کے زمانے میں مردوں کا گھر میں رفع حاجت کرنا اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ہم لوگ اس لیے گاؤں سے ملحق باڑوں یا ندی کی طرف نکلتے۔ یہ ایک تکلیف دہ کام تھا اور کبھی جب رات کو ضرورت محسوس ہوتی تو اُٹھنا مشکل ہو جاتا، میرا پیٹ جو شروع سے خراب رہتا، مگر پشتو (غیرت اور کبھی جاہلانہ غیرت) کی وجہ سے مزید پیچیدگیاں پیدا ہوتیں۔ یہ سلسلہ میرے

ایم اے تک رہا، کیونکہ اس وقت تک ہمیں کھیتوں اور ندی کی طرف جانے سے چھٹکارامل گیا۔آج میں سوچتا ہوں ہمارا یہ طرزِعمل جسے غیرت اور پشتو کہتے تھے سراسر جہالت تھی۔رفع حاجت کی ان تکالیف کے علاوہ نوجوانوں کے لیے گھر میں نہانا بھی باعثِ شرم گردانا جاتا تھا۔ہم اگرچہ خوش قسمت تھے کہ ندی قریب ہی بہتی تھی، تاہم مسجد میں کنویں سے پانی بھرنے کی باری بھی پورا کرنا پڑتی تھی۔ہم لوگ کنویں سے پانی لوٹوں اور کوزوں میں بھرنے کے ساتھ ساتھ مسجد کی سبیل بھی پانی سے بھرتے تھے۔صبح سویرے ہی سے مسجد کے غسل خانوں میں لوگوں کی بھیڑ ہوتی۔وہ حضرات جو رات کو مباشرت کی لذت اُٹھاتے، وہ تو اندھیرے ہی میں بوجوہ مسجد کا رخ کرتے۔یہ نام نہاد شرم اور غیرت اس وقت تک برقرار رہا جب تک لوگوں نے تعلیم حاصل نہیں کی تھی یا اپنے علاقے سے دوسرے علاقوں اور ملکوں میں روزگار کے سلسلے میں نہیں گئے تھے۔خود اپنے علاقوں اور گاؤں میں آبادیوں کے بڑھنے سے کھیت اور باڑیاں ختم ہوگئیں، تب نئے تقاضوں کی بناپر لوگوں نے گھروں میں ٹائلٹ اور غسل خانے بنانے شروع کیے۔

میرے بچپن کے زمانے میں لوگوں میں بچوں کے لیے کھلونے خریدنے کا رواج نہیں تھا۔اس وقت کمہار لوگ مٹّی سے کھلونے بنایا کرتے تھے۔ٹھیکریوں سے بنے ہوئے کھلونے، جیسے دنبے، بھیڑ وغیرہ پر گھاس تنکے لاد دیے اور پھر ان سے کھیلتے۔لڑکپن میں ہم لوگ پتلی سیخ سے پایوں والے گڈگڈاری بناتے اور اسے چلاتے رہتے۔جب ہم لوگ گاؤں کے قریبی جنگل میں جاتے، تو وہاں بیر کی درختوں میں موجود بامبیر پکڑتے اور اس کی ٹانگ کے ساتھ دھاگہ باندھتے اور اسے گول چکر میں اُڑاتے۔اسی طرح کھیلنے کے لیے لٹو بھی بناتے تھے۔بچپن اور لڑکپن کے زمانے میں ہمارے گاؤں میں بھٹ ہوا کرتے تھے جہاں سے ہم مکئی کے دانے بھنواتے تھے۔ایک مرتبہ میں اپنے دامن میں مکئی کے دانے لے کر بھنوانے کے لیے بھٹ گیا ہوا تھا، کافی رش تھا ابھی میری باری میں وقت تھا، میں بھٹ کے ساتھ کھڑا تھا کہ پشت سے کسی نے دھکا دیا اور میرا ہاتھ سیدھا گرم بھٹ پہ جا لگا۔ہاتھ بری طرح جل گیا، میں جلے ہوئے ہاتھ پر انڈے کی سفیدی اور بجھا ہوا چونا لگاتا رہا، تاہم یہ ہاتھ ایک عرصے تک زخمی رہا۔برہنہ پائی کی وجہ سے سردی کے موسم میں ہمارے پاؤں کے تلووں میں جلن اور خارش ہوتی تھی۔راتوں میں اس تکلیف کی وجہ سے والدہ پانی گرم کرتی اور

بچپن کے زمانے بچوں اور لڑکے لڑکیوں کی اکثریت کے علاوہ بعض بڑے بوڑھے بھی ننگے پاؤں گھومتے تھے۔پاؤں میں کانٹے چبھتے رہتے اور ہم سوئی لے کر اسے نکالتے رہتے۔

ہم بچے اور لڑکے عید کی آمد پر بہت خوش ہوتے، چاند رات کو شب بیداری کرتے، ساری رات گھومتے پھرتے، کھیلتے کودتے، ہنسی مذاق کرتے۔بازار اور اڈّے کے چکر لگاتے اور مٹھائیوں کی دکانوں کا نظارہ کرتے۔عید کے دن نئے کپڑے اور جوتے پہنتے، والد، ماموں، ماموند و اُستاد اور دیگر رشتہ دار عیدی دیتے۔اسی طرح عید کے دن میلے میں جایا کرتے تھے۔گاؤں کے قریبی قبرستان میں بھی میلہ لگتا تھا، لیکن یہ صرف خواتین کے لیے ہوتا تھا۔عید کے پانچویں دن شاہ منصور میں میلہ لگتا تھا، ہم لوگ اس میلے کا شدت سے انتظار کرتے اور ضرور دیکھنے جاتے تھے۔ایک مرتبہ میں پیزور (فیض الرحمان) اور اُن کے والد شمشو کاکا (شمس الرحمان) کے ہمراہ شاہ منصور میلہ دیکھنے گیا تھا، شمشو چاچا نے ایک بڑی اور لمبی واسکٹ پہنی تھی، وہ عطر فروش کے پاس رک گئے اور ایک ایک کر کے تمام خوشبوئیں دیکھتے اور قیمت پوچھتے، اسی دوران کسی طرح عطر فروش سے آنکھیں بچا کر کئی ایک شیشیاں انہوں نے اپنے بڑی جیب میں ڈال لیں۔شمشو کاکا خود ملک تھے، خوراک اور سیر سپاٹے کے شوقین تھے۔ہمارے گھر کے مشرقی دیوار سے ملحقہ موتی خیل کی مسجد تھی، جبکہ مغربی سمت میرے پھوپھی زاد شیرین خان لالا کا گھر تھا جو بعد میں ہم نے خرید لیا، مغرب کی جانب شمشو کاکا، کا گھر بھی تھا، گویا ہمارے ہمسائے تھے۔میں ان کے ہاں اکثر جایا کرتا تھا۔میں شمشو کاکا کے ساتھ شاہ منصور میلے کے علاوہ مردان اور پنڈی بھی گیا تھا، ابھی اسلام آباد نہیں بنا تھا۔پنڈی کے سفر میں شمشو کاکا اور پیزور کے علاوہ ہمارے ایک اور ہم قریہ شار ندان کاکا بھی ساتھ تھے۔اس سفر کے حوالے سے اتنا یاد ہے کہ ہم لوگ ٹیکسی میں راول ڈیم گئے تھے۔اس زمانے میں پنڈی اور راول ڈیم کا درمیانی علاقہ ویران تھا۔شمشو کا کا روائتی مسلک سے شاکی تھے، کاکا کے مذہبی خیالات علاقے کے مولوی حضرات کے برعکس وہابیت کی طرف مائل تھے۔

علاقے میں تعلیم کی کمی کے باعث خیالات بڑے فرسودہ تھے، لوگ یہ بات ماننے کے لیے تیار نہ تھے کہ بارش کا سبب آسمان کے بادل ہیں۔ریڈیو چونکہ اس زمانے میں ویسے بھی بڑے ہوتے تھے سو بہت سے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اس کے اندر کوئی بیٹھ کر بول رہا ہے۔فردوس کاکا تو

آخر تک اس بات کے قائل نہ ہوسکے کہ یہ تمام پروگرام ایک سٹیشن سے نشر ہوتے ہیں۔ اس زمانے میں سائنس کا نام ہی کفر گردانا جاتا تھا۔ اگرچہ جہالت عام تھی تاہم برداشت اور بردباری بہت زیادہ تھی۔ سوچتا ہوں کہ اس کی وجہ شاید ہندوؤں کے ساتھ صدیوں تک مشترکہ رہن سہن اور انگریزوں کا مذہبی معاملات میں غیر جانبدار رویہ تھا۔ جس کی وجہ سے مولوی اور ملاّ فقط روایتی کردار تک محدود ہو گیا تھا۔

لڑکپن

پرائمری سکول سے فراغت گویا میرے بچپن کے خاتمے کے مترادف تھی، اس وقت میری عمر دس گیارہ برس تھی، بچپن اور لڑکپن میں حدِ فاصل قائم رکھنا مشکل کام ہے، کیونکہ لڑکپن، بچپن کا تسلسل ہی تو ہے۔ بچپن کی بہت سی دلچسپیاں لڑکپن میں ساتھ رہتی ہیں، بلکہ بچپن کی بعض دلچسپیاں اور کھیل لڑکپن میں کچھ زیادہ دلچسپ بن جاتے ہیں۔ تاہم لڑکپن میں مزید نئی چیزوں اور حوالوں سے آگاہی بھی رہتی ہے۔ لڑکپن میں دلچسپیوں کا کینوس وسیع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بچپن کی نسبت لڑکپن میں ذہن کے افق میں وسعت اور گہرائی بھی آجاتی ہے۔

پرائمری سکول سے چوتھی جماعت میں کامیابی (اس زمانے میں پرائمری کی حد چوتھی تک محدود تھی) کے بعد غالباً ۱۹۵۸ء میں، میں گورنمنٹ ہائی سکول صوابی میں پانچویں جماعت میں داخل ہوا۔ اس زمانے دور دراز علاقوں مثلاً خدو خیل، بونیر اور گدون کے مختلف گاؤں کے طالبِ علم صوابی ہائی سکول میں پڑھنے کے لیے آتے تھے، یہ طالبِ علم سکول ہاسٹل میں رہائش پذیر ہوتے، خود صوابی کے اردگرد مختلف گاؤں کے طالبِ علم اسی سکول میں داخل تھے، کیونکہ اس زمانے میں تحصیل صوابی (موجودہ ضلع صوابی) میں سوائے اس ہائی سکول کے دیگر اہم گاؤں زیدہ، ٹوپی، نواں کلے، لاہور (چھوٹا) اور یار حسین میں ہائی سکول نئے نئے ہی بنے تھے۔ بدحالی کے اس دور میں بھی بعض ایسے گھرانے تھے، جو تعلیم کی اہمیت سے آشنا تھے، اس لیے غربت کے باوجود اپنے بچوں کو یہاں سکول اور ہاسٹل میں داخل کرواتے تھے۔

گورنمنٹ ہائی سکول صوابی، میری زندگی میں نئی کروٹیں لے کر آیا، ذہن میں نئے دریچے کھلنے لگے، نئے نئے تجربات ہونے لگے، میں صبح سویرے اپنے دوستوں خصوصاً شیر اور میر امان کے ساتھ بستہ کندھے سے لٹکائے ہائی سکول جاتا تھا، شروع کے دنوں میں ہم سینئر طلبا کے پیچھے پیچھے ہو لیتے اور سکول پہنچتے۔ مجھے یاد ہے کہ صاحبداد اور غزن (آپس میں چچا بھتیجا، ہم عمر اور سخت نالائق تھے) سکول کے زور آور طلباء میں سے تھے، ہم ان کے ساتھ سکول جایا کرتے تھے۔ یہ دونوں شرارتی بھی تھے، رستے میں کتوں کو چھیڑتے، پتھر مارتے، چیختے چلاّتے۔ ہم لوگ سکول جانے کے لیے باڑی کا رستہ زیادہ پسند کرتے تھے، دوسرا راستہ جو قبرستان ہو کر جاتا تھا، ہم اس سے

احتراز کرتے تھے، اور اگر کبھی اس راستے سے جاتے تو سعداللہ خان کرم خیل کے حجرے میں ستاتے۔ سعداللہ خان خود بھی چرس پیتے اور کئی ایک چرسی ان کے حجرے میں ضرور ہوتے۔ سردیوں میں یہ لوگ حجرے کے کمرے میں آگ جلاتے، چائے پکتی اور مکئی کی روٹیاں گرم کرتے نظر آتے۔

میں اپنے بڑے بھائی زیارت خان کے ساتھ سکول جانے سے احتراز کرتا، جو مجھ سے دو جماعت آگے تھے۔ وہ اکثر ماموند و استاد کے صاحبزادے مختار احمد کے ساتھ جایا کرتے تھے، بعد میں، اُنھوں نے مثل شاہ کے ساتھ جانا شروع کیا۔ میں شروع ہی سے یاغی اور باغی تھا، میں تھوڑا سا خودسر اور اپنے فیصلوں میں آزاد تھا اس لیے سکول، راستے، اور کھیل کود کے ساتھیوں کا خود انتخاب کرتا۔ اگرچہ میرے کافی زیادہ دوست تھے اور جن کی فہرست وقت کے ساتھ تبدیل بھی ہوتی رہی، تاہم میرے ابتدائی دوست، انور (علی حیدر کاکا کے صاحبزادے) تھے۔ کچھ عرصہ بعد شیر ولد شیرین خان، میرے قریب آ گئے۔ انور تو پرائمری ہی میں سکول چھوڑ گئے جبکہ شیر اسلامیہ کالج پشاور تک ساتھ تھے۔ ہائی سکول میں داخلے کے بعد، شروع کے زمانے میں، میں شیر کی ہم رکابی میں جایا کرتا تھا، پھر بعد میں مہر دل خان کے ہمراہ آنا جانا ٹھہرا۔ یوں مختلف اوقات میں ساتھی تبدیل ہوتے رہے۔

ہمارے گاؤں میں بجلی کی آمد گویا نئے زمانے کی دستک تھی، یہ واقعہ ایوب خان کے مارشل لاء لگنے سے کچھ عرصہ پہلے کا ہے، خود ہمارے گھر بجلی اس مارشل لاء سے کچھ دن پہلے یا بعد میں لگ گئی تھی۔ یہ مارشل لاء (جسے گاؤں میں خواتین مشرلا کہتی تھیں) نئے دور کا آغاز تھا۔ ۱۹۶۲ء میں ایوب خان نے بنیادی جمہوریت کا نظام متعارف کروایا، جس کے نتیجے میں سماجی اور معاشی سطح پر تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ گھروں کے علاوہ محلے اور گلیاں سٹریٹ لائٹ سے روشن ہونے سے گویا ہمارے کھیل کود کو نیا رنگ ملنا شروع ہوا، اب ہم رات گئے تک گلی میں کھیل و مستی میں مشغول رہتے۔ اس تبدیلی کا بہرحال یہ فائدہ ہوا کہ اب بڑے بزرگ حجروں میں ہماری موجودگی اور شور شرابے سے بےفکر اور پُرسکون ہو گئے۔

بجلی کی آمد اگرچہ نئے دور کی آواز تھی، تاہم میرے بچپن اور لڑکپن کے زمانے تک جدید زمانے کے آلات یعنی ریڈیو، ٹیپ ریکارڈر، ٹیلیوژن، ویڈیو، ڈی وی ڈی وغیرہ نہیں تھے، مگر کھیل

تماشے اور دیگر معاشرتی سرگرمیاں عام تھیں۔ اس دور کا سماج بڑی حد تک سیکولر تھا اور رواداری سے مملو تھا۔ منگنی، شادی بیاہ، ختنے کی تقریبات کے علاوہ حجروں میں ویسے بھی روایتی موسیقی کی مجلسیں برپا ہوتی تھیں۔ ان کے ساتھ ساتھ بعض اوقات شادی بیاہ میں طوائفوں کے ناچ گانے کی محفلیں بھی سجتیں۔ سپین کرم خیل کافی مست تھے اور خان خوانین کے نخرے بھی زیادہ ہوا کرتے تھے، اس لیے ان کے حجرے (بڑ حجرہ) میں اس طرح کی محفلیں منعقد ہوتی رہتیں۔ میں اور میرے دوست اپنے گاؤں کے علاوہ مانیری بالا اور صوابی کے حجروں میں بھی اس طرح کی برپا مجالس ومحافل میں جایا کرتے تھے۔ ناچ گانے کی ان مجلسوں میں بھانڈ اور مسخرے بھی بلائے جاتے تھے۔ جب گویے یا طوائف ناچ گانے سے تھک جاتیں تو یہ بھانڈ اور مسخرے اپنے فن سے حاضرین کو محظوظ کرتے۔ ''بہادرے'' اس زمانے میں علاقے کا سب سے مشہور ٹوقمار (مسخرہ: ہنسے ہنسانے والا) تھا۔ لوگ اس کے مذاق کے شیدا اور دیوانہ تھے۔ ہمارے بعض رشتہ دار بھی اس طرح کی محفلیں آراستہ کرتے۔ طوائفوں کو گھروں میں بلایا جاتا۔ اس زمانے میں زیادہ تر طوائفیں اور گویے ''پارہوتی'' میں مقیم تھے۔ اس طرح کی ایک محفل میں ہمارے ایک رشتہ دار کی آنکھ کچھ زیادہ لگ گئی اور طوائف سے شادی رچالی۔ ان مجالس اور محافل کے سنگ سنگ مذہبی تقریبات بھی منعقد ہوتیں، خصوصاً رمضان کے دوران میر احمد شاہ بابا جو غالباً مشرباً 'نقش بندی' تھے، اپنے حجرے میں قوالی کی محفل سجاتے۔ یہاں بھی ہم موجود ہوتے اور جب ان کے مرید وجد و مستی میں آجاتے تو گویا محفل دوآتشہ ہو جاتی۔ قوالی کی یہ محافل اب بھی منعقد ہوا کرتی ہیں۔

ایوب خان کا دور پاکستان میں صنعتی ترقی کا دور تھا، دیہات، دیہاتیوں اور کسانوں کی زندگی میں بھی مثبت تبدیلیاں آنا شروع ہوئیں۔ اس دور میں امریکی امدادی پروگرام (Village Aid) کے نتیجے میں زراعت میں بھی خوش گوار تبدیلیاں رونما ہونا شروع ہوئیں۔ تمباکو کی کاشت، تمباکو کے ڈپو اور تمباکو کی بٹیاں بننے لگیں۔ تمباکو کا کاروبار نئے معاشی اثرات مرتب کرنے لگا۔ اب صوابی کا تمباکو ملک کے دوسرے حصوں، خصوصاً مشرقی پاکستان (حالیہ بنگلا دیش) جانے لگا، جس کی وجہ سے کسانوں اور زمینداروں کے ہاں معاشی خوشحالی آ گئی۔ علاقے میں تمباکو کی کاشت سے پہلے عمومی طور پر مکئی اور جو کاشت کی جاتی تھی، گندم بھی کاشت ہوتی تھی، لیکن اس کی پیداوار زیادہ نہ تھی، اس لیے لوگوں کی اکثریت مکئی اور جو استعمال کرتے تھے۔ پھر جب امریکی امداد کے نتیجے

میں میکسی پاک بیج متعارف ہوا، لوگوں میں میکسی پاک ''نیستی پاک'' کے نام سے مشہور ہوا۔ اس تخم کے نتیجے میں گندم کی پیداوار اچھی ہونے لگی اور زمینداروں اور کسانوں نے جو کی بوائی کم کردی۔ دھیرے دھیرے یہ اجناس کم یاب اور پھر نایاب ہونے لگیں۔

زمانے کی یہ نئی کروٹ، نئی مہارتیں، نئے انداز اور نئی نئی فصلیں پہلے پہل ہندوستان میں متعارف ہوتی رہیں، پھر یہ ہمارے پنجاب میں رواج پاگئیں اور پنجاب کے توسط سے ہمارے صوبے میں اور پھر سرحد پار افغانستان میں بھی نئی روایات اور رجحانات پروان چڑھنا شروع ہوئے۔ ہمارے ہاں ورجینیا تمباکو کی کاشت، تمباکو کو پکانے کی بھٹی اور پھر اس سے متعلق ساری مہارتیں پنجاب سے آئی ہیں۔ اگرچہ ہمارے صوبے میں بعض تبدیلیوں کو کچھ حلقوں میں ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جانے لگا تھا اور اس کے خلاف باقاعدگی سے آوازیں بھی اُٹھتی رہیں، مثلاً شروع میں تمباکو کاشت ہونے لگا تو ملاّ صاحبان نے اس کی بھرپور مخالفت کی، بعض حضرات نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ جس نے اپنے کھیت میں ایک مرتبہ تمباکو کاشت کی تو اس پر چالیس سال تک اس کھیت کی فصلیں حرام ہوں گی۔ لیکن جب نئی فصلوں اور نئے طریقہ کار سے لوگوں کی معیشت بہتر ہونے لگی تو اس طرح کی باتوں کا کون روادار ہوسکتا ہے، اور عملاً یہی ہوا۔ صوابی اور مردان میں بھرپور انداز میں تمباکو کاشت ہونے لگا۔ شروع شروع میں پراسس (process) سے وابستہ فایئر مین (Fireman)، کیورر (Curer) اور گریڈر (Grader) اور دیگر عملہ پنجاب سے آتا تھا تاہم جلد ہی علاقے کے لوگوں نے ان کاموں میں مہارت حاصل کی۔ بھٹی میں پکنے کے لیے کھیت سے پکے ہوئے پتے تمباکو کے پودوں سے چن لیے جاتے ہیں۔ پھر ان پتوں کو ایک خاص ترتیب سے ڈنڈوں میں باندھ دیا کرتے تھے اور پکنے کے لیے بھٹی میں رکھ دیے جاتے۔ باندھنے کا یہی طریقہ تھا۔ میں نے بھی یہ ہنر کسی حد تک سیکھ لیا تھا۔ چونکہ گرمیوں میں تین مہینوں کی چھٹیاں ہوتی تھیں تو ہم لڑکے اس ہنر سے اپنی جیب خرچ کا بندوبست کر لیتے۔ علاوہ ازین ڈپو میں فروخت کے لیے لائے جانے والے پکے ہوئے تمباکو کی گریڈنگ (اول، دوم، سوم، چہارم) کے فارم (Form) جسے عام طور پر TP3 کہتے ہیں، بھرتا تھا۔

ایوب خان کی متعارف کردہ بنیادی جمہوریتوں کے نظام (BasicDemocracy) کے توسط سے میں بھی عملی طور پر سیاست سے آشنا ہوا۔ اگرچہ والد صاحب خدائی خدمت گار اور باچا خان

سے وابستہ تھے، مگر عمومی طور پہ لوگ سیاست سے ایک طرح بیزار تھے۔ پھر اس وقت اکثر خدائی خدمت گار جیلوں میں بند تھے۔ یہ ایوب خان کے مارشل لاء کے رعب و دبدبہ اور ان کی نئی سیاست کا زمانہ تھا۔ ان کے متعارف کروائے ہوئے بنیادی جمہوریتوں کے نظام میں ہمارے کئی قریبی لوگ حصہ لے رہے تھے۔ ہمارے ایک عزیز شیرین خان، گاؤں کے ایک وارڈ جو کرم خیل، شیر داد خیل، تو سخانی (طاؤس خان) پر مشتمل تھا، بی ڈی ممبری کے لیے امیدوار تھے، ان کے مدِّ مقابل والد صاحب کے دوست، محمد حیات طاؤسخانی تھے۔ شیرین خان کا انتخابی نشان 'کلہاڑا' جبکہ محمد حیات خان کا انتخابی نشان 'پیالی' تھا۔ میں نے خوشخط انداز میں شیرین خان کے لیے وال چاکنگ کی۔ محمد حیات خان کو شکست ہوگئی اور شیرین خان جیت گئے۔

بعد میں جب قومی اور مغربی پاکستان کی صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کا اعلان ہوا تو ہمارے بعض تربور (شریک) مثلاً شیر داد بابا اور ان کے بیٹے پیرداد خان اور صاحبداد نوابزادہ عبدالغفور ہوتی اور شیرین خان محمد علی خان ہوتی کے حمایتی ٹھہرے۔ ہماری ہمدردی امیرزادہ خان کے ساتھ تھیں۔

میں چھٹی یا ساتویں جماعت میں تھا کہ ہمارے بزرگ شریکوں نے فیصلہ کیا کہ وہ پیدل 'دیوانہ بابا' اور 'پیر بابا' کے مزارات پر جائیں گے۔ گروپ کی سربراہی علی گل خان کر رہے تھے۔ میں بھی اس قافلے میں شامل تھا، والدہ نے میرے لیے پراٹھے انڈے پکائے اور روانہ کیا، گوہر علی خان بھی میرے ساتھ تھے، گوہر علی خان اِس وقت میرے چھوٹے بھائی کے سسر ہیں۔ ہم لوگ سحری کے وقت روانہ ہوئے، صبح کا ناشتہ ''غورغشتو'' میں کیا، یہاں سامنے بڑا پہاڑ تھا، اُس طرف روانہ ہوئے، اس زمانے میں باقاعدہ سڑک نہ تھی، اِس پہاڑی کی چوٹی کو ''شاڈپ'' کہا جاتا ہے۔ گوہر علی خان چونکہ دکاندار تھے اور زیادہ گھومنے پھرنے کے عادی نہ تھے، اُن کے لیے پہاڑی پر چڑھنا مشکل ہو رہا تھا، میرے پاس چینک میں پانی تھا، جب جب اُن کے اوسان خطا ہوتے اور چلاّ کر پوچھتے کہ پہاڑ کا سفر اور بھی باقی ہے؟ تو میں چینک سے اُنہیں پانی پلاتا رہتا۔ جیسے تیسے ہم لوگ دوپہر کو پہاڑ کی دوسری طرف اُتر گئے اور رات گئے دیوانہ بابا پہنچ گئے۔ رات کے وقت پسوؤں کے کاٹنے کی تکلیف آج بھی یاد ہے۔ گوہر علی خان کی وجہ سے 'پیر بابا' پیدل جانے کے بجائے ہم لوگ بس سے گئے۔ واپسی میں ہم نے دوسری راہ اختیار کیا اور رستم کے

راستے گاؤں واپس ہوئے۔ شائد اُن دنوں میری سکول کی چھٹیاں تھیں۔

پشتونوں کی زندگی میں انتقام اور دشمنیاں روگ کی طرح لگی ہوئی ہیں، لیکن خوش قسمتی سے ہم لوگ اس سے محفوظ رہے۔ دراصل والد صاحب نے ہمیشہ بندوق کے بجائے عدالتی راستہ اختیار کیا، زمین اور جائداد کے جھگڑوں کے حل کے لیے والد صاحب عدالت کچہری جانے سے نہیں کتراتے تھے اور ہمیشہ اپنا حق وصول کرتے تھے۔ پھر جب ہم جوان ہوئے تو ناجائز دعویداریاں ویسے بھی ختم ہوگئیں۔ چھوٹے موٹے جھگڑے تو ہوتے ہی رہتے ہیں، لیکن یہ اللہ کا کرم ہے کہ کسی بھی سنگین دشمنی سے محفوظ رہے۔

سکول ہی کے زمانے کا واقعہ ہے کہ ہمارے قریبی حجرے میں ہمسائے کے بزرگوں میں کسی بات پر معمولی جھگڑا ہوا، ہمارے بہنوئی معظم خان کے بھتیجے ہستم خان نے طیش میں آکر ایک بزرگ افضل خان پر چھری کے وار کر کے قتل کیا، جس سے دشمنی پیدا ہوگئی، ہستم خان کو بیس سال کی قید ہوگئی اور اچھی بات یہ ہوئی کے اُس کے قید سے واپس آنے پر دونوں گھرانوں میں صلح ہوگئی۔

اِن ہی دنوں کی بات ہے ہمارے بڑے ماموں سید رحمان جو شادی شدہ تھے، ایک اور خاتون پر فریفتہ ہوئے اور نوبت یہاں تک آگئی کہ اُسے بھگا کر ہمارے گھر لے آئے۔ میری والدہ جہاندیدہ اور زمانے کی اونچ نیچ سے واقف تھیں، اُنہوں نے جیسے تیسے اُس خاتون کو واپس اس کے گھر پہنچایا اور معاملہ رفع دفع کیا، ورنہ زبردست قسم کی دشمنی کا آغاز ہوسکتا تھا۔

ہائی سکول میں داخل ہونے سے میری دنیا میں وسعت آگئی۔ ایک طرف کھیل کود اور سیر سپاٹے کے میدان وسیع ہوتے گئے تو دوسری جانب نئے مطالعے، نئے تجربات، نئے دوستوں اور نئے اساتذہ سے آگاہی ہوئی۔ سردیوں میں سکول کی چھٹی دیر سے ہوتی تھی اس لیے سخت بھوک لگتی تھی۔ گھر سے روٹی ساتھ لانا معیوب سا لگتا تھا، اگر چہ کئی ایک لڑکے پراٹھے، روٹیاں اور سالن سکول ساتھ لاتے تھے۔ والد صاحب جیب خرچ کے لیے پرائمری میں ایک پیسہ دیتے تھے، بعد میں یہ ایک ٹکا ہوا، اور جب میں ہائی سکول آگیا تو یہ رقم ایک آنہ سے ہوتے ہوئے دو آنہ اور آخر میں چونّی تک بڑھ گئی۔ آدھی چھٹی (Recess) میں ہم ایک آنے کی گھنگھنیاں یا لوبیہ کھاتے، اور بھٹ سے بھنے دانے خرید لیتے۔ پھر جب سکول میں ظہر کی نماز لازمی قرار پائی تو یہ دونوں کام پھر ایک ساتھ نہیں ہوسکتے تھے کیونکہ ایک تو مسجد دور تھی اور پھر وضو کے لیے پانی کا نظام درست نہیں

تھا، کافی ہجوم ہوتا تھا، اس بنا پر بعض لڑکے تو بغیر وضو کیے نماز کے لیے کھڑے ہوتے۔ اس مختصر وقت میں کھانا کھانا اور نماز باجماعت ادا کرنا تقریباً ناممکن تھا۔

ہائی سکول میں جناب واصل خان (ریٹائیرڈ حوالدار) ڈرل ماسٹر تھے، جن کا تعلق ہمارے گاؤں سے تھا اور جن کے تعلقات ہم سے دوستانہ تھے۔ اس زمانے میں ہاکی پاکستان کا مقبول کھیل تھا، اُن کی خواہش تھی کہ میں سکول کی ہاکی ٹیم میں شامل ہو جاؤں، مگر میرے والد صاحب نے ماموں واستاد کے مشورے سے اس بات کی مخالفت کی۔ اِن کے خیال میں ہاکی کی وجہ سے میری تعلیمی سرگرمیوں پر اثر پڑ سکتا تھا۔ اِس زمانے میں سکول کی سطح پر کھیل لازمی سمجھے جاتے تھے۔ ہر سکول میں دیگر کھیلوں کے ساتھ فٹ بال، والی بال، باسکٹ بال اور ہاکی کی ٹیمیں موجود ہوتی تھیں۔ ہر سال باقاعدگی کے ساتھ تحصیل، ضلع اور صوبائی سطح پر ان کے مقابلے ہوتے تھے۔ ہمارے سکول کی فٹ بال ٹیم کافی بہتر تھی، ہمارے وقتوں میں مانیری بالا کے محمد زیب اور صوابی کے عبدالنبی جان (علی جان کاکا کے فرزند) سکول ٹیم کے نہایت عمدہ کھلاڑی تھے۔ محمد زیب غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، کافی تیز طرار فارورڈ تھے اور اکثر مخالف ٹیم کے خلاف گول کرنے میں کامیاب رہتے۔ کھیلوں کی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ سکاؤٹنگ کی ٹریننگ بھی دی جاتی تھی۔

ہائی سکول میں داخل ہونے کے کچھ عرصہ بعد سید حسن صاحب ہیڈ ماسٹر بن گئے۔ سید حسن صاحب سخت گیر ہیڈ ماسٹر تھے، ہر وقت مختلف کلاس رومز کا معائنہ کرتے کہ کہیں کوئی استاد غائب تو نہیں اور طلباء تعلیم میں مصروف ہیں یا نہیں۔ باچا استاد (عارفین) پست قد تھے اور سید حسن صاحب کے بھی استاد رہ چکے تھے، سکول سائیکل پر آتے تھے۔ باچا استاد کاہل آدمی تھے اور عموماً ان کی شیروانی کی جیب میں چنے یا ریوڑیاں موجود ہوتیں، انہیں پھانکتے رہتے۔ ان کی تدریس کا طریقہ یہ تھا کہ کلاس میں داخل ہوتے، کسی طالبعلم سے کہتے کہ کتاب کھولو اور گزشتہ دن کے سبق کو دھراؤ، اور خود کرسی پہ بیٹھ کر سو جاتے۔ اور جب سید حسن صاحب کلاس آتے، اُن کو آواز دے کر کہتے کہ باچا استاد آپ تو سوگئے ہیں تو آپ جاگ جاتے اور کہتے میں سویا تو نہیں، بلکہ اس لڑکے کے بارے میں سوچ رہا تھا، سید حسن صاحب مسکرا دیتے اور چل دیتے، باچا صاحب غصہ ہوتے اور بڑبڑانے لگتے۔ باچا استاد ہمیں اردو پڑھاتے، جبکہ پیپر مارکنگ پیمانے کی پیمائش سے کرتے۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ انہوں نے مجھے ایک پرچے میں چھیالیس نمبر دیے تھے حالانکہ

پورا پرچہ چالیس نمبرات کا تھا، چونکہ میری لکھائی خوشخط تھی اس لیے انہوں کہا کہ یہ چھ نمبر خوشخطی کے ہیں۔انھی کا ایک دوسرا واقعہ بھی مجھے یاد ہے، جب ہم پانچویں جماعت میں تھے، ہمارے ساتھ گلزار مسیح اور یونس مسیح دو عیسائی بھائی بھی پڑھتے تھے، یہ دونوں سیاہ رنگت کے تھے، اِسی کلاس میں مانیری بالا کے خاکی شاہ (قصاب) بھی تھے اور ان کا رنگ بھی سیاہ تھا۔کسی بات پر دو لڑکوں کے مابین لڑائی ہوگئی، اس دوران باچا صاحب آگئے، لڑکوں سے پوچھا کس پر لڑ رہے تھے، دونوں اپنی اپنی بات کر رہے تھے ایسے میں اُنہوں نے خاکی شاہ سے اردو میں پوچھا، مسیح تم کہو، اصل معاملہ کیا ہے؟ خاکی شاہ کی رنگت کی وجہ اُنہوں نے اسے عیسائی سمجھ لیا، ہم لوگ ہنسنے لگے، تب باچا صاحب شرمندہ سے ہوگئے۔

میں ڈاکٹر یا انجنیئر کیوں نہیں بن سکا؟ دراصل جس زمانے میں ہم طالب علم تھے، وہ ملازمت کے حوالے سے کافی وسعت رکھتا تھا، یہاں تک کہ میٹرک پاس کو بھی آسانی سے ملازمت مل جاتی تھی۔ ڈاکٹر اور انجنیئر بننا بھی قدرے آسان تھا، کیونکہ اس زمانے میں اتنی مسابقت نہ تھی۔سکول میں میرا شمار لائق طالب علموں میں ہوتا تھا اور اس زمانے کی رپورٹ بک اس بات کی گواہ ہے، تاہم جب میں آٹھویں جماعت میں تھا، کچھ عرصے کے لیے میرا دل تعلیم سے بیزار سا ہو گیا اور نتیجتاً سکول سے غائب ہونے لگا۔اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ میں دیگر مشاغل یعنی کھیل کود اور آوارہ گردی میں مصروف ہوگیا تھا۔میں روزانہ گھر سے سکول کے لیے نکلتا اور سکول کے بجائے بستہ رستے میں ہی کسی 'ارہٹ' (رہٹ) میں رکھتا، کبھی میرہ (ویرانے) کی طرف نکلتا۔کبھی کسی گانی میں گڑ بنانے کے عمل کا تماشا دیکھتا، کبھی اڈہ چلے جاتا اور یہ سب کچھ نہ ہوتا تو غلیل تو میرے پاس ہوتی ہی تھی، اس سے شکار کھیلتا یا گورگورے (ایک خودرو پھل) جمع کرتا، تتلیاں اور چڑیاں پکڑتا۔میرا سکول سے یوں غائب ہونا زیادہ دن اس لیے چھپ نہیں سکتا تھا، کیوں کہ اساتذہ مجھے اور میرے بھائی زیارت خان کو ذاتی طور پر جانتے تھے، چنانچہ انہوں نے والد صاحب سے شکایت کی۔میں کافی خودسر ہوچکا تھا۔نہ تو مجھ پر نصیحتیں اثر انداز ہوسکیں اور نہ ہی سختی یا دباؤ۔جب بڑوں کے تمام حربے ناکام رہے، تب والد صاحب نے مجبور ہوکر کہا کہ اگر تعلیم کا شوق نہیں تو پھر میرے ساتھ کھیتی باڑی سنبھال لو۔میں نے مجبوراً اسے قبول کیا۔اس زمانے میں آٹھویں کے امتحانات سیکنڈری بورڈ کے بجائے ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ لیا کرتا تھا۔میں والد

صاحب کے ساتھ روزانہ کھیتوں میں جانے لگا۔والد صاحب قصداً مجھے ایسے کاموں میں لگا دیتے کہ میں بیزار ہوجاؤں اور واپس تعلیمی سلسلہ سے جڑ سکوں۔مثلاً والد کہتے کہ وہ جو کھیت کے ایک سرے پر پڑی لکڑیاں ہیں وہ دوسرے سرے پر رکھ آؤ، میں جب ایسا کر لیتا تو حکم ہوتا اسے واپس اپنی جگہ جمع کرلو، میں ایسا ہی کر لیتا۔آخر جب والد صاحب اپنے حربوں میں ناکام رہے تو تقریباً دو ہفتے بعد انہوں نے ایک دن ڈنڈا اُٹھایا اور اچھی خاصی پٹائی کردی اور زبردستی سکول بھیج دیا۔تاہم یہ سب کچھ مجھے تعلیم جاری رکھنے پر آمادہ نہ کرسکا۔میری کوشش تھی کہ کسی طرح اس سکول سے چھٹکارا مل جائے۔میں اُن دوستوں کو بڑی رشک سے دیکھتا تھا جو تعلیم کے جھنجھٹ سے آزاد تھے۔اس کشمکش کے دوران ہی نوماہی امتحان سر پر آگئے اور اس میں کامیاب ہونے والے ہی ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کے زیرِ انتظام سالانہ امتحانات میں شریک ہوسکتے تھے۔میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ سکول کی سطح کے ان امتحانات میں قصداً فیل ہوجاؤں گا، اس لیے میں نے اس داخلی امتحان میں سوالات کے جوابات میں اشعار اور 'چاربیتۂ' (پشتو صنف شعر) لکھتا رہا۔سائنس سے متعلق تقریری مقابلے میں پڑھا گیا یہ پشتو شعر بھی میں نے ایک پرچے میں لکھ دیا تھا۔

مفہوم: سائنسی ترقی کا یہ دور مجھے نہیں چاہیے، میں تو پرانے زمانے، پرانے دن رات کا شیدائی ہوں۔

امید یہی تھی کہ ناکام رہوں گا اور سکول کے جنجال سے چھٹکارا مل جائے گا مگر جب اس امتحان کا نتیجہ آیا تو میں پاس ہوگیا تھا جبکہ بعض دیگر ساتھی مثلاً میرا مان اور روزی امان جو فیل ہوگئے تھے، انہیں میں رشک کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور سوچتا تھا کہ کاش میں بھی فیل ہوجاتا۔دراصل میرے اساتذہ مجھے اچھی طرح جانتے تھے اور پھر میری سابقہ رپورٹ بک بھی اُن کے سامنے تھی اس لیے اُنہوں نے مجھے ناکام ہونے نہیں دیا۔چاروناچار مجھے اصل امتحان دینا پڑا اور اچھے نمبروں سے پاس ہوکر نویں جماعت میں پہنچ گیا۔شاید میری اُفتادِ طبع کی وجہ سے میرے اساتذہ نے میرے لیے سائنس کے بجائے آرٹس کا انتخاب کیا اور یوں میں سائنس پڑھنے سے رہ گیا، جو دراصل میڈیکل اور انجنیئرنگ کے لیے لازمی تھا۔

میرے اساتذہ نے گو یہ فیصلہ نیک نیتی کے ساتھ کیا تھا کہ یوں میرا دل پڑھائی میں لگ جائے گا لیکن بعد میں اسے اپنی بدقسمتی گردانے لگا، کیونکہ میں سائنس پڑھ سکتا تھا۔میں سمجھتا ہوں کہ

یہ فیصلہ شاید میری بد نصیبی کا آغاز تھا۔ بہرحال میں جماعت نہم میں پہنچ چکا تھا، اب میں گزشتہ جماعت کی دیوانگی سے بڑی حد تک جان چھڑا چکا تھا اور سکول کتاب سے دل لگ گیا تھا۔ گھر میں اپنے پڑھنے کے لیے الگ جگہ کا انتخاب کیا اور سکول کے نصاب کے ساتھ باقاعدگی کے ساتھ اخبار کا مطالعہ بھی کرنے لگا۔ اِن دنوں ویتنام کی جنگ زوروں پر تھی۔ میں اخبارات سے خبریں اور تصاویر کاٹ کر سرہانے دیوار پر چسپاں کیا کرتا۔ سیاست کی دنیا کے ساتھ دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ اُن دنوں ہمارے ایک اُستاد ہیڈ ماسٹر رنگین شاہ صاحب غالباً سپورٹس یا سکاؤٹنگ کے سلسلے میں لندن سے ایک کورس مکمل کر کے واپس آئے تھے۔ رنگین شاہ صاحب ہمیں انگریزی پڑھاتے تھے اور انگلینڈ سے متعلق کورس کی کتاب میں جو اسباق تھے، اسے نہایت دلکش انداز میں سکھاتے اور ولایت سے متعلق اپنے تجربات سے بھی ہمیں مستفید کرتے۔ صوابی کے وزیر استاد ہمیں ریاضی پڑھاتے تھے اور اس مضمون میں مجھے کافی عبور حاصل تھا۔ دیگر مضامین یعنی اردو، اسلامیات، سوشل سٹڈیز، پشتو اور جنرل سائنس کافی آسان تھے اور اساتذہ کی محنت کی ضرورت نہ تھی۔

زیارت خان کی منگنی سلیم خان گاؤں میں ہو چکی تھی۔ یہ منگنی درحقیقت پشتونوں کی کہاوت کہ لڑکے کے لیے بیوی کا ''غم'' لڑکپن میں ہونا چاہیے، کے مصداق تھا۔ دستور کے مطابق والدین مجھے بھی منگنی کے لیے مجبور کر رہے تھے۔ پشتونوں کے رواج کے مطابق ان معاملات میں لڑکیوں، بلکہ یہاں تک کہ لڑکوں سے بھی پوچھنا گوارا نہیں کیا جاتا۔ میری مخالفت کے باوجود اسی طرح میری منگنی بھی قریبی رشتہ داروں میں کردی گئی تھی۔ مجھ سے کہہ دیا گیا تھا کہ مجھے اگر کسی اور جگہ دلچسپی ہو تو اُن کو بتادوں۔ اُن کا یہ گمان تھا کہ مجھے کسی سے محبت ہوگئی ہے۔ دوست دوستوں سے باتیں باہم شریک کرتے ہیں، اِسی طرح ایک لڑکی کی میں نے بھی کسی موقع پر تعریف کی تھی، مگر اس تعریف میں محبت یا عشق و عاشقی کا کوئی حوالہ نہ تھا۔ یہ لڑکی نہ تو ہمارے عزیزوں میں سے تھی اور نہ ہی ہمارے 'چم' رہتی تھی بلکہ اُن کا گھرانہ گاؤں سے باہر میرہ یعنی پیر تیب میں رہتا تھا۔ لڑکپن کی خواہشیں وقت گزاری کا حوالہ ہوتی ہیں، میں قطعاً اُس سے منگنی کے لیے آمادہ نہ تھا۔

نہم اور دہم میں، میں نے دل لگا کے پڑھا اور اپنے اُن اساتذہ (یمین استاد، ہیڈ ماسٹر رنگین شاہ اور سید عرب استاد، جو اگرچہ مجھ سے محبت کرتے تھے) کے اس خیال کو باطل ثابت کیا کہ میری حاضری باقاعدہ نہیں ہے، اس لیے مجھے سائنس نہیں لینا چاہیے۔ اب میں نہ صرف ریگولر تھا

بلکہ میں نے تمام مضامین میں زیادہ دلچسپی دکھائی اور سکول کی سطح پر تمام امتحانات میں سب سے آگے رہا۔ مارچ ۱۹۶۴ء میں ہمارے میٹرک کے امتحانات بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن صوبہ سرحد کے زیرِ انتظام ہوئے۔ سائنس کے برعکس آرٹس میں نمبر حاصل کرنا مشکل ہوتا ہے، کیونکہ سائنس کے مشکل سوالات کے جوابات اگرچہ مشکل ہوتے ہیں مگر یہاں نمبر پورے کے پورے ملتے ہیں مگر آرٹس مضامین میں جوابات زیادہ موضوعاتی ہوتے ہیں، مگر نمبر اُس طرح نہیں دیے جاتے۔ بہرحال جب میٹرک کے نتائج سامنے آئے تو میں نے فرسٹ ڈویژن کے ساتھ ۶۳۶ نمبر حاصل کیے تھے اور موجودہ ضلع صوابی میں تمام سکولوں میں اول نمبر پر تھا۔ اُن دنوں صوابی میونسپل کمیٹی کے سیکرٹری جن کا تعلق چارسدہ سے تھا، اُن کا بیٹا امتیاز بھی اس امتحان میں شامل تھا۔ سیکرٹری صاحب کی شدید خواہش تھی کہ ان کا بیٹا ٹاپ کرے۔ امتیاز لائق طالبِ علم تھا اور اسے انجینئر بننے کی خواہش تھی، اس لیے کافی محنت بھی کر چکا تھا لیکن فرسٹ آنے کی یہ دوڑ میں ہی جیتا اور وہ دوسرے نمبر پر رہے۔ سیکرٹری صاحب نے میری مہمانداری کی اور میرے بارے میں تعریفی کلمات کہے، اُس وقت اُن کے دل پر جو گزر رہی تھی وہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

میٹرک کے امتحان اور نتیجے کے بعد میری زندگی کا ایک اور اہم مرحلہ شروع ہوا۔ اب میں بالغ نوجوان تھا اور دل آزادی کا متمنی، نئے دوست، نئی آشنائیاں اور صحبتِ یاراں کی نئی محافل کی امنگ لیے ہوئے تھا۔ صوابی اور قرب وجوار کے دیہات کے نوجوانوں کے لیے صوابی اڈہ آکسفورڈ سٹریٹ، شانزے لیزے، مال روڈ اور جناح سٹریٹ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اب میں بھی آزادی کے ساتھ اڈہ آنے جانے لگا۔ بچپن اور لڑکپن کے کھیل کود اور سیر سپاٹے اب خیالِ محال بن گئے۔ اب میں تھا، اڈہ تھا، اڈے کے چائے خانوں کی چائے، کیک اور کیک رس تھے۔ مانیری بالا کے محمد نعیم (فردوس خان کاکا کے صاحبزادے) جو پشاور کالجیٹ میں پڑھتے تھے اُن کے امتحانات بھی ہو چکے تھے اور اب گاؤں میں تھے، وہ اپنے بھائی سلیم کے ہمراہ اور دیگر نوجوان بھی باقاعدگی کے ساتھ اڈہ پہ چکر لگایا کرتے تھے۔ یہیں میرا ان کے ساتھ تعارف ہوا اور پھر ان کے توسط سے ان کے بزرگوں سے بھی ملا۔ یہ لوگ بھی خدائی خدمتگار تھے، اس لیے یہ تعلق خاصا گہرا ہوا، یوں اُن کے ہاں آنا جانا اور بیٹھنا خاصا زیادہ ہوا۔

اِن دنوں گورنمنٹ کالج صوابی کی بلڈنگ گوہاٹی نہر کے کنارے بن رہی تھی، جبکہ دوسال

پہلے انٹرمیڈیٹ کالج کا افتتاح ہو چکا تھا اور عارضی طور پر کلاسز گورنمنٹ پرائمری سکول صوابی کی عمارت میں جاری تھیں۔ موسیٰ کلیم صاحب اس کالج کے اوّلین پرنسپل تھے۔ اُن کے بعد اسلم بیگ صاحب جو غالباً مروت تھے، پرنسپل مقرر ہوئے۔ اسلم بیگ صاحب زیارت خان کو جانتے تھے اور اسی نسبت سے میرے نتیجے سے آگاہ تھے۔ اُن کی یہ خواہش اور کوشش تھی کہ میں صوابی کالج میں داخلہ لوں۔ چنانچہ میں نے اس کالج میں داخلہ لے لیا۔ اِن دنوں زیارت خان انٹرمیڈیٹ پاس کر کے اسلامیہ کالج پشاور میں داخل ہو چکے تھے۔ میری خواہش کہ میں اسلامیہ کالج میں داخلہ لوں، جبکہ میٹرک رزلٹ کی بنیاد پر مجھے ۴۵ روپے ماہانہ وظیفہ بھی مل رہا تھا، لیکن اسلامیہ کالج میں دو بیٹوں کے اخراجات برداشت کرنا والد صاحب کے لیے مشکل تھا۔ اڈہ کے ساتھ ہماری ساڑھے تین کنال اراضی تھی اور آج کے حساب سے کروڑوں کی بنتی تھی، والد صاحب نے یہ زمین ساڑھے نو ہزار روپے میں فروخت کردی۔ دراصل والد صاحب ہماری تعلیم کے بڑے شیدائی تھے اور پھر ہم دو بھائیوں کے کالج میں پڑھنے سے والد صاحب کا وقار عزیز رشتہ داروں میں بڑھ بھی گیا تھا۔ صوابی کالج کا یونیفارم سفید قمیص اور سلیٹی رنگ کے پتلون پر مشتمل تھا۔ ہم لوگ چونکہ پینٹ پہننے میں شرم محسوس کرتے تھے، اس لیے پینٹ شرٹ گھر کے بجائے راستے میں ایک رہٹ میں رکھ آتے اور صبح یہیں سے پہن کر جاتے۔ کالج سے واپسی پر اِسی رہٹ میں دوبارہ کپڑے تبدیل کر لیتے۔ ایک دن میں پینٹ شرٹ پہنے گھر کی طرف آ رہا تھا کہ علی حیدر کاکا کے بیٹے انور، خالی بوری لے کر آٹا چکی جا رہے تھے، مجھے دیکھا تو وہی بوری میری پتلون پر دے ماری اور کہا کہ یہ کیا پہن کر آ رہے ہو؟ میں آٹے سے سفید ہو گیا اور خاصا شرمندہ ہو کر اپنے گھر داخل ہوا۔

کالج داخلے کے کچھ ہی عرصے بعد کالج کی اپنی بلڈنگ گوہاٹی نہر کے کنارے مکمل ہوئی اور ہم لوگ وہیں منتقل ہو گئے۔ ہمارے انگریزی اور اکنامکس کے اساتذہ پنجاب سے تھے، پشتو کے لیکچرر ہماری تحصیل سے ہی تھے، جغرافیہ کے استاد جہانگیرہ کے گاؤں سے تعلق رکھتے تھے، جبکہ باقی اساتذہ کے نام اور مقام یاد نہیں رہے۔ یہ دور ایوب خان کی حکومت کے جوبن کا تھا۔ صدارتی انتخابات کا دور، اور طلباء ایجی ٹیشن ابھی شروع نہیں ہوا تھا، یہاں تک کہ طلباء یونین پر بھی ابھی پابندی نہیں لگی تھی۔ صوابی کالج کے انتخابات بھی غیر سیاسی بنیادوں پر منعقد ہوئے تھے۔ میرے زمانے میں کالج انتخابات کے لیے ڈاگئی کے فضل دادا اور زیدہ کے عبدالنعیم امیدوار تھے دونوں اس

وقت سالِ دوم کے طالبِ علم تھے اور دونوں خاصے نالائق تھے۔ ہم فضل داد کے حمائتی تھے۔ فضل داد کی حمائت کی وجہ شاید تھی کہ ان کے بڑے بھائی اے۔ سی یا تحصیلدار کے دفتر میں ہیڈ کلرک یا سپرنٹنڈنٹ تھے اور ہمارے گاؤں کے ساتھ تعلق اور آنا جانا تھا۔ اگرچہ ''زیدہ'' سے ہمارا تعلق قبیلہ راتی تھا تاہم چونکہ رزڑ مردان اور پشاور کے رستے میں پڑتا تھا، اس لیے ہمارا ان کے ساتھ تعلق اور آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ہم طالبعلم الیکشن کمپین کے سلسلے میں دن رات گاؤں گاؤں جاتے رہے اور فضل دادا کے حق میں ووٹ ڈالنے کے لیے دیگر طلباء کو آمادہ کرتے رہے۔ فضل دادا اس الیکشن میں یونین کے صدر بن گئے۔ اس وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ مستقبل میں عبدالنعیم اور ان کے خاندان کا سیاسی ہم مسلک بنوں گا اور فضل داد بچارا ایسا ہی کورا رہے گا۔ ہماری اس وقت کی وہ محنت ایک عبث کام ہی تھا۔ اس دور کے دوستوں میں سے میرا خان (تور)، نعیم اور صابر کاکا کے ساتھ میرا تعلق آخری عمر تک رہا۔

میں تقریباً ایک سال تک اِس کالج میں رہا (اِس زمانے میں انٹر اور ڈگری امتحانات دو دو سال بعد ہوتے تھے) یہاں کئی نئے دوست بنے، نئی اور فعال سیاست کے ساتھ تعلق بھی جڑا۔ محمد نعیم بھی جب اسلامیہ کالج سے واپس آتے تو میری طرف ضرور آتے، خود میں گاہے گاہے اسلامیہ کالج چلے جاتا۔ اسلامیہ کالج مجھے ذاتی حوالے سے اور سیاست کی وجہ سے بہت پُرکشش لگنے لگا تھا۔

بائسکوپ (سنیما) سے میں سکول کے زمانے میں آشنا ہو چکا تھا۔ پہلی مرتبہ میں بیزور (فیض الرحمٰن) اور اُن کے والد کے ساتھ مردان فلم دیکھنے گیا تھا۔ پھر جب میں صوابی کالج میں داخل ہوا تو اکثر دوستوں کے ساتھ مردان فلم دیکھنے جایا کرتا تھا اور جب کبھی پشاور آتا تو ضرور سنیما کا چکر لگا لیتا تھا۔ اس وقت ہندوستانی فلموں کی نمائش پر پابندی نہیں لگی تھی کیونکہ ابھی تک دونوں ملکوں کے درمیان ستمبر ۱۹۶۵ کی جنگ نہیں ہوئی تھی۔

پاکستان کی سیاسی فضاء میں تبدیلی آ گئی تھی۔ اسی ہزار بی۔ ڈی ممبران منتخب ہو چکے تھے۔ خدائی خدمتگار یا نیشنل عوامی پارٹی کے وہ لیڈران اور کارکن جو ''ون یونٹ'' کے خلاف تحریک میں جیل بجھوائے گئے تھے، اُن میں سے بعضے آزاد ہو چکے تھے اور بعض رہائی کے قریب تھے۔ رہائی پانے والوں میں ''کوکوکاکا'' بھی تھے۔ میں نعیم اور سلیم کے ساتھ ان کے حجرے (مشین) جایا کرتا تھا اور نئے نئے لوگوں سے آشنا ہوتا تھا۔ ان میں سے اکثر لوگ باچا خان کے حمائتی اور ساتھی

تھے۔سیاست کے ساتھ میری دلچسپی روز بہ روز بڑھتی گئی۔۱۹۶۲ء کے آئین کے زیر اہتمام جنوری ۱۹۶۵ء میں صدارتی انتخاب کا اعلان ہوا۔اِس وقت نیشنل عوامی پارٹی کے سربراہ مشرقی پاکستان (بنگال) کے نامور سیاستدان مولانا عبدالحمید بھاشانی تھے۔عبدالولی خان کو اِس وقت زیادہ لوگ پہچانتے نہیں تھے، بلکہ ان کی مقامی شہرت بھی فقط باچا خان کے صاحبزادے کی تھی۔نیپ نے ایوب خان کے خلاف محمد علی جناح کی بہن فاطمہ جناح کا ساتھ دیا، یہاں تک کہ صدارتی انتخاب کے لیے ان کا نام بھی بھاشانی ہی نے تجویز کیا تھا۔اِن انتخابات کی وجہ سے سیاسی فضاء خاصی گرم ہوگئی تھی۔میں پہلی مرتبہ حزبِ اختلاف کے جلسے میں شرکت کے لیے مردان چلا گیا تھا۔یہ جلسہ کافی بڑا اور مردان کمپنی باغ میں منعقد ہوا تھا۔اس جلسے میں بھاشانی کے ساتھ ساتھ حزبِ اختلاف کے اکثر لیڈر موجود تھے۔یہ جلسہ عملاً نیپ ہی نے منعقد کیا تھا، عبدالقیوم خان ایبڈو قانون کے تحت سیاسی سرگرمیوں سے معطل تھے، ان کی بیگم نے اس جلسے میں تقریر کی۔اگرچہ یہ بڑا جلسہ اور کامیاب سیاسی شو (show) تھا، تاہم صدارتی انتخاب کا اختیار عوام کے ہاتھ نہیں تھا بلکہ اسی ہزار منتخب ہونے والے بی۔ڈی ممبران کے ہاتھ میں تھا۔اور یہ لوگ بڑی آسانی کیساتھ پیسے کے لالچ اور حکومتی دباؤ میں آسکتے تھے۔میں نیپ کی جانب سے منعقدہ جرگوں اور جلسوں میں شریک ہوتا رہا۔ایوب خان کی انتخابی مہم میں مردان کے نوابزادگان کرنل غفور خان، کرنل امیر خان اور دیگر لوگ پیش پیش تھے۔انہی کے ایک تربور (چچازاد۔شریک) ایوب خان کے خلاف تھے اور نیپ کے ساتھ جلسوں میں شریک ہوتے رہے۔صوابی میں اکثر امیر زادہ خان اور مردان کے دیگر لیڈر آتے تھے اور جب بھی آتے ضرور مانیری آتے۔سالار منیر خان کا حجرہ کوزہ مانیری میں سڑک کنارے تھا۔اگرچہ سالار منیر خان غریب آدمی تھے اور زیادہ مہمان نوازی کی طاقت نہیں رکھتے تھے مگر صوابی اور اس کے مضافات کے پرانے دوست اسی حجرے میں آتے، جبکہ زیادہ تر لوگ ''کوکو'' کے ہاں آتے۔کوکو ٹرانسپورٹر تھے اور یہ گھرانہ صاحبِ حیثیت تھا، ان کا پرانا تعلق خدائی خدمتگار اور کانگریس سے چلا آرہا تھا۔سیاست سے مفادات حاصل کرنے کے گُر جانتے تھے۔جس طرح پاکستان بننے کے بعد کئی ایک کانگرسی اور خدائی خدمتگار مسلم لیگ میں شامل ہوگئے تھے، اسی طرح ایوب خان کے دور میں بعض افراد جیسا کہ غلام نبی کاکا اور شیرداد بابا کا خاندان، ہوتی کے نواب خاندان وغیرہ کے توسط سے ایوب خان کے ساتھ ہوگئے تھے۔انتخابات میں ایوب خان جیت گئے۔دراصل ایوب خان نے جو بلدیاتی نظام ترتیب دیا تھا

اور جس طرح اسے الیکٹورل کالج قرار دیا تھا اُس میں کسی اور کے لیے انتخاب جیتنے کی گنجائش تھی ہی نہیں، لیکن فاطمہ جناح کے انتخاب میں حصہ لینے سے سیاست میں زبردست ارتعاش ضرور پیدا ہوا تھا اور اس نئے بنائے ہوئے نظام کو اس نے ایک طرح سے کھوکھلا کر دیا تھا۔میرے لیے سیاست کے مراکز صوابی اڈہ، کوکو کا مشین اور جلسے جلوس کے علاوہ جانس خان مزید خیل کا حجرہ بھی تھا اور ہم وہاں بھی جاتے۔جانس خان خود بھی قید میں رہ چکے تھے اور اس پر فخر کیا کرتے تھے۔اکثر کانگریسی یہاں آتے تھے۔اس دور میں کئی نئے دوست بن گئے، جن میں مشہور ہوٹل کے مالک اور ہمارے گاؤں کے صالحین کاکا کے صاحبزادے جبل الورید بھی شامل ہیں۔

اجمل خٹک کے ساتھ میری اوّلین ملاقات غالباً ۱۹۶۴ء میں صوابی اڈہ میں خیرولی ہوٹل میں ہوئی تھی۔اب مجھے پوری طرح یاد نہیں کہ میٹرک کے نتائج آچکے تھے یا ہم اس کے انتظار میں تھے۔خیرولی ہوٹل صوابی بس اڈہ کے ایک جانب واقع تھا، اجمل خٹک اس ہوٹل میں فردوس خان کوکو اور ان کے خاندان کے دیگر لوگوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ہم اُس وقت اڈہ میں موجود ’پیروزے‘ نانبائی کے تنور پر بیٹھے گپ شپ میں مصروف تھے کہ ایک دراز قامت جوان، جس نے قراقلی ٹوپی پہنی تھی کوکو کے بہنوئی مفرح شاہ کے ساتھ تھے۔یہ لوگ مانیری بالا جا رہے تھے یا اس طرف سے آرہے تھے، اردگرد لوگوں میں، جن میں مفرح شاہ کے ایک دوست شفیع بھی شامل تھے، نے بتایا کہ یہ اجمل خٹک ہیں، اس وقت وہ ہوٹل میں بیٹھ چکے تھے۔ہم ان کے پاس گئے، یہ میری اُن سے پہلی ملاقات تھی۔یہ پہلی ملاقات اُس بس اڈے میں اُس جوان اجمل خٹک کے ساتھ تھی جو میری زندگی، تعلیم، مستقبل اور کیرئر پر ایسے اثرانداز ہوئے جیسے سمندر کسی بندرگاہ پر کھڑے بحری جہاز کو لنگر سے آزاد کر دے اور اُسے ایسے طوفانی موجوں کے سپرد کر دے، جسے کوئی اور لنگر نہ ڈال سکے۔اب جب میری عمر ساٹھ سال سے اوپر ہو چکی ہے، میں اب بھی یہ سمجھتا ہوں کہ میری زندگی کی کشتی تاحال یونہی زندگی کی موجوں کے تھپیڑوں پر ہے۔

حصہ دوم

نوجوانی: اسلامیہ کالج پشاور

اگرچہ میں گورنمنٹ کالج صوابی میں داخلہ لے چکا تھا، مگر اب میرا دل بڑی حد تک گاؤں اور صوابی کالج سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ میری شدید خواہش تھی کہ میں بھی اسلامیہ کالج پشاور میں داخلہ لوں، کیونکہ زیارت خان اسلامیہ کالج میں سال سوم میں داخلہ لے چکے تھے۔ گورنمنٹ کالج صوابی ابھی نیا نیا بنا تھا اور اسے عام طور پر کاریزو کالج کہتے تھے۔ صوابی کالج جس جگہ بنایا گیا تھا، وہاں خودرو کاریزہ (Centuria) کی بہتات ہوتی تھی، کالج ہذا میں کچھ تو واجبی سی تدریس اور پھر کالج تک آنے جانے کے مسائل نے مجھے بالکل بیزار کر دیا تھا۔ اس دوران دو اہم واقعات ہوئے، اول یہ کہ مجھے سکالرشپ ملا، دوم والد صاحب نے اڈہ والی زمین فروخت کر دی اور جب اسلامیہ کالج پشاور میں داخلہ کے لیے میرا اصرار بڑھا تو والد صاحب بھی راضی ہو گئے۔

اسلامیہ کالج کے پرنسپل اشرف درانی صاحب تھے۔ یونیورسٹی کے نائب خزانچی، ڈاکٹر نذیر صاحب اجمل خٹک کے دوست تھے اُن کا تعلق ضلع صوابی کے گاؤں 'گلہ' سے تھا۔ چنانچہ اجمل خٹک کے توسط سے جناب ڈاکٹر نذیر مجھے اپنے ہمراہ اشرف درانی کے پاس لے گئے۔ میرے تعلیمی ریکارڈ، میٹرک کے نمبر اور پھر ڈاکٹر نذیر کی سفارش کی بدولت صوابی کالج سے اسلامیہ کالج مائیگریشن ممکن ہوئی۔

اس زمانے میں ہمارے گاؤں کے شیر ولی (ہمارے رشتہ دار) اور نذیر یونیورسٹی میں جبکہ ڈاکٹر سلیم، محمد نواز، امیر نواز، اور نعیم اسلامیہ کالج میں پڑھ رہے تھے۔ میری 'مائیگریشن غالباً اپریل یا مئی ۱۹۶۵ میں گرمیوں کی چھٹیوں سے پہلے ہوئی تھی، اس لئے کہ مجھے یاد ہے مجھے گلے کی تکلیف تھی، اس لئے پشاور کے لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں میرا ٹانسلز کا آپریشن ڈاکٹر جبار کے ہاتھوں ہوا۔ ڈاکٹر جبار اس زمانے میں آنکھ، کان، ناک اور گلے کے واحد سپیشلسٹ ڈاکٹر تھے، میں پرائیویٹ کمرہ میں داخل ہو، آپریشن سے ایک دن پہلے چونکہ میں اکیلا تھا اس لئے میں نے فردوس سینما میں آخری بھارتی فلم 'زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے' بھی دیکھی اور جب اسی سال ستمبر میں پاک بھارت جنگ ہوئی تو اس کے بعد بھارتی فلموں کی نمائش روک دی گئی۔ آپریشن کے بعد میں گاؤں چلا گیا، ان دنوں صوابی اڈہ میں میاں ہدایت اللہ کا برف اور آئس کریم کا کارخانہ تھا، میں وہاں سے

کالج یونیفارم سفید شلوار قمیص اور شیروانی پر مشتمل (آج بھی) تھا۔ اس زمانے کے اہم اساتذہ میں نثار لالا اکنامکس، جغرافیہ ڈیپارمنٹ کے چیرمین زبیر صاحب (جن کے بھائی صوابی میں وکالت کرتے تھے اور میرے والد کے دوست تھے) اور جن کے ساتھ ہمارے خاندانی مراسم تھے، ولی محمد صاحب ہمیں جغرافیہ پڑھاتے تھے۔ اردو کے پروفیسر کا تعلق چارسدہ سے تھا، انگریزی کے استاد محفوظ جان صاحب طرزِ استاد تھے، انتہائی محنت کرتے تھے۔ ستار لالہ کا مضمون تاریخ تھا۔ پولیٹیکل سائنس فتح الرحمٰن صاحب، جبکہ فزیکل کلاس بٹ صاحب لیتے تھے، نور الحق صاحب (ڈین) اسلامیات پڑھاتے تھے، ان کا انداز دوستانہ اور مزاج رنگین تھا۔ ڈین صاحب یونیورسٹی کے وائس چانسلر چوہدری محمد علی کا خاص خیال رکھتے تھے، جبکہ اپنے ان شاگردوں کا اکثر تذکرہ کرتے جو بیورو کریسی میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔

اسلامیہ کالج کے اس دور میں ہماری عیاشی چائے پر گپ شپ اور گانا سننا تھی، شام کو ہم سب ساتھی اسلامیہ کالج کے بالمقابل سڑک پار ''نعمت محل'' چائے پینے اور ریکارڈ پلیر پر پرانے ہندوستانی فلموں کے گانوں سے لطف اٹھانے جاتے۔ انہی دنوں جب اسلامیہ کالج کا اپنا ''ریکریشن سنٹر'' قائم ہوا تو ہماری آمد ورفت یہاں بھی شروع ہوئی، تاہم ریکریشن سنٹر میں میوزک اور نغمات کے لیے وقت مخصوص تھا۔ اسی طرح جب ہم پشاور شہر آتے تو خصوصاً خیبر بازار میں موجود کسینو کیفے ضرور جاتے، چائے پیتے اور گیت سنتے۔ خیبر بازار کے کسینو کیفے میں بیٹھنا اس زمانے میں ایک طرح سے فیشن تھا۔ ہم لوگ پشاور شہر صدر میں ارباب روڈ اور گورا بازار (جناح سٹریٹ) مٹر گشت کرتے، خیبر کیفے اور سلور سٹار میں سموسے، پنیر کے پکوڑے، کٹلس اور چائے نوشِ جاں کرتے۔ یونیورسٹی کی کافی شاپ جانا، یہاں چائے پینا، سموسے کھانا، گیت سننا یا پھر ایس ٹی سی (سٹوڈنٹس ٹیچر سنٹر) میں چائے اور گپ شپ کے علاوہ روڈ نمبر۲ پر دل پشوری کرنے کا اپنا رنگ اور مزا تھا۔

۱۹۶۵ کی گرمیوں کی چھٹیوں کے خاتمے پر ہم دوبارہ کالج آگئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ پاکستان نے کشمیر میں اپنے لوگ داخل کر کے حالات خراب کرنا شروع کیے تھے۔ ایوب خان کا خیال تھا کہ اگر جنگ ہوئی بھی تو کشمیر کی سرزمین پر جنگ لڑی جائے گی۔ پاکستان سے کشمیریوں کے لباس میں ہندوستان میں داخل ہونے والے مداخلت کاروں کو ہندوستان نے گرفتار کیا۔ ہندوستان،

ڈاکٹر کی ہدایت پر تھرماس میں آئس کریم لے آتا اور کھایا کرتا تھا، اس زمانے میں عام طور پر فریج متعارف نہ تھا۔ اسلامیہ کالج مائیگریشن ہونے پر مجھے 'بٹلر ہاسٹل' میں جگہ ملی اس زمانے میں فتح الرحمٰن صاحب وارڈن اور عطاء اللہ پراکٹر تھے، ہاسٹل رولز کے مطابق عشاء کی نماز کے بعد ہاسٹل بند ہوتا اور اس کے بعد جو طلباء آتے ان کو جرمانہ کیا جاتا، بلکہ اس زمانے میں پراکٹرز پشاور شہر اور پشاور صدر میں گشت کرتے ''سائن آور'' کے بعد کوئی طالبعلم نظر آتا تو انھیں بعد میں جرمانہ کرتے۔

پشاور یونیورسٹی اس زمانے میں گویا ایک نخلستان (OASIS) تھا۔ ''گورا قبرستان'' سے یونیورسٹی ٹاون تک پورا علاقہ تقریباً غیر آباد تھا یا پھر کھیت کھلیان تھے۔ 'کوزتا کال' (تہکال پایان) اور 'برتا کال' (تہکال بالا) مرکزی سڑک سے دور تھے، اس طرح ''پاکستان رورل اکیڈمی'' سڑک سے کافی دور تھی، مسعود کھدر پوش غالباً اس زمانے میں اکیڈمی کے ڈائریکٹر تھے۔ یونیورسٹی کیمپس کے گرد دیوار نہ تھی۔ سپین جماعت (مسجد) اور نعمت محل (اسلامیہ کالج کے سامنے ایک ہوٹل) کے درمیان صرف ایگریکلچر ڈیپارٹمنٹ کی عمارت تھی جبکہ دوسری طرف ایگریکلچر کالج کے ہاسٹلز کے آگے کا تمام علاقہ ویران اور غیر آباد تھا۔ تہکال میں جب ارباب جہانگیر نے کھیتوں کے درمیان اپنا نیا گھر بنایا تو یہ سڑک سے کافی دور لگتا تھا، سوچتا ہوں آبادی کتنی تیزی سے پھیل گئی، آج یہ (جہانگیر آباد) گنجان علاقہ بن چکا ہے۔ مرکزی سڑک پر اسلامیہ کالج سے آگے کسٹم پوسٹ اور اس سے آگے برج ہری سنگھ تھانہ تھا (جہاں اب پولیس پبلک سکول اینڈ کالج بن چکا ہے)، نعمت محل کے ساتھ ارباب عبدالواحد کا مکان تھا، ریل کی پٹڑی کے اس پار دانش آباد میں روغانی صاحب، حشمت اللہ سابق چیئرمین پشاور بورڈ اور مطیع اللہ ناشاد کے والد صاحب رہتے تھے۔ یہ مکان نئے نئے بنے تھے اور مطیع اللہ ناشاد کے والد غالباً روغانی صاحب کے کرایہ دار تھے۔ صدر سے یونیورسٹی اور اسلامیہ کالج تک ڈبل ڈیکر بس چلتی تھی، لیکن زیادہ تر تانگے ہوتے تھے۔

اسلامیہ کالج اور ہاسٹل کی زندگی کا اپنا ہی رنگ تھا۔ کالج سے ملحقہ پشاور یونیورسٹی کے لان، گراونڈ اور میوہ جات کے باغات کی اپنی بہار تھی۔ ہم لوگ اکثر جناح کالج فار وومن کے سامنے باغ سے مالٹے توڑتے، ہاسٹل کی فیس چالیس یا بیالیس روپے ماہانہ تھی، مہمانوں کے آنے پر اور رات گزارنے پر کوئی پابندی نہیں تھی، صرف پراکٹر صاحب کو اطلاع دینا ضروری تھا، مہمان کے لئے ہاسٹل میں کھانا تقریباً فری تھا، ہم اکثر اپنے مہمان کے لئے باہر سے چپل کباب خرید کر لاتے۔

پاکستان کے اس منصوبے سے آگاہ ہو چکا تھا، لہذا ہندوستان نے براہِ راست ۶ ستمبر کو پنجاب کی طرف سے پاکستان پر حملہ کیا۔ پروفیسر 'ہینری مائیکل کلوز' جو اسلامیہ کالج میں انگریزی کے استاد تھے، تدریس کے شعبہ میں آنے سے پہلے ایک فوجی میجر کی حیثیت سے دوسری جنگ عظیم میں حصہ لے چکے تھے۔ اس صورتحال میں پروفیسر کلوز تمام ہاسٹلز کے طلباء کے گویا انچارج ہو گئے، انھوں نے ہم طلباء سے ہاسٹلوں کے گرد خندقیں (TRENCHES) کھدوائیں، تاکہ ہوائی حملے کے نتیجے میں حفاظت ممکن ہو۔ ہندوستانی ہوائی جہاز داخل ہوتے ہی سائرن بجتے اور ہم لوگ فوراً خندقوں میں پناہ لیتے۔ اس تمام وقت میں پروفیسر کلوز ہماری نگرانی کرتے تھے۔ جنگ کے دوران پروفیسر کلوز ہمیں دو مرتبہ افواج پاکستان کے ساتھ یکجہتی اور عملی خدمت کی خاطر ہوائی اڈے بھی لے گئے۔ چونکہ اس زمانے میں پاک فضائیہ کا ہیڈ کوارٹر پشاور میں تھا، ہوائی اڈہ پر ہم نے جنگی جہازوں کے گرد ریت بھری بوریوں کی دیوار بنائی۔ چونکہ پشاور یونیورسٹی اور اسلامیہ کالج ہوائی اڈے کے نزدیک ہیں، رات کو مکمل بلیک آوٹ ہوتا تھا، پروفیسر کلوز صاحب اسکی سخت نگرانی کرتے، کسی کو اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔ اس صورتِ حال میں بعض طلبہ بھاگ کر اپنے گاؤں چلے گئے۔ خاص کر آفریدی خیبر ایجنسی منتقل ہوئے اور ساتھ میں اپنے بعض دوستوں کو بھی لے گئے۔ تقریبا سترہ دن کی لڑائی کے بعد جب جنگ بندی ہوئی، تب بلیک آوٹ کے سائرن کی آوازن سے ہماری جان چھوٹ گئی۔ (اس جنگ میں اگر چہ پاکستان کو شکست ہوئی لیکن پروپیگنڈ یہ ہوا کہ پاکستان نے ہندوستان کو شکست دی ہے اور یہ کہ خود ہندوستان جنگ بندی پر مجبور ہوا) نیپ (NAP) سمیت تمام سیاسی پارٹیوں کے راہنماؤں نے اخبارات اور ریڈیو پر پاکستان کی حمایت میں بیانات جاری کیے تھے۔ اجمل خٹک افواجِ پاکستان کی توصیف میں ریڈیو پر اشعار سناتے اور اس ضمن میں ان کا ایک مجموعہ باتور (بہادر) کے عنوان سے شعبہ اطلاعات نے ترتیب دیا تھا' باچا خان پاک بھارت جنگ کے دوران کابل میں تھے، انھوں نے جنگ کے خلاف آواز اٹھائی۔ اقوام متحدہ میں جناب ذوالفقار علی بھٹو سلامتی کونسل میں اپنے جذباتی خطاب کی بنا پر کافی مقبول ہوتے جارہے تھے۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو کی اس جذباتی تقریر نے ان کے سیاسی قد کاٹھ میں زبردست اضافہ کیا، جبکہ ایوب خان کی شخصیت اور رعب داب میں بھی خاصا اضافہ ہوا۔ اس جنگ کی وجہ سے پاکستان کی معاشی ترقی کو کافی نقصان پہنچا۔ ہندوستان اور پاکستان

دونوں امن معاہدے کے لیے تاشقند (سوویت یونین یعنی موجودہ ازبکستان) پہنچے۔ مذاکرات کے بعد ۱۰ جنوری ۱۹۶۶ کو معاہدے پر دستخط ہوئے، دستخطوں کے فوری بعد بھارتی وزیراعظم لال بہادر شاستری دل کے دورہ کی وجہ سے آنجہانی ہوئے تو گویا یہ معاہدہ پاکستان کی جیت پر تمام ہوا پاکستان بھر میں یہ تاثر دیا گیا کہ بھارتی وزیراعظم پاکستانی صدر ایوب خان کے رعب میں آگئے اور بادل نخواستہ معاہدے پر دستخط کیے۔

اسلامیہ کالج پشاور اور پشاور یونیورسٹی میں ایک طرح کی سیاسی خاموشی تھی۔ خدائی خدمتگاروں کے فرزند، جو ان اداروں میں زیر تعلیم تھے ان کی اکثریت خاموش اور غیر فعال تھی۔ صرف ہم چند طلباء ایسے تھے، جو فعال نظر آتے تھے۔ اگر چہ خیبر یونین کے انتخابات غیر سیاسی بنیادوں پر ہوتے تھے لیکن کالج عملاً دو گروہوں میں تقسیم نظر آرہا تھا۔ صوابی کیمپ ایک طرف تھا، چارسدہ دوسری طرف ہوتا تھا جس میں مردان کے طلبا بھی شامل تھے ان میں اکثریت بڑے بڑے خاندانوں کے چراغوں کی تھی، جس میں بعض تو نشے کے عادی اور شوقین مزاج تھے، اور بعض کو لینے اور چھوڑنے شیورلیٹ جیسی گاڑیاں آیا کرتی تھیں۔ صوابی کیمپ میں زیادہ تر متوسط گھرانوں کے لڑکوں کے ساتھ بیوروکریٹ اور تاجروں کے بیٹے شامل تھے۔ خیبر یونین کے اولین انتخابات میں صوابی کیمپ، وزیرستان سے تعلق رکھنے والے مسعود الرحمن وزیر کا حمایتی تھا جبکہ قاسم جان کی پشت پر چارسدہ والا گروہ تھا۔ قاسم جان خود بھی پڑانگ (چارسدہ) کے رہنے والے تھے جو بعد میں پشاور یونیورسٹی میں ہمارے تعاون سے پشتون سٹوڈنٹس فیڈریشن کے یونیورسٹی صدر بنے۔ خیبر یونین کے الیکشن میں مسعود الرحمن کامیاب رہے اس وقت ہماری خواہش تھی کہ یہ انتخاب سیاسی اور نظریاتی بنیادوں پر ہوں اور ہم نے پرانے رجحان کو تبدیل کرنا شروع کیا۔

اسلامیہ کالج میں داخل ہونے کی وجہ سے میں خیبر میڈیکل کالج کے طالب علم مطیع اللہ ناشاد سے متعارف ہوا۔ ناشاد غریب گھرانے کے لائق فرزند تھے۔ ان کے والد لنڈی کوتل کے کسی سکول میں استاد اور دانش آباد میں معروف شاہ روغانی کے کرایہ دار تھے۔ مطیع اللہ ناشاد اصلاً سوات سے تعلق رکھتے تھے، لیکن ان کے والد کو والئی سوات نے ریاست بدر کر دیا تھا۔ یہ لوگ پہلے ساولڈھیر میں رہے، پھر دانش آباد پشاور میں سکونت اختیار کی۔ ناشاد نہ صرف پشتو، اردو اور انگریزی کے شاعر و ادیب ہونے کے علاوہ ان زبانوں کے اچھے مقرر بھی تھے۔ ناشاد یار باش، رنگین مزاج

اور بائیں بازو کی سیاست کے علمبردار تھے، معمولاتِ زندگی میں کسی قسم کی باقاعدگی اور پابندی کے قائل نہ تھے، میجر جنرل محمد اکرم، پرنسپل خیبر میڈیکل کالج، انھیں تعلیمی سرگرمیوں میں دلچسپی لینے اور امتحانات کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کرتے۔ ناشاد اجمل خٹک سے قریبی اور گہرا تعلق رکھتے تھے اور اس تعلق کا بنیادی سبب شاعری اور بائیں بازو کی سیاست تھی۔ اجمل خٹک کے ساتھ ساتھ ناشاد کی سلیم (کوکو کاکا کے فرزند) اور نعیم کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے۔ ناشاد کی عادات میں سے ایک خرابی یہ تھی کہ دوستوں سے رقم قرض تو لے لیتے لیکن واپسی ناممکن ہوتی۔ ہم جب بھی انکے ساتھ پشاور صدر یا شہر آتے تو ناشاد کسی ایسے راستے کا انتخاب کرتے، جہاں کسی قرض خواہ سے مڈھ بھیڑ کے امکانات نہ ہوتے۔ ایک مرتبہ جب میں نے کئی مہینوں سکالرشپ کی جمع شدہ رقم ایک ساتھ وصول کی تو کسی طرح ناشاد کو خبر ہوگئی۔ چنانچہ میں، ناشاد اور نعیم ایبٹ آباد کے لیے روانہ ہوگئے، اور پھر وہاں سے مری گئے۔ مری میں ہمارا قیام حاکم ہنزہ کے ہوٹل میں تھا، کیوں کہ حاکم ہنزہ کا صاحبزادہ ناشاد کے ساتھ میڈیکل کالج، میں پڑھ رہا تھا۔ اور جب تک رقم ختم نہیں ہوئی، ہم وہیں پر رہے۔ اس پورے سفر اور قیام میں ہمارے بدن پر وہی پہناوا تھا جو ہم پشاور سے پہن کر گئے تھے جس سے بدبو آنے لگی تھی، انہی کپڑوں میں واپس پشاور وارد ہوئے۔ ناشاد ایک فعال سیاسی کارکن اور اچھا بولنے والے تھے۔ ہم ان کے ساتھ اکثر افضل بنگش کے بالاخانے خیبر بازار جاتے۔ افضل بنگش اس زمانے میں نیشنل عوامی پارٹی (NAP) کے صوبائی لیڈر تھے۔ انکے دفتر میں اجمل خٹک اور تہکال کے محمد خان کاکا موجود ہوتے اور رات گئے تک سیاسی و پارٹی کاموں میں مصروف رہتے۔ ایک مرتبہ کسی بات پر میری اور ناشاد کی لڑائی ہوئی، ناشاد نے مجھے دھمکی دی کہ اس بالاخانے اب مت آنا، میرا جواب اس سے بھی سخت تھا کہ یہ جگہ کوئی تمھارے باپ کی نہیں اور یہ کہ اگر تم مجھے یہاں آنے سے روک سکتے ہو تو روک لو! افضل بنگش کو جب ہماری اس لڑائی کی خبر ہوئی تو انھوں نے سختی سے ناشاد کو ڈانٹا اور کہا کہ تم کون ہوتے ہو، جو میرے بالاخانے پر لوگوں کو آنے سے منع کرتے ہو۔ افضل بنگش نے ناشاد سے کہا کہ آئندہ تم یہاں نہ آنا۔ بعد میں اجمل خٹک کی سفارش پر معاملات درست ہوئے۔ بہر حال ناشاد کی اس خوبی کا ذکر بھی ضروری ہے کہ اس کے دل میں کسی کے لیے کینہ اور دشمنی نہیں رہتی تھی۔

ون یونٹ کے قیام کی وجہ سے صوبہ سرحد مغربی پاکستان میں ضم ہو چکا تھا۔ چونکہ نیپ کا تنظیمی

ڈھانچہ پاکستان کی پانچ صوبائی تنظیموں سے مل کر بنا تھا، اس لیے افضل بنگش کا بالا خانہ اب بھی نیپ کا صوبائی دفتر تھا۔ چنانچہ اس وقت کے خدائی خدمتگار، نیپ کے ضلعی، تحصیل اور تپوں (WARDS) کے تنظیمی عہدہ دار یہاں آتے۔ علاوہ ازیں دیگر ترقی پسند سیاسی کارکن، دانشور اور ادباء بھی یہیں اپنی محفلیں سجاتے۔ ایک مرتبہ تو شوروی اتحاد (سابقہ سویت یونین) کے چند اہم شاعر بھی اس بالا خانے تشریف لائے۔ بعد میں ایک کارکن شراف دین نے اپنے گھر ان شعراء کے اعزاز میں چائے کا اہتمام کیا، جہاں ہم بھی مدعو تھے۔

ایوب خان کی حکومت نے جب سویت یونین اور چین کے ساتھ ثقافتی تعلقات کے باہمی تعاون کے ضمن میں معاہدے کیے تو کمیونسٹ اور سوشلسٹ لٹریچر باآسانی دستیاب ہونے لگا۔ چینی سفارت خانے کے توسط سے کمیونزم اور چین سے متعلق ثقافتی لٹریچر کی بہتات ہوگئی۔ سرخ رنگ کے بیج، جو اصلاً ماؤزے دونگ کی تصویر تھی، لگانا اور کمیونزم پر بات کرنا فیشن بن گیا تھا۔ ایک مرتبہ میں اجمل خٹک کے ساتھ 'دوہ سرہ' گیا، رات ہم نے محمد دین کاکا کے ہاں گزاری۔ محمد دین کاکا کے صاحبزادے عثمانیہ ہاسٹل میں ہمارے ساتھی تھے (جو تعلیم سے فراغت کے بعد بنک میں ملازم ہو گئے)۔ اسکے علاوہ اس رات عطاء اللہ خان آف گل آباد کے فرزند اور نثار خان کے برادر خورد میر عالم بھی موجود تھے، باتوں باتوں میں جب روس اور چین کے انقلابات، لینن اور ماؤزے دونگ (جنہیں عام طور پر ماؤزے تنگ کہا جاتا تھا) کے افکار پر بحث ہونے لگی۔ میر عالم کہنے لگے کہ میں بھی ماؤ کے افکار سے واقف ہوں، اس نے یہ کہا ہے وہ کہا ہے۔ میں اس کا شیدائی اور ایک انقلابی ہوں۔ میں سوچتا رہا کہ کہاں انقلاب اور کہاں میر عالم جیسا جاگیردارانہ پس منظر اور ذہن رکھنے والا انقلابی۔ عالمی سطح پر چین اور روس کی انقلابی راہیں جدا ہو چکی تھی۔ بنگش صاحب نے شعوری طور پر چین کے کمیونسٹ ورژن کو قبول کر لیا تھا، جبکہ اجمل خٹک صاحب کا رجحان روس کی طرف تھا۔ ہم نوجوان زیادہ تر اجمل خٹک کے قریب تھے۔ اجمل خٹک نے اپنے آپ کو سیاست اور ادب کے لیے وقف کر دیا تھا چنانچہ ہم زیادہ انہی کے پاس بیٹھتے تھے۔ بنگش صاحب چونکہ وکالت کے پیشے سے وابستہ تھے اس لیے ان کے پاس ہمارے لیے زیادہ وقت نہ تھا۔ اجمل خٹک کبھی کبھار یونیورسٹی اور کالج کے ہاسٹلوں میں بھی آجاتے، عمومی طور پر سیاسی فضا سرد تھی صرف نیشنل عوامی پارٹی (NAP) کارنر میٹنگز کیا کرتی تھی۔ اس کے برعکس اس زمانے میں مشاعروں اور

ادبی محافل کا دور دورہ تھا، بہت سے غیر شاعر اور ادیب بھی شاعر اور ادیب بن چکے تھے۔ ان شعراء میں محمد خان کاکا بھی تھے جن کے پاس فقط ایک ہی نظم تھی جو وہ ہر مشاعرے میں سناتے، اس زمانے کی ادبی اور سیاسی فضا میں ایک سے زائد فعال اور سرگرم مراکز تھے، جن کی تفصیل یوں ہے:

۱۔ محمد افضل خان بنگش کا بالا خانہ، جہاں زیادہ تر ادبی اور سیاسی پرندے جمع ہوتے۔ یہاں سیاسی اور ادبی مباحث ہوتے، شرکت کرنے والوں میں محمد افضل بنگش کے علاوہ اجمل خٹک، ارباب سکندر خان، عاصی ہشتنغرے، مہدی شاہ باچا، فدا محمد خان کاکا، مسلم شاہ، سیکرٹری فضل الرحمٰن، قمر الزمان قمر، زیارت گل لالہ، ستار لالہ، احمد علی، شکور لالہ، لطیف آفریدی، شراف الدین، خادم حسین مغل، میاں مظفر شاہ، عبداللہ جان ثانی اور تاجک صاحب شامل ہوتے۔ طلباء میں، میں، سلیم، مطیع اللہ ناشاد، نعیم شامل ہوتے، بعد میں قریش گل، ارباب نثار، صلاح الدین (مشر) عبدالنعیم، نثار شنواری اور شوکت سمیت کئی طلباء حاضری دیتے رہے۔

۲۔ بالا خانہ ارباب سکندر خان۔ ارباب صاحب نیپ کے اہم لیڈر تھے، اس بالا خانے میں خدائی خدمتگار اور خصوصاً جنوبی اضلاع کے نیپ والے زیادہ آتے، جب بنگش صاحب نیپ چھوڑ چکے، تب ہم نے اسے ہی اپنا مرکز بنا لیا اور ارباب صاحب نیپ کے صوبائی صدر منتخب ہوئے۔ اجمل خٹک بھی بنگش صاحب کا بالا خانہ چھوڑ کر یہاں منتقل ہو گئے۔

۳۔ نیپ کا ضلعی دفتر چوک یادگار میں تھا، فدا محمد درانی یہاں ہوتے، یہاں پشاور شہر کے پارٹی کارکن اور ہشتنگر کے پرانے خدائی خدمتگار آتے تھے۔

۴۔ نیپ کا ضلعی دفتر، جو چارسدہ روڈ پر واقع تھا وہاں مہدی شاہ باچا ڈیرہ ڈالے ہوئے تھے، یہاں پر بھی بعض ضلعی خدائی خدمتگار اور بعض ادبی شخصیات تشریف لاتیں۔

۵۔ دوست محمد خان کامل کا بالا خانہ ایک اور اہم مرکز تھا۔ یہاں بہت سی ادبی اور سیاسی شخصیات آتیں، میں بھی اکثر وہاں چلا جاتا۔ کامل صاحب قابلِ قدر اور قدردان شخصیت تھے، پشتو زبان و ادب کی تاریخ کامل صاحب کے تذکرے کے بغیر نامکمل سمجھی جائے گی۔ اس بالا خانے میں ادبی اور تنقیدی نشستیں بھی برپا ہوتی تھیں۔

۶۔ ارباب سیف الرحمان کا بالا خانہ بھی سیاسی اور کسی حد تک ادبی مرکز تھا۔ میں بھی کبھی کبھار

یہاں چلا آتا تھا، سیف الرحمان صاحب اسمبلی کے ممبر رہ چکے تھے، اس بالا خانے پر زیادہ تر ان کے تعلق دار آتے، عاصی ہشتنغرے یہاں ڈیرہ ڈالے ہوئے تھے۔

۷۔ خان بہادر خان بھی بالا خانے کے مالک تھے اور سیاست سے بھی دلچسپی رکھتے تھے، چنانچہ یہاں بھی بعض احباب آتے۔ بعد میں جب خان بہادر خان ضلعی صدر ہوئے تو یہ بالا خانہ ایک مرکز میں تبدیل ہوا۔

۸۔ بیرسٹر ظہور الحق صاحب کے بالا خانے میں نیپ کے پرانے لیڈر اور ترقی پسند اکبر جی بھی بیٹھتے اور اپنی پریکٹس کرتے تھے۔ ہم طالبِ علم سیکھنے کی غرض سے کبھی کبھی یہاں بھی حاضری دیتے تھے۔ اکبر جی صاحب اگرچہ زیادہ فعال نہ تھے تاہم ہم لوگ ان کی روشن فکری سے مستفید ہوتے رہتے۔

۹۔ نصر اللہ خان نصر صاحب کا دفتر جوان کے قتل کے بعد نصر اکیڈمی کا دفتر قرار پایا، ایک اہم مرکز تھا۔ یہاں زیادہ تر ادبی کام ہوتا تھا۔ ہمیش خلیل یہاں مستقل آتے تھے اور یہیں سے بہت سی ادبی خدمات سرانجام دیں۔

۱۰۔ خیبر میل اخبار کا دفتر صدر میں واقع تھا۔ خیبر میل اخبار کے ایڈیٹر نامور صحافی جناب عسکر علی شاہ (بعد میں کچھ عرصے کے لیے قلندر مومند صاحب بھی ایڈیٹر رہے) تھے۔ ان پر الزام تھا کہ انہوں نے پنڈی سازش کیس کے راز افشا کئے تھے، تاہم یہ فقط الزام تھا۔ عسکر علی شاہ صاحب بہت باخبر انسان تھے، انقلاب ثور کے فوری بعد آپ کابل آئے تھے، اس دورے میں وہ ایک دن میرے کمرے میں بھی مہمان رہے، اس ملاقات میں انہوں نے فرمایا تھا کہ صرف کابل پر قبضہ کرنے سے افغانستان فتح نہیں ہو جاتا، ان کی صرف اس ایک بات سے ان کے مطالعے اور تجربے کا اندازہ ہو سکتا تھا۔

۱۱۔ عبدالخالق خلیق مشہور خدائی خدمتگار تھے، ان کی دکان ان کا ڈیرہ تھا، ان کے دوست احباب یہیں آتے تھے، ادب اور سیاست پر گفتگو ہوتی تھی۔ خلیق صاحب انتہائی میٹھے اور نرم خو انسان تھے۔

۱۲۔ پشاور میں حکیم سنجری صاحب کا مطب بھی ایک اہم مرکز تھا۔ بعض اہم اصحاب یہاں جمع ہوتے۔

١٣۔ قصہ خوانی میں خادم حسین کے والد کی خشک میوہ جات کی دکان اور غلام محمد گاما (آپ ڈاکٹر خان صاحب کے ساتھ ریپبلکن پارٹی کے ساتھی تھے) کی بانسوں کی دکان بھی اہم مراکز تھے، ہم بھی کبھی کبھار جھانک آتے۔ پشاور صدر میں لالہ ایوب کا گرین ہوٹل بھی دوستوں کا مرکز تھا۔

١٤۔ جناب مصطفیٰ کمال کے والد ماسٹر خان گل خٹک (کرک) اپنی ذات میں انجمن تھے۔ اس زمانے میں قصہ خوانی کی پشت پر رہتے تھے 'منظور عام کتب خانہ' کے نام سے کتابوں کی فروخت اور چھپائی کا ادارہ چلاتے تھے۔ ماسٹر صاحب ایک فعال اور وسیع تعلقات والے آدمی تھے، اگرچہ آپ نیپ میں شامل نہ تھے تاہم ''ون یونٹ'' کے سخت مخالف تھے۔ بعد میں آپ نے اخبار ''بانگِ حرم'' خرید لیا اور کاروبار اور جگہ تبدیل کر لیا۔

١٥۔ یونیورسٹی بک ایجنسی قصہ خوانی بازار، ایک اور اہم مرکز تھا جہاں اہل علم وفکر جمع ہوتے تھے۔ یونیورسٹی بک ایجنسی کے مالک مولانا فضل منان صاحب ادیبوں اور سیاستدانوں سے وسیع تعلقات رکھتے تھے، اجمل خٹک کے ساتھ قریبی تعلق تھا۔ اجمل خٹک کی کتاب ''دَغیرت چغہ'' اسی ادارے نے شائع کی تھی اور جب اس کتاب پر پابندی لگی، تب بھی یہ ادارہ اسے چوری چھپے فروخت کرتا رہا۔ مولانا صاحب کے افغانستان میں بھی تعلقات تھے اور وہاں بھی کتب کی ترسیل کرتے تھے۔

١٦۔ قلندر مومند صاحب گویا اپنی ذات میں انجمن اور ادارہ تھے۔ دوسروں کے برعکس آپ کے گھر، واقع ہشتنگری (جی ٹی ایس اڈہ کے پشت پر) میں دوستوں، ادیبوں اور سیاستدانوں کی محافل جمتیں۔ قلندر صاحب ایک ہمہ جہت عالم، محقق، ادیب اور انتہائی خوددار انسان تھے۔ قلندر صاحب کے بھائی صاحبزادہ فیضی بھی اچھے شاعر تھے، مجھے یاد ہے کہ ہم بھی گاہے گاہے شریک ہوتے۔

١٧۔ ڈاکٹر شیر افضل نے جب کیمسٹ اینڈ ڈرگسٹ کا کاروبار شروع کیا تو جلد ہی یہ دوا خانہ اہم مرکز بن گیا۔ [۱] یہ دوا خانہ ہماری تعلیمی سلسلے کے بعد قائم ہوا کیونکہ اس زمانے تک سوئیکارنو چوک ابھی زیرِ تکمیل تھا۔

سیاسی فضا پر جبر مسلط ہونے کی وجہ سے مشاعرے زیادہ برپا ہوتے، جہاں شاعر حضرات اپنا

دل ہلکا کرتے، عبدالرحمٰن بابا اور خوشحال خان خٹک کی برسیوں کی مناسبت سے ہونے والے سالانہ مشاعرے شعراء اور سیاسی ورکروں کے لیے اہم فورم تھے، اس طرح صنوبر حسین کاکاجی کی یاد میں بھی بعض اچھے پروگرام منعقد ہوتے تھے۔ ان پروگراموں اور مشاعروں میں زیادہ تر دردمند صاحب، قلندر مومند صاحب، صاحبزادہ فیضی، عاصی ہشتنغرے۔ قمرزمان قمر، ایوب صابر، مطیع اللہ قریشی، فضل دین سیلاب، فضل اکبر سیلاب، زیارت گل، شاد محمد میگے، سیف الرحمان سلیم، امیر شاد، راحت سیال، امیر نواز جلیا، پیر گوہر، سعد اللہ جان برق، ہمیش خلیل، اور امیر حمزہ خان شنواری شرکت کرتے نظر آتے۔ سلیم راز ان دنوں کراچی میں تھے۔ علاوہ ازیں اسلامیہ کالج پشاور کے ریکریشن سنٹر میں بھی مشاعرے اور اجتماعات ہوتے، ان میں محمد اعظم اعظم، شفقت شہاب، مطیع اللہ قریشی، مطیع اللہ ناشاد اور پوردل خٹک وغیرہ شرکت فرماتے، میں بھی سامع کی حیثیت سے موجود ہوتا۔

پشتو مشاعروں کے علاوہ اردو مشاعرے بھی منعقد ہوتے، جن میں اردو کے مقامی شعراء شامل ہوتے تھے، مجھے اب زیادہ تر نام یاد نہیں رہے، ان میں مرزا محمود سرحدی یاد ہیں۔ ایک اور اردو کے شاعر تھے (اب نام یاد نہیں) جنھیں دیکھتے ہی ہم راستہ بدل لیتے کیونکہ وہ اپنا پورا کلام سرِراہ ایک ہی نشست میں سنانے کے عادی تھے۔ اس زمانے کی سب سے اہم عوامی سرگرمی 'جشن خیبر' کے سالانہ اردو شاعروں میں جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، دلاور فگار، قتیل شفائی، خاطر غزنوی، محسن احسان اور دیگر شعراء شریک ہوتے۔ فیض احمد فیض بالا خانے پر بھی آتے تھے اور ان کے ساتھ سیاسی وادبی نشست بھی ہوتی تھی۔

ہمارا اصل تعلق اجمل خٹک صاحب کے ساتھ تھا اس لیے عموماً چائے روٹی انہی کے ساتھ تھی۔ باہمی پیسہ (عموماً چند آنے) جمع کرتے، بازار دال گراں میں ایک سالن فروش تھے کبھی تو وہیں بیٹھ کر دال کھاتے اور کبھی دفتر لے آتے، کبھی دال، کبھی لوبیا بگھار کر کھاتے اور کبھی سادہ سا سالن۔ جب کبھی ہماری جیب میں قدرے زیادہ پیسے ہوتے تو مطیع اللہ ناشاد کے ساتھ ہشتنگری میں واقع چارسدہ اور سوات بس اڈہ کے ساتھ سواتی چاچا کے ہاں چاول کھاتے یا کبھی کبھی جہانگیر پورہ میں پیڑیوں پر بیٹھ کر تکے (بڑا گوشت) کھانے کی عیاشی بھی کر لیتے۔ ایک آدھ مرتبہ کامل صاحب اور ارباب صاحب کی معیت میں مشہور بخشی پل کباب کھانے کو بھی گئے۔ کامل صاحب

دمہ کے مریض تھے اس لیے کمزور گھوڑا یا گھوڑی والا تانگہ ڈھونڈتے تا کہ آہستہ آہستہ سفر ہو۔

۱۹۶۶ میں جب میں سال دوم کا طالبعلم تھا بٹلر ہاسٹل سے عثمانیہ ہاسٹل چلا گیا۔ عثمانیہ میں میاں منور گل کا رومیٹ بنا۔ اس زمانے پروفیسر عطا اللہ (کیمسٹری) عثمانیہ ہاسٹل کے وارڈن، قاسم خٹک (ڈیمانسٹریٹر) ڈپٹی وارڈن اور شیرین محمد (چارسدہ کے) ہاسٹل پراکٹر تھے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب پروفیسر غفران اللہ امریکہ سے واپس ہوئے تو نثار لالہ کی بجائے وہ ہمیں اکنامکس پڑھانے لگے۔ اسی زمانے میں سٹوڈنٹس یونین پر پابندی لگی اس وقت ٹرائبل ہاسٹل میں کوئٹہ کے تین طالبعلم تھے جن میں سے بشیر کا نام مجھے یاد ہے۔ ان کے ساتھ بھی گپ شپ بھی ہوتی۔ بشیر کے گھرانے کے ایم این اے ملک ولی خان کوکی خیل کے ساتھ دوستانہ مراسم تھے، کبھی وہ ہاسٹل آجاتے تو کبھی اپنے ہاں مدعو کرتے۔ ایک مرتبہ میں بھی ان کے ساتھ ولی خان کوکی خیل کو ہاسٹل میں دی گئی ایک ضیافت میں شریک ہوا تھا۔ اسی زمانے کی بات ہے کہ صلاح الدین (مشر) کے ساتھ تعلقات پیدا ہوئے۔ عبدالنعیم کے ساتھ میرا تعلق پہلے ہی سے تھا، صلاح الدین کی بدولت انکے دوسرے بھائیوں فیض الرحمان، عبدالسلام اور سلیم کے ساتھ متعارف ہوا، اور ان کے والد شیر افضل خان کے ساتھ میرے کافی گہرے تعلقات بن گئے، چنانچہ کبھی کبھی میں ان کے ہاں زیدہ چلا جاتا۔ اسی طرح یہ لوگ بھی میری طرف آتے رہتے تھے۔ صلاح الدین کے سب سے بڑے بھائی عبدالستار جو کوآپریٹو میں افسر تھے اور 'جی لالہ' کے نام سے مشہور تھے، ان کا گھر پشاور شہر میں مرچ منڈی کی پشت پر تھا ہم اکثر وہاں بھی جاتے۔ جن دنوں عبدالستار صاحب ایبٹ آباد میں تھے تب ایک مرتبہ ہم بھی انکے ہاں ایبٹ آباد گئے تھے۔ صلاح الدین اگر چہ ترقی پسند تھے لیکن غلام احمد پرویز کے افکار سے متاثر تھے۔ طلوع اسلام کا باقاعدہ مطالعہ کرتے اور میرے ساتھ بحث مباحثہ کرتے۔ عبدالنعیم میری معرفت سے نازش سے مل کر ایک فعال ترقی پسند بنا۔

عبدالطیف آفریدی کے ساتھ بھی اسی زمانے میں متعارف ہوا۔ عبداللطیف آفریدی اس وقت ایم اے اکنامکس کے طالبعلم تھے، ہاسٹل ون یا ہاسٹل ٹو میں رہائش پزیر تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان کے ہاسٹل میں الوداعی پارٹی تھی۔ انگلش ڈپارٹمنٹ کے چیرمین ڈاکٹر مظہر علی خان صاحب مہمان خصوصی تھے، یہیں میں عبداللطیف کے ساتھ متعارف ہوا۔ عبداللطیف آفریدی ترقی پسند تھے اور طلباء میں اچھا خاصا اثر رسوخ رکھتے تھے۔ سید مختار باچا اس زمانے میں باٹنی

ڈپارٹمنٹ کے طالبعلم تھے۔ مختار باچا اور ان کے والد، اجمل خٹک کے ساتھ تعلق تو رکھتے تھے لیکن بہت ہی محتاط تھے۔ ایک مرتبہ ہاسٹل میں جب میں نے مختار باچا کو آواز دے کر بتایا کہ اجمل خٹک صاحب بلا رہے ہیں، تو مختار باچا نے فوراً منہ پر ہاتھ رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ مختار باچا کا محتاط رویہ آخر تک ان کا شعار رہا۔

شاید اگست ۱۹۶۶ء کی بات ہے کہ پروفیسر غفران اللہ کی معیت میں ہم طلباء تعلیمی ٹور پر کراچی گئے۔ اس ٹور میں ۱۲ ساتھی تھے، جن کے نام اور صورتیں زیادہ یاد نہیں، البتہ ایاز گل (بدرگہ) یاد ہے، جو ہمارے گروپ لیڈر تھے۔ کراچی صدر ریلوے سٹیشن پر ذوالفقار علی بھٹو سے ملاقات ہوئی۔ ہم نے انہیں گھیر لیا اور سوالات کرنے لگے، وہ غالباً لاڑکانہ جانے والے تھے۔ بھٹو صاحب نے کہا کہ میں جلد پشاور آؤں گا اور اپ لوگوں سے ملاقات کرونگا۔ بھٹو صاحب کو ایوب خان نے جون ۱۹۶۶ء میں اپنی کابینہ سے برطرف کر دیا تھا۔ ان دنوں بھٹو کافی سرگرم تھے۔ کچھ عرصے بعد یعنی 30 نومبر 1967ء کو انہوں نے پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی۔ اس ٹور میں ہم لوگ انٹرنیشنل ہوٹل کراچی صدر میں رہائش پذیر رہے۔ کراچی پورٹ ٹرسٹ کی جانب سے مہیا کردہ جہاز میں سمندر کی سیر کی۔ منوڑہ بھی گئے۔ ایچ۔ ایم سیلک (H.M.Silk) اور ولیکا کے کارخانوں کی سیر کی اور ان کے مہمان بنے۔ کمشنر کراچی دربار علی شاہ سے ملے اور ان کے ساتھ چائے پی۔ کراچی یونیورسٹی گئے اور ادارہ ''MBA'' کا دورہ بھی کیا۔ مجموعی طور پر یہ ٹور انتہائی معلوماتی رہا۔

تھرڈ ائیر (سال سوم) میں پروفیسر جلال الدین خلجی اور پروفیسر کلوز ہمارے انگریزی کے استاد تھے۔ جبکہ سال چہارم میں محمود احمد شمسی صاحب ہمیں انگریزی پڑھاتے تھے۔ اکنامکس دونوں سال پروفیسر غفران اللہ سے پڑھتے رہے، جنرل سائنس کیمسٹری کے پروفیسر صاحب گل پڑھاتے تھے، جبکہ جہانزیب نیاز صاحب پشتو پڑھاتے تھے۔ غنی خان صاحب جہانزیب نیاز کے پسندیدہ شاعر تھے، ان کا تقریباً تمام کلام انہیں حفظ تھا۔ اسی دور میں مانیری بالا کے احمد حسین ائیر فورس میں بحیثیت کارپورل یعنی کاپل ٹیک (Corporal Tech) پشاور کینٹ میں تعینات تھے۔ میں اور صابر کاکا اکثر ان کے پاس جاتے تھے، وہ انتہائی شریف انسان تھے۔ اگر چہ احمد حسین صابر کاکا کے رشتہ دار تھے لیکن مجھ سے بھی محبت سے پیش آتے۔ احمد حسین صاحب بھی کبھی کبھار ہماری طرف آتے اور خیر خبر لیتے۔ اس زمانے کا اہم واقعہ پاکستان میں روس اور چین سے کمیونسٹ

لٹریچر کی آزادانہ آمد ہے۔ افضل بنگش نے اجمل خٹک کی معیت میں اندر شہر (صرافہ بازار) کے سرے پر مکتبہ افکارِ نو کے نام سے کتابوں کی دوکان کھولی۔ یہ دوکان یا سٹال لکڑی سے بنا عارضی کیبن تھا اور ان کا مقصد یہی تھا کہ ترقی پسند نظریات کی نشر و ترویج ہو۔ انھوں نے محمد خان کاکا کو یہاں بٹھایا۔ یہ مکتبہ افکارِ نو جلد ہی صوبے کی ترقی پسند سیاست کا مرکز بن گیا۔ ہم نوجوان ساتھی یہاں بھی حاضری دیتے، میں نے تو صوابی میں مکتبہء افکارِ نو کی شاخ بھی کھول رکھی تھی۔ دراصل حبل الورید (فرزند صالحین کاکا) نے صوابی اڈہ میں سگریٹ نسوار کی فروخت کے لیے کیبن کھول رکھا تھا۔ اسی کھوکھے پر میں نے افکارِ نو سے بڑی تعداد میں ترقی پسند لٹریچر لا کر رکھ دیا۔

یوں یہ اور ''مرض'' صوابی میں بھی پھیلتا گیا۔ اس دوران ایک جمعہ کو قاضی عصمت اللہ (طاوس خانی) نے فتویٰ دے دیا کہ اس دکان پر کفریہ کتابیں فروخت ہو رہی ہیں۔ قاضی عصمت اللہ صاحب انگریز دور میں تحصیل انتظامیہ میں رسمی قاضی تھے۔ حبل الورید نے فوری طور پر مجھے صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ میں قاضی صاحب کی عادات سے واقف تھا چنانچہ میں نے اس سے کہا کہ قرآن مجید کے چند نسخے لے جا کر دکان میں رکھ دو اور قاضی صاحب کو چائے کی دعوت بھی دو۔ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ چنانچہ اگلے جمعہ کے دن انھوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مجھے غلط اطلاع دی گئی تھی۔ یوں کفر کا فتویٰ واپس ہوا۔ چین اور روس کے باہمی اختلافات نے پاکستان کے ترقی پسندوں پر منفی اثر ڈالنا شروع کیا تھا، اگرچہ بعض بزرگوں اور ساتھیوں کا کہنا تھا کہ ہمیں ان معاملات میں نہیں پڑنا چاہیے اور دونوں نظریاتی ممالک کے اختلافات کا اثر یہاں نہیں ہونا چاہیے، لیکن حقیقت میں یہ اثرات بہت گہرے تھے۔ یہاں بھی ترقی پسندوں کے مابین واضح گروپ بندی نظر آنے لگی تھی۔ مولانا عبدالحمید بھاشانی جو اس وقت نیپ (NAP) کے صدر تھے اور صدارتی الیکشن میں ایوب خان کے خلاف فاطمہ جناح کو سامنے لانے والوں میں سے تھے، انتخابات میں وہ پارٹی فیصلے کے برخلاف ایوب خان کی حمایت کرنے لگے۔ جب ان سے استفسار ہوا تو کہنے لگے کہ دورہ چین میں چواین لائی (وزیر اعظم چین) نے ان سے ایوب خان کی حمایت کے لیے کہا تھا۔ یوں نیپ عملاً دو حصوں میں منقسم ہو گئی تھی۔ نیپ کا سربراہ صدر ایوب خان کے ساتھ تھے، پارٹی کے دوسرے عہدہ دار اور ورکرز بھی تقسیم ہو گئے۔ آدھی پارٹی ایوب خان کی ہم نوا اور آدھی پارٹی فاطمہ جناح کی طرف دار تھی۔ مغربی پاکستان (موجودہ پاکستان) میں

میجر اسحٰق، سی آر اسلم، سردار شوکت، چودھری فتح محمد، انیس ہاشمی، طفیل عباس، مرزا ابراہیم، کنیز فاطمہ اور کئی دوسرے 'چینی' راستے پر گامزن تھے۔

خود ہمارے صوبے میں افضل بنگش، شیر علی باچا، شکور لالہ، زیارت گل اور لطیف آفریدی وغیرہ خفیہ طور پر ان کے ساتھ تھے۔ تاہم افضل بنگش جانتے تھے کہ نیپ سے علیحدگی ان کے لیے نقصان دہ ہوگی، اس لیے افضل بنگش اگرچہ اعلانیہ طور پر ولی نیپ کے ساتھ تھے، جبکہ نیپ کے ساتھ ساتھ افضل بنگش نے ہشتنگر اور مردان کے کسانوں کو (کسان کمیٹی) کے بینر تلے جمع کیا تھا۔ اس گومگو کی صورتحال میں پاکستان کے ترقی پسندوں میں اپنے موقف کے لیے زیادہ سے زیادہ طرف دار تیار کرنے کی مقابلہ بازی جاری تھی۔ چنانچہ اس مقصد کے تحت سی آر اسلم بھی پشاور آئے۔ میاں شاہین شاہ نے اس زمانے میں (کسان جرگہ) کے نام سے لیڈی ریڈنگ ہسپتال کی چڑھائی اور ڈھکی نعلبندی کے شمالی جانب دفتر قائم کیا تھا۔ سی آر اسلم نے یہیں پر میٹنگ بلوائی تھی، ان کی خواہش اور کوشش تھی کہ اجمل خٹک ان کا ساتھ دیں۔ میں بھی ان میٹنگز میں شامل ہوا کرتا تھا۔ دوسری طرف ماؤ نوازوں میں بھی ایسے ہی رجحانات پائے جاتے تھے۔ گویا پورے ملک میں ترقی پسند تقسیم در تقسیم ہوتے جا رہے تھے۔ آخر کار روس نواز ترقی پسندوں کی کوشش کے نتیجے میں نیپ کے بھاشانی مخالف فریق نے اعلانیہ اپنی راہیں جدا کیں۔ ترقی پسندوں اور دیگر جمہوریت پسندوں اور قوم پرستوں نے مل کر 1968ء میں رائل ہوٹل پشاور میں نیشنل عوامی پارٹی کے کنونشن کا انعقاد کیا۔ بنگالی کمیونسٹوں کے پرزور اصرار پر عبدالولی خان اس پارٹی کے صدر بنا دیے گئے۔ محمود الحق عثمانی جنرل سیکرٹری، محمود علی قصوری مغربی پاکستان اور مظفر الدین احمد مشرقی پاکستان کے صدور قرار پائے۔ اب ایک نئی صورت حال درپیش ہوئی، نیپ عملاً دو حصوں میں تقسیم ہوئی، ایک حصہ چین نواز نیپ (بھاشانی نیپ) اور دوسرا حصہ روس نواز نیپ (ولی نیپ) کہلانے لگا۔ اسی طرح جب مردان میں ولی نیپ کا اجلاس منعقد ہوا تو افضل بنگش سے واضح طور پر کہا گیا کہ نیپ اور کسان کمیٹی میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لیجیے۔ کیوں کہ پارٹی آئین کے تحت ایک فرد بیک وقت دو سیاسی تنظیموں کا رکن نہیں رہ سکتا تھا۔ افضل بنگش اپنی پوزیشن سے اچھی طرح واقف تھے، چنانچہ انھوں نے ''کسان کمیٹی'' کا انتخاب کیا، یوں ان کی راہیں نیپ سے جدا ہو گئیں یا یہ کہ نیپ سے ان کا اخراج ہوا۔

بیسویں صدی کی چھٹی دھائی میں دنیا بھر میں 'ریڈیکل' (انقلابی) نظریات کا چرچا تھا۔ پاکستان کے سیاسی منظرنامے اور نظریاتی سیاست میں اس کے اثرات پوری طرح محسوس کیے گئے تھے۔ میں بھی دوسروں کی طرح اس نظریاتی لہر سے متاثر ہوا۔ ہم کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر اپنے نظریات کے ساتھ فعال تھے۔ پابندی کے باوجود کمیونسٹ لٹریچر، ہینڈ بلز اور دیگر ترقی پسندانہ تبلیغی مواد سائیکلوسٹائل کر کے یا چھاپ کر رات کے اندھیرے میں طلباء کے کمروں میں پہنچا دیتے۔ مجھے یاد ہے کہ اس زمانے میں کوئٹہ سے تعلق رکھنے والے بعض پشتون طلبا کو پنجاب یونیورسٹی سے خارج (Rusticate) کر دیا گیا، اس کی وجہ یہ تھی ان طلبا کا دیگر طلبا (غالباً اسلامی جمعیت طلبہ) کے ساتھ جھگڑا ہوا تھا۔ اس واقعہ نے ہمیں زیادہ مشتعل اور متحرک کر دیا، ہم نے بڑی تعداد میں ہینڈ بل اور پمفلٹ تقسیم کیے۔ اس صورتحال سے پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر انتہائی پریشان ہوئے تھے اور شاید انھوں نے پنجاب یونیورسٹی کے اخراج شدہ طلبا اور پشاور یونیورسٹی میں طلبا کے ردعمل کے حوالے سے متعلقہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے ٹیلی فونک بات کی تھی، بہر حال اخراج شدہ طلباء کو بحال کر دیا گیا۔

یہاں ''سرن زیب خان'' کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا۔ سرن زیب خان ضلع شانگلہ کے ہیڈ کوارٹر 'الپوری' کے قریب گاؤں ''لیلونی'' سے تعلق رکھتے تھے۔ والئ سوات کی مخالفت کی وجہ سے ریاست بدر کیے گئے تھے اور پشاور میں اجمل خٹک کے ساتھ رہتے تھے۔ سرن زیب کی کوشش سے ''نیپ'' نے والئ سوات کی مخالفت میں بھرپور تحریک چلائی تھی۔ سرن زیب متواتر سوات ہینڈ بل بھجواتے اور مختلف افراد کو خطوط لکھتے۔ علاوہ ازیں اخبارات میں والئ سوات کے خلاف اخباری بیانات بھی چھپتے رہے۔ نیپ کا مطالبہ تھا کہ ون یونٹ کے خاتمے کے ساتھ ہی ریاست سوات کو صوبہ سرحد میں ضم کیا جائے تاکہ پشتون قومی ہم آہنگی میں مزید وسعت آئے۔ اگرچہ میری ذاتی رائے ہے کہ نیپ کو سوات جیسی روشن فکر ریاست کے ادغام کی بجائے قبائلی ایجنسیوں کو صوبے میں ادغام پر زیادہ زور دینا چاہیے تھا۔ بہر حال اس گناہ میں، میں بھی ایک طرح سے شریک تھا کہ میں نے بھی سائکلوسٹائل مواد کی تیاری میں حصہ لیا تھا۔ کبھی کبھار ہم ہاتھ سے بھی پروپیگنڈا خطوط لکھا کرتے تھے۔

اولین ''کابل'' یاترا

پہلی مرتبہ ۱۹۶۷ء میں کابل جانے کا پروگرام بنا۔ افغانستان کے بجائے ''کابل'' اس لیے کہنا پڑ رہا ہے کہ کابل افغانستان کے دارالحکومت کے ساتھ ساتھ پورے ملک کی ایک جاذب تصویر تھی۔ کابل جانے سے پیشتر ہی کابل کے ساتھ ایک طرح کا تعلق پیدا ہو چکا تھا۔ یہ تو یاد نہیں کہ اس وقت افغان قونصلیٹ میں قونصل جنرل کون تھا، تاہم ان دنوں عبدالغفار فراہی قونصلیٹ میں سیکرٹری تھے، جن کا تعلق افغانستان کے صوبے 'فراہ' سے تھا۔ فراہی صاحب افضل بنگش کے قریبی دوست تھے اور اکثر افضل بنگش کے بالا خانہ پر آتے ہم لوگ بھی گپ شپ میں شریک رہتے۔ جب شاہ محمد دوست قونصلر جنرل بن کر آئے تو میں نے افغان ویزہ کے لیے درخواست دی۔ غالباً ۱۹۶۷ء کی گرمیوں کی چھٹیوں کا زمانہ تھا کہ مجھے ویزہ دیا گیا۔ اس سے پہلے ارباب سکندر خان خلیل کی سفارش پر (سی آئی ڈی) کے ایک ڈی ایس پی کی توسط سے ریڈ پاس مل گیا۔ ریڈ پاس کا حصول فقط افغانستان کے لیے مشروط تھا اور یہ سلسلہ انگریزی کے دور سے چلا آ رہا تھا۔ روانگی سے قبل اجمل خٹک نے مجھے کئی ایک خطوط دیے جن میں زیادہ تر ''پرچم'' کے اکابرین کے نام تھے۔

اس زمانے جی ٹی ایس (گورنمنٹ ٹرانسپورٹ سروس) کی ایک بس روزانہ کی بنیاد پر کابل چلتی تھی، اس طرح دوسری طرف سے ایک افغانی بس (افغان پوست) بھی چلتی، میں جی ٹی ایس کے ذریعے کابل پہنچا، میرے پاس ڈھائی سو روپے کی رقم تھی اور یہ اس وقت اچھی خاصی رقم تھی، میں کابل میں یکسر اجنبی تھا۔ بہر حال پل باغ عمومی میں تیمور شاہ کے مقبرے کے قریب تیمور شاہی سنیما کی پشت پر دریائے کابل کے سامنے ایک ہوٹل میں ٹھہرا۔ اگلے دن میں پروفیسر محمد اللہ کے پاس شہر نو میں ان کے فلیٹ میں منتقل ہوا۔ محمد اللہ صاحب تو لاندی گاؤں سے تعلق رکھتے تھے اور ایک عرصہ تک پشاور یونیورسٹی کے ایگریکلچر کالج میں پروفیسر رہے تھے۔ پروفیسر صاحب میرے اور اصلاح الدین کے دوست تھے۔ ان کا فلیٹ پاکستانی سفارت خانے کے قریب محمد زئیوں کے ایک فلیٹ میں تھا۔ اس فلیٹ کے سامنے کاروان ہوٹل تھا جہاں ہم کھانا کھاتے اور چائے پیتے۔ محمد اللہ صاحب ان دنوں سوئٹزر لینڈ کی کمپنی ''سیبا'' افغانستان میں ڈائریکٹر تھے۔ یہیں سے میں نے ڈاکٹر نجیب اللہ (سابق افغان صدر) کو اپنے کابل آنے کی خبر دی۔ ڈاکٹر نجیب اپنے بہنوئی

(بہن کے شوہر) نیک محمد خان کے ہمراہ، اس کی موٹر میں آئے اور اپنی فوکس ویگن موٹر میں اپنے گھر لے آئے۔ ڈاکٹر نجیب کے خاندان کا مکان کابل کے علاقے (کارتہ ء پروان) میں آسمائی پہاڑی کی پشت پر تھا۔ ان سے کچھ آگے پہاڑی کے ساتھ سلیمان لائق کا گھر تھا۔ اجمل خٹک نے اپنی کتاب ''دغیرت چغہ'' اور بعض دیگر نظمیں دی تھی، جو میں نے نجیب کے حوالے کر دیں اور انھوں نے یہ سلیمان لائق کو دے دیں۔ کابل مجھے دیدہ زیب لگا، پشاور اس زمانے میں ایک چھوٹا سا شہر تھا اور کچھ زیادہ ترقی نہیں کی تھی اور زندگی بھی پرانے ڈگر پر تھی۔ کابل میں خواتین پوری طرح آزاد دکھائی دیں، خصوصاً کابل کے علاقے شہرنو کا رنگ ڈھنگ نرالا تھا۔ میں نے دیکھا کہ یورپ اور امریکہ کے ہپّی لوگ (HIPPIES) کثیر تعداد میں افغانستان خصوصاً کابل آرہے تھے۔ رنگ برنگے لباسوں میں ملبوس بے ترتیب بالوں، گند میں اٹے اور نشے میں دھت یہ جوان ہپی لوگ کابل کے ہوٹلوں، سڑکوں، بازاروں اور گلیوں میں نظر آتے۔ خاص کر شام کے وقت تو انکی وجہ سے چرس کی بو ہر سمت پھیل جاتی۔ ہپیوں کی اس باغی اور آزاد نسل کے لیے ''کابل'' جائے امان تھا، کیونکہ اس زمانے میں کابل شاید دنیا کا سستا ترین اور امن پسند شہر تھا۔ تب مجھے معلوم نہ تھا کہ کابل افغانستان کی اصل تصویر نہیں، بلکہ کابل تو افغانستان میں فقط ایک جزیرہ ہی تھا، الگ تھلگ، سارے افغانستان سے الگ تھلگ!

1965ء کی پاک بھارت جنگ کی وجہ سے پاکستان میں ہندوستانی فلموں کی نمائش بند کر دی گئی تھی۔ دراصل خود پاکستانی فلموں کا معیار بھی پست ہونے لگا تھا، اگرچہ ٹیپ ریکارڈر پاکستان میں متعارف ہو چکا تھا لیکن (VCR) ابھی مارکیٹ میں نہیں آیا تھا۔ ہندوستانی فلموں کے شوقین گروہ در گروہ سندھ اور پنجاب کے شہروں خصوصاً کراچی اور لاہور سے عازم کابل تھے۔ کبھی کبھی تو پاکستان سے آنے والے فلم بینوں کا گروپ اتنا بڑا ہوتا کہ پورا سینما بک کروالیتا۔ موسم گرما میں تو گہما گہمی کچھ زیادہ ہی ہوتی اور پل باغ عمومی کا جمیل ہوٹل اہل پنجاب اور کراچی والوں سے بھرا رہتا۔

ڈاکٹر نجیب اللہ نے پرچم کے تمام اکابرین سے مجھے متعارف کروایا۔ ان دنوں پرچم کا مرکزی دفتر کابل میونسپلٹی کے دفتر کے سامنے تھا۔ باچا خان دارالامان والی سڑک پر دارالامان کے قریب رہائش پذیر تھے۔ میں کئی مرتبہ یہاں باچا خان (عبدالغفار خان) سے ملا۔ ایک ملاقات میں باچا خان کی کہی ہوئی ایک بات مجھے اب بھی شدت سے یاد ہے کہ جب میرے ساتھ

حاجی نادر خان کے کزن اور میرے دوست ''دوستے'' (بعد میں دوست محمد خاصہ دار فورس کے میجر رہے) بھی تھے، میرے ایک سوال کے جواب میں باچا خان نے مجھے مخاطب ہو کر کہا ''تمھارے دماغ میں تشدد ہے تشدد!''۔ اس وقت نہ باچا خان جانتے تھے اور نہ ہی ہمارے وہم و گمان میں تھا کہ اگلے برسوں میں اسی باچا خان کے صاحبزادے عبدالولی خان کے حکم پر ہم تشدد برپا کرنے کی خاطر اس افغانستان میں جلاوطنی اختیار کر لیں گے۔ اس اولین سفر میں میری پرچم کے اہم لیڈروں ببرک کارمل، استاد میر اکبر خیبر، سلیمان لائق، نور احمد نور اور ڈاکٹر اناہیتا کے علاوہ پرچم کے بعض دیگر اہم اور فعال افراد سے ملاقاتیں ہوئیں۔ صداقت صاحب، حاجی نادر خان، نیک محمد، اختر محمد خان (نجیب اللہ کے والد) صدیق (نجیب اللہ کے بھائی) اور کئی ایک دیگر سے ملاقاتیں رہیں۔ رشید وزیری سے بھی متعارف ہوا، جو ان دنوں کابل میڈیکل کالج میں زیر تعلیم تھے، وہ اپنے دیگر کئی وزیر دوستوں کے ہمراہ کابل کے علاقے دہمزنگ میں ایک بالا خانے میں رہتے تھے۔[۲] دہمزنگ کی پشت پر ڈاکٹر عبدالحق (حاجی نادر خان کے کزن) اور وزیرستان کے ڈاکٹر غلام ایک مکان میں رہتے تھے، ان سے بھی ملاقات ہوئی۔ یہ لوگ بھی طب کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ کابل کے قبائل مہمان خانے میں قبائل جنھیں 'پختونستانی' کہا جاتا تھا، سے ملنے گیا۔ یہاں کوثر صاحب کے علاوہ پشتونستان کے کئی حامیوں سے ملاقات ہوئی۔ جشن کابل میں بھی شریک ہوا۔ ڈاکٹر نجیب اللہ کے گھر ان کی مہمان نوازی سے مستفید ہوا اور ان کے تمام خاندان والوں سے آشنائی ہوئی۔ نجیب اللہ ان دنوں یونیورسٹی میں پرچم کے سٹوڈنٹ لیڈر تھے، کابل میڈیکل کالج میں نیا نیا داخلہ لیا تھا۔ مجید سربلند اور عبدالوکیل سے میں تب متعارف ہوا تھا، جب یہ دونوں براستہ پشاور دہلی جا رہے تھے، ان سے میری ملاقات اجمل خٹک کے حکم پر پشاور میں ہوئی تھی۔ جب یہ دونوں تعلیم کے حصول کے لیے براستہ پاکستان، ہندوستان جا رہے تھے تاکہ ان کی خدمت مدارات ہو۔ 'نیلاب یا اباسین ہوٹل' میں ٹھہرے تھے اور بنگش صاحب کے بالا خانے گپ شپ کے لیے آتے تھے۔ ان دونوں سے بھی کابل میں ملاقات ہوئی۔

پشتو زبان و ادب کے لکھاری، سماجی اور سیاسی شخصیت قیام الدین خادم اس زمانے میں سینیٹر تھے۔ قیام الدین سے میں اس سے پہلے پشاور میں مل چکا تھا۔ ان سے میں نے ایک مرتبہ افضل بنگش کے بالا خانے میں پوچھا تھا کہ آیا ظاہر شاہ کو پشتو آتی ہے؟ تو خادم نے بڑے مبتذل

انداز میں کہا کہ ”داشے می ورزی“ (اُسے یہ آتی ہے) اور یہ کہتے ہوئے اشارہ اپنے عضوِ تناسل کی طرف تھا۔ اس وقت مجھے بڑا عجیب لگا تھا کہ ایک سوٹڈ بوٹڈ نکٹائی والا افغان اتنا پست جواب دے گا۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ تو ان کی عادت ہی ہے۔“

دوسری مرتبہ کابل جانے کا موقع ۱۹۶۹ء کے موسم گرما میں ملا۔ اس مرتبہ میں ڈاکٹر نجیب اللہ کا مہمان تھا۔ میں اپنے ساتھ بڑی تعداد میں ترقی پسند اور کمیونسٹ لٹریچر پشاور سے لے کر گیا تھا۔ اس سفر میں بھی نہ صرف میں پرچم کے اہم لوگوں سے ملا بلکہ ان کے مجالس میں بھی شرکت کی۔ پرچم کے دفتر سے میں پرچم کی طرف سے شائع کردہ مواد پشاور لایا اور دوستوں میں بھی تقسیم کیا تھا۔ اس دورے کی اہم بات یہ ہے کہ اس دورے میں، میں ڈاکٹر نجیب کو انگریزی اور اردو پڑھاتا رہا تاکہ سیاست کے ساتھ ساتھ وہ پاکستان میں مروج ان زبانوں سے بھی واقف ہو۔ اُس وقت پاکستان میں جنرل یحییٰ خان کی حکومت تھی۔

☆☆☆

1968ء میں پاکستان کی سیاسی فضا تیزی سے بدل رہی تھی۔ عوامی لیگ کامیابی کے ساتھ مشرقی پاکستان کے بنگالیوں کی محرومی کا واویلا کر رہی تھی۔ شیخ مجیب الرحمان نے جمہوریت کے حق میں، حکمران طبقے کے مشرقی پاکستان کی برابری (Parity) اور مرکز پرست سیاست کے خلاف اپنا چھ نکاتی ایجنڈا شد و مد کے ساتھ پیش کیا تھا۔ مجیب الرحمان کو مارشل لاء حکومت نے ”اگرتلہ سازش کیس“ میں بند کیا تھا۔ مجیب اس وقت بنگالیوں کے سب سے اہم لیڈر بن چکے تھے، بنگالی پاکستان کے حکمران طبقے کے خلاف اُٹھ کھڑے تھے۔ بالغ رائے دہی اور پارلیمانی نظام کے لیے حالات سازگار ہوتے چلے جا رہے تھے۔ عبدالولی خان نے نیپ کے صدر بننے کے فوری بعد مشرقی پاکستان کا کامیاب دورہ کیا۔ وہاں وہ بنگالیوں سے ہمدردی کے ساتھ ساتھ پشتون بلوچ اور سندھیوں کے قومی اور صوبائی حقوق کے لیے ان سے ہم آواز ہو گئے۔ ایوب خان نے ذوالفقار علی بھٹو کو اپنی کابینہ سے برطرف کر دیا تھا، انہوں نے نومبر 1967ء میں پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھ دی تھی۔ مزدور کسان اور محروم طبقات کے احساسات کے ساتھ ساتھ پنجابی بھارت دشمن شاؤنسٹ جذبات کی نمائندگی کا جھنڈا بلند کر دیا تھا۔ نیپ اپنے طور پر فعال تھی۔ دوسری طرف بلوچستان میں بلوچ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن (BSO) کے بننے اور بلوچستان کے پشتون طلباء نے

بسم اللہ کاکڑ اور دیگر کی قیادت میں پشتون سٹوڈنٹس فیڈریشن کی بنیاد ڈالنے کی تگ و دو شروع کی تھی۔

اس دور میں ہمارے صوبے کا سب سے اہم مطالبہ ”ون یونٹ“ کے خاتمے کا تھا، اگرچہ اس مطالبے میں سندھ بلوچستان اور بنگال بھی شامل تھے لیکن یہ مطالبہ پہلی مرتبہ پورے زور شور سے یہاں سے بلند ہوا۔ کابل میں ہر سال پشتونستان کا دن منایا جاتا تھا، جشنِ کابل کے موقع پر باچا خان اپنی تقریر میں ون یونٹ کے خاتمے اور پانچ مساوی بھائیوں یعنی صوبوں کے پاکستان کے قیام پر زور دیا کرتے تھے۔ باچا خان نے کبھی بھی ڈیورنڈ لائن کے خاتمے اور متحدہ پشتون ریاست کی بات نہیں کی۔ پاکستان میں پشتون سرزمین پر فقط ایک یونیورسٹی (جامعہ پشاور) تھی جو ون یونٹ کی بنا پر مرکزی حکومت سے ملنے والی گرانٹ میں کمی کی وجہ سے مالی مشکلات سے دوچار ہوتی تھی۔ ہمارے تمام تر تعلیم یافتہ پیشہ ور حضرات (پرفیسرز، ڈاکٹرز، انجینئرز وغیرہ) اور نوکر شاہی (بیوروکریسی) میں شامل لوگ لاہور کے ماتحت ہو گئے تھے، اور بڑی مشکل سے اپنے مسائل حل کروا رہے تھے۔ اس فضاء میں ہم نے پختون سٹوڈنٹس فیڈریشن کی بنیاد رکھی اور اس کے پلیٹ فارم سے ون یونٹ کے خاتمے کا مطالبہ کرتے رہے۔ ہمارے مطالبات بظاہر غیر سیاسی معلوم ہوتے تھے، کیونکہ ہم اپنے تعلیمی مسائل حل کرنے کے لیے ون یونٹ کے خاتمے کو ضروری قرار دے رہے تھے اور کوشش کرتے رہے کہ زیادہ سے زیادہ طلبہ اس چھتری تلے جمع ہوں۔ اس وقت عبدالسبحان خان، شمشیر جنگ اور امیر شاد ہمارے ساتھی بن گئے۔ تاہم بعد میں عبدالسبحان خان عبدالقیوم سے جا ملے اور ”غازی پشتون“ کا ڈول ڈالا۔ امیر شاد بھی ساتھ مل گیا جبکہ شمشیر جنگ کونسل مسلم لیگ کے حضرت علی کے زیر اثر ہوتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد ہم نے انور کمال مروت کو پشتون سٹوڈنٹس فیڈریشن کا صدر بنا دیا، جن کے والد (حبیب اللہ) ایوب خان کی کابینہ میں وزیر داخلہ ہوتے تھے۔ دیگر لیڈران میں عبدالسبحان اور نثار شنواری شامل تھے۔ پشاور یونیورسٹی کی سطح پر ”PSF“ کے صدر چارسدہ کے قاسم جان مقرر ہوئے. اگرچہ بظاہر ہمارا نعرہ یہ تھا کہ ہمارا کسی بھی جماعت یا گروہ سے تعلق نہیں ہے لیکن اصلاً اجمل خٹک اور نیپ سے ہمارا راز و نیاز جاری رہتا تھا اور نزدیک کا تعلق قائم و موجود تھا۔

اسی زمانے کے ایک اور طالبعلم کا تذکرہ بھی ضروری ہے جسکی وجہ سے پشاور شہر کی سیاست میں ایک نیا عنصر پروان چڑھا۔ غلام احمد بلور کے چھوٹے بھائی عزیز بلور ان دنوں ایڈورڈز کالج کے

طالبعلم تھے، ہم نے انہیں ایڈورڈز کالج کے لیے "PSF" کا صدر بنا دیا۔ بلور برادران کی اس زمانے میں بازار داالگراں میں پرچون کی دکان تھی، جبکہ نشتر آباد میں رہائش تھی۔ عزیز بلور کی وجہ سے اجمل خٹک اور نیپ کے دیگر ارکان کا بلور برادارن سے تعلق بڑھا۔ عزیز بلور تعلیم سے فراغت کے بعد امتحان دیکر CSP بن گئے، تاہم ان کا پورا خاندان NAP، NDP اور ANP کے توسط سے پشاور کی سیاست کا اہم کھلاڑی بن گیا۔ سیاست ہی کی وجہ سے ان کی مالی اور اقتصادی حالت کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے۔

اس زمانے میں میری ڈیوٹی یہ تھی کہ پسِ پشت رہ کر کام کروں۔ اس پورے عرصے میں نیپ سے احکامات لینا اور یونیورسٹی ٹریثرر ڈاکٹر نذیر سے اعداد و شمار جمع کرنا اور انہیں نشر کرنا میرے ذمہ تھا۔ اور انہی خطوط پر یونیورسٹی کی تنظیم بھی اپنی تبلیغ کرتی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس دور میں پشاور یونیورسٹی کی سالانہ گرانٹ اڑتالیس لاکھ روپے تھی، جبکہ اس کے مقابلے میں اورینٹل کالج لاہور کو حکومت کی طرف سے باون لاکھ روپے ملتے تھے۔ یہ ظلم اور ناانصافی کی فقط ایک مثال تھی۔ دوسری طرف ایوب حکومت کے ایجنٹ بھی سرگرم عمل تھے۔ یہ لوگ مسلسل اس کوشش میں تھے کہ طلباء تنظیموں میں رخنہ اندازی کے ذریعے حکومت کے حمایتی طلباء پیدا کریں۔ مجھے یہ فکر لاحق کہ کہیں "سی آئی ڈی" والے قاسم جان کو خرید نہ لیں! چونکہ میں قاسم جان کے علانیہ اور خفیہ دونوں قسم سرگرمیوں سے واقف تھا۔ ہم جب بھی پشاور شہر جاتے تو قاسم جان قصہ خوانی میں ہم سے کہیں غائب ہو جاتا، یہ تو بعد میں پتہ چلا کہ وہ جہانگیرہ پورہ میں دوسرے نشئی لوگوں کے ساتھ نشہ کرتا۔ یونیورسٹی میں اس وقت کئی ایک ساتھی تھے جن میں ناشاد، سلیم، چمنے، شوکت، مرغوب، قاسم جان کے نام یاد رہ گئے ہیں۔

افراسیاب خٹک شاید اس زمانے میں بنوں کالج میں زیرِ تعلیم تھے اور پختون سٹوڈنٹس فیڈریشن میں شمولیت کر چکے تھے، تاہم ابھی جونیئر تھے۔ پختون سٹوڈنٹس فیڈریشن کے ابتدائی رہنماؤں کے بعد فعال کارکنان اور لیڈران کی ایک لمبی فہرست بن گئی تھی۔ یہ فیڈریشن یونیورسٹی اور کالجوں میں شدت کے ساتھ سرایت کر گئی اور طلباء کے لیے مقبول ترین پلیٹ فارم بن گیا۔ اس زمانے میں ذوالفقار علی بھٹو کا نیا طرزِ سیاست پورے ملک میں مقبول ہو رہا تھا اور یہی وجہ تھی کہ بھٹو صاحب کی کرشماتی شخصیت کا سحر پشاور یونیورسٹی میں بھی چلنے لگا۔ قاضی انور جو پہلے واپڈا یونین کی

سیاست سے وابستہ تھے، خیبر لا کالج کے طالبعلم بھی تھے۔ قاضی صاحب بہت اچھے مقرر تھے، یونیورسٹی بھر میں بھٹو اور پیپلز پارٹی کے حق اور ایوب خان کی آمریت کے خلاف تقاریر کرتے۔ قاضی انور ہر رات کسی نہ کسی ہاسٹل میں طلباء سے خطاب کرتے نظر آتے۔ قاضی انور اور بھٹو کی اس مقبولیت نے پختون سٹوڈنٹس فیڈریشن میں ایک طرح سے دراڑ پیدا کر لی تھی۔ چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا کہ قاضی انور کے خلاف پروپیگنڈا مہم پوری شدت کے ساتھ چلائیں گے، چنانچہ قاضی انور کی طلباء میں ساکھ اور اعتبار کو ٹھیس پہنچانے کے لیے ایک دن ہم نے مشہور کر دیا کہ رات پولیس ڈی ایس پی قاضی انور سے ملا تھا اور اچھی خاصی رقم بھی دی۔ دوسرے دن یہ افواہ گرم تھی کہ قاضی انور کو ڈی سی کے بنگلے میں دیکھا گیا ہے، جہاں وہ رقم وصول کرنے گئے تھے۔ چونکہ قاضی انور پختون سٹوڈنٹس فیڈریشن کی راہ کا سب سے بڑا کانٹا بنتے جا رہے تھے، سو ہم نے بھی اس کی کردار کشی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ غنی خان اس زمانے میں طلباء کی دعوت پر یونیورسٹی آتے رہتے، گو کہ میرا ان سے پہلے کا تعارف تھا۔ عبدالولی خان جب نیپ کے صدر منتخب ہوئے تو ہم لوگ شاہی باغ (چارسدہ) جاتے تو ان سے بھی ملتے۔ اسی طرح جب غنی خان، ارباب سکندر خان صاحب کے بالا خانے یعنی نیپ کے صوبائی دفتر آتے تو یہاں بھی ملاقاتیں ہوتی رہتیں۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ افضل بنگش کے نیپ سے اخراج کے بعد ارباب سکندر خان خلیل کا بالا خانہ ارباب سکندر خان کے صوبائی صدر ہونے کی وجہ سے نیپ کا صوبائی دفتر قرار پایا۔ پختون ایس ایف کی فعالیت اور مقبولیت کی دیکھا دیکھی بعض دیگر تنظیمیں بھی منظر عام پر آئیں۔ لطیف آفریدی نے پاکستان سٹوڈنٹس فیڈریشن کے نام سے طلباء تنظیم کی بنیاد رکھی جس میں بائیں بازو کے کئی اہم متحرک لوگ شامل ہو گئے، جن میں شاہ جہاں (ہائی کورٹ جج) گل بہادر (محکمہ ٹیلیفون میں افسر) فضل معبود (سپیشلسٹ ڈاکٹر) اور قیصر خان جیسے سیاسی کارکن تھے۔ اسی طرح پیپلز پارٹی نے پیپلز ایس ایف کو جنم دیا، اسلامی جمعیت طلباء اگرچہ پہلے سے موجود تھی تاہم یہ تنظیم خیبر میڈیکل کالج کے چند طلباء تک محدود ہوتی تھی۔ اسی زمانے میں ہم نے ون یونٹ کے خلاف ہڑتالوں کا سلسلہ شروع کیا۔ کئی ایک شہروں میں ہم نے کامیاب ہڑتالیں کیں۔ جب ہم نے پشاور شہر میں ہڑتال کا اعلان کیا تو چوک یادگار کے کپڑے کے تاجر اور نیپ کے ضلعی صدر

(صدیق خان) اور گرین ہوٹل کے لالہ ایوب نے کافی تعاون کیا۔ ماسٹر خان گل اس وقت مغربی پاکستان عوامی لیگ کے صدر تھے۔ کابلی دروازہ کے قریب چڑھائی پر ''بانگ حرم'' کا دفتر تھا جسے ماسٹر خان گل چلاتے تھے۔ یہ اخبار پختون ایس ایف کے لیے گویا وقف تھا۔ اس زمانے میں اس اخبار میں ہمارے کاز کے حوالے سے مضامین شائع ہوتے۔ اجمل خٹک کے دفتر کے علاوہ ہم بانگ حرم کے دفتر بھی جاتے رہتے اور ماسٹر خان گل سے ملتے اور تبادلہ خیال کرتے۔ سیاسی محاذ کافی گرم ہو چکا تھا اور ایوب خان کے خلاف کئی ایک سیاسی پارٹیوں نے مل کر ڈیموکریٹک ایکشن کمیٹی (DAC) کے نام سے اتحاد قائم کیا۔ مقصد یہ تھا کہ ایوب خان کو گول میز کانفرنس بلانے پر مجبور کیا جائے۔ پیپلز پارٹی اور بھاشانی نیپ اس اتحاد میں شامل نہ تھے، بلکہ انھوں نے کانفرنس کا بائیکاٹ کیا۔ دیگر جماعتیں بالغ رائے دہی اور وفاقی پارلیمانی نظام پر متفق ہو گئی تھیں، تاہم بعد میں جماعت اسلامی، نظام اسلام پارٹی اور نواب زادہ نصر اللہ خان کی آٹھ نکاتی عوامی لیگ نے پانچ صوبوں کے ایک وفاق کے تصور سے اختلاف کیا، وہ مغربی و مشرقی پاکستان کا وفاق چاہتے تھے عبدالولی خان کی نیپ، شیخ مجیب الرحمٰن (عوامی لیگ)، ممتاز محمد خان دولتانہ (کونسل مسلم لیگ وغیرہ اپنے موقف پر ڈٹے رہے اور ان کے ایوب خان کے ساتھ راولپنڈی میں مذاکرات جاری تھے۔ یہ وہ دور تھا جب میں اسلامیہ کالج میں سے بی۔ اے کرنے کے بعد ایم۔ اے انگریزی کے لیے شعبہ انگریزی پشاور یونیورسٹی میں داخل ہو چکا تھا۔ مذاکرات کے لیے ولی خان پنڈی کے فلیش مین (FLASH MAN) ہوٹل میں مقیم تھے۔ جس دن ہم ان سے ملاقات کے لیے ہوٹل آنے والے تھے، اسی دن بھٹو نے پنجاب میں ون یونٹ کے حوالے سے اخباری نمائندگان کے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ ''میں پنجاب کے خلاف کسی دھڑے بندی میں شامل نہیں ہوں گا''۔ گویا بھٹو صاحب 'ون یونٹ' کے خاتمے کو پنجاب کے خلاف سازش سمجھتے تھے، یہ بھٹو صاحب کی سیاسی چال تھی، جس سے وہ پنجابی ووٹ کیش کرنا چاہتے تھے۔

بھٹو کے اس بیان نے ہمیں غصے کے ساتھ ساتھ رنج میں بھی مبتلا کر دیا۔ اگلے دن بھٹو صاحب کا جناح پارک پشاور میں جلسہ تھا۔ میں، مطیع اللہ ناشاد، سلیم اور شوکت (گورنمنٹ کالج پشاور کے صدر) بانگِ حرم کے دفتر میں جمع تھے اور بھٹو صاحب کے مذکورہ بیان کے نتیجے میں اس بات پر متفق تھے کہ بھٹو کے کل والے جلسے کو سبوتاژ کریں گے، مگر کیسے؟ ماسٹر خان گل میز کے پیچھے

بیٹھے ہماری باتیں سن رہے تھے، انھوں نے اپنے میز کی دراز سے پستول نکال کر ہمارے سامنے رکھ دیا کہ یہ لو اور بھٹو کو گولی مار دو۔ ہم سب دم بخود رہ گئے کیونکہ کچھ عرصہ پہلے اسی جناح پارک میں ''ہاشم'' نامی نوجوان نے ایوب خان کے جلسے میں گولی چلائی تھی۔ ہم تو صرف بھٹو کا جلسہ سبوتاژ کرنا چاہتے تھے کسی کا قتل یا گولی چلانا ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ چنانچہ ہم دوست خاموش ہو گئے اور بانگ حرم کے دفتر سے باہر آگئے، کیونکہ ماسٹر خان گل کا طرز عمل بہت بڑی مصیبت کے مترادف تھا۔ بہرحال اگلے دن بھٹو صاحب کا جلسہ ہوا، ہم پختون ایس ایف والوں نے سٹیج پر قبضہ کر کے ون یونٹ کے خلاف نعرہ بازی کی۔ بھٹو صاحب نہایت ہوشیار آدمی تھے انھوں نے سٹیج کی بجائے ٹرک کے اوپر حصے میں کھڑے ہو کر تقریر کی اور ون یونٹ کے خاتمے میں ہماری ہم نوائی کی۔ ٹرک میں بھٹو صاحب کے ساتھ میجر جنرل اکبر خان اور حیات محمد خان شیر پاؤ بھی تھے اور انہوں نے بھی تقاریر کیں۔ پیپلز پارٹی کے جلسے کے اگلے دن جب ہم پنڈی میں عبدالولی خان سے ملے تو انھوں نے ہماری مذکورہ کارکردگی پر ہمیں شاباش دی۔ عبدالولی خان کے ساتھ اس وقت پنڈی میں اجمل خٹک، ارباب سکندر خان اور نیپ مشرقی پاکستان کے صدر پروفیسر مظفر بھی موجود تھے۔ ایوب خان کے ساتھ مذاکرات کے لیے عبدالولی خان نے ان کے سامنے یہ شرط رکھی کہ جب تک مذاکرات میں شیخ مجیب الرحمٰن شامل نہ ہوں ہم بھی مذاکرات میں نہیں بیٹھیں گے۔ شیخ مجیب الرحمٰن اگرتلہ شازش کیس کے مقدمہ میں قید تھے۔ ولی خان کی اس کوشش کی وجہ سے انہیں رہائی ملی۔ شیخ مجیب الرحمٰن ڈھاکہ سے سیدھا پنڈی آئے اور سب سے پہلے عبدالولی خان سے ملاقات کی۔ یہاں پر بتاتا چلوں کہ پروفیسر مظفر نے عبدالولی خان کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ ایسا طرز عمل اختیار کرے کہ بجائے شیخ مجیب کے پاس جانے کے شیخ مجیب الرحمان آپ کے پاس آئے۔ پنڈی میں گول میز کانفرنس شروع ہوئی، ابوالاعلیٰ مودودی (جماعت اسلامی) چوہدری محمد علی (نظام اسلام پارٹی) اور نوابزادہ نصر اللہ خان (آٹھ نکاتی عوامی لیگ) نے پارلیمانی نظام کی حمایت کی لیکن وفاقیت کے مسئلہ پر مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کا فیڈریشن چاہتے تھے۔ انھوں نے مشترکہ موقف سے ہٹ کر موقف اپنایا۔ اگرچہ یہ لوگ بالغ رائے دہی کے قائل تھے، تاہم ون یونٹ کے خاتمے کے خلاف تھے۔ اس کے نتیجے میں یہ کانفرنس ناکام رہی۔ عبدالولی خان صاحب نے ہمیں وہ دستاویز دی جس پر ۱۹۵۷ء میں مسلم لیگی رہنما سردار بہادر خان اور ریپبلکن

پارٹی کے صدر فیروز خان نون کے دستخط تھے اور جس پر جی ایم سید کے ساتھ مفاہمت ہو چکی تھی کہ اسمبلی کے فلور پر جی ایم سید کی سربراہی میں نیپ اراکین ان کی حمایت کریں گے جبکہ یہ لوگ ون یونٹ کے خاتمے کا اعلان کر دینگے۔ یہ جی ایم سید کا اہم کارنامہ تھا۔ ہم یہ دستاویز لے کر مولانا مودودی کے پاس گئے اور ان سے انکی وعدہ خلافی پر احتجاج کیا۔ ہم نے کافی گرم اور سخت باتیں کیں، مولانا انتہائی نرم مزاج شخصیت کے حامل تھے۔ وہ ہماری سخت باتوں پر مسکرائے اور کہا ون یونٹ کوئی مسئلہ نہیں، بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ جب تک صالح افراد سامنے نہ آئیں، حالات تبدیل نہیں ہو سکتے۔ جب ہم اسی معاملے کو لے کر چوہدری محمد علی کے پاس گئے تو انہوں نے کہا میں جانتا ہوں آپ لوگوں کو ولی خان نے بھیجا ہے، انہوں نے ایک طویل تقریر جھاڑی۔ ہم تو طالبعلم تھے، کسی کے ہاتھ بکے تو نہ تھے، ہم نے بھی برملا کہا کہ آپ ہمارے ہوتے اٹک پل پار نہیں کر سکیں گے۔ انکی پارٹی کے بنگال ونگ کے لیڈر مولوی فرید احمد خاصے بد اخلاق تھے، جب ہم پہنچے تو وہ اس وقت پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے اور فقط اُٹھنا بھی گوارا نہ کیا اور لیٹے لیٹے ہم سے گفت گو شروع کی۔ ہم نے بھی خوب سنائیں، بلکہ بے عزت کر کے واپس آئے۔ جب ہم نصر اللہ خان کے ہاں پہنچے تو وہ بیٹھے چلم پی رہے تھے اور سارا گھر دھوئیں سے بھرا ہوا تھا، ان کے ساتھ بھی اچھی خاصی تلخ کلامی ہوئی اور ہم واپس ہوئے۔ ہم نے سب کو وہ دستاویز دکھلائی جس میں ون یونٹ کے خاتمے کا وعدہ کیا گیا تھا۔

۶۹۔۱۹۶۸ میں طلباء کے علاوہ دیگر سماجی گروہوں اور مختلف پیشہ ور طبقوں سے منسلک افراد نے جلسے جلوسوں کا اور ہڑتالوں کا اہتمام کیا تھا۔ اور یہ تمام عرصہ اسی حکومت مخالف سرگرمیوں میں گزرا۔ پختون ایس ایف نے ون یونٹ کے خاتمے کے حق میں زبردست مہم چلائی، بھوک ہڑتالی کیمپ لگائے اور ان کیمپوں میں مختلف سیاسی جماعتوں کے رہنما بھی آتے رہے۔ بیگم نصرت بھٹو نے بھی ایک مرتبہ ہمارے اس طرح کے ایک ہڑتالی کیمپ کا دورہ کیا۔

گول میز کانفرنس کی ناکامی کے فوری بعد مغربی پاکستان میں بھٹو صاحب کی ایوب خان مخالف تحریک اور مشرقی پاکستان میں مولانا بھاشانی کی گھیراؤ جلاؤ تحریک نے ایک نئے مارشل لاء کو جنم دیا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۶۹ء کو یحیٰ خان نے مارشل لا لگایا۔ اگلے دن عاشورہ کا دن تھا، ہم تو پہلے ہی سے جلسے جلوسوں کے عادی تھے، پشاور شہر میں عاشورہ کی مناسبت سے علم اور ذوالجناح کے جلوس

نکلتے تھے۔ ہم چند ساتھی مطیع اللہ ناشاد کی ایما اور اسی کی معیت میں ذوالجناح کے جلوس میں شامل ہوئے۔ جلوس میں ماتمی نعرے ”واویلا واویلا، کربلا کربلا“ لگ رہے تھے، جب کہ ہم ساتھی واویلا، واویلا، مارشل لاء مارشل لاء کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ ہمارے اس انداز پر بعض افراد تو مسکرا کے رہ گئے مگر بعض نے تند و تیز نگاہوں سے استقبال کیا۔ ہم ان کے تیور دیکھ کر کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد جلوس سے باہر آئے۔

میں آج سوچتا ہوں کہ اس زمانے کی سرگرم سیاست کے میدان میں اپنی شرکت اور مصروفیت کے باوجود میں کسی طرح پڑھتا رہا۔ پھر جب میں نے ابتدائی طور پر بی اے اور ایم اے میں اچھے نمبر حاصل کیے تو آج میں سوچتا ہوں کہ اگر میں تعلیمی سرگرمیوں کو زیادہ وقت دیتا اور زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ کرتا تو یقیناً میٹرک کی طرح میں فرسٹ ڈویژن یا ٹاپ کرتا اور شاید بہت ترقی کر لیتا۔ تاہم یہ اچھی بات رہی کہ میری فطری صلاحیت نے ان تمام غیر تعلیمی سرگرمیوں کے باوجود مجھے تعلیمی ناکامیوں سے دور رکھا۔

۱۹۶۶ء میں، میں نے ایف۔ اے کیا تھا اور ۱۹۶۶/۶۷ء میں سالِ سوم کا طالبعلم تھا جبکہ عثمانیہ ہاسٹل میں رہائش پذیر تھا۔ ۱۹۶۷/۶۸ء میں جب میں فورتھ ائیر میں ہوا تو چیمسفورڈ ہاسٹل منتقل ہوا۔ یہاں چیمسفورڈ میں ہمارے وارڈن آرکیالوجی کے پروفیسر شجاع تھے۔ سالِ چہارم میں انگریزی پروفیسر کلوز اور شمسی پڑھاتے تھے۔ اکنامکس غفران اللہ اور جنرل سائنس کیمسٹری کے پروفیسر صاحب گل پڑھاتے رہے۔ چیمسفورڈ میں میرے گاؤں کے شیر، نعیم اور سوات کے زرین بشیر تھے، جبکہ صابر کاکا اس وقت بٹلر ہاسٹل میں تھے۔ ان کے ساتھ دوسرے فعال کارکن بٹلر میں رہائش رکھتے تھے۔ شیر اور نعیم چونکہ ایف اے میں فیل ہو چکے تھے اس لیے مجھ سے ایک سال جونیئر ہو گئے۔ زرین بشیر بھی ایک یا دو سال جونیئر تھا۔ میں چیمسفورڈ میں کیوبکل میں اکیلا رہتا تھا۔

۱۹۶۸ء میں میں نے سیکنڈ ڈویژن میں ”B.A“ پاس کیا۔ سیاست اور تعلیم ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ اسی سال زیارت خان ”ایم ایس سی“ جغرافیہ میں فرسٹ آئے۔ زیارت خان ہاسٹل ون میں رہائش پذیر تھے، مثل شاہ بھی ہاسٹل ون میں قیام پزیر تھے۔ احسان اللہ (پنج پیر) نوکری بیچ میں چھوڑ کر انجنیئرنگ کالج میں داخلہ لے چکے تھے۔ میں کبھی کبھار ان سے بھی ملنے جایا کرتا تھا اور ان کی خیریت دریافت کرتا۔

BA کرنے کے بعد میری خواہش تھی کہ میں ''MBA'' کرلوں۔ ایم بی اے، اس زمانے میں اتنا عام نہیں تھا۔ پشاور یونیورسٹی کیمپس میں قائداعظم کالج آف کامرس موجود تھا تاہم یہاں طالب علم میٹرک کے بعد داخل ہوتے اور سی کام، ڈی کام کے ساتھ بی کام کی ڈگری ملتی۔ انسٹیٹوٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن کراچی ایک نہایت ہی اعلیٰ ادارہ تھا جو ایوب خان کے دور میں کراچی میں قائم کیا گیا تھا۔ یہ ادارہ امریکہ کے اشتراک سے بنا تھا اور امریکہ ہی اسکی سرپرستی کرتا تھا۔ جہاں ایم بی اے کے لیے یہ ایک بہترین ادارہ تھا، تاہم یہاں داخلہ لینا جان جوکھوں سے کم نہ تھا۔ داخلہ کے لیے پورے پاکستان سے طلبا کا ٹیسٹ اور انٹرویو کے ذریعے انتخاب ہوتا۔ پشاور یونیورسٹی کے شعبہ اکنامکس میں ہر سال اس ادارے کی ایک ٹیم اس غرض سے آیا کرتی، یہاں ٹیسٹ اور انٹرویو کے نتیجے میں اچھے طلبا کا انتخاب کرتی۔ میں نے بھی فارم بھر لیا اور ٹیسٹ میں بیٹھ گیا۔ اس سال ۶۰ طلباء نے امتحان دیا تھا، ٹیسٹ میں اکثریت ایم اے پاس طلباء کی تھی جبکہ اکنامکس میں ایم اے ڈگری ہولڈر بھی موجود تھے۔ اس کے باوجود میں کامیاب رہا اور سات کامیاب طلباء میں میرا نام شامل تھا۔ کراچی سے داخلہ کا سرکاری دعوت نامہ آیا، میرے لیے اجمل خٹک صاحب مشورے کا مرکز اور صلاح کار تھے۔ میں مشورے کے لیے اجمل خٹک سے ملا۔ اجمل خٹک کو اپنی سیاست ہر شے سے عزیز تھی۔ انھوں نے کہا کہ کراچی جا کر کیا کرلو گے؟ بلکہ کراچی جا کر ضائع ہو جاؤ گے، یہیں پشاور یونیورسٹی میں کسی ڈیپارٹمنٹ میں داخلہ لے لو۔ اور میں انکا مشورہ مان گیا، ورنہ ''ایم بی اے'' کرلینا اور امریکہ چلے جانا اور اعلیٰ ملازمت کرنا یقینی تھا کیونکہ اس ادارے کی امریکی سرپرستی میں یہ کافی آسان تھا۔ بہر حال میں نے شعبہ اکنامکس میں فارم جمع کیا اور داخلہ بھی مل گیا۔ ان ہی دنوں شعبہ انگریزی نے بھی داخلے کے لیے مقابلے کے امتحان competetion کا اعلان کیا۔ اس زمانے میں فقط انگریزی ڈیپارٹمنٹ میں داخلے کے لیے امتحان کی شرط تھی اور اس امتحان میں کامیاب ہونے والوں کی اکثریت اعلیٰ انگلش میڈیم اداروں سے فارغ ہونے والے طلبا کی ہوتی تھی۔ میری طرح سرکاری سکولوں سے آنے والے خال خال ہی پاس ہوتے تھے۔ اگرچہ اس امتحان کے لیے میں نے کوئی زیادہ تیاری بھی نہیں کی تھی مگر مارکس ازم اور لینن ازم کا مطالعہ کر چکا تھا اور اسی مطالعے کو بروئے کار لاتے ہوئے ٹیسٹ میں کامیاب رہا۔ زبانی امتحان (انٹرویو) میں پروفیسر کلوز اور پروفیسر عبدالصمد شامل تھے جو مارکس ازم

کے مطالعے کے ساتھ ساتھ دیگر موضوعات کے حوالے سے بھی وسیع المطالعہ شخص تھے۔ میں ان کے سوالات کے شافی جوابات دیتا رہا۔ اس انٹرویو میں پروفیسر کلوز نے بڑی حیرانی سے پوچھا کہ مجھے علم نہیں تھا کہ ''جمعہ'' آپ مارکسسٹ ہو (I did not know that you were a marxist.)۔ دراصل پروفیسر کلوز میرے استاد رہ چکے تھے، اور پھر BA میں عملی سوشل ورک میں، میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ اس دور میں تین ہفتے پر محیط سوشل ورک بی اے، بی ایس سی ڈگری کے لیے لازم تھا۔ اسلامیہ کالج میں پروفیسر کلوز ہی سوشل ورک ڈیپارٹمنٹ کے چیرمین تھے، آپ ہی مختلف گروپ مرتب کرتے، یہ گروپ مختلف اساتذہ کی نگرانی میں گرمیوں کی چھٹیوں میں شہر کے مضافات یا کسی بھی دوسرے شہر، خصوصاً پہاڑی علاقوں میں جاتے اور خدمات سرانجام دیتے۔ اس سال ہمارے ساتھی سوات اور دیگر پہاڑی علاقوں میں گئے تھے۔

تاہم میں اپنی سیاسی مصروفیات کی وجہ سے اپنے گروپ سے رہ گیا تھا، اس لیے میں پروفیسر کلوز کے گروپ میں شامل ہو گیا اور تھکال بالا میں ہم نے خدمات سرانجام دیں۔ ان دونوں حوالوں کے باوجود اس دوران کبھی بھی پروفیسر کلوز کے ساتھ مارکسزم کے حوالے سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ بہر حال ایم اے انگریزی میں داخلہ مل گیا اور یوں اکنامکس کے بجائے میں انگریزی پڑھنے لگا۔ سیاست کا سلسلہ بھی ساتھ ساتھ جاری تھا۔ ان دنوں یونیورسٹی کے تقریباً تمام شعبہ جات میں یکم ستمبر (یعنی گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد) کو تعلیمی سلسلے کا آغاز ہوتا۔ ستمبر ۱۹۶۸ء میں جب ہماری ایم اے کلاسز کا آغاز ہونا تھا، تب ملک میں ایوب خان کے خلاف تحریک جوبن پر تھی اور خود میں بھی ایوب خان کی مخالف تحریک میں پوری طرح غرق تھا۔ ایوب خان کے خلاف تحریک کے نتیجے میں بجائے عام انتخابات کے ایک اور مارشل لا مسلط ہو گیا۔ ایوب خان فارغ اور جنرل یحیٰی خان مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بن گئے۔ یحیٰی خان کے اولین اقدامات میں سے اہم اقدام ون یونٹ کا خاتمہ اور ریاست سوات کو صوبہ سرحد میں مدغم کرنا تھا، بلوچستان کو صوبہ کا درجہ مل گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یحیٰی خان کی پہلی نشری تقریر کا مسودہ ان کی نشری تقریر سے پہلے 'شہباز' اخبار پہنچ چکا تھا۔ شہباز جب خریدا گیا تو اس کا پہلا دفتر کابلی تھانے کے سامنے والی بلڈنگ میں تھا جسے بعد میں گرا کر میونسپل پلازہ تعمیر کیا گیا۔ قلندر مومند اس کے پہلے ایڈیٹر تھے تھے۔ قلندر صاحب نے وہ مسودہ ہمیں دکھلایا اور ساتھ ہی ایک قطعہ لکھ کر دیا۔ اس

قطعہ کے تین مصرعے اب تک یاد ہیں۔

جن کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ: آج مخالف کے گھر گویا ماتم ہے، جو لوگ ہمیں نابود کرنا چاہ رہے تھے اب تو خود ان کا خاتمہ بالخیر ہونے کو ہے۔

ون یونٹ کے خاتمے سے یہ نقصان ہوا کہ بلوچستان کے پشتون رہنما عبدالصمد خان اچکزئی نیپ سے الگ ہوگئے اور پشتونخوا نیپ کے نام سے الگ سیاسی جماعت قائم کی۔اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ آپ نیپ کے اس خیال کے مخالف تھے کہ بلوچستان کے پشتون بلوچستان ہی میں بلوچوں کے ساتھ مل کر رہیں۔ اچکزئی کی خواہش تھی بلوچستان کے پشتون صوبہء سرحد میں شامل ہوں۔محمود خان اچکزئی اور عبدالرازق دوتانی (محمود خان کے ساتھ پشتونخوا ملی عوامی پارٹی کے سکرٹری جنرل رہے) اس زمانے میں انجینیرنگ کالج پشاور کے طالب علم تھے۔، ہم لوگ پختون ایس ایف اور نیپ کے جلسے اور جلوسوں میں مصروف ہوتے، جبکہ محمود خان ہمیں طعنے دیتا رہتا کہ تم لوگ بلوچوں کے ایجنٹ ہو۔ چنانچہ ہم بھی جواباً انہیں قیوم خان کا ایجنٹ قرار دیتے تھے۔نیپ کی پالیسی تھی کہ بلوچوں کے ساتھ اعتماد کی فضا قائم رہے، ترقی پسند اور قوم پرست دونوں چاہتے تھے کہ بلوچوں کے ساتھ تزویراتی وحدت قائم رہے، اس کی وجہ انتہائی منطقی اور ملی تھی، کیونکہ بلوچ ساحل کے ساتھ آباد ہیں اور اس بنا پر زیادہ کردار ادا کر سکتے ہیں، میرا ذاتی خیال بھی یہی ہے کہ اس وقت نیپ کی یہ سوچ زیادہ صحیح اور درست تھی۔

ستمبر ۱۹۶۸ء میں ہماری انگلش سال اوّل (previous) کی کلاسز شروع ہوئیں۔اس وقت ڈاکٹر مظہر علی خان شعبہ انگریزی Deptt. of English کے چیئرمین تھے۔وہ مشہور شیعہ عالم علاّمہ رشید ترابی کے بھائی تھے۔ڈاکٹر صاحب انتہائی عالم فاضل شخصیت اور مسلکاً صوفی اور متصوف تھے۔تصوف میں آپ مولانا جلال الدین رومی (بلخی) کے پیروکار تھے۔ڈاکٹر مظہر علی خان صاحب ہر سال مولانا روم کی یاد میں اپنے گھر پر قوالی کی محفل منعقد کرتے تھے۔ ہماری کلاسوں کا آغاز ہو چکا تھا، ڈاکٹر صاحب کبھی کبھار انگریزی شاعری کی کلاس بھی لیتے تھے۔

مس مارگریٹ ہرباٹل (Ms Margaret Harbottle) ڈراما پڑھاتی تھی۔میڈم ہرباٹل انتہائی قابل اور جہاندیدہ خاتون تھیں۔انہوں نے پوری طرح پشتون معاشرے میں اپنے آپ کو ضم کر لیا تھا۔انہوں نے ایک غریب ڈرائیور کے بیٹے کو اپنا بیٹا بنا لیا تھا، اس کی تعلیم و تربیت کی اور

وہی ان کا وارث بھی ٹھہرا۔مس ہرباٹل مجھ سے بھی خصوصی محبت رکھتی تھیں اور اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مجھے مشہور پشتون شاعر اور دانشور غنی خان سے خصوصی عقیدت تھی جبکہ خود میڈم بھی عبدالغنی خان سے قریبی تعلقات رکھتی تھیں، مس ہرباٹل انہیں پشتونوں کی عظیم علمی، ادبی شخصیت اور فلسفی سمجھتی تھیں۔اگرچہ میڈم اپنے تمام طلباء اور طالبات کا خاص خیال رکھتی تھیں لیکن میرے ساتھ ان کا شفقت آمیز رویہ خاص تھا۔ایک مرتبہ جب میں بیمار ہوا اور دو تین دن ڈیپارٹمنٹ نہ جا سکا تو میڈم ہرباٹل میری خبرگیری کے لیے ہاسٹل آ گئیں۔میڈم انتہائی سلیقے اور دلچسپ انداز میں ڈراما پڑھاتی تھیں۔

پروفیسر عبدالصمد صاحب تنقید (Criticism) پڑھاتے تھے۔آپ اگرچہ صرف ایم۔اے انگریزی تھے، پی۔ایچ۔ڈی نہ تھے، مگر نابغہ روزگار اور ایک مکمل استاد تھے۔ان کی چوٹی کا استاد پوری یونیورسٹی میں ملنا مشکل تھا۔پروفیسر صمد ہندوستانی مہاجر تھے اور پشاور ہی کو اپنا گھر بنا لیا تھا۔آپ نظریاتی طور پر بائیں بازو سے تعلق رکھتے تھے تاہم آپ روس کے بجائے چینی طرزِ انقلاب اور سوشلزم کو پسند کرتے تھے۔میں چونکہ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کا حامی تھا اس لیے کبھی کبھی پارٹی کے اعلامیے ان کے لیے لے آتا۔پروفیسر عبدالصمد اتنی دلچسپی اور تیاری کے ساتھ اپنی کلاس لیتے کہ کوئی طالب علم غیر حاضری نہ کر پاتا۔

نامور پروفیسر، پروفیسر داؤد کمال صاحب ناول پڑھاتے تھے۔داؤد کمال پشاور یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر چوہدری محمد علی صاحب کے بڑے صاحبزادے تھے۔چوہدری صاحب ہزارہ میں آباد ہو چکے تھے۔داؤد کمال صاحب کی بیگم پشتون تھی اور ان کا تعلق مردان سے تھا۔پروفیسر داؤد کمال انتہائی شریف اور نرم دل انسان تھے۔آپ انگریزی ادب کا کماحقہ مطالعہ رکھتے تھے، خود انگریزی کے عمدہ شاعر تھے اور بعد میں فیض صاحب کا منتخب کلام بھی انگریزی میں ترجمہ کر کے شائع کیا۔

شاعری پروفیسر بشیر الدین پڑھاتے تھے۔بشیر الدین صاحب مجسم شرافت تھے۔ان کے بھائی ڈاکٹر ضیاء الدین ریاضی کے پروفیسر تھے اور پروفیسر عبدالہاشم خان کے وائس چانسلری کے زمانے میں پشاور یونیورسٹی کے رجسٹرار بھی رہے۔ڈاکٹر مظہر علی خان ہمارے سال اول کے زمانے میں ہی ترکی یا روس میں انتقال کر گئے۔ دراصل وہ لیکچر کے سلسلے میں ترکی گئے، وہاں دل کا

دورہ پڑا اور وہیں فوت ہو گئے۔

ڈاکٹر مظہر علی خان کی وفات کے بعد ان کے ذاتی استعمال کی اشیا فروخت کی گئیں تو میں نے ان کے استعمال میں رہنے والی میز اور کرسی خریدی۔ مستقل کابل جانے تک یہ میز اور کرسی میرے فلیٹ میں تھیں اور جب میں کابل شفٹ ہوا تو مجھے نہیں معلوم فلیٹ سے دیگر اشیا کے ساتھ ساتھ یہ میز اور کرسی بھی کون لے گیا؟ انگلش ڈیپارٹمنٹ کے دفتر کے انچارج ہیڈ کلرک نذیر بابو تھے۔ ان کا تعلق تہکال سے تھا، نہایت ایماندار شخص تھے اور یہی وجہ تھی کہ ایک طویل عرصے سے اس سیٹ پر کام کر رہے تھے۔ بابو نذیر ڈیپارٹمنٹ کے تمام سٹاف ممبروں کے کام کرتے تھے، بلکہ شعبہ سے باہر کے کام بھی خوش اسلوبی سے کیا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ ہم طلبا کے مسائل بھی حل کرتے تھے۔ شعبہ انگریزی کی لائبریری کے انچارج رحمت تھے۔ رحمت کا تعلق پشاور شہر سے تھا۔ رحمت شریف آدمی تھے اور ہم سے خاصا تعاون کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد خود بھی ایم۔اے کیا اور کسی اور جگہ ملازمت اختیار کر لی۔ شاید کسی کالج میں لیکچرر مقرر ہوئے۔ ان افراد کے علاوہ ہمارے شعبے میں دو چپڑاسی بھی تھے، ان کی صورتیں مجھے اچھی طرح یاد ہیں لیکن افسوس ان کے نام یاد نہیں آ رہے۔

شعبہ انگریزی میں پہلا سال معمول کے مطابق درس و تعلیم اور سیاست میں گزرا۔ اس سال ایوب خان کے خلاف طلبا تحریک، پی۔ ایس۔ ایف کا مختلف ٹکروں میں بٹنا، نیپ کے جلسے جلوس، وسیع سٹوڈنٹس تحریک اور ذوالفقار علی بھٹو کا ایجی ٹیشن اہم واقعات ہیں۔ بھٹو تحریک کی بنیاد تاشقند معاہدہ کے راز افشاء کرنا اور روٹی، کپڑا، مکان جیسے جذباتی نعروں سے عبارت تھی۔ بھٹو صاحب کے ان نعروں نے انہیں مغربی پاکستان میں خاصا مقبول بنا دیا تھا۔ یونیورسٹی کی سطح پر پیپلز سٹوڈنٹس فیڈریشن قائم ہوئی اور ایوب خان کے خلاف اس تنظیم نے کچھ عرصے کے لیے پختون سٹوڈنٹس فیڈریشن کے ساتھ مل کر جدوجہد کی۔ پیپلز سٹوڈنٹس فیڈریشن جلد ہی ایک مضبوط تنظیم کی حیثیت سے سامنے آئی۔

مطیع اللہ ناشاد طلبہ تحریک کے اولین رہنماؤں سے تھے، تاہم جلد ہی بوجوہ ہم سے جدا ہو گئے، انھیں مجبوراً کراچی جانا پڑا تھا۔ ناشاد مجبوراً اپنی میڈیکل کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر شہباز کاکا آف رشکی کی بیٹی کے ساتھ کراچی کوچ کر گئے۔ ناشاد کراچی میں اجنبی تھے کوئی مستقل ٹھکانہ نہ تھا اس لیے کبھی اِس کے ہاں اور کبھی اُس کے ہاں ڈیرہ ڈال دیتے، آخر کار پاپوش نگر میں ٹِک گئے اور میڈیکل ریپ بن گئے۔ بعد میں جب میں کراچی گیا تو چند دن ان کے ہاں ٹھہرا بہر حال اُن کے

حالات ان دنوں زیادہ اچھے نہ تھے، بعد میں وہ بہت دولتمند ہو گئے۔

ہمارے دوسرے دوست لطیف آفریدی جو ہم سے عمر میں بڑے تھے خاصے فعال ہو گئے تھے۔ پاکستان سٹوڈنٹس فیڈریشن جس کا پیپلز سٹوڈنٹس فیڈریشن اور پاکستان پیپلز پارٹی کے ساتھ مفاہمت کے تعلقات تھے، جبکہ معمولی اختلاف کے باوجود لطیف آفریدی طلبہ تحریک اور جلسے جلوس میں مصروف تھے۔ ایک دن انہوں نے پشاور میں ایک جلوس کی قیادت کی اور اِس جلوس میں انہوں نے گوریلا لیڈر ''چی گویرا'' زندہ باد کے نعرے لگائے جس پر ڈاکٹر شیر افضل نے ناگواری کا اظہار کیا اور انہوں نے آفریدی سے کہا کہ کہیں گوریلے بھی جلوس نکالا کرتے ہیں؟ یہ قصہ خود شیر افضل نے مجھے سنایا۔ دراصل شیر افضل لطیف آفریدی سے بڑی محبت کرتے تھے اور ان کے دل میں آفریدی کے لیے بہت احترام تھا۔

ان حالات میں ملک میں دوسرا مارشل لاء لگ گیا اور جلسے جلوسوں کی سرگرمیاں وقتی طور پر رک گئیں۔ یحییٰ خان نے ون یونٹ کے خاتمے اور نئے انتخابات کا اعلان کے ساتھ ساتھ PCO یعنی عارضی آئینی حکم بھی نافذ کیا۔ اس کے ساتھ ایوب خان کا آئین اور قوانین معطل ہو گئے۔ پاکستان ایک نئی راہ پر گامزن ہوا۔ ون یونٹ ٹوٹنے کے ساتھ ہی پرانے صوبے یعنی بنگال، سرحد، پنجاب، سندھ، بلوچستان بحال ہوئے اور ون یونٹ سے پیدا شدہ مسائل و خدشات ختم ہونے کے علاوہ صوبوں کی اپنی حاکمیت بحال ہوئی۔ نیپ کی کوششیں کامیاب ہوئیں اور اس طرح ایجی ٹیشن اختتام پذیر ہوئی اور میں اپنی تعلیمی سرگرمیوں کے لیے فارغ ہوا۔

ایم۔اے انگریزی میں میرے ساتھ اردو میڈیم سے آنے والے طالبعلموں میں گل خان (پنج پیر)، شوکت (ڈیرہ اسمٰعیل خان)، رفیق (پشاور شہر)، نور اللہ آفریدی وغیرہ کے علاوہ میجر جنرل ضیاء الدین (قاہرہ ہوائی حادثہ میں فوت ہوئے) کی صاحبزادی، صوابی کھنڈہ گاؤں کے کرنل مراد کی صاحبزادی پروین اور ایک بنگالی لڑکی بھی تھی۔ ڈیپارٹمنٹ کے داخلی انتخابات میں اس بنگالی لڑکی کو ہم نے صاحبزادہ فیاض کے مقابلے میں کامیاب کرایا۔ صاحبزادہ فیاض، صاحبزادہ ریاض کے چھوٹے بھائی تھے، انگلش میڈیم سے آئے تھے اور ٹامی لہجے میں بڑی رواں دواں انگریزی بولتے تھے۔ صاحبزادہ ریاض کا تعلق ضلع صوابی کے گاؤں کوٹھا سے تھا اور ان کے والد تخت بھائی شوگر مل میں ملازم تھے۔ صاحبزادہ فیاض کو اپنی انگریزی دانی پر بڑا ناز تھا اور اس

مغالطے میں تھے کہ اس بنا پر الیکشن جیت جائیں گے۔ جب ناکام ہوئے تو میرے پاس آ کر کہا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟ آخر میرا گناہ کیا تھا؟ میں نے جواباً کہا کہ تم خود اپنے رویے پر غور کرو، اور اپنے آپ کو دوسروں سے برتر کیسے سمجھتے ہو؟ سب کے ساتھ برابری کی سطح پر رہو۔ شوکت اور گل خان میرے ساتھ ہوسٹل ۲ میں رہتے تھے۔ انہی دنوں رشید وزیری کابل سے پشاور آئے تھے اور اجمل خٹک کے ساتھ ارباب صاحب کے بالا خانے میں رہائش پذیر تھے۔ ایک دن میرے پاس آئے اور رات میرے ساتھ ہوسٹل میں گزاری۔ میں انہیں پوری یونیورسٹی بھی دکھا لایا۔ ان دنوں کابل کے ساتھ میرے روابط گہرے ہو گئے تھے۔ میں کبھی ایک حوالے سے اور کبھی دوسرے حوالے سے کابل سے رابطے میں رہا۔ ایک مرتبہ تو میں حاجی نادر خان کے خاندان کے بعض افراد کی معیت میں بغیر پاسپورٹ کے بھی کابل گیا۔

بنگالی رہنماؤں میں احمد الکبیر وہ آخری لیڈر تھے، جو پشاور آئے اور ڈینز ہوٹل پشاور صدر میں قیام پذیر رہے۔ ارباب ہمایوں، نثار اور میں انہیں راتوں رات ٹیکسی میں بٹھا کر شاہی باغ (چارسدہ) عبدالولی خان کے پاس لے گئے۔ احمد الکبیر شروع ہی سے نیپ میں شامل تھے، بعد میں انتخابات میں اسمبلی ممبر اور وزیر بن گئے۔ شاید اُس وقت کوئی خصوصی پیغام لے کر آئے تھے۔ ایک مرتبہ صادق کانسی شہید بھی پشاور آئے تھے۔ میرے خیال میں ان کا زیادہ تعلق اجمل خٹک کے ساتھ تھا اور وہاں سے یونیورسٹی میرے پاس آئے تھے۔ اس ملاقات میں کانسی نے کہا کہ آپ کے چارسدہ اور مردان کے خان خوانین لاہور جاتے ہیں اور وہاں طوائفوں پر دولت لٹا دیتے ہیں اور اپنے علاقے کے مقامی فنکاروں اور ہنرمندوں پر خرچ نہیں کرتے۔ انہوں نے کہا کہ میں اس روایت کو توڑنا چاہتا ہوں، مجھے ہوتی مردان لے چلو وہاں موسیقی اور ناچ کی مجلس سنیں اور دیکھیں گے۔ میں بھی اس طرح کے مقامات سے آشنا نہیں تھا، عشا کے وقت مردان پہنچے۔ مردان میں مانیری بالا کے عمر خان کاکا کا خاندان آباد تھا، اُن کے ہاں چلے گئے۔ ان کے ہاں کھانا کھایا اور انہوں نے صادق کی خاصی خاطر مدارات کی۔ تقریباً گیارہ بجے رات ہم ''ہوتی'' میں حرمتی کے ڈیرے پر گئے، یہ لوگ سوئے ہوئے تھے، ان کو جگایا اور بیچارے نے رات گئے ہمارے لئے محفل آراستہ کی۔ ہم نے ناچ گانا سنا جبکہ صادق نے طوائف کو اچھی خاصی رقم دی۔ اس کے بعد ہم واپس اسی حجرے میں آئے، باقی ماندہ رات گزاری اور دوسرے دن پشاور واپسی ہوئی۔ چند دن پشاور میں گزار کر صادق کوئٹہ روانہ ہوئے اور وہیں شہید کر دیے گئے۔ صادق کانسی نہایت دلیر اور سچے پشتون تھے۔

میرا لیکچرار بننا (۱۹۷۰ تا ۱۹۷۳)

جولائی ۱۹۷۰ء میں میرے انگلش فائنل کے امتحانات مکمل ہو گئے اور تقریباً ایک مہینہ بعد نتائج آ گئے، خوش قسمتی سے میں سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہو چکا تھا اور یہ نتیجہ خود میری توقعات سے بھی بہتر تھا۔ انگریزی زبان وادب میں سیکنڈ ڈویژن آنا کافی مشکل ہوتا ہے اور فرسٹ ڈویژن تو محال ہی تھا۔ میں اس لیے بھی خوش قسمت تھا کہ پورا دور میں نے سیاسی اور دیگر غیر نصابی سرگرمیوں میں گزارا تھا اور یوں اتنے اچھے نمبروں سے کامیاب ہونا معجزہ ہی تھا۔

ایم۔اے کے فوری بعد میں سائنس سپیریر کالج میں بطور انگریزی زبان وادب کے لیکچرار تعینات ہوا۔ سپیریر کالج اس زمانے میں عارضی طور پر ورسک روڈ پر واقع تھا۔ میں روزانہ صبح اسلامیہ کالج کے بیچلر ہوسٹل سے سپیریر سائنس کالج بذریعہ بس چلا جاتا تھا۔ فدا جو مجھ سے ایک سال سینئر تھا، وہ بھی کسی کالج میں بطور لیکچرر کام کر رہا تھا، میں اُس کے ساتھ رہتا تھا۔ سپیریر سائنس کالج میں میرا عرصہ ملازمت نہایت مختصر تھا، بس ایک آدھ مہینہ ہی۔ جلد ہی میرا تبادلہ گورنمنٹ کالج صوابی ہو گیا اور وہاں درس وتدریس کا آغاز کیا۔ صوابی کالج میں بھی میرا آب ودانہ مختصر ہی تھا کیونکہ جلد ہی میرا انتخاب بطور لیکچرر انگریزی زبان وادب اسلامیہ کالج پشاور یونیورسٹی ہو گیا۔ تاہم انتخاب اور باقاعدہ کالج جائننگ کے دوران ہی انجینیر نگ کالج کے ایک پروفیسر ملک صاحب (جن کا تعلق پنجاب سے تھا) نے اپنا تبادلہ اس پوسٹ پر کیا اور مجھے تقرری (Appiontment Letter) کے ساتھ ہی ایک دوسرا خط بھی ملا جس کے مطابق میرا تبادلہ انجینئر نگ کالج کیا جا چکا تھا اور یہ کہ میری تنخواہ اسلامیہ کالج ہی سے ملے گی۔ اگرچہ مجھے یہ بات بڑی عجیب لگی اور میں نے سوچا کہ اس پر اعتراض کروں لیکن پھر سیاست نے مجھے اس چھوٹے کام سے روکے رکھا۔ بزرگوں نے بھی یہی مشورہ دیا کہ انجینئر نگ کالج جوائن کر لوں۔ پھر یہ بھی کہا کہ انجینئر نگ میں انگریزی لازمی مضمون کے طور پر نہیں پڑھائی جاتی تھی، یوں مجھے سیاست اور نظریاتی کاموں کے لیے زیادہ وقت ملے گا۔ انجینیر نگ کالج میں، میں نے فنکشنل انگلش پڑھانا شروع کیا۔ جسے بعد میں کمیونیکیشن کا نام دیا گیا ہے۔ یہاں میرا کام طلباء کو انگلش بولنا اور لکھنا سکھانا تھا۔ انجینئر نگ میں انگریزی فقط سالِ اول کے طلباء کو پڑھائی جاتی تھی، لیکن سال اول کے کئی سیکشن ہوا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب

تعارف کرواسکتا تھا اور نہ ہی کھانے پینے کے لیے اس کو ہوٹل لے جاسکتا تھا، گویا جب وہ آجاتا میری ساری آزادی سلب ہو جاتی۔ اس کی موجودگی میں میری کوشش ہوتی تھی کہ میرے کمرے میں کوئی نہ آئے، لیکن اگر ایسے میں کوئی دوست یا عزیز نازل ہو جاتا تو مجھے جھوٹ کا سہارا لینا پڑتا اور میں کہہ دیتا کہ موصوف میرے کراچی کے دوستوں کے عزیز یا دوست ہیں۔ نازش کے آنے سے گویا میں خود بھی انڈر گراؤنڈ بن جاتا، کیونکہ نازش کا افشاء ہونا میں اپنے لیے پاکستان میں لانے یا آنے والے انقلاب سے غداری سمجھتا تھا۔

اس زمانے کا سب سے اہم واقعہ پاکستان کی تقسیم اور بنگلہ دیش بننا ہے، چنانچہ میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس واقعے پر بھی مختصراً اپنے خیالات کا اظہار کر دوں۔ انجینئرنگ کالج میں درس وتدریس کے اس دور میں میں نے کئی مرتبہ اپنے شاگردوں سے اس پیشین گوئی کا اظہار کیا تھا کہ بنگال ہم سے آزاد ہو جائے گا، مگر وہ لوگ اس بات کا یقین نہیں کرتے تھے۔ اور جب پاکستان نے بنگال میں فوج کشی کی اور آپریشن شروع کیا، تب بھی میں کہتا رہا کہ اب بنگال کی آزادی زیادہ دور نہیں۔ اور یہ بات میں نے اس وثوق سے اس بنیاد پر کہی تھی، کہ کئی لوگوں کے سامنے عبدالولی خان نے کہی تھی، یہ اہم بات بعد کو خود خان صاحب بھی بھول چکے تھے، کیونکہ انہوں اس کا ذکر اپنی کتابوں میں نہیں کیا۔ یہ بات اصلاً صدرِ پاکستان ایوب خان نے ان سے کی تھی۔ ایوب خان کے اقتدار کے آخری دنوں میں جو گول میز کانفرنس منعقد کی گئی اور جب اُس کی ناکامی کے آثار نظر آنے لگے، تب ایوب خان نے ولی خان سے ایک پشتون ہونے کے ناطے کہا تھا کہ ''اگر تم لوگ پاکستان پر حکومت کرنا چاہتے ہو تو مشرقی پاکستان سے چھٹکارا حاصل کرلو'' ایوب خان نے یہ کلمات انگریزی میں ادا کیے تھے جو اس طرح تھے۔ ''If you want to rule Pakistan,get rid of East Pakistan.'' اور اس کا واضح ثبوت ون یونٹ کے بننے، اقتدار پر فوج اور بیوروکریسی کے قبضے، اور سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے گٹھ جوڑ سے آسانی سے مل جاتا ہے جس کا مقصد بنگالیوں کو اقتدار سے محروم رکھنا تھا۔ جب ہر طرف سے نئے انتخاب کی آوازیں آنے لگیں تو مغربی پاکستان اور اگر میں زیادہ صحیح کہوں تو پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ (Establishmint) نے شعوری طور پر ان سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہا، اور پھر قائداعظم محمد علی جناح، لیاقت علی خان اور مسلم لیگ، سب نے تقسیم ہند کی دہلیز پر مسلم لیگ بنگال کے صدر حسین شہید سہروردی اور بنگالی کانگریس کے رہنما

میں پہلی مرتبہ کلاس میں گیا اور کمپوزیشن کے حوالے سے اپنا لیکچر دینے کے بعد جب لڑکوں سے کہ
کہ اب آپ اس موضوع پر خود سے مضمون لکھ لیں تو سامنے بیٹھے ہوئے لڑکوں میں "میسا" گاؤں
کے خدائی خدمتگار رنانا کے صاحبزادے عباس بیٹھے تھے، بہ آوازِ بلند پشتو میں کہا کہ "مڑہ دا بہ سوک
لیکی"، یعنی اسے کون لکھے گا۔ دراصل عباس اسلامیہ کالج میں میرے کلاس فیلو تھے فقط یہ فرق تھا ک
میں آرٹس میں اور وہ سائنس میں تھا۔ عباس، بی۔ ایس۔ سی کے بعد انجینیر نگ میں داخلہ لے چ
تھا۔ عباس کی یہ حرکت مجھے اچھی نہ لگی کیونکہ استاد اور شاگرد کے درمیان بہر حال ایک فاصلہ او
دیوار رہتا ہے جسے پار نہیں کرنا چاہیے۔ اس وقت ہمارے چیرمین عباس رضوی تھے، جو ریاضی دان
اور ہندوستانی مہاجر تھے۔ رضوی صاحب نہایت شریف انسان تھے۔ ان کے علاوہ دیگر اساتذ
جیسے خادم الکبیر (کیمسٹری)، محمد خان (ریاضی)، اور ابرار اللہ (اسلامیات) کے نام یاد ہیں۔

ایک زمانے میں میرے دل میں بھی اس خواہش نے انگڑائی لی کہ دوسرے تعلیم یافت
نوجوانوں کی طرح مقابلے کے امتحان میں شریک ہو جاؤں اور سی۔ ایس۔ ایس کر کے پاکستان کی
سول بیورو کریسی یا خارجہ سروس میں شامل ہو جاؤں۔ اس سلسلے میں اپنے قریبی احباب سے صلاح
مشورہ بھی کیا اور ان کی بھی یہی رضا تھی، مگر میرے صلاح مشورے کی آخری اور اہم منزل جناب
اجمل خان خٹک تھے، جب میں نے ان سے اس معاملے میں رائے دریافت کی تو انہوں نے کہ
کہ افسر شاہی میں جا کر کیا کر لو گے؟ یونیورسٹی زیادہ بہتر ہے یہاں قوم کی بھلائی کے لیے کچھ
کر سکتے ہو اور خود بھی آرام سے رہو گے۔ خود میں بھی ذاتی طور پر یونیورسٹی کو پسند کرتا تھا اور یوں
اس خیال کو میں نے ذہن کے دریچوں سے دور کر دیا۔

جب میں نے یونیورسٹی کی ملازمت اختیار کی، تب میں نے اسلامیہ کالج کے ہوسٹل میں
باقاعدہ فلیٹ اپنے نام الاٹ کرایا، اس فلیٹ کا نمبر ۱۲ تھا۔ اب یہ فلیٹ میری سرگرمیوں کا مرکز بن
چکا۔ میرے تمام دوستوں کے علاوہ طلبا اور ترقی پسند یہیں آیا کرتے تھے، تاہم امام علی نازش
(جنرل سیکرٹری کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان) کے آنے پر میں ناگواری محسوس کرتا تھا کیونکہ و
دائمی مریض تھے۔ ٹی۔ بی کے ساتھ دمہ کا مرض بھی لاحق تھا اور آتے ہی کھانسنے لگتے تھے، جبک
ساتھ میں پائپ بھی پیتے تھے۔ علاوہ ازیں پولیس اور دیگر ایجنسیوں کو مطلوب ہونے کی بنا پر دائم
انڈر گراؤنڈ رہتے تھے۔ میری مشکل یہ تھی کہ اسے آزادانہ گھما سکتا تھا، نہ ہی کسی کے ساتھ اس ک

سرت بوس کی ہمنوائی میں، ایک جداگانہ متحدہ بنگال کی حق میں رائے دی اور انگریز بھی اس پر متفق ہو چکا تھا، لیکن مرکزی کانگریس نے اس کی مخالفت کی اور وہ نہ مانے۔ میں سمجھتا ہوں بھٹو اور جنرل یحییٰ کا عوامی لیگ کو اقتدار منتقل نہ کرنا اسی سازش کی منطقی کڑی تھی۔

۱۹۷۱ء میں جب پاک وہند کی فوجیں جنگ کے دہانے پر تھیں، ایسے میں چند کشمیریوں کا ہندوستانی ہوائی جہاز اغوا کرنا اور اسے لاہور کے ہوائی اڈے پر اُتارنا اور ذوالفقار علی بھٹو کا اس کو خوش آمدید کہنا، گویا اپنے آپ کو جنگ میں جھونکنے کے مترادف تھا اور یہی ہوا، ہندوستان نے پہلے مشرقی اور مغربی پاکستان کے مابین ہوائی راستے پر پابندی لگادی جس کا خمیازہ ہمیں بنگلہ دیش کی صورت میں برداشت کرنا پڑا۔ بعض لوگوں کا یہ خیال کہ اس جہاز کے اغوا کا ڈراما خود بھارتی ایجنسیوں کا کیا دھرا ہے، اصلاً یہ اس لیے غلط ہے کہ جب میں ۱۹۹۶ میں انگلینڈ میں تھا اور وہاں کشمیریوں سے میرے روابط بنے تو انہوں نے بتایا کہ یہ اغوا پاکستانی ایجنسیوں کے ایما اور حمایت کے نتیجے میں ہوا۔ یہ جہاز اشرف قریشی اور ہاشم قریشی نے مقبوضہ کشمیر سے اغوا کیا تھا۔ بعد میں اغواء کے سلسلے میں اشرف قریشی اور ہاشم قریشی کے علاوہ مقبول بٹ، غلام محمد لون، میر عبدالقیوم اور میر عبدالمنان پر لاہور میں مقدمہ چلا، بھٹو کے اقتدار کے زمانے میں لاہور ہائی کورٹ نے ان لوگوں کو باعزت بری کر دیا۔

صوبہ سرحد میں کمیونسٹ پارٹی کی تاسیس

اگرچہ میں کالج کے زمانے سے ترقی پسند تحریک سے کسی قدر آشنا اور وابستہ ہو چکا تھا لیکن میری اولین تربیت افضل خان بنگش کے بالاخانے میں ہوئی کیونکہ اس بالاخانے کا ماحول مکمل طور سے ترقی پسند تھا۔ اس بالاخانے میں خدائی خدمتگار اور نیشنل عوامی پارٹی کے رہنماؤں اور کارکنوں کا آنا جانا بھی لگا رہتا تھا اور اجمل خٹک کا ڈیرہ بھی یہی تھا، تہکال کے محمد خان کا کا بھی دائمی طور پر یہیں پائے جاتے تھے، یہ بالاخانہ اصل میں افضل خان بنگش کا وکالت خانہ تھا اور ان کے موکل ان سے یہیں ملتے تھے، تاہم سیاسی کارکن اور خصوصاً ترقی پسند رہنما یہیں پر سیاسی مسائل کے حل اور بحث مباحثہ کے لیے جمع ہوتے۔ اس زمانے تک روس اور چین کے طرزِ انقلاب اور طرزِ سوشلزم کی نظریاتی تفریق نے اس بالاخانے کا رخ نہیں کیا تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ایک تو کمیونسٹ لٹریچر آسانی سے دستیاب نہیں تھا اور جب یہ لٹریچر دستیاب ہوا تو اس بالاخانے میں صرف انگریزی اور اُردو زبانوں میں چینی سفارت خانے کی جانب سے ملنے والی کتابیں، رسالے اور ماؤزے دنگ کی تصویر والے بیج دستیاب تھے اور ہم بڑے شوق سے ان بیجوں کو آویزاں کرتے تھے۔

جب روس اور چین کی نظریاتی تفریق پاکستان کمیونسٹ پارٹی میں داخل ہوئی تو نیشنل عوامی پارٹی کا ایک حصہ مولانا عبدالحمید بھاشانی کی صدارت میں چین نواز بن گیا، جبکہ باقی ماندہ پارٹی روس کے ساتھ وابستہ رہی۔ ۱۹۶۸ء میں کمیونسٹ قوم پرستوں اور جمہوریت پسندوں نے عبدالولی خان کی قیادت میں ایک علیحدہ نیپ کی بنیاد رکھی، افضل بنگش اگرچہ چین نواز تھے لیکن اس وقت تک نیپ سے جدا نہیں ہوئے تھے۔ ان کی زیادہ توجہ اور کام ہشتنگر میں تھا اور پھر آپ کسان کمیٹی کے صدر بھی تھے اور یہی وجہ ان کے نیپ سے اخراج کا سبب بھی بنی کیونکہ کوئی کارکن بیک وقت دو سیاسی تنظیموں کا عہدہ دار نہیں بن سکتا اور بنگش صاحب کسان کمیٹی سے استعفیٰ دینے کے لیے تیار نہ تھے۔

صوبہ سرحد میں کمیونسٹ تحریک کے اکثر عہدہ دار چین نواز بن گئے تھے، جبکہ دونوں اطراف (روس نواز اور چین نواز) کی طرف سے ایک دوسرے کے کارکنوں پر محنت اور کنویسنگ کا عمل بھی جاری تھا۔ سی۔ آر اسلم، فرید مطلبی صاحب اور کئی ایک دیگر نے یہ کوشش کی کہ اجمل خٹک

ان کے ساتھی بن جائیں لیکن اپنی اس کوشش میں ناکام ہوگئے۔ اس طرح کی بعض میٹنگز می کے ساتھ میں بھی ہوتا تھا۔ اجمل خٹک کا چینی کیمپ نہ جانے کا بنیادی سبب یہ تھا کہ چین اور نواز، پشتونوں کے ملّی مسئلے سے انکاری تھے، جبکہ قوم پرستوں کو وہ بورژوا سمجھتے تھے۔ دوسری ط اجمل خٹک سیاسی طور پر باچا خان اور ولی خان کے زیرِ اثر تھے اور اپنی وضعداری کے سبب ا چھوڑ نہیں سکتے تھے، نتیجتاً نظریاتی طور پر تنہا رہ گئے۔

غالباً ۱۹۷۱ء کا سال تھا کہ امام علی نازش پشاور آ گئے، ان دنوں اجمل خٹک روزنامہ "شہ کے دفتر، واقع نذر باغ فلیٹس جی ٹی روڈ میں ڈیرہ ڈالے ہوئے تھے۔ یہیں نازش کی موجودگی کمیونسٹ پارٹی کا پہلا اجلاس منعقد ہوا جس میں نازش اور اجمل خٹک کے علاوہ صوفی (راق سید مختار باچہ، سرن زیب خان اور عاصی ہشنغرے شریک تھے۔ نازش نے اس تاریخی اقدا ہمیں مبارک باد دی۔ اُسی شام سرن زیب خان نے ایک طویل خط لکھ کر اجمل خٹک کو دیا میں دیگر باتوں کے علاوہ عاصی پر یہ اعتراض کیا تھا کہ وہ ایک بے اعتبار اور ناقابلِ بھروسا ہے اور ہمارے راز حکومت کے سامنے افشا کرے گا۔ دوسرا اہم اعتراض یہ تھا کہ وہ مسلمان ہ اللہ اور اس کے رسول پر پکا یقین رکھتے ہیں جبکہ کمیونزم مذہب کے ساتھ کوئی سروکار نہیں رکھتا او کہ میں کسی صورت اپنا عقیدہ نہیں چھوڑ سکتا، اس لیے میں کمیونسٹ پارٹی کے اجلاسوں میں شرک سے معذور ہوں۔ سرن زیب خان اس تاسیسی اجلاس کے بعد ہم سے جدا ہو گئے۔ عا ہشنغرے طبعی طور پر نظرانداز کر دیے گئے اور پارٹی میں زیادہ دن ٹھہر نہ سکے، بعد میں افراسیاب خٹک ہمارے گروپ میں شامل ہو گئے۔ اصلاً یہ صوبائی تنظیم تھی اور اس کے اکثر اجلاس میرے کمرے میں ہوتے تھے۔

میر اکبر خیبر کی میزبانی اور مہمانداری

میں بیچلر ہوسٹل میں تھا کہ مولانا نازش آ گئے۔ ان کی خواہش تھی کہ ہم لوگ افغانستان کی پرچم پارٹی کے ساتھ اپنا تعلق جوڑیں۔ اس وقت مزدور کسان پارٹی کا تعلق افغانستان کی ایک دوسری کمیونسٹ دھڑے "خلق" سے جُڑ چکا تھا اور یہ لوگ عوامی جمہوریت کے سفر پر رواں دواں تھے جبکہ ہم قومی جمہوریت کے داعی تھے۔ میں اور اجمل خٹک بہت پہلے سے "پرچم" کے ساتھ رابطہ میں تھے۔ پرچم افغانستان میں باچا خان کی اور پاکستان میں نیپ کی حمایتی تھی۔

پارٹی کی طرف سے مجھے ڈیوٹی دی گئی کہ خفیہ طور پر کابل جاؤں اور وہاں پرچم کے رہنماؤں سے ملوں اور انہیں اجمل خٹک کا خط بھی پہنچا آؤں۔ یہ سخت سردی کا زمانہ تھا، میں سادہ شلوار قمیص، ٹوپی پہنے اور چادر اُوڑھے ملک نادر خان کے کزن دوست محمد کے ساتھ کابل کے لیے روانہ ہوا۔ روانگی سے پہلی والی رات میں نے ان کے حجرے، اشرف کلے (جسے اب نادر خان کلے کہا جاتا ہے) میں گزاری۔ سخت سردی کے اس موسم میں جب کابل پوری طرح سے برف میں ڈھکا ہوا تھا اور میں قبائلی طرز کے کپڑوں میں ملبوس تھا جبکہ پاؤں میں بوٹ کے بجائے پشاوری چپل تھے۔ ہم سیدھے نادر خان کے گھر واقع 'کارتہ ءسہ' گئے۔ نادر خان کا خاندان سردیاں گزارنے کے لیے اپنے ہی گھر واقع جلال آباد شفٹ ہو چکے تھے۔ نادر خان 'کارتہ پروان' میں گھر بنانے سے پہلے کابل میں کرایہ کے مکان میں رہا کرتے تھے۔ میں بہانے سے دوستی (دوست محمد) سے علیحدہ ہوا اور 'کارتہ پروان' ہی میں ڈاکٹر نجیب اللہ کے گھر چلا گیا، مگر بدقسمتی سے نجیب گھر پر موجود نہ تھے۔ وہ پرچم کے دفتر واقع مکرویان میں تھے (اس زمانے تک مکرویان ۲، ۳، اور ۴ تعمیر نہیں ہوئے تھے)۔ مجھے پرچم کا دفتر معلوم نہ تھا کہ کس بلاک اور کس اپارٹمنٹ میں ہے۔ میں توکّل کر کے مکرویان چلا گیا، مختلف بلاکس کے درمیان برف پوش زمین پر پشاوری چپل پہنے گھوم رہا تھا کہ سامنے سے میر اکبر خیبر آ رہے تھے، خیبر بھی گھر سے پرچم کے دفتر کے لیے نکلے تھے۔ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے کہ میں اور یہاں؟ بہر حال میں ان کے ہمراہ دفتر گیا۔ وہاں ببرک کارمل، اناھیتا راتبزاد اور شاید نور احمد نور پہلے سے موجود تھے۔ میں نے اجمل خٹک کا خط ان کے حوالے کیا، انہوں نے مشترکہ طور پر پڑھا اور کافی خوش ہوئے۔ اِن لوگوں نے میری تواضع اور مدارات

کی۔اس ملاقات کے بعد میں واپس نادرخان کے گھر گیا اور دوستی سے بہانہ کیا کہ جس شخص سے ملنے گیا تھا، وہ نہیں ملا۔ میں نے اس سے واپس پاکستان جانے کا کہا اور غالباً اسی دن ہم واپس جلال آباد آگئے اور جہاں نادرخان کے گھر رات گزاری۔ دوسری صبح سویرے ہم نے طورخم بارڈر کراس کیا، وہ گاؤں چلا گیا جبکہ میں یونیورسٹی واپس آیا۔

اس مہم جوئی کے تقریباً ایک دومہینہ بعد خیبر، میرا جان سیال کوڈاخیل کے دو بھتیجوں سلیم اور سرفراز کے ساتھ، جو پرچمی تھے، میرے کمرے میں وارد ہوئے۔ یہ لوگ پاپیادہ براستہ مہمند شبقدر آئے تھے اور پھر وہاں سے میرے پاس آئے تھے۔ ان کے آنے سے ایک بڑی ذمہ داری میرے کندھوں پر آن پڑی۔ خیبر صاحب کو خفیہ رکھنا تھا، کیونکہ انکا افشاء ہونا پارٹی اور خود میرے لیے بڑی شرمندگی اور پشیمانی کا باعث بن سکتا تھا۔ میرے کمرے میں تو ہر قسم کے لوگ آیا کرتے تھے جن میں میرے گاؤں والے، دوست، پی۔ ایس۔ ایف کے سٹوڈنٹس، میرے کولیگ اور دیگر بن بلائے مہمان قیام پذیر ہوتے۔ اس کے علاوہ دوسری محفوظ جگہ نہیں تھیں۔ ڈاکٹر نذیر اُن دنوں ٹریژرر تھے، لیکن میں اس پر زیادہ بھروسہ نہیں کرسکتا تھا۔ میں مجبور تھا کہ جب تک پارٹی کے رہنماؤں کو خبر ہو اور وہ لوگ ان کا کچھ بندوبست نہیں کرتے، خود بھی اِن کے ساتھ اپنے کمرے میں قید رہوں اور انہیں بھی باہر جانے نہ دوں، اور اگر مجھے کالج یا کسی دوسرے ضروری کام سے باہر جانا ہوتا تو میں انہیں کمرے میں چھوڑ کر باہر سے تالا لگایا کرتا تھا اور اگر ہم دونوں کمرے کے اندر ہوتے تب بھی باہر سے تالا اس غرض سے لگایا کرتا تھا کہ آنے والوں کو معلوم ہو کہ میں کمرے میں نہیں ہوں، تاکہ کسی کو خبر نہ ہو۔ چند دن تک یہ احتیاط کرتا رہا تاہم خیبر صاحب کے لیے رسائل واخبارات لایا کرتا تھا۔ سننے کے لیے ریڈیو بھی موجود تھا اور کھانے پینے کے لیے اشیاء بھی موجود ہوتی تھیں، انہیں پکایا کرتے تھے۔ ایک آدھ مرتبہ تاریکی میں اسلامیہ کالج اور یونیورسٹی بھی گھوم آئے تھے۔ یہ وہ دن تھے جب پاکستان ٹوٹ چکا تھا اور اقتدار بھٹو کے ہاتھ آگیا تھا جبکہ ابھی تک صوبہ سرحد میں نیپ اور جمعیت کی مخلوط حکومت شاید قائم نہیں ہوئی تھی۔ ان ہی دنوں نازش آگئے، تب میرا اکبر خیبر ڈاکٹر نذیر کے گھر منتقل ہوئے۔ ڈاکٹر نذیر کے گھر اجمل خٹک، خیبر اور نازش وغیرہ نے کئی میٹنگز کیں اور اہم فیصلے کیے۔ چونکہ میں یونیورسٹی میں ملازم تھا، اس لئے خیبر کو سید مختار باچہ کے حوالے کر دیا گیا، یوں میں خیبر کی ذمہ داری سے آزاد

ہوا۔ خیبر نے چند دن پشاور میں سرفراز اور سلیم کے رشتہ داروں کے ہاں بھی گزارے تھے۔ مختار باچہ اسے سیر کے لیے سوات لے کر گئے تھے اور وہاں انہوں نے فتح محمد خان کے ہاں بھی قیام کیا تھا۔ چند دنوں کی سیاحت اور یہاں کے کمیونسٹ کامریڈوں سے میل ملاقات کے بعد میرا اکبر خیبر اپنے جاننے والوں کے ساتھ کوڈاخیل مہمند ایجنسی کے راستے افغانستان واپس چلے گئے۔ آج میں سوچتا ہوں کہ کہ میرا اکبر خیبر اسلامیہ کالج کے بیچلر ہوسٹل کے جس فلیٹ نمبر۱۲ میں چند دن مہمان رہے، اُسے میرا اکبر خیبر کے نام سے موسوم کیا جانا چاہیے، اور یونیورسٹی کی انتظامیہ متفق ہو تو ان کے نام کی تختی لگادی جائے۔ دراصل میرا اکبر خیبر وہ فرد تھے جن کے قتل کے بعد افغانستان اور پھر پاکستان میں وہ خون خرابہ شروع ہوا، اور اُس تباہی کا آغاز ہوا جو تیس بتیس برس گزرنے کے باوجود تھمنے کا نام نہیں لیتی۔

میر اکبر خیبر بے مثال مدبر، نظریہ ساز اور سیاستدان تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ صدر داؤد کو ہر قیمت پر سپورٹ کیا جانا چاہیے۔ ان کے بقول داؤد کے خلاف سازش اور بغاوت افغانستان کے ساتھ بڑا دغا اور جفا ہوگی۔ خیبر صاحب اُس وقت پرچم پارٹی کی طرف سے مسلح افواج میں پارٹی تنظیم کے انچارج تھے۔ صدر داؤد کی ریپبلکن گارڈ پرچمی افسروں سے بھری پڑی تھی اور ان کے کمانڈر بھی ایک پرچمی، ضیا مجید تھے۔ موصوف کا وہ قول اب بھی مجھے یاد ہے جو انہوں نے ۱۹۷۳ء میں میرے سوال کے جواب میں مجھ سے کہا تھا۔ اُنھوں نے کہا تھا ''داؤد خان کو ہٹانا اور اقتدار پر قبضہ کرنا ہمارے لیے چند لمحوں کا کام ہے، مگر ہمارا یہ عمل افغانستان کے عوام کے ساتھ عظیم خیانت ہوگی، کیونکہ عام افغان ہمارے ساتھ نہیں ہیں''۔ اُن کی یہ پیش بینی کتنی سچ ثابت ہوئی۔ [۳]

ہم کابل پہنچ گئے اور پل خشتی کے مسجد سے تھوڑا شمال مشرقی جانب کابل دریا کے کنارے شعبہ بازار کے ایک عام سے ہوٹل 'فولادی ہوٹل' میں کمرہ لیا۔ وعدے کے مطابق دوسرے دن ہم نے کابل ننداری سنیما کے آس پاس کئی چکر لگائے لیکن کوئی بھی ہمیں لینے نہیں آیا اور یوں ہی واپس اپنے کمرے آگئے۔ باسط بہت مایوس تھا اور اگلے دن پشاور کے لیے روانہ ہوا۔ میں نے اپنا بکس لیا اور نجیب کے گھر کارتہ پروان چلا گیا۔ چند دن کابل میں رہا۔ فلمیں دیکھیں، سیاستدانوں سے ملا، باچا خان سے ملنے گیا، اچھی طرح گھوما پھرا، کچھ خریداری کی جس میں دو کالی عینک بھی تھے اور واپسی کے لیے سامان باندھ لیا لیکن جب معلوم ہوا کہ واپس جانے کا پروگرام ملتوی ہو گیا ہے تو یہ عینک میں نے نجیب کے چھوٹے بھائیوں احمد زئی اور روشان کو تحفے میں دیدیے۔ میں جب واپسی کے لیے پوری طرح تیار تھا کہ نجیب میرے پاس آگئے اور کہا کارمل آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ کارمل اس وقت مکرویان میں پرچم کے دفتر میں تھے۔ کارمل نے مجھ سے کہا کہ سوویت دوست آپ کی تلاش میں ہیں۔ میں نے ان کے ساتھ جانے کا وقت مقرر کیا، نجیب اور دیگر لوگوں کو اس کی اطلاع نہیں دی۔ اُس وقت صرف روشان اور احمد زئی گھر پر موجود تھے، میں نے ان سے بہانہ کیا کہ میں واپس پاکستان جا رہا ہوں، ان کو تحفے میں عینک دیے اور سہ پہر کو اپنے بکس اور سامان کے ساتھ ان کے گھر سے نکلا، کارتہ پروان کے عمومی روڈ پر دو سوویت دوست جیپ میں میرے انتظار میں تھے، ان کے ساتھ جیپ میں سوار ہوا اور وہ مجھے علاقہ جمال مینہ میں ایک گھر لے گئے جہاں یہ لوگ رہ رہے تھے۔ بعد میں کابل میں پتہ چلا کہ یہ گھر ڈاکٹر محمد حسن شرق کا تھا، جہاں یہ لوگ کرایہ دار تھے۔ اِن سے معلوم ہوا کہ کابل ننداری کے پاس معینہ دن ہم لوگ ایک دوسرے کو دیکھ نہ پائے اور بھیڑ کی وجہ سے ایک دوسرے کو پہچان نہ سکے، اس لیے اس دن ملاقات نہ ہو سکی۔ میں نے دو دن شرق صاحب کے اس گھر میں گزارے۔ تیسرے دن میں تین روسیوں کے ساتھ اس وقت کے روس افغان بارڈر شیر خان بندر روانہ ہوا۔ ان تین روسیوں میں ایک ویلیور گابریلوچ اوساپچی تھا۔ ویلیور گابریلوچ بعد میں سوویت مداخلت کے بعد افغانستان میں صدر ببرک کارمل کے سینئر مشیر مقرر ہوئے، جبکہ کچھ عرصے بعد ماسکو یا سوچی میں حرکتِ قلب بند ہونے سے انتقال کر گئے۔ شیر خان بندر جاتے ہوئے ہم راستے میں کھانے کے لیے رک گئے تھے، مجھے درست طور سے یاد نہیں آرہا کہ آیا یہ مقام سالانگ تھا یا سالانگ سے آگے پلِ خمری کے

میرا ماسکو کا خفیہ دورہ

پاکستان کمیونسٹ پارٹی انڈر گراؤنڈ ہونے کے علاوہ اس کے فیصلے بھی خفیہ ہو
تھے۔اور وہ مسائل، جن پر کھل کر اظہارِ خیال کیا جاسکتا تھا، اسے بھی ہم انڈر گراؤنڈ طریقے
حل کرنا چاہتے تھے۔ اگر چہ حالات کمیونسٹ پارٹی کے لیے سازگار نہیں تھے اور اس پر بہت ز
پریشر بھی تھا، لیکن انتہا پسندی بھی ماورائے عقل ہوتی ہے۔ ۱۹۷۲ء میں مجھے اجمل خان خٹک
ذریعے حکم دیا گیا کہ میں ایک کورس کے سلسلے میں ماسکو (روس) جاؤں۔ میں اس لیے مان گیا
کوئی دوسرا چارہ نہ تھا کیونکہ میرا شمار تابعدار کارکنوں میں تھا اور خود میں بھی انقلاب کا داعی
اسیر تھا۔ مجھ سے کہا گیا کہ اس فیصلے کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو یہاں تک کہ پارٹی کے قر
خیر خواہوں کو بھی جانکاری نہ ہو۔

آخر یہ کورس کس نوعیت کا اور کتنے دورانیے کا ہوگا، کسی نے بھی مجھے معلومات نہ
دیں، یہاں تک کہ اجمل خٹک بھی اس سے بے خبر تھے، بلکہ یہ تو اُس کے تصور سے بھی بعید امر تھ
ان حالات میں ایسا کوئی بھی نہیں تھا جو مجھے یہ سمجھاتا کہ میں ملازمت سے چھٹی لوں یا استعفیٰ دو
یا یہ کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ مجھے جلد واپس آنا ہے اور اس حکم کے صادر ہونے
وقت ہماری گرمیوں کی چھٹیاں بھی تھیں۔ میں بھی اِن نزاکتوں میں نہیں پڑا۔ میں تو ایک سی
سادہ اور کمٹڈ ورکر تھا کہ ایک مرتبہ ہاں کہا، تو اب اس سے پیچھے کیسے ہوتا۔ میں نے یہ جانا کہ
ایک اہم آدمی ہوں اور ایک اہم کام کے سلسلے میں جا رہا ہوں۔

آخر فیصلے کی گھڑی قریب آ گئی، ۱۸ اگست میرے کوچ کا پروگرام تھا، اس سفر میں لاہو
ایک نوجوان باسط میر بھی میرا ساتھی تھا۔ میں نے پاسپورٹ بنا لیا تھا اور ہدایت تھی کہ پاسپور
میرے پاس ہو۔ ہم دونوں کابل کے لیے روانہ ہوئے اور یہ حکم تھا کہ ہم دونوں منطقہء جشن
کابل ننداری سینما کے آس پاس رہیں، اب یاد نہیں کہ ہمارے ہاتھوں میں گلاب کے پھول ہو
گے یا کوئی رسالہ۔ بہر حال یہ کہا گیا تھا کہ ایک روسی جیپ سوار سینما کی حدود میں ہمارے قری
آئے گا اور کہے گا ''Are you Juma from Peshawar'' اور جواباً میں کہوں گا ''Yes''
دونوں اُس روسی کے ساتھ جیپ میں سوار ہو کر اُس کے حوالے ہو جائیں گے۔

قریب دریا کے کنارے ایسی خوراک کھائی جس میں نیم پختہ ٹھنڈا گوشت تھا، جس کی وجہ سے میری طبیعت بگڑ گئی اور میں نے اُلٹیاں کیں۔ وہ لوگ مجھ پر ہنس رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ اس کے عادی ہو جاؤ گے۔ میں دراصل آذربائیجانی کے طور پر سوویت پاسپورٹ پر سفر کر رہا تھا اور اس میں میرا نام پرویز محمد وف درج تھا۔

ہم لوگ ظہر اور عصر کے درمیان میں شیر خان بندر پہنچ گئے۔ اس بارڈر کے آر پار افغان اور روسی مامورین اور محافظین کنٹینروں اور لکڑی سے بنے عارضی کیبنوں اور کمروں میں رہ رہے تھے۔ ہم لوگ بڑی آسانی کے ساتھ افغان امیگریشن سے ہو کر گئے۔ روسی مال بحری جہازوں میں لد کر آ رہا تھا۔ ہم بھی دریائے آمو کے کنارے کھڑی ایک کشتی میں سوار ہوئے اور دریا پار گئے، وہاں چائے پی۔ میرے ساتھ آنے والے تین میں سے دو روسی افغان بارڈر پر رک گئے۔ ہم لوگ ایک موٹر میں سوار اگلی منزل کے لئے روانہ ہوئے۔ راستے میں چھوٹے بڑے گاؤں اور شہر آتے گئے۔ زیادہ یاد نہیں ہے کہ روسی (تاجکستان) بارڈر پر اور کون لوگ ہمارے ساتھ سوار ہوئے، شاید ہم نے رات لینن آباد میں گزاری یا رات گئے تاجکستان کے دارالخلافہ دوشنبہ پہنچ گئے تھے۔ دوشنبے میں ہم سرکاری مہمان خانے گئے، جہاں ہر سہولت موجود تھی۔ اس مہمان خانہ میں ایک بڑا خوراک خانہ یعنی ڈائننگ روم تھا جہاں خوبصورت روسی لڑکیاں ترتیب وار کھانے پینے کی اشیاء لا رہی تھیں۔

میں نے چند دن دوشنبے میں گزارے اور اچھی طرح گھوما پھرا۔ دوشنبے کے قریب پہاڑی علاقے گرمیاں گزارنے کے نہایت اچھے مقامات ہیں، وہیں میں مہمان تھا۔ یہاں میں نے کئی فلمیں دیکھیں۔ ہفتہ دس دن بعد ماسکو میں کمیونسٹ پارٹی کے عہدہ دار اور مرکزی کمیٹی میں پاکستانی امور کے ذمہ دار (شاید پلیشوف) آ گئے۔ اُس نے اپنے گھر کے لیے 'خربوزے' خریدے اور پھر ہم دونوں ہوائی اڈے کی طرف گئے۔ یہ میرا پہلا فضائی سفر تھا، اس سے پہلے اگرچہ ایئرپورٹ تو دیکھ چکا تھا لیکن سفر سے محروم تھا۔ تقریباً چھ گھنٹے کے طویل فضائی سفر کے بعد ہم ماسکو کے داخلی ایئرپورٹ (شاید 'دامادیدوا' ایئرپورٹ) پر اترے۔ میں ایک اہم مہمان تھا، اس لیے وی۔ آئی۔ پی یعنی 'دیپوتاتسکی زال' کے راستے سے نکلے اور بلیک 'وولگا' کار میں بیٹھ کر سوویت یونین کے کمیونسٹ پارٹی کے مرکزی کمیٹی کے ہوٹل (پرانے والا اکتوبر ہوٹل) گئے جو وزارت

خارجہ کے دفتر کے پشت پر سکاچرسکی پریوولک (کوچہ ءسکارچرسکی) میں واقع تھا۔ اس وقت تک اکتوبر سڑک (انقلاب اکتوبر کے حوالے سے) نیا اکتوبر ہوٹل یعنی ''اکتیابرسکایا گستانیتسا'' ابھی نہیں بنا تھا۔ تھوڑی سی روسی جو سیکھ چکا تھا اسی سے کام لے رہا تھا البتہ تفصیلات ماسکو آنے جانے سے معلوم ہوتی گئیں۔

چند دن میں اکتوبر ہوٹل میں مقیم رہا، یہ ستمبر کے ابتدائی دن تھے، کئی تاریخی مقامات اور عجائب گھروں کی سیر کی۔ ہر شام میوزک اور آرٹ کے پروگرموں میں شرکت کے لیے لے جایا گیا۔ اُس امریکی جہاز کے باقیات اور پائلٹ گیری پاول کا لباس بھی دکھایا گیا، جو ۱۹۶۰ء میں پشاور سے اُڑا اور جسے سوویت یونین کے حدود میں داخل ہونے کے بعد روسیوں نے گرایا تھا۔ ایک دن مجھے ایک موٹر کار میں بٹھا کر ماسکو شہر کے درمیان سے ہوتے ہوئے شہر سے باہر لے گئے۔ ماسکو کے پدمسکوا (مضافات) میں 'زاگورسک' نامی جگہ پہنچے جہاں کئی ایک تاریخی کلیسائیں ہیں، مجھے ایک جنگل لے جایا گیا جہاں کمیونسٹ پارٹی کا پارتینہ شکولہ (پارٹی سکول) تھا۔ جو ایک وسیع وعریض عمارت، لیبارٹری، ہاسٹل، کھانے کا میس، سپورٹس کی سہولیات، سنیما، الغرض ایک پورا اور مکمل کمپلیکس تھا۔ یہاں دوسرے ممالک اور خطوں کے انڈر گراؤنڈ کارکنوں کی تربیت ہوتی تھی، یہاں میرا تعارف ایک افغان ''احمد شاہ'' کے طور پر کرایا گیا۔

اِس سکول میں تربیت پانے والے تبدیل ہوتے رہتے تھے مگر اکثریت برٹش گیانا، جنوبی افریقہ اور صومالیہ کے جوانوں کی تھی۔ گیانا سے تقریباً بیس افراد تھے۔ گیانا میں سیاہ فام اور ہم جیسے گندمی رنگت والے ہندی نژاد لوگ ایک ساتھ رہتے ہیں۔ اس سکول میں گیانا کے وزیر اعظم چیڈی جگان (ہندی نژاد) کی بیٹی اپنے عاشق کے ساتھ موجود تھی۔ اس زمانے میں گیانا میں سیاہ فام 'برنم' کی حکومت تھی جو امریکہ نواز تھے جبکہ چیڈی جگان بائیں بازو کی جماعت پیپلز پارٹی کے سربراہ تھے۔ مجھے ایک سیاہ فام گیانوی کے ساتھ کمرے میں ٹھہرایا گیا۔ کمرے میں ٹائلٹ موجود تھا تاہم نہانے کے لیے ایک اجتماعی باتھ روم ہوسٹل کے کونے میں تھا جہاں سب لوگ ایک ساتھ شاور کے نیچے ننگے نہاتے تھے۔ تاہم لڑکیوں کے لیے علیحدہ باتھ روم تھا۔ گیانوی رومیٹ نہانے کا زیادہ شائق نہیں تھا بلکہ ٹرکش باتھ (گیلے تولیہ سے بدن رگڑنا) کا قائل تھا اور وہ بھی اپنے کمرے کے باتھ روم کے شینک میں۔

ستمبر یا اکتوبر ہی میں ہماری کلاسز شروع ہوگئیں، اگر چہ تمام درس روسی زبان میں تھے لیکن ترجمان موجود ہوتے تھے۔ یہ ترجمان انگریزی میں ترجمہ کرتے تھے، جس کی وجہ سے کوئی مشکل پیش نہ آتی تھی۔ ہمیں تین مختلف اساتذہ، سیاسی اقتصاد، کمیونزم، اور فلسفہ پڑھانے آیا کرتے تھے۔ اقتصادیات کے استاد جو ایک کمیونسٹ تھے، اس کیساتھ میں بحث کرتا تو خفا ہوتے۔ اِن کلاسز کے علاوہ مجھے ایک اور خصوصی کلاس میں پرنٹنگ، فوٹو گرافی اور انڈر گراؤنڈ پروپیگنڈا کرنے کی تربیت دی گئی۔ تعلیم وتربیت کا سلسلہ جاری تھا لیکن مجھے پاکستان میں اپنی ملازمت اور یوں بغیر بتائے غائب ہونے کی فکر بھی لاحق تھی۔ سو بہانہ کر کے کالج میں، میں چھ مہینے کی بغیر تنخواہ چھٹی کی درخواست دے دی۔ مگر اپنے خاندان کے ساتھ میں نے کیا کیا؟ میں نے اپنے گھر والوں کو لکھا کہ میں کراچی میں ہوں اور جس معصوم لڑکی کے ساتھ میری منگنی ہوگئی ہے اس کے ساتھ میں شادی نہیں کرسکتا، اسے بھی آزاد کرنے کے لیے خط لکھا۔ اس طرح یہ معاملات سنبھل گئے۔ زیارت خان مجھے ڈھونڈنے کراچی بھی گئے مگر لاحاصل۔ اصلاً میرے خطوط روسی لوگ لے کر کراچی سے پوسٹ کرتے تھے۔ اگرچہ میں حقیقتاً غائب تھا لیکن اِن خطوط سے یہ تاثر ملتا کہ میں پاکستان میں ہوں۔

اِس ٹریننگ سنٹر میں تعلیم وتربیت کے علاوہ ہم ہر ہفتے کی شام بالشوئے تھیٹر میں بیلے دیکھنے، کبھی کبھار ماسکو سرکس دیکھنے، کبھی اوپیرا (opera) دیکھنے، کبھی کبھار کانگرس ہال میں مشہور کنسرٹ دیکھنے جاتے، جہاں ڈنر، میوزک اور ڈانس ہوتا۔ خود اس ٹریننگ سنٹر میں بھی مختلف دن مختلف انداز میں منائے جاتے جس میں موسیقی، ڈانس اور کھانا ہوتا۔ دن کے وقت ہم 'کلخوزوں' (مشترکہ کواپریٹو فارم)، 'سفخوزوں' (ریاستی کواپریٹو فارم) یا کارخانوں کو جاتے۔ اس سکول کے اندر سینما میں بھی مختلف انقلابی فلمیں دکھائی جاتی تھیں، یہ تفریح اتوار یا پھر کسی اور چھٹی کے دن ہوتی تھی۔

میرے ٹریننگ اور تعلیم کے دنوں میں ہی انقلابِ اکتوبر کی 55 ویں سالگرہ آ گئی۔ دراصل روس میں کمیونسٹ انقلاب ولاڈی میر ایلیچ لینن کی قیادت میں ۱۹۱۷ء میں برپا ہوا تھا اور یہ پرانے کیلینڈر کے مطابق اکتوبر کا مہینہ تھا۔ انقلابِ اکتوبر کی سالگرہ کا یہ دن پورے سوویت یونین میں خوشی اور جشن کا دن ہوتا تھا۔ روس کی جدید تاریخ میں یہ ایک اہم دن ہے اور اسے منانا سوویت

یونین میں فطری اور طبعی بات تھی۔ اس دن کی مناسبت سے جدید کیلنڈر کے مطابق ۷ نومبر کو کریملن کے سامنے کراسنایا پلوشاد (ریڈ سکوایئر) میں ایک بہت بڑی فوجی پریڈ ہوتی تھی جس میں فوجیوں کے علاوہ بڑی تعداد میں عام لوگ، اساتذہ، لکھاری، شاعر، فنکار، غرض زندگی کے ہر شعبے سے وابستہ نمائندہ لوگ ایک بڑے جلوس کی شکل میں لینن کے مقبرے کے سامنے سے گزر رہے ہوتے تھے جبکہ چبوترے پر سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی، اور حکومتی عہدہ دار کھڑے فوجی جلوس سے سلامی لیتے۔ مجھے بھی یہ پریڈ دیکھنے کی دعوت دی گئی تھی۔

اس عظیم الشان پریڈ سے ایک دن پہلے کانگرس ہال کریملن میں سوویت پارٹی کے اعلیٰ عہدیداران اور مہمان عالمی کمیونسٹ تحاریک کے رہنماؤں کا ایک عظیم اجتماع ہوتا تھا جس میں سوویت یونین کے کمیونسٹ پارٹی کے مرکزی کمیٹی کے جنرل سیکرٹری 'لیونداِ ایلیچ بریژنیف' کا اہم پالیسی خطاب ہوتا تھا۔ کمیونسٹ پارٹی آف سوویت یونین، حکومت اور ریاست کے عہدہ دار سٹیج پر براجمان ہوتے تھے۔ میں بھی اس اجتماع میں شامل تھا اور بریژنیف کے سامنے بائیں طرف مہمانوں کی قطار میں بیٹھا تھا، اس تقریر کا ترجمہ ساتھ ساتھ مختلف زبانوں ہو رہا تھا۔ یہ دن میرے لیے حقیقتاً ایک بڑا دن تھا۔

روس میں قیام کے ابتدائی دنوں میں میرے ذہن میں یہی تھا کہ تین مہینے کے بعد میرے پاکستان واپس جانے کا بندوبست ہوگا مگر تین مہینے گزرنے کے باوجود کسی نے میری خیر خبر نہ لی، میں یہاں تنگ آچکا تھا۔ میرے اس طرح غائب ہونے سے کئی ایک مسائل اور المیوں کے وہم میرے ذہن میں آتے۔ میں سوچتا کہ یہ سوال ضرور اٹھ سکتا ہے کہ کیسے یونیورسٹی کا ایک پروفیسر جو ٹھیک ٹھاک ہوا اور اسے کوئی تکلیف بھی نہ ہو، کیسے غائب ہوگیا ہے؟ کہاں چلا گیا؟ کسی نے اغوا کیا؟ یہ تمام سوالات میرے لیے پریشان کن تھے۔ میں نے روسیوں سے کہا کہ مجھے واپس جانا چاہیے تاہم کسی نے میری بات کو توجہ نہیں دی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری غیر موجودگی میں نازش اور اس کے مختصر حلقے نے میرے بارے میں کیا فیصلے کیے، کیونکہ روسیوں نے مجھے بتایا کہ مجھے فوجی ٹریننگ میں پر بھی جانا ہے۔ میں بھی اپنی ضد پر اڑا رہا کہ ہر حالت میں واپس پاکستان جاؤں گا۔ انہوں نے مختلف بہانوں سے مجھے مزید دو مہینے روکے رکھا۔ اور جب میں نے بانگ دہل احتجاج شروع کیا تو وہ لوگ مجبور ہوئے اور میری واپسی کا بندوبست کیا۔

شاید جنوری ۱۹۷۳ء میں میری واپسی ممکن ہوئی۔ مجھے ماسکو سے براستہ تاجکستان، شیرخان بندر، قندوز، کابل، جلال آباد پہنچایا گیا۔ جلال آباد میں محمد اسرار (صدر صاحب) کے صاحبزادے اور میرے دوست نثار لالہ کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر رؤف ننگرہار میڈیکل کالج میں پڑھتے تھے۔ میں ان کے پاس چلا گیا اور رات اس کے ساتھ گزاری۔ بظاہر تو اسے پتہ نہیں چلا کہ میں کہاں گیا تھا اور کہاں سے آرہا ہوں اور ہوسکتا ہے اسے شک ہوا ہو، تاہم اس نے کچھ ظاہر نہیں کیا۔ اگلے دن میں پاکستانی پاسپورٹ کے توسط سے طورخم کے راستے 24 جنوری 1973ء کو پشاور پہنچا۔ اس طرح اس وقت سوویت یونین کا خفیہ سفر، وہاں سے ترقی پسند نظریات کی سیاسی تعلیم وٹریننگ کا ماجرا اگرچہ اختتام پذیر ہوا لیکن زندگی اور نظریات کی نئی راہوں کی کہانی اب بھی باقی ہے۔

حصہ سوم

پہلی بات

ہمارے خطے میں اور خصوصاً پاکستان اور افغانستان میں انتہا پسندی اور دہشت گردی کے حوالے سے جو خاک وخون کا سیلاب رواں دواں ہے اور گزشتہ ۳۳۔۳۴ سال سے افغانستان جس المیے کا سامنا کر رہا ہے اس کے بارے میں مختلف لکھنے والے اور تجزیہ نگار اس صورتِ حال کی پیدائش اور ابتداء کے بارے مختلف عوامل کی نشاندہی کرتے ہیں جو جزوی طور پر سچ ہو سکتے ہیں، لیکن ایک عمومی عامل جو اس زمانے میں امریکہ اور سوویت یونین کے مابین 'سرد جنگ' کے نام سے مشہور تھا ساری دنیا کی سیاست پر حاوی تھا۔ اس پر تمام تجزیہ کار متفق ہیں۔ تاہم داخلی اور اندرنی عوامل پر اتفاق موجود نہیں ہے۔

اس تمام معاملے میں افغان تجزیہ کار تین گروہوں میں منقسم ہیں:

۱۔ وہ تجزیہ کار جو داؤد خان کو اس سارے قضیے کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں کہ انہوں نے ظاہر شاہ کا تختہ الٹ کر آئندہ کی بغاوتوں کا راستہ ہموار کیا۔

۲۔ وہ تجزیہ کار جو اپریل ۱۹۷۸ء کے انقلابِ ثور کو ذمہ دار گردانتے ہیں، جس کے نتیجے میں خون بہنا شروع ہوا اور خارجی قوتوں کو دعوت دینے کا سلسلہ شروع ہوا۔

۳۔ وہ تجزیہ کار جو افغانستان میں سوویت افواج کی آمد کو اس معاملے کا ذمہ دار سمجھتے ہیں۔

پاکستان کے دائیں بازو کے تجزیہ کار بھی اسی طرح تین گروہوں میں تقسیم نظر آتے ہیں، مگر یہ لوگ سارا الزام سوویت یونین اور کمیونزم پر ڈالتے ہیں۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ سوویت یونین دراصل افغانستان کے راستے پاکستان پر قبضے کا خواہاں تھا اور گرم پانیوں تک رسائی چاہتا تھا۔

دوسری طرف آزاد، لبرل اور بائیں بازو کے تجزیہ نگار بھی دو حصوں میں بٹے نظر آتے ہیں۔

ا۔ ۱۹۷۴۔۱۹۷۵ میں پاکستان کی جانب سے گلبدین حکمتیار، برہان الدین ربانی، احمد شاہ مسعود اور دیگر اخوان عناصر کو پاکستان میں منظم کرنا اور فوجی تربیت دینے کو اس قضیے کا پیش خیمہ قرار دیتا ہے۔

ب۔ دوسرے گروہ کے نزدیک اس معاملے کی اصل جڑ پاکستان کی جانب سے افغان انقلاب اور سوویت افواج کے افغانستان میں داخلے کے خلاف مجاہدین کو تربیت دینا، انہیں مسلح

کرنا اور پاکستان میں ان کے کیمپ قائم کرنا ہے۔ اور دونوں عوامل ایک دوسرے سے جڑے ہونے کی تصدیق کرتے ہیں۔

اب ایسے تجزیہ کاروں میں اضافہ ہو رہا ہے جو پہلے عامل کو ہی زیادہ وزن دیتے ہیں جبکہ دائیں بازو میں بھی ان کے ہمنوا بنتے جا رہے ہیں۔

تاہم سب تجزیہ کار ایک اہم اور بڑے عامل کو نظر انداز کرتے محسوس ہوتے ہیں۔ وہ عامل یہ ہے کہ ان متواتر المیوں کی ذمہ داری نیشنل عوامی پارٹی، خصوصاً ولی خان کی جانب سے 1973ء میں بھٹو اور پاکستان کے خلاف جنگ کا آغاز کرنے کا فیصلہ ہے۔ اسی نے داؤد خان کی حکومت کو ایک انجام شدہ عمل (fait accompli) سے دوچار کر کے افغانستان کو جنگ کی طرف دھکیل دیا۔ یوں افغانستان کو داخلی اور خارجی طور پر پاکستان کی جانب سے عدم استحکام کا شکار کیا۔ اس کے نتیجے میں دائیں بازو کو ایجی ٹیشن پر اُبھار کر خود اس کا حصہ بنے اور فوجی جرنیلوں سے ساز باز کی۔ یوں افغانستان اور پاکستان دونوں ایک المناک سانحے سے دوچار ہوئے اور آخر میں ولی خان دیدہ دلیری سے عدم تشدد کا راگ الاپنے لگے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ افغانستان میں خوں ریز انقلاب برپا ہوتا ہے اور وہاں کی حکومت اپنے تمام عہدیداروں کے ساتھ جسمانی طور پر ختم کر دی جاتی ہے، وہ اپنی ناکامیوں کے عوامل لوگوں تک پہنچانے سے قاصر رہتے ہیں۔ پھر ترہ کئی اور امین کی حاکمیت انقلاب کی ہلچل کے دوران ہی سرنگوں ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد کارمل اور نجیب کی حکومتیں بہ امر مجبوری اسی لیڈر شپ کی محتاج رہتی ہیں۔ دوسری طرف پاکستان میں بھٹو بھی قتل کیے جاتے ہیں اور اس کے جانشین ضیا فوجی حکومت بھی کچھ عرصے کے لیے ان کی محتاج رہتی ہے۔ دونوں طرف کے کردار اپنی داستانِ الم سنانے سے پہلے ہی دنیا کے پردے سے ہٹتے چلے جاتے ہیں اور اصل عامل پوشیدہ رہتا ہے۔

بھٹو کے عمل اور کردار سے آنکھیں بند کرنا مشکل ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ غوث بخش بزنجو کی رضا کے بغیر نیشنل عوامی پارٹی نے تشدد کا راستہ اختیار کیا تھا، جس کی وجہ سے بلوچ اپنے علاقوں کو چھوڑ کر پہاڑوں کی طرف ہجرت کر گئے اور پشتون قوم پرست نوجوانان پختون زلمے تنظیم کے بینر تلے اکٹھے کیے گئے۔ اگرچہ نیپ کے اس فیصلے میں بعض دیگر بلوچ رہنما اور کمیونسٹ بھی شامل تھے لیکن اصل فیصلہ عبدالولی خان ہی کا تھا۔ باچا کے بیٹے کی حیثیت سے ان کا افغانستان میں ایک

اعتبار قائم تھا جس سے اس نے فائدہ اُٹھایا۔ باچا خان کا اس فیصلے میں شاید کوئی فعال کردار نہیں تھا، بلکہ انہوں نے مصلحتاً چپ کی راہ اختیار کی اور اس فیصلے کی راہ میں روڑے نہیں اٹکائے۔ نیپ کی جانب سے یہ پُرتشدد راستہ ۱۴ فروری ۱۹۷۳ء کو اختیار کیا گیا، جب صوبہ سرحد اور بلوچستان کے گورنر برطرف کر دیے گئے اور بلوچستان میں عطاء اللہ مینگل کی حکومت کو ختم کیا گیا، اور صوبہ سرحد میں نیپ اور جمعیت کی مخلوط حکومت نے احتجاجاً استعفیٰ دیا تھا۔

عبدالولی خان کا خیال تھا کہ اگر ہم نے موثر تشدد کا راستہ اختیار کیا تو افغانستان مجبور ہوگا کہ پشت پناہی کے لیے ہماری مدد کرے۔ اس سے پہلے بھی یحییٰ خان کے زمانے میں کچھ اسی طرح کی فضاء بنانے کی کوشش کی گئی تھی، جب یحییٰ خان نے نیپ پر پابندی لگائی تھی اور نیپ نے پہلی مرتبہ اجمل خٹک کو افغانستان بھیج دیا تھا، تاہم کچھ ہی عرصے بعد جب بھٹو کے حوالے حکومت کر دی گئی تو اس نے نیپ پر سے پابندی ہٹا دی، تب اجمل خاموشی کے ساتھ واپس آئے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

پشتونوں کی تاریخ بھی عجیب تاریخ ہے، بلکہ انتہائی تاسف کا مقام یہ ہے کہ یہ تاریخ ہمیشہ سے اپنوں کے بجائے کوئی اور لکھتا آیا ہے۔ اور المیہ یہ ہے کہ یہ تاریخ نویس جہاں ہمارے مسائل سے ناآشنا ہوتے ہیں، وہاں وہ ہماری داستان سننا تک گوارا نہیں کرتے۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم خود سچ بولنا، سچ لکھنا اور سچ سننا برداشت نہیں کر پاتے۔ ہم ہر کام منطق کے بجائے تو کل (بلکہ اٹکل) سے کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ہمیں انجام کی فکر ہوتی ہے اور نہ نتائج کی پرواہ۔ ولی خان نے اپنی کتاب "باچا خان او خدائی خدمتگاری" میں ان تمام واقعات اور نتائج سے چشم پوشی کی ہے، جو خود اُن کے غلط اقدامات اور فیصلوں کی وجہ سے ظہور پذیر ہوئے۔

تقسیم ہند سے کچھ ہی عرصہ پہلے غنی خان کی سرکردگی میں "زلمے پختون" نامی تنظیم قائم ہوئی تھی، جس کا بنیادی مقصد آزادی کی جنگ لڑنا تھا، مگر نہ تو غنی خان اس تنظیم کو چلانے کی اہلیت رکھتے تھے اور نہ کانگریس یا خدائی خدمتگار اس کام کے اہل تھے۔ اِس تنظیم کے کریڈٹ پر کوئی خاص کام بھی نہیں، فقط تقسیمِ ہند کے بعد کے فسادات میں چند ہندو گھرانوں اور ان کی دکانوں کو مسلم لیگ کے ورکروں سے محفوظ رکھا، تاہم جو پیسہ تنظیم کے جوانوں کے نام پر آتا تھا وہ اِن کے رہبر اپنی ہی جیبوں میں ڈال لیتے تھے۔ اِسی طرح ایک اور طرفہ تماشا ۶ مئی ۱۹۷۰ء کو دیکھنے میں آیا، جب شاہی

باغ پشاور میں نیپ کا جلسہ منعقد ہوا اور جس میں ''پختون زلمے'' کے اعلان کے ساتھ ساتھ عبدالولی خان کو اِس تنظیم کا سالارِ اعلیٰ بنا دیا گیا۔ ولی خان نے نیپ کی صدارت کے ساتھ پختون زلمے کا عہدہ بھی اپنے لیے پسند کیا۔ درحقیقت یہ ایک نہایت نامناسب فیصلہ تھا، وہ اس عہدے کے لیے قطعی نامناسب تھے، مگر اس کا کیا کیجیے کہ خاندانی اور موروثی سیاست کے یہی کرشمے ہوتے ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے، پاکستان دو حصوں میں تقسیم ہوا، اپریل ۱۹۷۲ء میں دو صوبوں میں نیپ نے مخلوط حکومتیں قائم کیں اور فروری ۱۹۷۳ء میں بھٹو نے بلوچستان کی حکومت برطرف کی، احتجاجاً صوبہ سرحد کی حکومت بھی مستعفی ہو گئی، تب ولی خان کو پختون زلمے کی یاد آ گئی۔ ولی خان نے تنظیم کے منظم کرنے کی ذمہ داری افضل خان کے سپرد کی اور انہیں پختون زلمے کا چیف کمانڈر بنا دیا۔

نیپ نے بابائے بلوچستان غوث بخش بزنجو کو طنزاً بابائے مذاکرات مشہور کر دیا۔ دراصل غوث بخش بزنجو صاحب اس خراب صورت حال میں بھی بھٹو سے مذاکرات کے قائل تھے۔ غوث بخش بزنجو صاحب کی کہی ہوئی بات تاریخ نے حرف بہ حرف درست ثابت کی۔ ان کا کہنا تھا کہ بھٹو کے ساتھ جنگ میں ہمارا ہی نقصان ہوگا، پشتون جیل چلے جائیں گے اور بلوچ پہاڑوں میں فراری زندگی گزارنے پر مجبور ہوں گے، کراچی اور پنجاب کے کمیونسٹ کیفے میں بیٹھ کر چائے کی پیالی میں اور شب ناموں کی تقسیم سے انقلاب برپا کرتے رہیں گے۔ آخری نتیجہ یہی ہوگا کہ ہم بھی جماعت اسلامی کی طرح مقتدر قوتوں سے امیدیں وابستہ اور جرنیلوں کو دعوت دینے والے بن جائیں گے، ہماری موجودہ طاقت اور قوت منتشر ہو جائے گی۔ نہ بھٹو رہے گا اور نہ ہی ہم۔ مقامِ افسوس یہ ہے کہ اہلِ بصیرت ہمیشہ تاریخ یا پھر اپنوں کی بے وفائی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بزنجو اکیلے رہ گئے، جبکہ ولی خان اور ان کے دوستوں کی منطق جیت گئی۔ اور پھر بات بزنجو کے تجزیے سے بھی آگے چلی گئی اور جو حالات بنے، اس نے افغانستان کو بھی اپنے خون آلود پنجوں میں جکڑ لیا۔ بھٹو کا پاکستان ڈوبنے لگا اور ضیاء الحق جیسا انقلاب مخالف برسرِ اقتدار آیا۔ افغانستان انقلاب ثور کا شکار ہوا۔ اس کشمکش میں رد انقلاب جیت گیا۔ مادرِ انقلاب یعنی سوویت یونین شکست وریخت کا شکار ہوا۔ یہ تمام کشاکش پشتونوں کے نام سے ہوتی رہی اور پشتون مخالف انجام سے دوچار ہوئی۔ بہرام خان کا گھرانہ دولت سمیٹتے ہوئے بڑے آرام کے ساتھ پھلتا پھولتا رہا اور

پشتونوں کو فقط عدم تشدد کے نعروں سے بہلاتا رہا۔

زندگی کے سفر میں مرحوم اجمل خٹک سے جھوٹ اور سچ کا سرا کہیں کھو گیا تھا اور آخر تک اس کے لیے سرگرداں رہے، تاہم اسے پا نہ سکے، چنانچہ اس تلاش کا بوجھ میں نے اپنے سر لے لیا۔ تاکہ میں نے جو کچھ دیکھا، جو کچھ سنا اور جو کچھ مجھ پہ گزری، اسے بیان کر دوں اور تاریخ کے آئینے کے سامنے سرخرو رہوں۔ جہاں تک افغانستان کا تعلق ہے تو کرزئی کے آنے سے یہ امید پیدا ہو گئی تھی کہ شاید افغانوں کے دکھوں کا مداوا ہو اور تاریکی کی طویل شب میں سحر طلوع ہو۔ وائے افسوس، ایسا نہ ہو سکا، کرزئی نے بھی وہی راستہ اختیار کیا، جس سے افغانوں کو پہلے بھی لوٹا گیا تھا۔ کرزئی اور دیگر افغان حکام اپنی حاکمیت کو قانونی ثابت کرنے کے لیے اس راستے پر گامزن ہیں کہ پاکستان میں موجود پشتونوں (بلکہ گھرانوں) کی تائید سے داخلی طور پر اٹھنے والے سوالات کے جوابات فراہم کریں۔ اس صورتِ حال میں مجھے اُس پاکستانی مہمند ملک کی بات یاد آ رہی ہے، جو وہ مذاق میں پشتونستان کے حمایتی ملکان سے کہتا تھا کہ اگر پشتونستان بن گیا تو میں آپ سب لوگوں کو دھمزنگ جیل میں ڈال دوں گا۔ دھمزنگ کابل میں ایک مشہور جیل ہوا کرتی تھی۔ پشتونستان کے حمایتی ملکان کہتے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے، تُو تو پاکستان کا حمایتی ہے، تُو یہ کام کیسے کر سکتا ہے؟ وہ ملک ہنس دیتا کہ اگر پشتونستان بن گیا تو تم سے پہلے ایک بہت بڑا جھنڈا بنا لوں گا اور شاہی محل کے سامنے کھڑا ہو کر نعرے لگا کر کہوں گا کہ اِن لوگوں نے پشتونستان کی مخالفت کی تھی اور جب تک سچ آشکارا ہوگا، تب تک تم لوگ دھمزنگ جیل ہی میں سڑتے رہو گے۔ یہ اس لیے کہ افغانستان ایک ایسا ملک ہے، جہاں فائل اور ریکارڈ رکھنے کی روایت نہیں۔ پاکستان کے برعکس، جہاں انگریزوں کے زمانے ہی سے ریکارڈ تمام دفاتر میں مرتب رکھا جاتا ہے۔ یوں افغانستان کی خرابی اور بربادی میں جو جتنا زیادہ حصہ لیتا ہے، اتنا ہی زیادہ معتبر ٹھہرتا ہے۔ سرحد کے دونوں جانب آباد پشتون اس امر سے زیادہ باخبر نہیں ہیں کہ پاکستان کی جانب سے ۷۵-۱۹۷۴ میں افغانستان کے اخوانی عناصر کو مہمان بنانا، انہیں فوجی تربیت دینا اور انہیں مسلح کرنا دراصل ولی خان کی جانب سے پشتون نوجوانوں کو افغانستان بھیجنے اور انہیں مسلح کرنے کے جواب میں تھا۔ اس طرح پاکستان کی جانب سے مختلف مواقع پر داؤد خان کی حکومت کے خلاف سازشیں بھی اصلاً پختون زلمے کی تخریبی کاروائیوں اور حیات محمد خان شیر پاؤ کے قتل کے خلاف جوابی کاروائی تھی۔ اس ساری تباہی کے

محرکین اور مولفین وہی لوگ ہیں جو آج عدمِ تشدد کے لبادے اور غلاف میں ملفوف ہیں۔

صدر داؤد خان کے سامنے دو ہی راستے رہ گئے تھے، وہ غیر جانبدار رہتے یا ولی خان کی تحریک کا ساتھ دیتے۔ اُنہوں نے طبعی طور پر اپنے ماضی اور گزشتہ تعلق کی وجہ سے دوسری بات کو پسند کیا اور اس کا نتیجہ بھی بھگت لیا۔ یہاں میں افغانوں کی توجہ ایک اور حقیقت کی طرف بھی مبذول کرانا چاہتا ہوں، جو پاکستان پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ پاکستان کے حکام افغانستان میں اپنی مرضی کے لوگوں کو اقتدار میں لانا چاہتے ہیں اور یہ کہ پاکستان افغانستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرتا ہے۔ الزام لگانے والے اپنے اعمال پر توجہ کیوں نہیں دیتے کہ کھیل اصلاً کس نے شروع کیا؟ ضرورت اس بات کی ہے کہ اب دونوں اطراف اس تباہی کا ادراک کریں کہ ان سے کیا غلطیاں ہوئیں اور اس کا آغاز اپنی خود احتسابی سے کریں۔

میری جلاوطنی اور پختون زلمے کی عملی کارروائیاں

اجمل خٹک کو افغانستان بھیجنے کا فیصلہ نیپ پہلے ہی کر چکی تھی لیکن بھٹو کے اقدامات نے اس فیصلے کو حتمی اور عملی صورت میں متشکل کیا۔ عبدالولی خان نے یہ فیصلہ اپنے طور اور اپنی سوچ کے مطابق کیا تھا جبکہ باچا خان نے اسے مجبوراً قبول کیا کیونکہ اُنہیں اس معاملے پر کئی ایک تحفظات تھے مگر اِس زمانے میں قوم پرست سیاست پر ولی خان چھائے ہوئے تھے اور اس نے اپنے فیصلے کی تائید میں پوری پارٹی کو ہمنوا بنا لیا تھا۔ بدقسمتی سے ۲۳ مارچ ۱۹۷۳ء کو راولپنڈی میں حزبِ اختلاف کے جلسے پر، جس میں نیپ ایک اہم جماعت کے طور پر شریک تھی، بھٹو حکومت کی جانب سے گولیاں برسائی گئیں، جس سے اجمل خٹک کو بہانہ ہاتھ آ گیا اور وہ باجوڑ کے راستے افغانستان چلے گئے۔ موصوف اس وقت نیپ کے جنرل سیکرٹری ہوا کرتے تھے۔

اجمل خٹک جب افغانستان پہنچے تو فطری طور پر افغان حکومت نے ان کا استقبال کیا اور خوش آمدید کہا اور اُنہیں کابل کے ایک اہم ہوٹل ''کابل ہوٹل'' میں ٹھہرایا گیا۔ اُس وقت موسیٰ شفیق صدرِ اعظم (وزیرِ اعظم) تھے۔ موصوف اگرچہ ایک زیرک سیاست دان تھے، مگر ان کا زیادہ رجحان مغرب کی جانب تھا۔ موسیٰ شفیق پاکستان اور ایران کے ساتھ تمام تاریخی مسائل کا حل چاہتے تھے اور اِن مسائل کو افغانستان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے تھے۔ موصوف افغانستان کی جانب سے نیپ کی مدد اور حمایت کے قائل نہ تھے اور اس لیے چشم پوشی کر رہے تھے۔ ولی خان کا یہ اندازہ اور سوچ کہ افغانستان مجبور ہو کر لامحالہ ان کی مدد کرے گا غلط ثابت ہو رہا تھا۔ موسیٰ شفیق اچھی طرح جانتے تھے کہ ۱۹۴۷ء میں افغانستان کی جانب سے باچا خان کے ساتھ ہم آہنگی اور یک جہتی افغانستان کے لیے مضر ثابت ہو چکی تھی، اس لیے وہ ہر قیمت پر پاکستان کے داخلی مسئلے سے افغانستان کو الگ رکھنا چاہتے تھے، تاہم نیپ کی مدد سے براہِ راست انکار بھی نہیں کرتے تھے۔

صدر داؤد خان نیپ کی سیاست کے طرفدار تھے اور اجمل خٹک کے کابل آنے سے مطلع تھے۔ دوسری طرف پرچم سے وابستہ لوگ پہلے ہی سے باچا خان، ولی خان، نیپ اور خصوصاً نیپ میں شامل کمیونسٹوں سے رابطے میں تھے۔ داؤد خان کے دل میں شروع سے ہی یہ ارادہ تھا کہ ظاہر شاہ کی حکومت کا تختہ اُلٹ دے۔ ظاہر شاہ کے اکثر طرفدار پہلے ہی سے سردار داؤد خان کے

سخت مخالف تھے اور ان مخالفین میں بادشاہ کا داماد سردار عبدالولی سرِفہرست تھے۔ سردار داؤد خان مناسب موقع کی تلاش میں تھے اور ان کو خبر تھی کہ ظاہر شاہ یورپ اور خصوصاً روم جائیں گے۔ اُس نے اِس موقع کو غنیمت جانا اور اپنے حمایتیوں کے تعاون سے ۱۷ جولائی ۱۹۷۳ء کو ظاہر شاہ کے خلاف ایک کامیاب بغاوت کی۔ ظاہر شاہ کی بادشاہت کا خاتمہ ہوا اور جمہوریہ کا اعلان کیا گیا۔ افغان عوام نے اس اعلان کا خیر مقدم کیا۔ داؤد خان صدر بن گئے۔ داؤد شروع سے پشتونستان کے مدعی تھے۔ انہوں نے اقتدار میں آنے کے بعد اس قضیے کو ازسرِنو تازہ کیا اور اس مقصد کے حصول کے لیے افغانستان کا مقدر 'بہرام خان' کے گھرانے اور اس وقت اس خاندان کی نمائندگی کرنے والے ولی خان کے ساتھ باندھ دیا۔ اس سے قبل افغانستان پختونستان کو ہی دونوں ممالک کے درمیان وجہ نزاع گردانتا تھا۔ اب ان لوگوں نے ولی خان کی تقلید میں اس اصطلاح کو پشتون اور بلوچوں کی خودارادیت سے منسوب کیا۔ قبائیلوں کی مستقل ریاست کا محکمہ جو پہلے براہِ راست صدرِ اعظم کی نگرانی میں کام کرتا تھا اسے ترقی دے کر 'وزارتِ سرحدات' کا نام دیا گیا۔ اس عمل سے داؤد خان نے عبدالصمد خان اچکزئی کی سیاست کی نفی کی جو نیپ اور خصوصاً ولی خان سے اس بات پر خفا تھے کہ انہوں نے جنوبی پختونخوا کے پشتونوں کو صوبہ بلوچستان میں بلوچوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا ہے۔

جمہوری افغانستان کی پالیسی گویا نیپ کی تابع ہوگئی تھی۔ کابل میں اجمل خٹک کو گھر، نوکر، محافظ، ڈرائیور اور گاڑی دی گئی۔ اجمل خٹک اپنے سرگرم رجحانات کی وجہ سے جلد ہی مرکزِ توجہ ہوگئے۔ داؤد خان نے اجمل خٹک کو غیر سرکاری مگر عملاً وہ مقام دیا جو اس کی کابینہ کے ارکان کو بھی حاصل نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اکثر مقتدر افغان صلاح مشورے اور افغان حکومت سے مستفید ہونے کے لیے اجمل خٹک کے پاس آنے لگے۔ دوسری طرف پاکستان میں نیپ کے لیڈروں کی گرفتاری کا عمل جاری تھا۔ ۱۹۷۳ء کے آئین کی متفقہ منظوری کے چند گھنٹوں بعد ہی غوث بخش بزنجو کو اسمبلی ممبران کے ہاسٹل اسلام آباد سے جبکہ خیر بخش مری اور عطاء اللہ مینگل کوئٹہ سے گرفتار کیے گئے۔ اگرچہ بھٹو بزنجو کے ساتھ اپنے راہ ورسم برقرار رکھنا چاہتا تھا اور اس مقصد کے لیے انہوں نے بزنجو کے دوست بی۔ ایم۔ کوٹی (B.M.Kutty) کی خدمات حاصل کیں کہ وہ بزنجو سے مل لیں اور بھٹو کے ساتھ ملاقات کے لیے آمادہ کرلیں تاکہ باہمی مسئلے کا حل ڈھونڈا جاسکے۔

تاہم بزنجو نے اس بنیاد پر ملاقات سے انکار کیا کہ وہ ولی خان اور دیگر بلوچ رہنماؤں کی مرضی کے خلاف اِس طرح کی ملاقات کے قائل نہیں ہیں۔ یہ ایک اصولی موقف تھا اگرچہ اس ملاقات کے نہ ہونے سے یہ مسئلہ اتنا بڑھا اور پیچیدہ ہوا کہ خطے کے تمام لوگوں کے لیے مضر ثابت ہوا۔

صوبہ سرحد میں پختون زلمے کی تنظیم کاری جاری تھی۔ اگرچہ سالارِ اعلیٰ اور کمانڈرِ اعلیٰ اس کام کے لیے مناسب لوگ نہیں تھے کہ آنے والی جنگ کے لیے مناسب کمانڈروں کا انتخاب کرسکیں۔ لیکن اس کے باوجود اس تنظیم کی تخریبی کاروائیاں شروع ہو چکی تھیں۔ بلوچ اس طرح کی صورتِ حال سے آشنا تھے، اور دنیا کی تحریکوں اور گوریلا جنگوں کا مطالعہ رکھتے تھے، لیکن پشتونوں کی حالت اس حوالے سے اچھی نہ تھی اور جب میدان عمل کا موقع آیا تو بہت سے کمانڈر سامنے آنے سے کترانے لگے۔ ان حالات میں سارا بوجھ یوسفزئیوں اور محمد زئیوں پر آن پڑا۔ اجمل خٹک (بہت بعد میں افراسیاب خٹک) کے علاوہ تمام خٹک عملیت پسندی کا شکار ہوئے، جو لڑنے والوں کے بجائے لڑوانے والوں کی قطار میں شامل تھے۔ اضلاع میں فقط صوابی، مردان، چارسدہ، پشاور اور کسی حد تک نوشہرہ، سوات اور دیر میں جوان میدان میں آگئے، مگر ان کی مقدار بھی آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ صرف بلوچستان میں پشتون طلباء کا ایک گروپ جنگ کے لیے آمادہ ہوا۔

میں اِس زمانے میں انجینئرنگ کالج میں اپنے فرائض سرانجام دے رہا تھا لیکن، اس کے ساتھ ساتھ سیاست میں بھی فعال تھا۔ میرا رابطہ کابل میں اجمل خٹک کے ساتھ برقرار تھا بلکہ ان سے رابطے کے لیے میں ہی درمیانی آدمی تھا، گویا میں فارورڈ پوسٹ تھا۔ مجھے سختی کے ساتھ ہدایت تھی کہ کوئی راز افشا نہ ہو، اور افشاء کی صورت میں پولیس کے ہتھے لگنے سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کروں اور انڈر گراؤنڈ چلا جاؤں۔ میں اور اجمل خٹک ایک ہی راستے کے مسافر تھے، ایک پاؤں عبدالولی خان کی کشتی میں تھا اور دوسرا پاؤں کمیونسٹ پارٹی کی ناؤ میں۔ اِس میں شک نہیں کہ اس جنگ کی بنیادی وجہ بھٹو کے اقدامات کے علاوہ ولی خان اور بعض بلوچ رہنما بھی پیش پیش تھے۔ ان کے علاوہ ترقی پسند بھی کھڑے تھے۔ فقط غوث بخش بزنجو ایک ایسے آدمی تھے جو اس تاریک صورتِ حال میں روشنی کی بات کرتا تھا مگر بدقسمتی سے ان کے خیالات کی پذیرائی دونوں جانب نہ تھی۔

ایک طرف نیپ اور خصوصاً ولی خان نے سردار داؤد کو ایک ناگزیر صورتحال کے مقابل لا

کھڑا کیا تو دوسری طرف پختون زلمے کی تنظیم سازی اور اس کی تخریبی کاروائیاں جاری تھیں۔ بہت پہلے یعنی 1970ء کو تنظیم کے مرکزی دفتر کے لیے یونیورسٹی ٹاؤن میں جگہ حاصل کی گئی تھی، جہاں ولی خان کو تنظیم کی جانب سے باوردی سلامی دی گئی تھی۔ افضل خان لالہ جب گرفتار ہوئے تو گل آباد کے ہدایت اللہ ضلع پشاور کے ساتھ صوبائی کمانڈر بھی بنا دیے گئے۔ بعد میں پشاور کے کمانڈر رسول خان بنا دیے گئے۔ انور خان ضلع مردان، شیر شاہ ضلع سوات، نوابزادہ ضلع ڈیرہ، اخلاق حسین استرزئی ضلع کوہاٹ، نجیب اللہ ضلع مانسہرہ، سعید خان ضلع دیرہ، حاجی عدیل پشاور شہر، گلاب گل ضلع چارسدہ، قلی خان کے پوتے رضا قلی خان کوہاٹ اور عطاء اللہ ضلع بنوں کے کمانڈر مقرر کیے گئے تھے۔ اس زمانے میں صوابی، چارسدہ اور نوشہرہ وغیرہ اضلاع کے بجائے تحصیل تھے جبکہ سوات اور دیر دو الگ الگ ضلعے تھے۔ روزگل پشتون نوجوان فیڈریشن کے صدر مقرر ہوئے تھے۔ ہدایت اللہ کے بعد زرفروش صوبائی صدر نامزد ہوئے۔ ان میں سے اکثر کمانڈر دو نمبری تھے اور طویل گوریلا جنگ کی طاقت، حوصلہ اور تربیت نہیں رکھتے تھے، یہ صرف خانہ پُری تھی جو فقط ولی خان کی خوش فہمیوں کا نتیجہ تھی۔ ان تمام کمانڈروں میں فقط بغدادہ مردان کے امیر اللہ ایسے کمانڈر تھے جو سابقہ فوجی ہونے کے ساتھ انتہائی دلیر اور فعال آدمی تھے جو اصلاً افضل خان کی پیداوار تھے۔ امیر اللہ بعد میں مردان چھاؤنی میں بم سمیت گرفتار ہوئے۔

آفریدیوں کے قبیلہ ذخہ خیل میں نادر خان ذخہ خیل کا خاندان ایک سیاسی گھرانہ تھا اور باچا خان سے لے کر نچلی سطح تک کے رہنماؤں کے ساتھ روابط رکھتے تھے۔ میں بھی انہی کی توسط سے بغیر پاسپورٹ کے افغانستان جاتا تھا۔ نادر خان کے خاندان کی ملک ولی خان کوکی خیل سے چشمک اور رقابت تھی اور یہی وجہ تھی کہ ہر دو نے باری باری پاکستان اور افغانستان کا دامن تھام لیا تھا۔ تاہم باچا خان کے تعلق کی وجہ سے نادر خان میں ایک سیاسی استقامت پیدا ہوئی تھی۔ نیپ والوں نے اسی بنا پر اس خاندان کے دیگر لوگوں کے ساتھ تعلق اُستوار کئے رکھا اور افغانستان آنے جانے کے لیے انہیں ایک ذریعے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ اجمل خٹک کے ساتھ رابطہ کا اہم ذریعہ بھی نادر خان اور اُس کا گھرانہ تھا۔ ایک مرتبہ خود میں نے اہم کاغذات و دستاویزات نادر خان کے ایک رشتہ دار "اشنا محمد" کے حوالے کئے تھے، جس میں کمیونسٹ پارٹی کے کاغذات جس میں اس دور کے پاکستان کے حالات کا تجزیہ اور اس تجزیے کی روشنی میں حکمت عملی اور اس

حکمت عملی کے متعلق اجمل خٹک کے لیے ہدایات، بعض بلوچ کمانڈروں کے متعلق معلومات، باڑہ کے جلسے کی روداد کے علاوہ میرا ایک خط بھی شامل تھا۔ ڈاکومنٹس کی حوالگی کی مخبری ہو گئی تھی اب میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کیسے ہو گیا۔ قریش گل (آفس سیکرٹری، نیپ) کے مطابق دراصل جب میں نے قدرے بلند آواز میں باڑہ جلسے کے دوران اشنا محمد کو پکار کر کہا تھا کہ کابل جا رہے ہو تو میرا خط بھی لیتے جانا اور یہی بات اس جلسے میں موجود جاسوس اہلکاروں نے نوٹ کی تھی۔ بہرحال اشنا محمد طورخم بارڈر پر ان دستاویزات سمیت گرفتار کیے گئے۔ مجھے کئی اطراف سے خبر دی گئی کہ میں کہیں چھپ جاؤ۔ میرے پاس دو راستے تھے، اول یہ کہ اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دوں اور خود کو بچاؤں اور "انقلاب" اور "آزادی" کو خطرے میں ڈال دوں، دوم یہ کہ کہیں چھپ جاؤں، کراچی یا افغانستان چلا جاؤں اور اپنے مشن کو آگے بڑھاؤں۔ بڑوں کا مشورہ یہی تھا کہ افغانستان چلا جاؤں۔ چنانچہ محمد اسرار خان (صدر) کے صاحبزادے پروفیسر نثار لالہ کی توسط سے میں گڑمنڈی پشاور کے ایک آڑھتی سے ملا۔ اُس آڑھتی نے مجھے کرمنہ کے گل ولی کے حوالے کیا۔ گل ولی گڑو کو، باڑہ یا علی مسجد کے درمیان خچروں کے ذریعے باربرداری (بلکہ سمگلنگ) کا کام کرتے تھے۔ میں نے رات کرمنہ میں گل ولی کے ساتھ گزاری، صبح ان کے خچروں کے ساتھ روانہ ہوا، دوپہر سے پہلے ہم نے تیراہ کے علاقے 'بازار' کے قریب ایک گھر میں کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد دوبارہ روانہ ہوئے اور کچھ وقت کے بعد ہم "مسوبی کنڈو" کے پار "گڑوکو" پہنچ گئے۔ گل ولی تو گڑوکو ہی میں رہ گئے اور میں ایک ٹرک میں سوار ہو کر 'گردی غوث' کے راستے جلال آباد پہنچ گیا۔ اب یاد نہیں کہ رات میں نے جلال آباد میں گزاری یا کہ راتوں رات کابل کے لیے روانہ ہوا۔ غالباً میں کابل ۲۵ اگست ۱۹۷۳ء کو پہنچا تھا۔ میں سیدھا کابل کے علاقے کارتہ پروان میں نجیب اللہ کے گھر پہنچ گیا۔ اس سے اگلے دن "جمال مینہ" میں اجمل خٹک کے گھر اُن سے ملا۔ شروع میں اجمل خٹک کچھ شک میں مبتلا نظر آئے اور محتاط ہو کر بول رہے تھے لیکن جلد ہی انہیں حقیقتِ حال کا یقین ہوا تو یہ مشورہ دیا کہ کچھ عرصے کے لیے کابل میں بھی پوشیدہ رہوں۔ دراصل اجمل خٹک اپنے داخلی اور خارجی ذرائع سے میرے بارے میں زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے اس لیے مجھے "پرچم" کے حوالے کیا گیا۔ پرچم والے اس وقت داؤد خان کی حکومت میں حصہ دار تھے۔ میری ذمہ داری ڈاکٹر فاروق کے سپرد کی گئی۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت مکرویان (ابھی

مکرویان کا دوسرا، تیسرا اور چوتھا فیز نہیں بنا تھا) کے سامنے تپہ نادر خان کے نیچے سیمنٹ خانہ کے قریب اپنے تین بھائیوں اور والد کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کے گھر کے ساتھ ہی ڈاکٹر صاحب کے چچا کا گھر بھی تھا۔ ڈاکٹر فاروق کے گھر کے سامنے ان کا حجرہ تھا جو صحن اور تین کمروں پر مشتمل تھا جہاں ہر صبح پرچم کے لیڈران مکرویان سے ورزش کے لیے آیا کرتے تھے۔ فاروق صاحب کے والد علاقہ دار رہے تھے اور نہایت شیرین آدمی تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے بھائی بھی مجھ سے بہت اچھا تعلق رکھتے تھے۔ یہیں پر پرچم کے اکثر دوست ملنے کے لیے آیا کرتے تھے، بحث ومباحثوں کے ساتھ میری خدمت کرتے تھے۔ میں نے اپنے آپ کو خفیہ رکھنے کے لیے داڑھی رکھ لی تھی اور اسی سبب سے اجمل خٹک صاحب مجھے صوفی کہہ کر پکارتے تھے، اور یوں اِسی نام سے مشہور ہوگیا۔

سردار داؤد خان کی حکومت میں پرچمی پوری طرح شامل تھے، اور اس لیے کافی خوش تھے۔ فیض محمد مسیت (محسود) وزیر داخلہ، جیلانی باختری (کارمل کے پھوپھی زاد) وزیر زراعت، ضیاء مجید جمہوری گارڈز کے کمانڈر، جیسے لوگ حکومت شامل تھے۔ انہی کی توسط سے بڑی تعداد میں پرچم سے وابستہ افراد بڑی بڑی سرکاری پوسٹوں پر تعینات تھے۔ پرچمی عناصر کے علاوہ ''خلق'' سے وابستہ باچا گل وفادار 'وزیرِ سرحدات' تھے۔ جبکہ کئی دوسرے خلقی فوجی افسران اور رہنما بھی شریکِ اقتدار تھے تاہم ان کا اثر اور اہمیت پرچم سے کم تھا۔ ان افراد کی شمولیت سے یہ مغالطہ نہ ہو کہ سردار داؤد خان نیشنل ازم یا افغانیت کی پوزیشن سے ہٹ گئے تھے۔ ان کی کابینہ اور دوسرے اہم عہدوں پر دائیں بازو کے بہت سے افراد براجمان تھے۔ گویا یہ ایک متوازن حکومت تھی۔ داؤد نے پرچم کی طرف سے ترتیب دیے گئے اولین خطاب (خطاب بہ مردم) میں پاکستان کے ساتھ پشتونوں اور بلوچوں کا مسئلہ واحد سیاسی اختلاف گردانا تھا، جس سے دونوں ملکوں کے مابین تعلقات نہایت خراب ہو گئے تھے۔ افغانستان میں پاکستان کے خلاف پروپیگنڈا بہت تیز تھا۔ پاکستان میں نیپ اور خصوصاً نیپ کے صدر عبدالولی خان کا لہجہ بھی تیز تر ہوتا چلا گیا۔ پرچم اس بات کا پروپیگنڈا کر رہا تھا کہ افغانستان کی ریپبلکن حکومت کی پشت پر سوویت یونین اور سوشلزم موجود ہے۔ اس وجہ سے ہماری جدوجہد کے ساتھ ایک وسیع ہمدردی پائی جاتی تھی۔

بلوچ اور خصوصاً مری قبائل پہاڑوں پر چلے گئے تھے۔ بلوچ جوان متحرک ہو گئے تھے۔ جگہ

جگہ آزادی کے نعرے لگ رہے تھے۔ بلوچستان میں چونکہ 'پختون زلمے' کے نام سے تنظیم فعال نہیں تھی اور نہ ہی منظم شکل میں موجود تھی، اس لیے پشتون سٹوڈنٹس فیڈریشن سے وابستہ لیڈران بپھر گئے تھے اور بلوچوں کے ساتھ یکجہتی کا اعلان کر چکے تھے۔ عبدالصمد خان اچکزئی اپنی جداگانہ سوچ اور سیاست کی بنا پر اس تحریک کے خلاف تھے اور بھٹو حکومت کے ساتھ جا کھڑے ہوئے تھے۔ دوسری طرف ولی خان متحدہ حزبِ اختلاف کے لیڈر ہونے کی وجہ سے بھٹو کے لیے دردِ سر بنے ہوئے تھے۔

ریڈیو افغانستان کابل سے پاکستان کے خلاف پروپیگنڈا ایک عرصے سے پروگرام ''پختونستان'' کے نام سے ہوتا تھا اب اُس میں تبدیلی لا کر نہ صرف اس کے دورانیہ میں اضافہ کیا گیا بلکہ اس کا نام پختونوں اور بلوچوں کا پروگرام رکھ دیا گیا۔ اجمل خٹک کے گھر (ہیڈ کوارٹر) نے بہت اہمیت حاصل کر لی تھی۔ صدر داؤد خان کی حکومت کے اکثر چھوٹے بڑے عہدہ دار، پرچم، خلق اور افغان ملت سے وابستہ سیاسی زعماء اور کارکن، آزاد روشن فکر، داخلی اور خارجی قبائلی مشران اور جوان، کابل یونیورسٹی، خوشحال خان بابا اور عبدالرحمن بابا لیسہ (سکول) کے طالبعلم گویا سب لوگوں کے لیے فوکل پوائنٹ تھا۔ اور جب اجمل خٹک اور صدر داؤد کے مابین ملاقاتیں زیادہ ہو گئیں تو یوں محسوس ہونے لگا کہ اجمل خٹک گویا اس نئی حکومت کا غیر رسمی حصہ ہوں۔ دراصل اجمل خٹک کو نفسیاتی طور پر ایک دربار کی ضرورت رہتی تھی، جو اب سردار داؤد خان مرحوم نے مہیا کر دیا تھا۔ میں کم و بیش دو مہینے ڈاکٹر فاروق کے ساتھ رہا اور اکتوبر ۱۹۷۳ء میں اجمل خان خٹک کے گھر واقع 'جمال مینہ' منتقل ہوا۔ اجمل خٹک کے گھر میں ''تورلالی'' کا راج چلتا تھا۔ میری حیثیت ایک جونیئر اور ناچیز ہی کی تھی جسے ناسمجھ اور بیکار سمجھا جاتا تھا۔ دراصل تورلالی اپنے اور اجمل کے مابین کسی اور کو برداشت نہیں کرتا تھا۔ وہ دل کا بہت اچھا تھا، اگرچہ بزعم خود ہر موضوع پر حاوی تھا اور اس لیے طبع آزمائی بھی کر لیتا تھا لیکن یہ اس کی سادہ لوحی تھی۔

سردار داؤد نے جلد ہی داخلی طور پر اپنے آپ کو مضبوط کر لیا اور اس ضمن میں ضروری اقدامات بھی کر لیے۔ اس کے بعد داؤد خان نے نیپ کی عملی امداد کا عندیہ ظاہر کیا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے میری ڈیوٹی لگا دی گئی کہ خفیہ طور پر عبدالولی خان کو یہ پیغام پہنچا دوں۔ اس مہم کی سرانجام دہی کے لیے قندھار اور چمن کے راستے کچلاک پہنچا۔ رات میں نے کچلاک میں

عبدالعلی کاکڑ کے بیٹھک میں گزاری۔ ہلکی سی سردی لگ رہی تھی غالباً اکتوبر کا مہینا تھا۔ یہاں یہ فیصلہ ہوا کہ کوئٹہ کے بجائے لورالائی کے راستے ڈیرہ غازی خان جاؤں، چنانچہ صبح سویرے بس کے ذریعے لورالائی روانہ ہوا، اور لورالائی پہنچا تو نو بجے والی واحد جی۔ٹی۔ ایس کی بس روانہ ہو چکی تھی، اس لیے ایک کوئلوں سے بھرے ٹرک کی چھت پر سوار ہو کر روانہ ہوا۔ مری، بگٹی اور کوہِ سلیمان کے درمیان راستہ انتہائی خراب تھا، آدھی رات کے اندھیرے میں کوئلہ سے کالا کلوٹا ایک انتہائی بیکار قسم کے ہوٹل میں کمرہ لے کر جیسے تیسے رات گزاری۔ اگلی صبح سویرے لاہور کے لیے روانہ ہوا، جہاں سے ٹرین کے ذریعے پشاور پہنچا۔ پشاور سٹیشن پہنچنے کے بعد سیدھا اسلامیہ کالج کے کافی شاپ بازار کے ساتھ بنے نثار لالہ کے گھر گیا۔ رات نثار لالہ کے گھر گزاری۔ اگلی صبح وہاں سے ولی خان کے گھر شاہی باغ (ابھی ولی باغ نہیں بنا تھا) چارسدہ گیا۔ ولی خان سے ملا اور انہیں سردار داؤد کا پیغام بلکہ اجمل خٹک کا پیغام دیا کہ افغانستان اس بات کے لیے تیار ہے کہ وہ پختون زلمے کو ٹریننگ دے اور اُنہیں مسلح کردے۔ ولی خان نے کہا کہ اچھا ہوا آپ آگئے میں تو خود حیدر زمان خان (مہمند خان) کو تیار کرنے والا تھا کہ افغانستان جائے اور صدر داؤد کو پیغام پہنچا دیں کہ پاکستان ایئر فورس کے بعض پشتون پائلٹ اپنے جیٹ طیارے اغوا کر کے افغانستان اُتر جائیں گے لیکن ایسا نہ ہو کہ داؤد خان اُن کو واپس پاکستان کے حوالے کردے۔ یہ ولی خان کا ناممکن مطالبہ تھا اور وقت سے پہلے افغانستان کو مسائل سے دوچار کر رہے تھے۔ اس دوران میں امام علی نازش اور مختار باچا سے بھی ملا اور اپنی معلومات میں ان کو بھی شریک کر لیا۔ پشاور میں چند دن گزارنے کے بعد پنڈی گیا اور وہاں سے ریل گاڑی کے ذریعے کوئٹہ پہنچا۔ ملک عبدالعلی کے گھر واقع کچلاک گیا، جہاں سے وہ مجھے چمن چھوڑ آئے۔ چمن سے قندہار کے لیے گٹو (پک اپ کے لیے مقامی نام) پر سوار ہو کر روانہ ہوا۔ قندہار پہنچنے سے پہلے ظہر کی نماز کے لیے گاڑی ترنک ندی کے کنارے رک گئی۔ لوگوں نے ظہر کی نماز ادا کی۔ میرے کپڑے ناپاک تھے، اس لیے نماز نہیں پڑھ سکا، چنانچہ چار پانچ مسافروں نے بار بار پوچھا کہ او صوفی! تو نے نماز نہیں پڑھی؟ میں شرمندہ سا ہو گیا اور جب قندہار پہنچا تو سیدھا حجام کے پاس پہنچ کر داڑھی منڈوائی۔ داڑھی تو منڈ گئی لیکن صوفیت اور صوفی کا نام برقرار رہا۔

قبائلیوں کے علاوہ سیاسی عناصر کی آمدورفت کا سلسلہ جاری تھا۔ بلوچستان کے زعماء کے

ساتھ بھی رابطے شروع ہو چکے تھے۔ کابل میں صوبہ سرحد کے نوجوانوں کے ساتھ بھی تعلقات بنتے جا رہے تھے۔ پشتونستان کے ماننے والے قبائلی زعما اور طلبا کے ساتھ کھل کر بات چیت ہو رہی تھی، اسی دوران کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے دو لیڈر سائیں عزیز اللہ اور رؤف وارثی کو بھیجا گیا، تاکہ روابط کو مضبوط کیا جائے اور پرچم کے ساتھ بعض اہم فیصلے کر لیے جائیں، یہ دونوں ہمارے ساتھ رہ رہے تھے۔ پشاور میں پختون زلمے سے وابستہ نوجوان اور نیپ قیادت دیہاتوں میں یہ خبر پھیلا رہے تھے کہ کھانے پینے کی اشیاء کو ذخیرہ کر لیں، کیونکہ آنے والے دنوں میں سول نافرمانی کی تحریک شروع ہونے والی ہے، لوگ ان کی باتوں پر یقین نہیں کر رہے تھے۔ نیپ کے تجزیہ و تحلیل خوش فہمی پر مبنی تھا۔ ولی خان بڑے بڑے جلسوں سے جارحانہ خطاب کر رہے تھے اور شاید اسی مغالطے میں تھے کہ پشتون بیدار ہو چکے ہیں اور اس کے ساتھ کھڑے ہیں۔

اب میں کھل کر سامنے آ گیا تھا اور اجمل خٹک کے گھر میں واقع دفتر کا انچارج بنا دیا گیا تھا۔ صوبہ سرحد میں نیپ ایک روایتی انداز کی پارٹی تھی اور اس کے دفاتر بھی روایتی انداز میں کام کر رہے تھے۔ ہم اپنی ساری کاروائی افغانستان جیسے روایتی ملک میں کر رہے تھے، جہاں ان کے اپنے ادارے جدید انداز سے کوسوں دور تھے۔ اس پسماندہ صورتِ حال میں اپنی پارٹی کی ہماری نمائندگی بھلا کس نوعیت کی ہو سکتی تھی اور ہمارا دفتر بھی کیا دفتر ہو سکتا تھا؟ گویا ایک بادشاہ ہو اور دوسرا وزیر ہو۔۔ باقی اللہ ہی اللہ۔ اس کے باوجود ہم نے اپنے دفتر میں کیمرے، ٹائپ رائٹر، فائلیں اور الماری کا بندوبست کر لیا۔ میرے خیال میں یہ اولین منظم دفتر تھا، تاہم ایک منظم تحریک اور انقلاب برپا کرنے کے لیے اس طرح کا دفتر کچھ خاص کردار ادا کرنے کی صلاحیت سے محروم تھا۔ بہر حال ہم جیسے تیسے کام چلا رہے تھے اور اسی دفتر کے توسط سے داخلی اور خارجی روابط کو مربوط کر رہے تھے اور اس کا ریکارڈ محفوظ کر رہے تھے۔ اجمل خٹک صرف بہت ہی خاص باتیں اپنی ڈائری میں لکھ لیتے، بعض چیزیں میں بھی نوٹ کر لیتا تھا۔

1973ء کے اواخر میں ولی خان آنکھ کے علاج کے بہانے لندن جانے کے بجائے پہلے کابل تشریف لائے اور تمام تخریبی اور تربیتی پروگرامات کا خود معائنہ کیا اور انھیں آخری شکل دی۔ جب موسم بدلنے لگا اور برف پگھلنے کے ساتھ بہار کا آغاز ہونے لگا تو مارچ ۱۹۷۴ء پشتون اور بلوچ جوان ٹریننگ لینے کی غرض سے مختلف گروپس کی شکل میں آنے لگے۔ پہلے گروپ

میں بلوچوں کی رہنمائی رازق بگٹی اور صوفی خالق کر رہے تھے جبکہ پشتون عالم زیب کی قیادت میں آئے تھے۔ یہ تمام لوگ عالم زیب کی عمومی کمان میں چہار آسیاب کے نزدیک ٹریننگ کے لیے آمادہ ہوگئے۔ یہ ٹریننگ نظریاتی کے ساتھ عملی بھی تھی۔ یہاں انہیں گوریلا جنگ لڑنے کے لیے اسلحہ کا استعمال اور دھماکہ کرنے کی تربیت دی جاتی۔ ان لوگوں کو تقریباً ایک ماہ کی منظم تربیت دی گئی۔ اسی زمانے میں ولی خان کابل سے بذریعہ ہوائی جہاز لندن گئے اور پھر لندن سے واپسی میں سڑک کے راستے کابل آگئے۔ ولی خان کا مختلف افغان صوبوں میں گورنروں اور دیگر عہدیداروں نے گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا۔ ہم نے بھی صوبہ میدان وردگ میں ان کا استقبال کیا، اس استقبال میں داؤد کی کابینہ کے اہم ارکان بھی شامل تھے۔ اس شاندار استقبال سے صدر سردار داؤد خان نے کھلے عام نیپ کے ساتھ اپنی حکومت کے مقدر کو نتھی کر دیا تھا۔ پاکستان سے آنے والے جوانوں کی ٹریننگ کے اختتام پر پاسنگ آؤٹ پریڈ میں ولی خان نے بھی حصہ لیا۔ پاسنگ آؤٹ کے بعد ولی خان جوانوں سے گھل مل گئے اور ہنسی مذاق بھی کرتے رہے۔ ولی خان قصرِ صدارت میں رہائش پذیر تھے، جہاں وزیر، جرنیل، ریاستی عہدیدار، سیاستدان اور قبائلی مشران ان سے ملاقات کے لیے آتے رہے۔ ولی خان اعلیٰ سطح کی دعوتوں میں شریک ہوتے تھے۔ یہ دعوتیں نائب وزیراعظم ڈاکٹر حسن شرق، وزیر داخلہ فیض محمد خان، وزیر سرحدات پاچا گل وفادار، اور دیگر اعلیٰ فوجی اور سویلین عہدیدار کیا کرتے تھے۔ ولی خان نے ہندوستان اور عراق کے سفراء کے علاوہ سوویت یونین کے سفیر سے بھی ملاقات کی۔ سردار داؤد سے تو ملاقاتیں جاری ہی رہتی تھیں۔ ان ملاقاتوں میں ولی خان سردار داؤد کو یہ باور کراتے رہے کہ تمام پشتون اور بلوچ نہ صرف نیپ کے ساتھ ہیں بلکہ ایک بھرپور جنگ کے لیے بھی آمادہ ہیں۔ ولی خان سردار داؤد کو یہ یقین بھی دلاتے رہے کہ افواجِ پاکستان ہندوستان سے شکست کی وجہ سے پست ہمت ہیں اور ان کا مورال کمزور ہے اور یہ کہ پشتونوں اور بلوچوں کی مشترکہ قوت کے سامنے یہ فوج ٹھہر نہیں سکتی۔ ولی خان اس طرح کی لاف زنی اور خوش فہمیوں سے مملو تجزیوں سے سردار داؤد کو گمراہ کر رہے تھے۔ کابل میں ولی خان کے ساتھ بیگم نسیم اور اس کی بہن زبیدہ کے علاوہ دیگر ہمدرد ایک ساتھ جمع ہو چکے تھے، اور ان شاندار مراسم اور حالات سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب ولی خان ماہِ جون میں پاکستان واپس گئے تب بھی بی بی اور ان کی

صاحبزادی گلالئی کچھ عرصہ مزید کابل میں رہیں۔[۴]

تربیت یافتہ جوان اپنی ٹریننگ کے اختتام پر مختلف راستوں سے پاکستان واپس ہوئے۔ یہ لوگ اپنے ساتھ اسلحہ، گولہ بارود، ٹائم بم، گرینیڈ اور دیگر مواد پاکستان لے گئے۔ جاتے ہی ان لوگوں نے پلان کے مطابق دہشت گردانہ کارروائیاں شروع کیں۔ پہلے بیچ کے بعد تواتر سے جوانوں کے گروپ گوریلا کارروائیوں کی ٹریننگ کے لیے افغانستان آتے گئے۔ اس تمام عمل کے نتیجے میں صوبہ سرحد میں تخریب کاری کا سلسلہ شروع ہوا۔ کہیں بینک میں بم دھماکہ ہوتا، کہیں جی۔ ٹی۔ ایس کی بس میں، کبھی پولیس تھانوں میں اور کبھی کسی تانگے میں بم پھٹتا۔ کوئی ریل کی پٹڑی کو اڑا دیتا تو کوئی بجلی اور ٹیلی فون کی تنصیبات کو نشانہ بناتا۔ گویا صوبہ بھر میں جگہ جگہ بم دھماکے اور تخریبی کارروائیاں ہوتی رہیں اور بے گناہ لوگ مرتے رہے۔ ان کارروائیوں نے حکومت کو اچھا خاصا پریشان کیا، تب حکومتِ پاکستان نے راست قدم اُٹھایا اور پولیس کو مزید با اختیار کیا۔ گرفتاریوں اور تشدد کا آغاز کیا گیا۔ بہت سے افراد کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوئے۔ ان لوگوں کو ہدایت دی گئی تھی کہ ہر حال میں گرفتاری سے بچنے کی کوشش کریں۔ بہر حال جو مطلوب آدمی پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا، بیچارا اچھا خاصا ٹارچر ہوتا۔ اسی طرح بعض جوانوں کی بیویوں اور بہنوں کو تھانے بھی بلایا جاتا اور بہت سے لوگوں کو بے عزت کیا گیا۔ بلوچستان میں بھی فوج کے خلاف جگہ جگہ کارروائیاں ہوتی رہیں۔ فوج کے ساتھ جھڑپوں کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا، نتیجتاً فوج نے لشکر کشی اور آپریشن کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مری قبائل پر بمباری کی گئی۔ ایران سے ملنے والے ہیلی کاپٹروں نے چمالنگ، تھڈری، ماوند اور دیگر مقامات پر بلوچ گوریلوں پر بمباری کی۔ بلوچوں کے آنے جانے والے راستوں پر فوج نے قبضہ کیا جبکہ خصوصی طور پر مری علاقے کا محاصرہ کیا گیا۔ اگرچہ اس لڑائی میں پاکستان آرمی کو بھی خاصا جانی اور مالی نقصان اُٹھانا پڑا۔ لیکن پاکستان آرمی کی جانب سے بے تحاشا اور بے دردی سے کی گئی بمباری کی وجہ سے بلوچ اور خصوصاً مری قبائل افغانستان ہجرت کر گئے۔ پہلے پہل یہ مہاجرین آٹھ سو خاندانوں پر مشتمل تھے جو قندھار کے ''کوکران'' اور زابل کے ''قلات'' کیمپوں میں رہ رہے تھے اور آخر میں ان کی تعداد میں اضافہ ہوا، اور ان کی تعداد سات ہزار تک پہنچ گئی۔ کچھ عرصہ بعد قلات کا کیمپ ہلمند صوبے منتقل ہوا۔

پاکستان اور افغانستان کے تعلقات انتہائی کشیدہ اور خراب ہو گئے۔ بلوچستان میں بلوچ گوریلا کارروائیوں اور پشتون سٹوڈنٹس فیڈریشن کی تخریبی سرگرمیوں جبکہ سرحد میں پختون زلمے کے دھماکوں میں اضافے کی وجہ سے معاملات خراب ہوتے چلے گئے۔ پاکستان کے وزیرِ اعظم ذوالفقار بھٹو نے قبائلی علاقوں کے دورے میں سردار داؤد کے خلاف نازیبا اور تند و تیز لہجہ اپنایا۔ اس دوران سعودی عرب اس کوشش میں تھا کہ دونوں برادر ممالک میں صلح ہو۔ کابل میں مقیم سعودی سفیر جو شاہی خاندان سے تھا، ہمارے ساتھ قریبی رابطے میں رہا اور کئی بار اُس نے ہمیں اپنے گھر کھانے پر بلایا۔ اسلامی ممالک کی تنظیم کے سیکرٹری جنرل مصر کے حسن التہامی کابل آئے اور افغان حکومت کے ساتھ بات چیت کی۔ افغانستان نے موقف اپنایا کہ پاکستان پشتون اور بلوچ بھائیوں کے حقوق غصب کر رہا ہے اور ہم ان کے ساتھ ہیں اور اگر پاکستان ان حقوق کی پاسداری کرتا ہے تو پھر ہم راضی ہیں۔ حسن التہامی کئی مرتبہ ہمارے گھر آئے اور اجمل خٹک سے تبادلہ خیالات کرتے رہے تاہم اس گفتگو کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ نیپ اور پیپلز پارٹی کے درمیان ایک وسیع خلیج بن گئی تھی۔ ولی خان کسی طرح صلح کے لیے آمادہ نہ تھے، بلکہ ان کا رویہ کافی حد تک مغرورانہ تھا، سو حالات کی سازگاری کے لیے اُٹھائے گئے ثالثی کے تمام اقدامات بے ثمر رہے۔

میں پختون زلمے کی جانب سے ہونے والی تمام تخریبی کارروئیوں کی روداد قلمبند کرتا اور سائیکلوسٹائل کر کے انہیں دوست ممالک کے سفارت خانوں کے علاوہ داخلی اور خارجی دوستوں اور خبر رساں اداروں کو ارسال کرتا۔ ہم قبائل کے ساتھ روابط کو وسعت دینے اور اپنی سیاست کے لیے فعال دوست پیدا کر رہے تھے۔ دوسری طرف پختون زلمے کی کارروائیوں کی وجہ سے حالات خود ان کے لیے بھی انتہائی خراب ہو گئے تھے اور اب حالت یہ تھی کہ کوئی ان کو پناہ دینے کے لیے تیار نہ تھا۔ نیپ کے کارکن اور لیڈران اس ساری لڑائی سے الگ تھلگ ہو گئے تھے اور اپنے آپ کو ہر طرح کے الزام سے محفوظ کیے ہوئے تھے۔ دراصل وہ خوفزدہ تھے۔ پاکستان اور خصوصاً سرحد میں جبر کا ماحول بن چکا تھا، نوجوانوں کے خلاف وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے تھے۔ اس صورتِ حال میں پختون زلمے سے وابستہ جوان مجبوراً افغانستان اور پاکستان کے آزاد قبائلی علاقوں میں چلے گئے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ اس طرح وہ اپنے آپ کو محفوظ کر سکنے کے علاوہ اپنی کارروائیاں بھی جاری رکھ سکیں گے۔ جبکہ ولی خان بھی یہی چاہتے تھے۔

افغانستان میں داؤد کے خلاف بھی سازشوں کے تانے بانے بن رہے تھے۔ جون ۱۹۷۴ء میں ڈاکٹر نیازی اور بعض اخوانی عناصر کی گرفتاری سے بغاوت اور تخریبی کارروائی ناکام بنا دی گئی۔ ڈاکٹر نیازی اور اس کے بعض ساتھیوں کی گرفتاری کے بعد گلبدین حکمتیار، برہان الدین ربانی، احمد شاہ مسعود، مولوی یونس خالص، مولوی محمد نبی، قاضی امین وقاد اور بہت سے دیگر فوجی اور چھوٹے اور گمنام ساتھی پاکستان چلے آئے اور بعض لوگ پاکستان کے زیرِ سایہ رہنے لگے۔ ان لوگوں میں بہت سے ماؤ نواز بھی افغانستان سے پاکستان بھاگ آئے۔ بعض قبائلی مشران بھی پاکستان شفٹ ہو گئے۔ حضرت صبغت اللہ مجددی نے جو داؤد کے سخت مخالف تھے، ڈنمارک ہی میں رہائش اختیار کی۔ پاکستان اور بھٹو کی حکومت کو اللہ نے بہترین موقع فراہم کر دیا اور وہ ان لوگوں کی مدد کے لیے فوراً تیار ہوا۔ اس وقت نصیر اللہ بابر فرنٹیر کور کے آئی۔ جی تھے۔ موصوف اپنی کاروائی کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے عادی تھے اور ان افغانوں کی ٹریننگ کا سال ۱۹۷۳ء بتاتے تھے، جبکہ کرنل سلطان (جو کرنل امام کے نام سے مشہور ہوئے) اس سلسلے میں صحیح طور پر ان لوگوں کی مدد اور تربیت ۱۹۷۴ء کے اواخر میں بتاتے ہیں۔ پیپلز پارٹی نے ان لوگوں کی تربیت دراصل ہماری کارروائیوں کے ردِعمل میں کی۔ اس تربیت کی ذمہ داری ایف۔ سی کے دائرہ کار میں سپیشل فورسز نے نبھائی، ان لوگوں میں بعض افغان فوج کے سابق افسران اور اہلکار بھی تھے۔ اور جب یکم اپریل ۱۹۷۹ء کو افغان مہاجرین کے لیے کمشنریٹ قائم کیا گیا تو اس وقت تک ان لوگوں کی تعداد ۹۸ سربراہانِ خاندان کی تھی اور خاندان کے ساتھ کُل ۱۳۳۱ ہو گئی تھی اور انہیں بھی کمشنریٹ کے حوالے کر دیا گیا۔ ان لوگوں کی تعداد پختون زلمے کے نام سے افغانستان میں مہاجر ہونے والوں سے زیادہ تھی۔ ان لوگوں کی کارروائیوں سے سردار داؤد کی حکومت کو کئی چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اگرچہ چھوٹی موٹی کارروائیاں پہلے بھی ہوتی رہیں۔ تاہم حیات محمد خان شیرپاؤ کی ہلاکت کے بعد سال ۱۹۷۵ء کے وسط میں افغانستان میں جوابی تخریبی کارراوئیاں زیادہ تیز ہو گئیں۔ یہ کارروائیاں زیادہ تر کونٹر، غزنی، پکتیا، بدخشان اور کابل میں ہوتی رہیں۔ پنجشیر میں کی گئی کارروائی بہت اہم تھی، کیونکہ اس نے داؤد خان کی حکومت کو انتہائی پریشان کر دیا تھا۔

’پختون زلمے‘ کی ٹریننگ، ان کے گروپ بنانا، ان کی انتظامی ضروریات، ان کی عملی فعالیت اور ان کے خفیہ ٹھکانوں کا بندوبست میرے دائرہ کار سے باہر تھا۔ میں اس تنظیم کا رکن نہیں

تھا، یہ کام ان کے کمانڈرز کا تھا۔ البتہ دفتر کے انچارج کی حیثیت سے ان کے آنے جانے اور ان کی کاروائیوں سے باخبر رہتا، جبکہ میں فقط ان کے مجھ سے متعلق مسائل حل کرتا۔ یہ ساری تفاصیل اجمل خٹک نے اپنی ڈائریوں میں درج کی ہیں۔

جب پختون زلمے کے لیے حالات ناموافق ہوگئے تو ہم نے انہیں فاٹا میں اپنے دوست اور طرفدار قبائل کے ہاں ٹھہرانے کا بندوبست کیا۔ باجوڑ کے علاقے سالارزئی میں ملک عظیم خان (تورملک) کا گاؤں ''شنگر گل'' مرکز بنایا گیا اور اس مرکز کی کمان عالمزیب کے حوالے کی گئی۔ فیض محمد خان کی ذمہ داری چارمنگ (باجوڑ) میں تھی۔ مہمند میں ہمارا اصل آدمی منشی سحر گل تھا جن کے عیسیٰ خیل (مہمند ایجنسی) اور کامہ (افغانستان) میں گھر اور جائیداد تھی اور خود اکثر جلال آباد میں رہتے تھے، ان کا ٹھکانہ دوسرا اہم مرکز تھا۔ اسی طرح کوڈا خیل (مہمند ایجنسی) میں سیال صاحب کے ہاں بھی کبھی کبھی کوئی پناہ لے لیتا، لیکن کوئی باقاعدہ مرکز نہ تھا۔ خیبر ایجنسی میں ملک نادر خان ذخہ خیل کا گھر اور حجرہ ''شین کمر'' کے گاؤں ''تورا ویلہ'' میں تھا۔ یہاں اعظم خان ہوتی بااختیار کمانڈر تھے۔ کرم ایجنسی میں چمکنی اور توری قبائل میں ہمارے دوست موجود تھے۔ شمالی وزیرستان میں مولانا ہاشم کے زیرسرپرستی منظر خیل کا علاقہ ہمارا مرکز تھا اور یہ شہباز خان کمانڈر کا ٹھکانہ تھا، جبکہ سردیوں میں مولانا صاحب دتہ خیل شفٹ ہوجاتے تھے۔ جنوبی وزیرستان میں بہت سے مسیت (محسود) اور احمد زئی وزیر ہمارے ساتھی تھے۔ بلوچستان کے پشتون 'توبہ کاکڑی' کے سامنے زابل صوبہ کے سرحد کے نخاس پہاڑ کے پہلو میں 'آسومرغہ' میں پشتون سٹوڈنٹس فیڈریشن کا ایک فعال مرکز بسم اللہ کاکڑ کے زیرِ نگرانی کا کام کر رہا تھا۔ شروع میں تو ہم نے تمام بھاگے ہوئے لوگوں کو ان کیمپوں میں رکھ لیا۔ یہ مراکز ہمارے فارورڈ اور ایڈوانس مورچے تھے، جن کے ساتھ ہمارے انتظامی اور سیاسی رابطے تھے۔ سالارزئی کے علاقے میں لیٹی ٹاپ میں ایک اور کیمپ ملک گل زرین مشوانی کے زیرِ کمان موجود تھا۔ عالمزیب نے بعد میں اپنا مرکز افغان صوبہ کونڑ (اس وقت کونڑ صوبہ نہیں بنا تھا) کے علاقے دانگام میں قائم کیا۔

جب پاکستانی قبائلی علاقوں میں جوانوں کی آمد زیادہ ہونے لگی تو پاکستان کی جانب سے ان قبائل پر دباؤ بڑھنے لگا جس کے نتیجے ان جوانوں کی دنیا گویا مزید تنگ ہوگئی، تب افغان حکومت کی مشاورت سے جلال آباد شہر میں 'وزارت سرحدات' کے قبائلی امور کے دفتر کے قریب 'مطبوعات کا

کلوپ' (پریس کلب) خالی کیا گیا اور اسے پختون زلمے کے کیمپ میں تبدیل کیا گیا۔ اس کیمپ کا عمومی کمانڈر اور نگران ہدایت اللہ عرف باچا تھا اور اعظم ہوتی ان کے ساتھ ہم پلہ تھے۔ کابل میں ہم نے تمام جوانوں اور ان کے لیڈران کے لیے نئے نام تجویز کیے گئے۔ عبدالولی کے لیے باز، بیگم نسیم کے لیے کمانڈر شیر (آپ اپنے لیے زڑہ ور خان کا نام بھی استعمال کرتی تھی)، اعظم ہوتی کے لیے کٹے (کھٹا)، حاجی نادر خان کے لیے میچہ (بھینس) اور اسی طرح دوسروں کے لیے فرضی نام رکھے گئے۔ اس طرح کی کاروائیوں کے لیے اس طرح کے فرضی نام رکھنا معمول کی بات ہوتی ہے۔

میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ''دیر'' کے حوالے سے علیحدہ بات ہو۔ ضلع دیر میں ضلعی کمانڈر علاقہ گھمبیر کے خوانین میں سے سعید خان کو مقرر کیا گیا۔ جب جون، جولائی اور اگست ۱۹۷۴ء میں پختون زلمے کی کاروائیاں اور ٹریننگ شروع ہوئیں، پختون زلمے سے وابستہ جوان انہی سعید خان کے توسط سے ملک عظیم خان کے پاس ان کے گاؤں شنگر گل (باجوڑ) پہنچتے اور ملک صاحب انہیں اسد آباد (کونڑ) پہنچا دیتے۔ ماہِ اگست میں سعید خان آف گھمبیر کی سرگرمیاں حکومت کی نظر میں آگئیں۔ ان کی گرفتاری کے لیے چھاپہ مارا گیا، لیکن وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔ سعید خان اپنے بڑے بھائی بخت باچا خان، جو کہ اس وقت گھمبیر کے خان تھے کے ساتھ ہجرت کر کے باجوڑ کے علاقے سالارزئی کے گاؤں گامبٹ چلے گئے۔ شیر محمد خان اس وقت سالارزئیوں کے خان تھے اور گامبٹ خان کے نام سے جانے جاتے تھے (آج کل ان کا بیٹا پشت خان کے نام سے مشہور ہے)۔ گھمبیر خوانین کا خاندان گامبٹ میں شیر محمد خان کے ہاں رہنے لگا، مگر جب دیر میں ہونے والے بم دھماکوں میں شدت آنے لگی تو ان کے لیے یہاں بھی حالات ناموافق ہوگئے۔ نیپ کے رہنماؤں کی عمومی گرفتاریاں شروع ہوئیں تو ولی خان نے سب سے کہا کہ آپ گرفتاریاں نہ دیں بلکہ افغانستان چلے جائیں۔ ان حالات میں جب گھمبیر کے خوانین شیر محمد خان کے علاقے میں تنگی بھی محسوس کر رہے تھے اور اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ شیر محمد خان قدرے کنجوس بھی تھے۔ چنانچہ ان لوگوں نے ولی خان کے مشورے سے افغانستان چلے جانے کا ارادہ کر لیا۔ شیر محمد خان نے ان لوگوں کا سارا اسلحہ روک لیا۔ شیر محمد خان کا کہنا تھا کہ ان لوگوں پر میں نے اچھا خاصا خرچ کیا ہے اور وہ مجھے مل جانا چاہیے اور یہ کہ افغان حکومت مجھے

اس کا معاوضہ دے۔علاقہ گھمبیر (دیر پائیں) کے تمام چھوٹے بڑے اپنی جائیداد، گھربار اور زمینیں چھوڑ کر افغانستان چلے گئے۔حکومت پاکستان نے ان کی ساری جائیداد اور زمینیں ضبط کر کے سابقہ ریاستِ دیر کے اہلکاروں میں تقسیم کی۔

گھمبیر خوانین کے افغانستان چلے جانے کے فوری بعد حیا سیرئی (میدان، دیر) کے ملک تحصیلدار صاحب، دوکڑئی خان، محمد امین خان، گل ملک، عبدالواحد خان، بانڈئی خان، گوڑ خان، میدان کے فاتح خان، وغیرہ بھی افغانستان چلے گئے۔ان لوگوں کو کس طرح مصروف رکھا جاتا؟ اجمل خٹک نے ان لوگوں پر مشتمل ایک جنگی شوریٰ (وار کونسل) ترتیب دیا اور بخت باچا خان کو سربراہ بنادیا گیا۔ان سب کو اسلحہ دیا گیا۔اسی طرح جندول کے عبدالرملک، تور ملک، گل ظریف ملک جو مشوانی قبیلہ کے مشران تھے، کے علاوہ دیگر چالیس افراد کو بھی اسلحہ دیا گیا۔یہ اسلحہ دانگام میں عالمزیب کے ذریعے دیا گیا تھا۔اس سلسلہ میں مشوانی ملک، ملک گل زرین کو اسلحہ دیا گیا تا کہ لیٹی کے بالائی میدانی علاقے میں بیس کیمپ بنا سکے۔یہیں پر افغان فوج بھی تعینات کی گئی۔دانگام کے ملک نیاز خان اور سالارزئی کے صفدر ماما ان جوانوں کی اچھی خاصی مدد کیا کرتے تھے۔ان دنوں حاجی محمد چمکنی کونڑ ضلع کے کمشنر تھے، جبکہ صاحب جان صحرائی قبائل ڈائریکٹوریٹ میں ڈائریکٹر تھے۔یہ دونوں صاحبان دل وجان سے ان جوانوں کی خدمت کرتے رہے اور جب ضلع دیر میں اقوام پائندہ خیل وسلطان خیل اور حکومت پاکستان کے مابین جنگل کی ملکیت اور رائیلٹی پر تنازعہ پیدا ہوا اور معاملات بگڑ گئے تو ہم نے فاتح خان سلطان خیل (اگر چہ یہ علاقے 'میدان' میں ہیں، تاہم قبائل کے اجتماعی ملکیت کے دعویدار تھے) اور ان کے ساتھ ساتھیوں کو اسلحہ فراہم کیا، اور جب ۱۹۷۶ء میں ملیشیا کے ساتھ ان قبائل کے مابین لڑائی چھڑ گئی تو جانبین سے بڑی تعداد میں ہلاکتیں ہوئیں۔ان قبائل سے متعلق کئی ایک "ملک" جلال آباد کیمپ سے باہر قیام پذیر تھے، جبکہ فقط عاقل خان، آدم خان، گل رحمان، ڈیلے (علاقہ مایار، جندول، دیر) وغیرہ کیمپ میں رہائش رکھتے تھے۔

جلال آباد کیمپ میں پاکستان سے آنے والوں کی بڑی تعداد جمع ہو گئی تھی۔اگر چہ اب مجھے تمام لوگوں کے نام اور تفصیلات یاد نہیں مگر پھر بھی ان میں سے بعض کے نام میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ان لوگوں میں چارسدہ سے نقیب عرفِ دلبر (سرڈھیری، چارسدہ) اسرار اللہ عرفِ ناصر (سرڈھیری، چارسدہ)، روز گل (خاص چارسدہ) ہدایت اللہ عرف باچا (گل آباد، چارسدہ)،

سردار عالم (چاسدہ)، پیر محمد خان، جاوید، عظیم خان، حکیم خان جرنیل، شاکر (منی خیل) میر علی شاہ (منی خیل) جہانگیر، عبد الواحد عرفِ بدرے، سلطان علی صابر، صنوبر، ہدایت اللہ عرفِ بہادر، عاصی ہشتنغرے، بلا خان، معزاللہ خان اور کئی دوسرے، صوابی سے عالم زیب، جہانزیب، شہباز خان، شیر ولی، اول شیر، شیر زمان، جبل الورید، فلک شیر، سید وہاب اور کئی ایک دوسرے، پشاور سے سیکرٹری فضل رحمان، سیاف، طوطی شمشاد، سلطان اور کئی دوسرے ساتھی، سوات وبونیر سے شمس بونیری، سلیم، کریم بابک، شوکت، نگار، صاحبزادہ، زبردست، مفتی (میا آدم) طوطی باچا، بخت علی، ظاہر خان وغیرہ، کوہاٹ سے اخلاق حسین استرزئی۔اس کیمپ کے عمومی کمانڈر ہدایت اللہ اور اعظم خان ہوتی تھے۔اس کیمپ میں قیام پذیر تمام لوگوں نے ان کمانڈران کے زیرِ نگرانی، پاکستان میں تخریب کاری اور سبوتاژ کارروائیوں میں حصہ لیا تھا۔جلال آباد کیمپ کا قیام ۱۹۷۴ء کے اواخر یا ۱۹۷۵ء کے اوائل میں عمل میں لایا گیا تھا، اس سے پہلے پاکستان سے آنے والے لوگ یا تو کابل میں ہمارے ساتھ رہتے تھے یا حکومتِ افغانستان کی جانب سے قبائلیوں کے لیے کونڑ اور جلال آباد میں قائم کردہ مختلف مہمان خانوں میں ٹھہرائے گئے تھے۔

حیات محمد خان شیر پاؤ کا قتل

۸ فروری ۱۹۷۵ء کی شام کو دنیا بھر کے ریڈیو سٹیشنز سے یہ خبر نشر ہوئی کہ پشاور یونیورسٹی کے ہسٹری ہال میں منعقدہ ایک تقریب میں بم دھاکہ ہوا جس میں پیپلز پارٹی کے صوبائی صدر اور صوبہ سرحد کے سینیر وزیر اور وزیرِ داخلہ حیات محمد خان شیر پاؤ جاں بحق ہو گئے۔ یہ ایک اہم واقعہ تھا اور جب یہ خبر نشر ہوئی تو صدر سردار داؤد نے فوری طور پر اجمل خٹک سے فون پر رابطہ کیا اور کہا کہ یہ کام آپ لوگوں نے کیا ہے؟ اجمل خٹک نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بالکل مکر گئے۔ مگر یہ ایک بڑا اور اہم واقعہ تھا اور شیر پاؤ کی موت کا یہ سانحہ نیپ جیسے سیکولر اور ترقی پسند پارٹی پر، افغانستان اور پاکستان کے باہم تعلقات اور پشتون و بلوچ اتحاد پر انتہائی اثر انداز ہوا۔

اجمل خٹک کے انکار اور مکرنے کے باوجود اس واقعے کے دوسرے ہی دن اس تخریبی کاروائی کے دونوں کردار (جنھیں میں غماز ان کہتا تھا) بُلا خان (حبیب اللہ خان) اور اس کے بھائی معز اللہ خان کے ساتھ افغانستان چلے آئے۔ اس سارے واقعے اور سانحے کی روداد یہ ہے کہ منصوبہ بندی کے مطابق انور اور امجد نے ایک ٹیپ ریکارڈر میں بم نصب کر لیا تھا۔[۵] پروگرام یہ تھا کہ سات فروری کو ٹیکنیکل کالج پشاور میں طلباء کی ایک تقریب میں، جس میں حیات محمد خان شیر پاؤ شرکت کر رہے تھے، بم دھماکہ کرنا تھا۔ لیکن اس دن ہوا یہ کہ پشتون سٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر افراسیاب خٹک بھی سٹیج پر بیٹھے ہوئے تھے چنانچہ منصوبے پر عمل نہ ہو سکا۔ اس تقریب کے دوسرے دن شیر پاؤ صاحب ہسٹری ڈیپارٹمنٹ کی نومنتخب سٹوڈنٹس یونین کی تقریبِ حلف برداری میں مدعو تھے۔ انور اور امجد نے اپنا ٹیپ ریکارڈر روسٹرم پر مائیک کے ساتھ بظاہر اس غرض سے رکھ لیا تھا کہ شیر پاؤ کی تقریر ریکارڈ ہو۔ جب شیر پاؤ تقریر اور سوالات و جوابات کے لیے روسٹرم پر آئے تو ایک زوردار دھماکہ ہوا، حیات محمد خان شیر پاؤ دھماکے کی نذر ہو گئے اور کئی دیگر افراد شدید زخمی ہوئے اور مرے بھی۔ اس دن بارش ہو رہی تھی، امجد اور انور بے خبری کے عالم میں کھیتوں میں سے ہوتے ہوئے چارسدہ روانہ ہوئے۔ راستوں پر بڑی تعداد میں پولیس تعینات تھی اور لوگوں کی تلاشی ہو رہی تھی۔ جب یہ دونوں چارسدہ سے کچھ فاصلے پر چارسدہ جانے والی عمومی سڑک پر آئے تو پولیس شک کی بنیاد پر انہیں گرفتار کر کے تھانے لے گئی۔ پولیس اور بھی کئی

لوگوں کو گرفتار کر کے لائی تھی۔ وہاں تھانے میں انھیں علم ہوا کہ شیر پاؤ مر چکا ہے۔ ان لوگوں نے وہاں بُلا خان کے ایک نوکر کو دیکھا اور اسے اشارے سے اپنے قریب بلا لیا اور ان سے بلا خان کو خبر دینے کو کہا۔ بلا خان ایک نڈر اور ہوشیار آدمی تھے، وہ آئے، پولیس کو ڈرایا دھمکایا اور کہا کہ تم لوگوں نے میرے معزز مہمانوں کو کیوں گرفتار کیا ہے؟ یوں انور اور امجد رہا ہو گئے اور بلا خان نے انھیں اپنے اور اپنے بھائی معز اللہ خان کے ہمراہ براستہ مہمند ایجنسی افغانستان روانہ کیا۔ انور اور امجد نے شروع کے چند دن شمالی افغانستان میں قندوز وغیرہ کے علاقوں میں چھپتے چھپاتے، خاموشی کے ساتھ گزارے، لیکن چونکہ افغانستان ایک پسماندہ اور تنگ و تُرش ملک تھا، فقط کابل ایسا شہر تھا جو زندگی گزارنے کے قابل تھا، اس لیے افغانستان کے کسی دیگر علاقے میں پشاور سے آنے والے مشکل ہی سے دن گزار سکتے تھے، اس لیے یہ دونوں چند دن کے بعد کابل چلے آئے اور طبعی طور پر ہمارے ہی پاس آ گئے۔ ان کے آنے سے تو گویا بات بالکل واضح ہو گئی۔ دوسری طرف پاکستان میں پولیس کو رستے میں پڑی ہوئی دو شیروانیاں مل گئیں اور ان شیروانیوں کی توسط سے اس درزی کے پاس پہنچ گئی جس نے ان کی سلائی تھی اور تفتیش درزی سے ہوتے ہوئے ان کے مالکوں کی پہچان تک پہنچ گئی یعنی انور باچا اور امجد باچا کے نام منظر عام پر آ گئے۔ اس قتل کا الزام بیگم نسیم ولی خان، اسفندیار ولی خان اور نثار محمد خان آف گل آباد پر لگا۔ نثار محمد خان خود پیپلز پارٹی میں شامل تھے اور شاید سیاسی اور خانی کی رقابت کی وجہ سے حیات محمد خان سے شاکی تھے۔ نثار محمد خان اور اسفندیار گرفتار کیے گئے اور سختی کے نتیجے میں اعتراف بھی کر گئے۔ نسیم بی بی کا نام بلاوجہ نہ تھا۔ کمانڈر ہدایت اللہ کے کہنے کے مطابق ۱۹۷۳ء میں ولی خان نے انہیں تاکید کی تھی کہ پختون زلمے کی کاروائیوں سے دو افراد کو کسی طرح کوئی خبر نہ ہو یعنی ایک اسفندیار اور دوسرے افراسیاب خٹک۔

یہاں میں اپنی ڈائری، مرقومہ پانچ جنوری ۱۹۷۵ء سے ہو بہو نقل کر رہا ہوں۔ ''فیض محمد خان (شیوہ۔صوابی) پانچ دن پہلے آئے تھے، آج واپس رخصت ہو گئے۔ ان کو خاص کام حوالے کیا گیا ہے۔ فیض محمد خان کے مطابق اس نے سب سے پہلے تخریب کاری شروع کی تھی، کہیں بجلی اور ٹیلیفون کے تار کاٹتا، پی۔ ٹی۔ سی (پاکستان ٹوبیکو کمپنی) کے دفاتر و گوداموں میں آگ لگاتا، بم دھماکے کرتا، اور اپنے پیسے سے درّہ (درہ آدم خیل) سے گرینیڈ خرید کر لاتا، سب سے پہلے یعنی ۲۴ اگست ۱۹۷۳ء کو میری گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوئے۔ لیکن افسوس کہ بعد میں کسی نے بھی

میری خیر خبر نہ لی۔ یہ سب کام میں ولی خان کے مشورے اور حکم سے کر رہا تھا، جبکہ نیپ کی مقامی یعنی ضلعی قیادت نے ہمیشہ میری راہ میں روڑے اٹکائے۔ شیر پاؤ اور عبدالقیوم خان کی ہلاکت کے منصوبے میں نے ولی خان کے کہنے سے بنائے تھے، میں نے بعض مفروروں کو جو اجرتی قاتل تھے، سے رابطہ کر کے بلا لیا تھا کیونکہ پختون زلمے نے اس سلسلے میں انکار کر دیا تھا کہ ان کے پاس وسائل نہیں ہیں۔ اصلاً یہ ڈرے ہوئے تھے، دوسری طرف پارٹی (نیپ) کے بعض رہنماؤں نے بھی میرے کاموں میں رکاوٹیں ڈالیں۔ بقول فیض محمد وہ ہر کام کے لیے تیار ہے اور بڑے جوش سے کہا کہ اللہ کرے کہ اسے اپنے کیے پر کوئی ندامت اور ملامت نہ ہو، میرے لیے پچھتاوے سے بہتر ہے کہ مر جاؤں۔ پانچ پانچ افراد پر مشتمل تین نئے گروپ بنا کر ان کے حوالے کر دیے گئے تا کہ یہ خود ان کی تنظیم کر سکے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ پختون زلمے کے کام میں تبدیلی لائی جائے، نئے اقدامات کریں یعنی ان تمام لوگوں کو موت کی نیند سلائیں جو ہمارے مخالف ہیں۔“

اس سے پہلے حیات محمد خان شیر پاؤ پر ’ڈینگے‘ نامی بدمعاش کے گروپ کے ذریعے ایک سے زائد مرتبہ حملے کی کوششیں بھی ہوئیں۔ ایک مرتبہ سوات میں حیات محمد خان کا جلسہ شجاعت علی خان اور فتح محمد خان، یعنی خوانین آف جورے کے ہاں ہو رہا تھا، شیر شاہ کو اس کے کمانڈر نے بم سے بھرا بریف کیس دیا تھا جو انہوں نے سٹیج کے ساتھ رکھ دیا تھا تاہم بم سے ملحق فیوز کے تار الگ ہونے کی وجہ سے پھٹ نہ سکا، شجاعت علی خان کے ایک نوکر کی اس بریف کیس پر نظر پڑ گئی اور وہ اسے اپنے گھر لے گیا کہ اس میں رقم ہو گی، لیکن کھولنے پر معلوم ہوا کہ اس میں تو بم نصب ہے۔ اس نوکر نے اس کی اطلاع شجاعت علی خان کو دی جس کے حکم سے یہ بریف کیس کہیں پھینک دیا گیا اور ضائع کیا گیا۔

شیر پاؤ کی شہادت کے فوری بعد نیپ پر پابندی لگا دی گئی اور اس پابندی کو سپریم کورٹ نے جائز قرار دیا۔ نیپ کے لیڈر جیلوں میں ڈال دیے گئے۔ ان پر حیدر آباد ٹریبونل میں غداری کا مقدمہ بنایا گیا۔ تمام منصوبہ بندی گویا شکست وریخت کا شکار ہوئی، گھٹن بڑھ گئی، استبداد کی زیادتی کے ساتھ ساتھ ہمارے جوانوں کی کاروائیاں ماند پڑنے لگیں۔ جبکہ اس کے برعکس افغانستان میں پاکستان کے تربیت یافتہ اخوان اور تخریبی عناصر کی کاروائیاں زور پکڑنے لگیں، نتیجتاً افغانستان سخت داخلی اور خارجی دباؤ میں آ گیا۔

کونڑ، مہمند، شنواری، خروٹی، خوگیانی، منگل اور احکزئی قبائل کے بعض اہم خاندان پاکستان چلے گئے۔ توازن بہت تیزی سے بدل چکا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اجمل خٹک نے ہندوستانی تعاون سے اردو زبان میں ”قومی جمہوری انقلاب“ کے عنوان سے ایک پمفلٹ شائع کیا تھا۔ میں نے یہ پمفلٹ انگریزی میں ترجمہ کیا اور اسکے ساتھ پختون زلمے کی کاروائیوں کی تاریخ وار لسٹ بھی منسلک کی، اور اس پر ایک مختصر سا دیباچہ لکھ کر اسے ’گولی کا جواب گولی‘ یعنی ”Bullet for Bullet“ کا عنوان رکھا گیا۔ یہ عنوان بشیر مٹہ نے پسند کیا تھا۔ یہ کتاب ہم نے انگلینڈ میں موجود ڈاکٹر خورشید عالم کے حوالے کر دی کہ وہاں سے شائع ہو۔ ابھی یہ کتاب شائع ہونے ہی والی تھی کہ حیات محمد خان شیر پاؤ کی شہادت کی خبر آ گئی۔ ڈاکٹر خورشید عالم نے فوری طور پر اس واقعہ کو بھی پختون زلمے کی کاروائیوں کی لسٹ میں شامل کر کے اس کتاب کو شائع کیا۔ یہ کتاب ہمیں ہندوستانی دوستوں کے توسط سے ملنے سے پہلے ڈاکٹر خورشید عالم کے ذریعے سینکڑوں کی تعداد میں تقسیم ہو چکی تھی۔ سو یہ پمفلٹ حکومت پاکستان کے ہاتھ بھی لگا۔ یہ ایک مضبوط ثبوت تھا، جسے سپریم کورٹ کے بنچ کے سامنے پیش کیا گیا۔ خود بھٹو صاحب نے اس پمفلٹ کو عوامی جلسوں میں لہرا کر پیش کیا۔ اجمل خٹک اور میرے نام سامنے آ گئے اور ایک لحاظ سے یہ کتاب نیپ کے خلاف سرکاری گواہ بن گئی۔

جب یہ کتاب ہم تک پہنچی تو اجمل خٹک نے مجھ سے کہا، کہ تمام کاپیوں سے پختون زلمے کی کاروائیوں کی فہرست والے صفحے سے شیر پاؤ کے قتل کا ذکر قینچی سے کاٹ ڈالوں۔ اجمل خٹک نے فوری طور پر ایک کہانی گھڑ لی اور پھیلائی کہ اگرچہ اصل کتاب تو انہوں نے لکھی ہے لیکن فیڈرل سیکورٹی فورس (F.S.F) اور خصوصاً سعید احمد خان کو اس کی خبر ہو گئی تو انہوں نے سازش کے طور پر پریس میں پختون زلمے کی کاروائیوں کی فہرست میں شیر پاؤ قتل کے واقعہ کا اضافہ کیا اور ہمارے سر تھوپ دیا۔ یہ بھی کہ حیات محمد خان شیر پاؤ کا قتل تو ایف۔ ایس۔ ایف نے کیا ہے۔ یہ ایک کمزور اور بے تکی کہانی تھی جسے کوئی دیوانہ ہی مان سکتا تھا۔ [٦]

حالات سنگین ہو گئے تھے۔ پاکستان نے شیر پاؤ کے قتل کی ذمہ داری ہم پر ڈالنے کے ساتھ افغانستان پر بھی ڈال دی۔ اجمل خٹک نے ۱۵ فروری کے نئے واقعات کے حوالے سے اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل کے نام خط لکھا، جسے میں نے انگریزی میں ترجمہ اور ٹائپ کیا اور خارجہ امور کی وزارت کے حوالے کیا کہ اسے اقوامِ متحدہ کے دفتر ارسال کر دے۔ اسی دن

'ارگ' (صدارتی محل) سے میجر عبدالحق نے فون کیا کہ انہوں نے سائیکلوسٹائل کی مشین خرید لی ہے اور آئندہ سائیکلوسٹائل کا کام وہ لوگ کریں گے۔ اس سے ہمیں یہ آسانی ہوگئی کہ قبائلی علاقوں میں بھٹو حکومت اور ان کی پیش قدمی کو روک سکیں، یعنی آزاد پشتونستان میں پاکستان کے اثرات کی روک تھام ہو۔ ''قامی فیصلہ'' (قومی فیصلہ) کے نام سے اجمل خٹک یا میں ایک تحریر قلمبند کرتے اور اسے گیسٹیٹنر کاغذ پر مخصوص قلم سے لکھ کر اور صفحے دائیں اور بائیں حاشیے پر بندوق کی تصویر بنا دیتا اور اسے ارگ لے جاتا۔ سردار داؤد ہر تحریر کو خود چیک کرتے اور اگر کوئی کمی بیشی ہوتی تو واپس کر دیتے اور تصحیح کے بعد ہی سائیکلوسٹائل کرتے۔ ہم اس طرح کی تحریروں کو قبائلی علاقوں میں اپنے لوگوں کے ذریعے تقسیم کرتے تھے۔ یہ تحاریر بعض اوقات کسی خاص قبیلے کو بھیجتے یا عمومی طور پر سب قبائل کے لیے ہوتے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ اپنے ذہن میں محفوظ اس تحریر کے متن کو یہاں قارئین کے لیے نقل کرلوں۔ اس تحریر کا متن کچھ یوں ہوا کرتا تھا:

''اے غیر تمند سالارزیو! یا اے غیر تمند قبائلی پشتونو! آپ اور آپ کے باپ دادا نے اسلام، غیرت اور پشتو کے بل بوتے پر اپنے وطن کو کفر سے محفوظ رکھا ہے اور آپ نے انگریز کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ آپ نے انگریزوں کی وراثت سے ملنے والے پاکستانی حکمرانوں کی سازشوں کو ناکام بنایا۔ اور اب کوشش کریں کہ اپنی سرزمین کو ان لوگوں کے ناپاک قدموں سے محفوظ رکھیں۔ یہ لوگ سڑک اور سکول کے نام اور بہانے سے آپ کی آزادی سلب کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں اجازت نہ دیں کہ فرنگی کے کفریہ نظام کے یہ وارث، آپ کی آزادی کو پامال کرسکیں۔''

گویا ہم قبائلیوں کو اکسا رہے تھے، کہ پاکستان کی جانب سے کی گئی ترقی اور پیش رفت کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں۔ قبائل سے متعلق افغانستان کی سیاست بھی یہی تھی اور جو برسوں سے چلی آرہی تھی۔ افسوس کہ قوم پرستوں نے بھی ایک طویل عرصے تک اس خطا کار اور گھناؤنی سیاست کی تقلید کی۔ ان قوم پرستوں نے اپنے ساتھ قبائلیوں کو گمراہ کیا اور پشتون قوم کے ایک بڑے حصے کو عملاً ماضی کی جہالت میں گرفتار کیے رکھا۔

حیات محمد خان شیر پاؤ کی موت سے پیدا ہونے والے حالات کے تناظر میں اجمل خٹک نے ۱۷ فروری ۱۹۷۵ء کو مختلف اہم لوگوں سے رابطے کئے اور خطوط لکھے۔ اس دن اجمل خٹک نے بنگلا دیش کے شیخ مجیب الرحمن کو خط لکھا، سوویت یونین کے سفیر افغانستان کے وزارتِ خارجہ گئے

تا کہ دونوں ممالک کے درمیان پیدا ہونے والی اس نئی صورتِ حال سے اپنے آپ کو باخبر رکھیں، شام کو اجمل خٹک مصری سفیر متعینہ کابل سے ان کی درخواست پر ان سے ملنے ان کے گھر گئے۔ پختون زلمے کی کاروائیوں اور ان کاروائیوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والے واقعات کو اجمل خٹک ہی رقم کرتے رہتے، ان اہم معلومات سے ہدایت اللہ اور عالمزیب اچھی طرح آشنا ہیں، میں تو فقط وہی واقعات و معلومات تحریر کررہا ہوں، جن سے میں باخبر ہوں یا جو مجھ تک محدود تھیں۔ بیگم نسیم ولی خان کی ایک دو بار خفیہ طور پر کابل یاترا کرنے سے میں واقف ہوں، لیکن ان کی کابل میں ملاقاتوں سے میں بے خبر رہا، نہ اُس زمانے میں کوئی جانکاری تھی اور نہ آج۔ بلکہ اصلاً نسیم بی بی اجمل خٹک کو بھی بائی پاس کرکے سردار داؤد سے ملتی رہیں اور بہت سے معاملات سے اجمل خٹک کو بے خبر رکھا۔ بیگم نسیم بائیں بازو والوں سے خوفزدہ تھیں اور ان کے خیال میں اجمل خٹک ایک لیفٹسٹ تھے۔ بہت بعد میں تجربات کے نتیجے میں مجھے احساس ہوا کہ میری کوئی حیثیت نہ تھی، بلکہ میں تو فقط ریت بھری بوری کے مانند تھا جو فقط دوسروں کی حفاظت اور شیلٹر کے لیے استعمال ہوتا رہا۔ جب بھی کوئی بائیں بازو والوں کے بارے میں اجمل خٹک سے پوچھتا تو وہ میرا نام لیتے اور اپنے آپ کو مبرا ٹھہراتے۔

اجمل خٹک ان حالات کی وجہ سے بھارتی سفیر سے ملنے کے لیے ان کے گھر گئے اور ان سے اپنی معلومات اور خدشات پر تبادلہ خیالات کیا۔ بھارت وہ ملک تھا جو اس طرح کے راز اور خفیہ معلومات میں زیادہ دلچسپی رکھتا تھا۔

☆☆☆

۲۵ اپریل کو بعض خوانینِ دیر پاکستان واپس جانے اور لڑائی لڑنے کے لیے تیار ہوگئے، کیونکہ اطرافی درے میں پاکستانی ملیشیا نے ان کے مختلف دیہاتوں پر حملہ کردیا تھا۔ اصل میں ملیشیا کو اطلاع دی گئی تھی کہ ان دیہاتوں میں افغانستان سے تربیت یافتہ دہشت گرد آچکے ہیں مگر کوئی نہ ملا اور ناکام واپس ہوئے۔

۵ جون کو بنگلہ دیش کے سفیر متعین کابل کے گھر میں دعوت تھی، سارے سفارتی نمائندگان اور افغانستان کے وزارتِ خارجہ کے پروٹوکول آفیسر کے علاوہ ہمیں بھی دعوت دی گئی تھی۔ ۷ جون کو جلال آباد میں ماموندوں، سالارزیوں اور چارمنگوں (باجوڑ کے قبائل) کا جرگہ ہوا جس میں

اجمل خٹک شریک تھے۔اس اجتماع میں پاکستان کے اقدامات کے خلاف فیصلے ہوئے۔۲۱ جون کو اجمل خٹک نے 'ڈیموکریٹک پاکستان' (Democratic Pakistan) کے ایڈیٹر ایم۔کے۔جنجوعہ کے نام ایک خط اور واقعات کی تفصیل اس غرض سے ارسال کی تاکہ شائع ہو۔۷ جولائی کو یونس غرنے گوریلا جنگ پر ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ اس غرض سے لے کر میرے پاس آیا کہ میں اس کا مطالعہ کرلوں۔یونس کا کہنا تھا کہ وہ اس طرح کی دیگر کتابوں کے ترجمے بھی کرنا چاہتا ہے۔میں نے ہمیش خلیل کے نام عالمزیب کے لیے سفارشی خط لکھا۔۹ جولائی کو میں نے جام ساقی کی طرف سے حیدرآباد ٹریبونل کے لیے بیانِ حلفی ٹائپ کیا۔دوسری طرف جنجوعہ ہسپتال میں بیمار پڑا ہوا تھا، لہٰذا جرنل (journal) کے لیے ولی خان کے حلفیہ بیان کا کیا بنے گا؟ بہرحال دوسرے دن میں نے ولی خان اور بزنجو کے حلفیہ بیانات کی نقول تیار کرکے دیگر ڈاک کے ساتھ جنجوعہ کو بھیج دیا۔۲۶ جولائی اور پھر ۲ اگست کو مزید مواد جنجوعہ کے نام پوسٹ کیا۔

افغان وزارتِ خارجہ نے گارڈین، لی مانڈ اور انتھونی میسکیر نہاس کے مضامین ایک پمفلٹ کے صورت میں چھاپ دیے تھے، ۱۴ اگست کو میں ان کی کچھ کاپیاں لے آیا۔۱۲ اگست کو افغان وزارتِ خارجہ کے شعبہء اول کے ڈائریکٹر محمد گل جہانگیری نے مجھے فون کیا کہ ہم نے جو رقم دی ہے اس کے بدلے میں وکیل التجار اختر محمد خان نے ''تاریخ مرصع'' کی پانچ عدد کاپیاں بھی دی ہیں جس میں سے ایک جلد عبدالحبیبی صاحب کو، ایک جلد پشتو ٹولنہ اور ایک جلد ڈاکٹر عارف عثمانوف کو دے دی گئیں۔

۲۶ اگست ۱۹۷۵ء کو فلک شیر نے کیمپ کے حوالے سے شکایت کردی۔اُس کی شکایت کچھ یوں تھی:

کیمپ میں امتیازی سلوک ہورہا ہے، ہر کسی نے علاحدہ گروپ بنالیا ہے، اعظم ہوتی اور عالمزیب نے الگ الگ گروپ بنالیے ہیں۔ہر کوئی اپنی خانی جتلا رہا ہے۔فلک شیر عالمزیب کے گروپ میں ہے اور موصوف اپنے گروپ کے سعید خان اور ملک عظیم خان کی طرفداری کررہا ہے اور اپنے گروپ کے لیے سب کچھ کررہا ہے۔عالمزیب نہ صرف اپنے لیے کپڑے، چپل اور ضرورت کا ہر قسم کا سامان خریدرہا ہے بلکہ یہ لوگ اپنے گھر والوں کو پیسوں کے ساتھ ساتھ کپڑوں کے بھرے ہوئے صندوق بھی بھیج رہے ہیں۔ہمارا خیال نہیں رکھا جارہا، جبکہ نوجوان مایوس ہوتے

جارہے ہیں، نہ تو اپنے بیس میں کام کرسکتے ہیں اور نہ ہی جلال آباد میں وقت گزار سکتے ہیں۔مایوسی کی حالت یہ ہے کہ بہت سے جوان اس کوشش میں ہیں کہ کسی طرح کوئی راہ نکلے اور یہ پاکستانی حکومت سے معافی مانگیں اور کسی ضمانت کا بندوبست ہو، گویا سارا کیا کرایا دھرے کا دھرا رہ جائے۔مذکورہ مسائل کے حل کے لیے اجمل خٹک کو جلال آباد جانا چاہیے۔فلک شیر خود بھی مایوس تھا، اس نے مجھ سے درخواست کی اس کے لیے ایک پستول اور ایک اچھا ساریڈیو خرید کر دوں۔فلک شیر نے کیمپ میں کھانے کی بھی شکایت کی۔

۳۱ اگست کو کابل میں پشتونوں اور بلوچوں کا دن منایا گیا، جس میں اجمل خٹک نے تقریر کی۔رات کو معمول مطابق کابل ہوٹل میں ایک پرتکلف دعوت تھی جس میں موسیقی کا پروگرام بھی تھا۔جنجوعہ نے ماہنامہ ڈیموکریٹک پاکستان کا شمارہ ارسال کیا۔میں نے اس شمارے کے دس کاپیاں ۱۰ ستمبر کو وزارتِ خارجہ میں ''جہانگیری'' کے حوالہ کیں۔۱۳ ستمبر کو میں نے جنجوعہ کی خدمت میں پشتونستان کے دن کی مناسبت سے ہونے والی تقریب میں تقریر کے انگریزی متن کے ساتھ کچھ اور ڈاک روانہ کی، جبکہ اسی دن پاکستان میں عدالت نے نیپ پر لگائی گئی پابندی کو جائز قرار دیا۔اس کے بعد لیڈران اور کارکنان کی گرفتاریوں میں تیزی آگئی۔اس موقع پر بھٹو نے کہا کہ اب تو ثابت ہوگیا ہے کہ نیپ والے غدار ہیں۔

۲۶ نومبر کو اجمل خٹک مسائل کے حل کے لیے جلال آباد گئے۔۲۹ نومبر کی شام کو فلک شیر اور سید وہاب کے ساتھ سید وہاب کا بھتیجا، شیر ولی کا بھائی، فیض محمد کا بھائی، اور شہباز خان کے دو چچا سیر وسیاحت کی غرض سے کابل آگئے۔اگلی صبح کراچی میں متعین افغان کونسلر جنرل حکیم آریوبی آگئے۔آپ نسیم بی بی کا خط لے کر آئے تھے۔زیادہ دیر نہ رکے اور جاتے جاتے شکایت کی کہ اجمل خٹک نے اس کے خلاف باتیں کی ہیں اور یہ کہ اس کی شکایت میں صدر مملکت اور وحید عبداللہ سے کرسکتا ہوں، تاہم میں انتظار میں ہوں کہ ولی خان جیل سے آزاد ہوں تو اس سے بات کرلوں۔

۱۳ دسمبر ۱۹۷۵ء کو اجمل خٹک، تورلالی، بشیر معہ بچوں، مظلوم معہ بچوں کے قندھار اور ہلمند کے لیے روانہ ہوئے، تاکہ وہاں موجود بلوچ کیمپس دیکھ سکیں اور سیاحت بھی ہو۔

۱۹۷۵ء میں پختون زلمے کی تخریبی کارروائیوں پر قابو پالیا گیا۔حیات محمد خان شیرپاؤ کی

بے جا موت اور واپڈا ہاؤس لاہور میں بم دھماکے میں جانی اور مالی نقصانات، دو اہم واقعات تھے۔ شیرپاؤ کی ہلاکت کا منصوبہ مکمل طور پر اعلیٰ لیڈرشپ نے ترتیب دیا تھا، جبکہ دوسرے واقعے میں نور محمد اچکزئی کا نام لیا جا رہا تھا، مگر اصلاً یہ کام پنجابی ہمدردوں کا تھا۔ یہ دونوں کام نہ صرف انتہائی نازک اور ہائی پروفائل، بلکہ پختون زلمے کی عقلی و ذہنی سطح سے ہی بہت بلند تھے۔

فعال جدوجہد کے بعد پختون زلمے سے وابستہ مہاجرین اب اس انتظار میں تھے کہ کیسے جلد از جلد اس سارے معاملے سے الگ ہوں، جبکہ ان کے کمانڈران سے بھی زیادہ تنگ آ گئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ عید کا دن تھا اور دونوں کمانڈروں کی آنکھوں میں آنسو تھے، دراصل اپنوں سے دور اس غریب الوطنی میں عید کا آنا اور منانا بہت تکلیف دہ تھا۔

اس تمام صورتِ حال کی وجہ سے اب افغانستان بھی پچھتا رہا تھا، کیونکہ خان عبدالولی خان کی تمام لاف زنیوں سے ہوا نکل چکی تھی۔ نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی (NDP) کا قیام اور اسکے اندازِ سیاست نے نیپ کی سیاست کو پسِ پشت ڈال دیا۔ اجمل خٹک نے بھی گویا اپنے آپ کو نظر انداز ہونے والا وجود مان لیا۔ حالات ہمارے لیے سازگار نہیں رہے۔ ان حالات میں اجمل خٹک نے خفیہ طور پر ''روزگل'' کو خط دے کر باچا خان کی طرف روانہ کیا۔ روزگل کے مطابق باچا خان نے کہا کہ میں نے اِن لوگوں کو سمجھایا بھی تھا کہ تشدد کا راستہ اختیار نہ کریں مگر یہ (ولی خان) صبر نہ کر سکے اور یہی نتیجہ نکلنے والا تھا جو میں دیکھ رہا ہوں۔

این۔ڈی۔پی نے نہ صرف نیپ کی سیاست سے روگردانی کی بلکہ بعض معاویہ میں جرنیلوں کے ہاتھوں میں ہاتھ دیا۔ یہ لوگ ہر حالت اور ہر قیمت پر بھٹو کے خلاف پی۔این۔اے، کی تحریک میں اپنا حصہ ڈالنا چاہتے تھے بلکہ جرنیلوں کا ایجنڈا بھی آگے بڑھانا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں حکومت کے خلاف پی۔این۔اے (پاکستان قومی اتحاد) کی تحریک اپنے پورے زوروں پر تھی۔ اس دوران نسیم بی بی نے اعظم ہوتی کے نام ایک خط جلال آباد روانہ کیا۔ اعظم ہوتی نے خط ذریعہ کے گاما کاکا کے حوالہ کیا کہ وہ اسے کسی طرح سردار داؤد تک پہنچا دے اور اجمل خٹک کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ گاما کاکا کابل پہنچے اور جب کوشش کے باوجود سردار داؤد تک خط پہنچانے کے لیے کوئی سبیل نکال نہ پائے تو مجبوراً یہ خط اجمل خٹک کے حوالے کیا کہ وہ کوئی بندوبست کرے۔ اس دور میں کابل میں ابھی فوٹو کاپی مشین متعارف نہیں ہوئی تھی بہرحال اس خط کا پورا متن مجھے لفظ بہ

لفظ یاد ہے۔ پشتو زبان میں لکھے گئے خط کا متن کچھ یوں تھا:

''گرانہ مشرا سلامونہ! (بزرگ محترم بہت بہت سلام!)

ہم نے اپنا تیس سالہ پرانا راستہ اس لیے ترک کر دیا، کیونکہ اب کوئی چارا نہیں۔ وردی والوں کے ساتھ میرا رابطہ ہے۔ پنڈی مذاکرات میں جلال آباد کے طوطیوں اور حیدر آباد کے شیروں کا ذکر تک نہ ہوا۔ تین چار دن بعد ایک نئی خوش خبری سے باخبر ہو جاؤ گے۔

زڑہ ور خان''

یہ خوش خبری بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹنے کی خبر تھی۔ جلال آباد کے طوطیوں سے جلال آباد کیمپ میں رہائش پذیر پختون زلمے سے وابستہ جوان تھے، جبکہ حیدر آباد کے شیروں کا مطلب حیدر آباد (سندھ) کی جیل میں غدّاری کے مقدمے میں بند نیپ کے رہنما اور لیڈران تھے۔ پنڈی مذاکرات فوجی جرنیلوں کے ساتھ ہو رہے تھے۔ یہ خط سردار داؤد کے سینے پر ایک اور وار تھا۔ سردار داؤد کو اپنے تمام اقدامات بیہودہ نظر آنے لگے۔ اس واقعے سے کچھ پہلے سردار داؤد ذوالفقار علی بھٹو سے ڈیورنڈ لائن مسئلے پر ایک حتمی نتیجے پر پہنچ چکے تھے اور دونوں ممالک کے درمیان تعلقات کی بہتری کے کئی اقدامات ہونے والے تھے۔

یہ بات زیادہ دیر چھپی نہ رہ سکی کہ جنرل ضیاء الحق کی بغاوت اور اقتدار پر قابض ہونے کے بعد جو لوگ جنرل سے ملاقاتیں کرتے رہے ان میں ولی خان اور بیگم نسیم ولی خان سرفہرست تھے، یہاں تک کہ باچا خان بھی کئی مرتبہ ضیاء الحق سے ملے۔ [۷] ان ملاقاتوں میں جنرل ضیاء نے باچا خان کو محبِ وطن قرار دیا تھا۔ افغانستان میں انقلابِ ثور کے فوری بعد ولی خان نے ضیاء الحق، جنرل فضل حق اور دیگر جرنیلوں کو ایک اہم ملاقات میں انقلابِ ثور سے وابستہ لیڈروں کے متعلق بریفنگ دی۔

یہاں اس امر کے بارے میں یہ اضافہ کر دوں کہ سردار داؤد کے سامنے ولی خان کی لاف زنیوں کی حقیقت آشکارا ہو چکی تھی اور ان کے مشورے کے بغیر حیات محمد خان شیرپاؤ کی ہلاکت کا منصوبہ ترتیب دینے کے بعد ولی خان کے ''لشکر'' کا عملاً سرنڈر ہو جانا کھل چکا تھا، جس کے نتیجے میں سرحدات کے ساتھ مقیم بہت سے قبائلی رہنما اور زعماء پاکستان کے طرفدار بن گئے تھے۔ افغانستان کے اخوانی عناصر کے لیے پاکستان میں جگہ جگہ ٹریننگ کیمپ کی تعداد اور استعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ان تمام واقعات سے افغانستان داخلی طور پر مشکلات و مسائل کا شکار ہوا اور ولی خان

کی سیاست بند گلی میں داخل ہو چکی تھی۔ ولی خان کبھی تو ۱۹۷۳ء کے آئین کے بھاری پتھر سے سینہ کوبی کرتے رہے اور کبھی طورخم بارڈر کی زنجیر اٹک پر باندھنے کا واویلا کرتے رہے۔

افغانستان پوری دنیا میں تنہا رہ گیا، کوئی بھی اس کا مؤقف سننے کا روادار نہ تھا، یہاں تک کہ سوویت یونین بھی پاک افغان متنازعہ سرحد ''ڈیورنڈ لائن'' پر افغان موقف پر برائے نام حمایت سے بھی اس لیے دستبردار ہو گیا تھا، کیونکہ صدر بریژنیف نے ایشیا کی اجتماعی امنیت کے نظریے (The Collective Asian Security Doctrine) کا نعرہ لگایا تھا۔ جس کی پہلی شق ہی یہ تھی کہ تمام ریاستوں کی موجودہ سرحدات کا احترام کیا جائے گا اور خود بھارت اپنے آپ کو برطانوی ہند کے تمام معاہدوں اور فیصلوں کا وارث سمجھتا ہے۔ سو اس صورتِ حال میں داؤد خان کے لیے پرانی سیاست پر نہ صرف کاربند رہنا مشکل تھا، بلکہ اب تو وہ اس پر پشیمانی کا اظہار کر رہے تھے۔ صدر سردار داؤد خان، ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ دیگر معاملات کے علاوہ ڈیورینڈ لائن پر ایک وسیع مفاہمت کے لیے تیار ہو گئے۔ جس کے نتیجے میں صدر داؤد نے پشتون اور بلوچ مہاجرین کو صاف جواب دے دیا۔ اگرچہ داؤد کی سیاست کا یہ رخ نہایت معقول تھا، لیکن اب بہت دیر ہو گئی تھی کیونکہ سردار داؤد اپنی گزشتہ طرز سیاست کے جال میں پھنس چکے تھے اور آخر کار اسی کا شکار ہو گئے، ان کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا گیا اور انہیں اپنے پورے خاندان سمیت قتل کر دیا گیا۔

آسومرغہ: دیگان کیمپ

ہمارے صوبے کے برخلاف بلوچستان کے پختونوں کی قومی شدت پسندوں کی تحریک تعلیم یافتہ نوجوانوں پر مشتمل تھی۔ اُن کی اکثریت پختون سٹوڈنٹس فیڈریشن سے وابستہ نوجوانوں کی تھی۔ ان کے علاقے میں 1947ء کی طرح پختون زلمے کی تنظیم کا کوئی وجود نہ تھا۔ وہ نہ صرف قوم پرست تھے بلکہ ترقی پسند نظریات کے زیر اثر بھی تھے۔ انہوں نے بھی پختون زلمے کی طرح ٹریننگ میں حصہ لیا تھا۔ اور اس 'قومی آزادی' کی متشدد تحریک میں سب سے زیادہ سرگرم تھے۔ تخریبی سرگرمیوں میں بلوچ گوریلا کارروائیوں کے ساتھ وہ کندھے سے کندھا ملائے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کا کیمپ صوبہ 'زابل' کے مشرق میں 'توبہ کاکڑی' کے پہاڑ 'نخاس' کے نیچے دامن میں واقع 'آسومرغہ' میں تھا۔ یہ صوبہ زابل کے صدر مقام قلات سے بہت دور کچے راستوں سے جڑا ایک ایسا مقام تھا، جو افغان حکومت کی فوجی چوکی واقع 'قلعہ رشید' سے بھی کافی دور تھا۔ اُن دنوں مواصلات کا ایسا ترقی یافتہ نظام موجود نہ تھا اور ہر طرح کی پیغام رسانی انسانی ذرائع سے ہی ممکن تھی۔ ایسی ہر آمد و رفت کافی فاصلے اور وقت کی محتاج تھی۔

میں یہاں اُن کی تربیت، اسلحہ، پیسوں اور دیگر سرگرمیوں کی تفصیل پر روشنی ڈالنا نہیں چاہتا۔ اس کے لیے مشتے از خروارے کے مصداق چند ڈائریاں نقل کر رہا ہوں۔ 1974ء کا سال زیادہ تر فوجی تربیت، اسلحہ اور دھماکہ خیز مواد کے لے جانے کا سال تھا۔ یہاں اور وہاں غیر منظم اور غیر مربوط تخریبی سرگرمیوں کی انجام دہی کا سال تھا۔ با مقصد اور مربوط فعالیت پختون زلمے اور ان کے اوپر نیپ کی قیادت کے فہم و فراست اور تربیت سے بہت باہر کی چیزیں تھیں۔ پہلے پہل جب یہ کیمپ وجود میں نہیں آئے تھے تو یہ تمام سرگرمیاں قندہار سے ہی کنٹرول کی جاتی رہیں اور ساتھی وہاں آیا کرتے تھے۔

28 اپریل 1975ء کو فضل دین سیلاب (پرانے خدائی خدمتگار اور عوامی شاعر) نور محمد اچکزئی سے رہ جانے والے 20 ڈیٹونیٹرز قندھار لے گیا اور وہاں پر اُن ساتھیوں کے حوالے کیے۔

11 مئی 1975: نور محمد اچکزئی نے صورتحال کے تجزیے اور اس حوالے سے تجاویز کے لیے ان نکات پر بات کی:

۱۔ ہمیں کہا گیا تھا کہ علاقہ ڈسٹرب کریں، وہ ہم نے کر دیا۔

۲۔ ایسی سرگرمیوں کے نتیجے میں فوج آجائے گی، وہ آگئی۔

۳۔ اب ہمارے دھماکوں کا راستہ بند ہو گیا ہے۔ ہماری وجہ سے بہت سے معصوم لوگ گرفتار کیے گئے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم فعال ہوں اور مسلح گروپ تشکیل دیں۔ اس کے لیے علاقے کے لوگ ہماری مدد کرنے کو تیار ہیں۔

۴۔ اگر ہم اپنے کیمپ میں اسی طرح خاموش اور عدم سرگرمی کی حالت میں رہیں گے تو فوج ہم پر حملہ کر سکتی ہے۔ اس کا ذمہ دار کون ہوگا؟

۵۔ ہماری تعداد دن بہ دن بڑھ رہی ہے۔ وہ لوگ جنہیں حکومت ہراساں کرتی ہے، ہمارے پاس آتے ہیں اور ہم سے حفاظت کے لیے کہتے ہیں۔

۶۔ اس کے باوجود کہ ہماری تعداد بڑھتی جا رہی ہے، ہمیں وہی پانچ ہزار روپے ماہوار ملتے ہیں۔ اُن میں سے بھی ایک ہزار ہم اُن ساتھیوں کو بھیجتے ہیں جو گرفتار ہو چکے ہیں اور انہیں مقدمات کا سامنا ہے۔

۷۔ ہمارے پیسوں کے ذرائع ڈاکٹر عنایت اللہ، ڈاکٹر ارباب یوسف، سردار عبدالصمد پانیزئی اور صوفی شیر وغیرہ تھے۔ اب ان کی گرفتاریوں کے باعث یہ ذرائع بند ہو چکے ہیں۔

۸۔ ہم ایک ہزار گرفتار ہو جانے والے ساتھیوں کو بھجواتے ہیں، کچھ یہاں ہمارے آنے جانے میں خرچ ہو جاتا ہے، اس لیے باقی ماندہ رقم کیمپ کے ساتھیوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ناکافی ہے۔

۹۔ ہم چاہتے ہیں کہ گوریلا گروپ منظم کریں۔ اپنی قوت میں اضافہ کریں، جھڑپیں کریں۔ ہمارے کچھ نہ کرنے سے تو لوگ تنگ ہوتے جا رہے ہیں۔ ہمارے دھماکوں کے باعث لوگوں کو مفت میں نقصان پہنچ رہا ہے۔ اچھی صورت یہ ہوگی کہ ان سب کو ہم منظم کریں۔ ہمیں اسلحہ دیا جائے اور اجازت دی جائے کہ جنگ شروع کریں۔

۱۰۔ فقط ایک ہی راستہ رہ گیا ہے: چھاپہ مار جنگ۔ اگر یہ نہ اختیار کیا تو ہم ختم ہو جائیں گے۔ اس موجودہ حالت سے تو بہتر یہ ہے کہ یہاں جلال آباد کیمپ والوں کی طرح آ کر بیٹھ جائیں اور تمام سرگرمیاں روک دیں۔ یہ جتنی باتیں آپ سے کی گئیں، یہ ہم سب ساتھیوں

کی رائے ہے۔

تبصرہ: یہ باتیں بہت سنجیدہ اور معقول دلائل پر مبنی ہیں۔ ہمیں ان کی وجوہات معلوم کرنی چاہیے اور مزید سوچنا چاہیے۔

31 مئی 1975: بسم اللہ کاکڑ، خدائے دوست اور میں سلیمان لائق سے ملنے گئے۔ گفتگو کے دوران بسم اللہ کو بعض تنظیمی اصول سمجھائے گئے اور تنظیم سازی پر زور دیا گیا۔

8 جون 1975: ملا عبدالسلام اور محمد حسن صاحبزادہ گروپ قرہ باغ (غزنی) میں دہلی حضرات کے مرید ہیں۔ یہ گروپ زابل، غزنی، ہلمند، پکتیا کے 'خروٹ' قبیلے اور سرحدی علاقوں میں لوگوں پر اثر رکھتا ہے۔ خاص طور پر ان کا اثر ناصری، سلیمان خیل، خروٹ اور دفتان قبائل پر بہت زیادہ ہے جو سرحد کے دونوں طرف آباد ہیں۔ یہ لوگ درحقیقت پاکستان مخالف، ملا شور بازار کے مخالف، جبکہ جمہوریت اور پختونستان کے طرف دار ہیں۔ بسم اللہ ان کے ساتھ رابطہ میں رہے گا۔ ان کے ساتھیوں سے شناسائی پیدا کرے گا۔ اس کے بدلے میں یہ لوگ بسم اللہ اور اس کے ساتھیوں کی مدد کریں گے یعنی رات گزارنے کی جگہ، کھانا پینا اور راستوں کی راہنمائی فراہم کریں گے۔ بسم اللہ ان کے ساتھ بیٹھ کر یہ طے کرے گا کہ وہ کس طرح مدد کر سکتے ہیں۔

یہ لوگ پرچم پارٹی کے طرف دار ہیں۔ لائق صاحب کی معرفت سے قادر مل آف مقر، غزنی کے ذریعے ان لوگوں سے ملا کرے گا۔ قادر مل باختر نیوز ایجنسی میں بین الاقوامی خبروں کے پشتو سیکشن میں کام کرتا ہے اور لائق صاحب کے زیر اثر ہے۔ بہاء الحق پارلیمنٹ کا سابق رکن بھی اس سلسلے میں مدد دے سکتا ہے جو پارلیمنٹ میں پختونستان کے معاملے میں بہت مدد و معاون ثابت ہوا تھا۔ بسم اللہ قادر مل سے فون کے ذریعے رابطے میں رہے گا اور مقر میں ان لوگوں سے ملے گا۔

12 جون: قادر مل اور ملا عبدالسلام دونوں نے اجمل خٹک سے ملاقات کی۔ ملا سلام آمادہ ہے کہ بسم اللہ کاکڑ کے ساتھیوں کی مدد کرے۔ لیکن اس سے پہلے وہ اپنے پانچ چھ معتمد ساتھیوں کو بسم اللہ اور اس کے ساتھیوں کے حوالے سے اعتماد میں لے گا تاکہ اُن کے اذہان میں کوئی شک شبہ پیدا نہ ہو۔

6 جولائی: نور محمد اور پروفیسر عزیز اللہ آگئے۔ 17 مئی کی 'انقلابی جمہوری محاذ کی جدوجہد' اور ضمیمے کی چند کاپیاں، اور سپریم کورٹ میں جام ساقی کی طرف سے حالیہ ریفرنس کے جواب میں جمع

کرائے گئے بیان حلفی کی نقل بھی ہمراہ لائے ہیں۔ نور محمد کا کہنا ہے کہ سائیں عزیز اللہ آنے والا ہے اور یہ موصوف کو یہاں تک پہنچائیں گے۔ یہ دونوں دراصل اُن لوگوں (ناصر اور ترین) کے قضیے کے بارے میں آئے ہیں جو افغانستان میں حکومت پاکستان کی طرف سے بم دھماکے کرنے کی غرض سے آئے اور گرفتار کر لیے گئے اور جن میں پولیس افسر بھی شامل ہیں۔ ان لوگوں سے کیمپ والوں نے اقبال جرم کرالیا ہے۔ اصل میں یہ تخریب کار تعداد میں 9 تھے اور بیس دن کے اندر اندر دھماکے کرنے والے تھے۔ اب افغان پولیس اور حکومت اس مخمصے میں ہے کہ ان لوگوں سے کیا سلوک کرے۔

7 جولائی: ہر شخص کو خوش کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ نور محمد نے پوچھا مجھے کہاں سونا ہے (اس کی خواہش تھی کہ میرے کمرے میں آرام کرے)۔ میں نے کہا نیچے گراؤنڈ فلور پر۔ وہاں چارپائیاں موجود ہیں۔ سچ یہ ہے کہ اب ہمارا ضبط بھی جواب دیتا جارہا ہے۔ آخر ہم اپنے لکھنے پڑھنے کا کام کریں یا لوگوں کو اپنے دفتر اور کمرے میں سونے، گپ شپ کرنے کے لیے جگہ دیں کہ وہ ناراض نہ ہوں۔ دوسری طرف حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ بھی غلام نہیں ہیں۔ ہماری مجبوری یہ ہے کہ اگر ہم انہیں خوش کرنے کے لیے سب کچھ کریں تب بھی انہیں خوش تو ہونا نہیں۔ اور اگر یہی صورت ہے تو کیوں اپنے آپ پر ظلم کریں اور ضبط کے کڑوے گھونٹ پییں۔

12 جولائی: بسم اللہ کا بھائی اور رشتے دار آپہنچے۔ ان کے چار ساتھیوں نے 'سرانان' کے قریب 6 جولائی کو بسوں کو روکا۔ اسی اثنا میں ایک فوجی جیپ آئی جس میں دو میجر، ایک پنجابی ایک کاکڑ، اور ساتھ دو سپاہی تھے۔ انہیں بھی اتار لیا گیا اور ان سے ایل ایم جی رائفل چھین لی گئی۔ اسی دوران ملیشیا کی گاڑی بھی آپہنچی۔ سڑک چونکہ بلاک تھی اس سے انہیں اندازہ ہو گیا اور انہوں نے گولیاں برسانا شروع کیں۔ یوں نوجوان مجبور ہوئے کہ دونوں میجروں کو قتل کریں۔ ملیشیا سے فائیرنگ کے تبادلے میں 6 سپاہی مارے گئے اور گوریلے جان بچا کر بھاگ نکلے۔

بسم اللہ کے اس کیمپ کو ہم پروپیگنڈا کے لیے بھی استعمال میں لایا کرتے تھے۔ وہ ایک سائکلو سٹائل مشین لوٹ لائے تھے۔ اس مشین پر ہم پشتو، اردو اور انگریزی میں 'زدان ژغ (نوجوان آواز)' کے نام سے ہر دو مہینے بعد ایک جریدہ شائع کرتے اور پاکستان میں تقسیم کیا کرتے تھے۔ مضامین اجمل یا ہم دونوں مل کر لکھتے اور ترجمہ بھی میں ہی کیا کرتا تھا۔ بعض چھوٹی

موٹی باتیں اور شذرے کیمپ والے بھی لکھ دیا کرتے تھے۔ یہ جریدہ افغان اور پاکستان دونوں حکومتوں کے تسلط سے آزاد تھا جس میں ہم اپنے مخصوص نظریات لکھا کرتے تھے۔

6 ستمبر 1975: بسم اللہ، علی خان محسود، انور باچا اور میں نے 'پختون سٹوڈنٹس فیڈریشن انقلابی' بنانے کے منصوبے پر بحث کی۔ مقصد یہ تھا کہ طالب علموں کی ایک ایسی خفیہ تنظیم بنائی جائے جو طالب علموں میں پروپیگنڈا کرے، پمفلٹ، ہینڈ بل اور شب نامے تقسیم کرے اور انہیں انقلابی سرگرمیوں کے لیے آمادہ کرے۔ لمبی چوڑی بحث ہوئی جس میں سب سے پہلے بسم اللہ نے اپنی تکالیف، شکایات اور گلے شکوے بیان کیے، جن میں بعض حقیقی اور بعض بے بنیاد تھے۔ جو حقیقی تھے وہ بھی تحریک کی عام مشکلات سے تعلق رکھتے تھے اور کچھ تو بالکل ہی جھوٹ پر مبنی بیانات تھے۔ انقلابی پی ایس ایف پر یہ بحث ہوئی کہ اگر یہ قدم اٹھایا گیا تو سب سے پہلی مخالفت تو افراسیاب کی طرف سے ہوگی۔ وہ موجودہ سرگرمیوں کو ولی خان اور نسیم ولی خان کے ذریعے کی جانے والی امریکی سازش قرار دے رہا ہے۔ اگر یہ نیا قدم اٹھایا گیا تو پی ایس ایف کی موجودہ قیادت سے ٹکراؤ کا خدشہ ہے۔ بسم اللہ نے پروپیگنڈے کے حوالے سے یہ کہا کہ ہم اپنی تخریبی سرگرمیوں کا کیا جواز پیش کریں گے؟ لڑکوں کی اکثریت ان سرگرمیوں کو برا سمجھتی ہے۔ لیکن ہم نے اسے سمجھایا کہ ہم صرف پختون بلوچ کے ساتھ عام زیادتیوں اور استحصال کے حقائق اور قصے بیان کریں گے۔ یہ پروپیگنڈا عمومی سیاسی پالیسی میں رہتے ہوئے کسی بھی موضوع پر کیا جاسکتا ہے۔

دوسری طرف انور باچا کا خیال تھا کہ اس مجوزہ گروپ کی قیادت ہمارے اختیار میں رہے (اُسے خوف تھا کہ یہ اختیار علی خان کے پاس نہ چلا جائے)۔ ہم نے عام تحریک پر گفتگو کی۔ بعض نکات واضح ہوئے اور بعض غیر واضح رہ گئے۔ رات ہم اجمل کے ساتھ بیٹھے اور پھر نئے سرے سے غیر واضح نکات پر بحث کی۔

بسم اللہ نے کہا کہ تحریک کو بتدریج آگے لے جانے کے لیے یہ ضمانت درکار ہے کہ اس کے راستے میں رکاوٹوں جیسے وسائل، لاجسٹک کی کمی وغیرہ کو دور کیا جائے گا۔ اجمل نے جواب دیا کہ چونکہ انہیں خود ایسی ضمانت نہیں میسر اس لیے وہ ایسی کوئی ضمانت نہیں دے سکتے۔

28 ستمبر: پرسوں بسم اللہ کے دس ساتھی جن میں خان میر، اسماعیل، خدائے دوست، دوسرا خان میر، عزیز اللہ، ثناء اللہ، عبدالسلام، عبدالشکور وغیرہ شامل تھے، آئے۔ یہ لوگ بسم اللہ سے

ناراض ہوکر آئے تھے۔ کہتے ہیں کہ ہمارے اُن کے ساتھ اختلافات بہت پرانے ہیں لیکن تنظیم اور ڈسپلن کی وجہ سے ہم خاموش تھے۔ ان کے بنیادی نکات یہ تھے:

۱۔ بسم اللہ ڈکٹیٹر ہے۔ ہر فیصلہ خود کرتا ہے۔ ہم سے کسی بات میں مشورہ نہیں ہوتا۔

۲۔ کیمپ کے کھانے پینے اور دیگر لوازمات کے پیسے اور فنڈز خود خرچ کرتا ہے، اس بارے میں ہم اُن سے کوئی سوال کرنے کا حق نہیں رکھتے۔

۳۔ ہم نے کارروائیوں کے لیے چھ لیڈران پر مشتمل کمیٹی بنائی تھی جس میں صوفی شیر اور عبدالوہاب اب جیل میں ہیں، باقی چار خان میر، عزیز اللہ، شکور اور بسم اللہ ادھر ہیں۔ اس کمیٹی سے بھی کوئی مشورہ نہیں کیا جاتا۔

۴۔ بسم اللہ سب کچھ اپنی مرضی سے کرتا ہے۔ ہمیں بلوچوں، پختون زلمے، اور دیگر سیاسی کارکنان سے بات چیت کرنے اور تعلقات استوار کرنے نہیں دیتا۔ اس میں خود پسندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور اس کے تمام اعمال کا محور اپنی قیادت ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ باچا خان محض ایک رومانی خیالات (یوٹوپیائی) والا بندہ ہے جبکہ ولی خان محض خانوں کا ایجنٹ ہے اور اجمل تو صرف شاعر ہے۔ اصلی کمیونسٹ صرف میں ہوں۔ میرے بین الاقوامی تعلقات ہیں اور آپ فکر نہ کریں ہر راستہ بند ہوسکتا ہے لیکن جو راستہ میں نے چنا ہے وہ کبھی بند نہیں ہوسکتا۔

۵۔ بلوچستان میں صرف بسم اللہ کی وجہ سے نیپ ہماری مدد نہیں کرتی۔ انہیں بسم اللہ اچھا نہیں لگتا کیوں کہ موصوف ہمیشہ نیپ کو برا بھلا کہتا ہے۔

۶۔ یہاں ’دیگان کیمپ‘ میں جو لیڈر ہم سے ملنے آتا ہے، بسم اللہ اُن سے بدتمیزی کرتا ہے اور یوں عوام میں ہماری طاقت کمزور ہوتی ہے۔

۷۔ کارروائیوں کے لیے جب ہم اپنے ساتھی بھیجتے ہیں تو بسم اللہ انہیں بھٹکاتا ہے۔ ہم انہیں ایک ہدف بتاتے ہیں اور وہ وہاں انہیں دھاکوں کے لیے اور جگہ بتاتا ہے۔ ضلع پشین میں بھی انہیں غیر اہم اہداف دکھائے۔ یہ سب وہ اس لیے کرتا ہے کہ اپنے ضلع میں اپنی لیڈرشپ کی دھاک بٹھاسکے۔

اس کے علاوہ انہوں نے اس ملاقات میں ایسی بہت سے باتیں کی جن کا ہمیں پہلے علم نہ

تھا۔ مثلاً پکتیا وال اور نیک زاد صاحب کو کہا تھا کہ میرے ساتھیوں سے گفتگو نہ کریں ورنہ ذمہ داری آپ پر ہوگی۔ خان میر کے پیٹھ پیچھے بہت باتیں کرتا ہے۔ خدائے دوست، خان میر کا قریبی رشتہ دار ہے۔ اُسے بسم اللہ نے کہا تھا کہ میں تمہیں مرکزی کمیٹی کا رکن بنادوں گا تم خان میر کی مخالفت کرو اور خان میر کو یہ بات نہ بتاؤ۔ خدائے دوست نے یہ سب باتیں خان میر کو بتادیں اور اب وہ خدائے دوست کی بھی مخالفت کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

ان سب باتوں میں کتنی صداقت ہے یہ تو اس وقت ہی معلوم ہوگا جب خود بسم اللہ آئے اور آمنے سامنے بات ہو۔ مگر یہ بات تو یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ:

۱۔ بسم اللہ نے ان سب چیزوں کے بارے میں ہمیں تاریکی میں رکھا، باوجود اس کے کہ وہ لیڈر ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ یہاں آتے جاتے ہیں۔

۲۔ بسم اللہ نے ہمیں یہ غلط تاثر دیا کہ میرے تمام ساتھی میرے ساتھ کھڑے ہیں، تنظیم انتہائی مضبوط ہے اور کمیونسٹ تنظیم کی طرح کا ڈسپلن ہے، لیکن یہ سب باتیں غلط نکلیں۔

۳۔ اُس نے ہماری حوصلہ افزائی اور اجازت سے پرچم پارٹی میں جو ملاقاتیں کیں، اُس کا غلط فائدہ اٹھایا اور اپنے ذاتی مفادات کے لیے استعمال کیا۔

۴۔ اس نے دوغلی پالیسی چلا کر اب تک ہم سے جھوٹ بولا۔ مراعات اپنے ساتھیوں کے نام سے حاصل کیں اور ہمیں بتایا گیا نکتہء نظر بھی ساتھیوں کی مشترکہ رائے کی حیثیت سے پیش کیا۔ اس نے ہمیشہ یوں ظاہر کیا کہ میں تو مطمئن ہوں لیکن میرے ساتھی فلاں فلاں بات پر مطمئن نہیں اور مجھ سے جواب طلبی کرتے ہیں۔ مگر حقیقت برعکس تھی۔

یہاں آئے ساتھیوں کی یہ بھی رائے ہے کہ ان تمام کاموں میں نور محمد، بسم اللہ کے ساتھ شریک ہے۔ وہ فنڈز جو بلوچستان میں اُن کے ساتھی مہیا کرتے ہیں انہیں لانے اور ان کی خرد برد میں بھی نور محمد اچکزے ہی کو ذمہ دار ٹھہرا رہے ہیں۔

ممکن ہے کچھ قصور ان ناراض ساتھیوں کا بھی ہو لیکن جو یہ کہہ رہے ہیں وہ بے بنیاد نہیں ہوسکتا۔ ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ تحریک کی عام مشکلات کی وجہ سے سارے لوگ تنگ، ناراض، پریشان ہوں اور ایک دوسرے سے شاکی ہونے کی وجہ سے لڑائی کے بہانے ڈھونڈ رہے ہوں۔

شام یہ دس کے دس ساتھی، ہمارے ساتھ یعنی تورلالی، شاہ جہان اور میرے ساتھ ڈاکٹر پکتیاوال

کے مہمان تھے۔اس دعوت کے موقع پر ہم نے ان ساتھیوں اور بسم اللہ کاکڑ کے درمیان مفاہمت کے امکانات کو ٹٹولا لیکن اسی نتیجے پر پہنچے یہ اب اکٹھے نہیں رہ سکتے تو انہیں علیحدہ کر کے جلال آباد میں پختون زلمے کے کیمپ بھیج دیا جائے۔

یکم اکتوبر 1975: نور محمد اچکزے آیا اور اپنے ساتھ بسم اللہ کاکڑ کا خط لایا ہے۔موصوف کا کہنا ہے کہ شکور حوصلہ ہار چکا ہے اور عزیز اللہ اپنی شرارت سے کیمپ میں دراڑیں ڈال رہا ہے۔ خان میر اچھا اور مضبوط لیکن سادہ انسان ہے۔باقی لوگ ان کے رشتہ دار ہیں۔ناراض کاکڑ نے کاکڑ کو، ناراض اچکزئی نے اچکزئی کو اور ناراض مندوخیل نے مندوخیل کو آواز دی اور سب کو روانہ کیا۔خدائے دوست اور سلام اللہ جاسوسیاں کرتے ہیں۔خدائے دوست، خان میر سے بات کرتا اور اس کی اطلاع بسم اللہ کو دیتا، پھر بسم اللہ کی ڈائری کا حال جس میں خان میر کے خلاف کچھ لکھا ہوتا خان میر کو بتاتا۔اسی طرح کی لگائی بجھائی سلام اللہ بھی کرتا تھا۔(شاباش نوجوان! سارے معاملے کو کتنی آسانی سے سمیٹ لیا ہے۔)

16 اکتوبر: بسم اللہ، نور محمد، عبدالرحمان اور استاد قاسم آئے لیکن ان کے ناراض ساتھیوں نے ان کا استقبال نہیں کیا۔

17 اکتوبر: بسم اللہ کا سب سے زیادہ اعتراض عزیز اللہ پر ہے اور کہتا ہے کہ وہ کیمپ میں مسلسل لڑکوں کا حوصلہ خراب کر رہا ہے۔وہ قصداً ایسے مواقع ڈھونڈتا ہے کہ کیمپ میں پھوٹ ڈالے۔شکور نے میرے ساتھ ذاتی اختلافات کو سیاسی رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔وہ اپنے ساتھیوں کے اختلافات کو نظریاتی اور سیاسی پردوں میں چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔خان میر بے قوف ہے۔میرا کبھی کبھار اُس سے اختلاف بھی ہوا۔کبھی وہ مجھ پر جملے بھی کستا۔لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس حد تک چلا جائے گا۔جہاں تک دوسرے خان میر کا تعلق ہے تو اس کا حال تو یہ ہے کہ وہ پرائے گھر دیوار پھلانگ کر داخل ہوا اور ہماری بدنامی کا باعث بنا۔سزا کے طور پر ہم نے اس پر کیمپ کے دروازے چھ ماہ کے لیے بند کر دیے مگر وہ تین مہینے بعد ہی لوٹ آیا۔

19 اکتوبر: بسم اللہ اپنے آپ کو تمام الزامات سے پاک کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ لیکن اب حالات کی نزاکت کا اندازہ لگانے کے بعد نرمی اور لچک کا مظاہرہ کر رہا ہے۔وہ مان گیا ہے کہ مفاہمت کے بغیر دوسرا کوئی راستہ نہیں۔ممکن ہے یہ بھی موصوف کی ایک چال ہو کہ اس طرح

مفاہمت کے نام پر اُس کے ناراض ساتھی کم از کم اس سے مصافحہ تو کریں

20 اکتوبر: دیگان کیمپ میں اختلافات کے دائمی خاتمے کے لیے ایک اصول نامہ مرتب کیا گیا جس میں ہر ایک کے حقوق اور ذمہ داریوں کا تعین کیا گیا۔

4 مارچ 1977: بسم اللہ نے نور محمد کو بھجوایا ہے کہ ناراض ساتھیوں سے ملے۔لیکن لگتا ہے کہ یہ حضرت اس کام کے اہل نہیں، کیوں کہ اس نے ابھی سے یہ رائے قائم کی ہوئی ہے کہ ناراض ساتھی اس وقت تک خوش نہیں ہوں گے جب تک اُن کو واپس گھروں کو جانے کی امید نہ رہے۔نور محمد کا کہنا ہے کہ بسم اللہ ان لیڈروں میں سے خان میر اور شکور کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔وہ کہتا ہے کہ اگر وہ راضی ہوتے ہیں تو چند دن بعد یہ پھر جدا ہوں گے۔کیوں کہ ان کا سب سے بڑا مطالبہ یہ ہے کہ وہ کیمپ کے اسلحے میں سے اپنا حصہ مانگتے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ تمام اختلافات کی جڑ یہی اسلحہ ہے۔بسم اللہ اور نور محمد اپنے آپ کو اس تمام اسلحے کا بلا شرکت غیرے مالک خیال کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ نور محمد کو امید نہیں کہ وہ ناراض دوستوں کو منا سکے گا۔اس گروپ نے اپنی صلاحیت کے مطابق اپنے علاقے میں تخریبی کارروائیوں میں سرگرم حصہ لیا تھا۔لاہور میں واپڈا ہاؤس میں ہونے والے دھماکے کا سہرا نور محمد اپنے سر باندھتا تھا جس میں بہت زیادہ جانی اور مالی نقصان ہوا تھا۔تاہم بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ یہ کارنامہ پنجاب کے ساتھیوں کا تھا۔

دیگان کیمپ کے ناراض ساتھی تقریباً دو سال تک جلال آباد کیمپ میں مقیم رہے۔جس وقت پاکستان اور افغانستان حکومتوں کے مابین ایک عمومی مفاہمت کا راستہ ہموار ہوا، پاکستان میں سیاسی فضا تبدیل ہوئی، عام معافی کا اعلان ہوا تو پختون زلمے بڑی برق رفتاری سے واپس پاکستان چلے آئے۔مگر آسومرغہ کا دیگان کیمپ آخر میں تھا۔ہم نے فیصلہ کیا کہ کیمپ کے تمام رفقاء متفقہ طور پر متحد ہو کر واپس جائیں۔اس میں ہمیں کسی حد تک کامیابی ہوئی۔

1978ء کا موسم سرما، اور مہینا غالباً جنوری کا تھا کہ میں جلال آباد میں مقیم ناراض ساتھیوں کو کیمپ تک ساتھ لے جاؤں اور پھر اکٹھے کیمپ کا ساز و سامان سنبھال کر ان کو قندھار لے جاؤں۔ہم تین چار جیپوں میں برف سے ڈھکے راستوں سے ہوتے ہوئے کیمپ تک گئے۔سردی زوروں پر تھی۔ابھی دو تین دن نہیں گزرے تھے کہ رات کے اندھیرے میں بسم اللہ نے میرا خان کیرل کو

اونٹوں سمیت طلب کیا۔ اس کی کوشش تھی کہ کیمپ کا مشترکہ اسلحہ جس میں رائفلیں، بندوقیں، ماؤزر پستول، دھماکہ خیز مواد اور مارٹر میزائل وغیرہ شامل تھے، اپنے ساتھیوں کو خبر کیے بغیر اپنی صوابدید پر بلوچستان بھجوائے۔

مجھے عزیز اللہ اور اس کے ساتھیوں نے نیند سے بیدار کیا۔ میں ایک جھونپڑی میں سویا ہوا تھا جس میں دو یا تین لوگ سو سکتے تھے۔ انہوں نے مجھے بیدار کر کے یہ منظر دکھایا۔ یہ سارا منظر ہمارے ساتھ گئے ہوئے زابل صوبے میں سرحدی امور کے ڈایئریکٹر، عبدالجلیل سرتور، نے بھی دیکھا جو ہمارے ساتھ گیا تھا۔ وہ مفاہمت جو ہم نے کرائی تھی ٹوٹ چکی تھی۔ تاہم میں نے ناراض ساتھیوں کو اعتماد میں لے کر جنگ و جدل سے باز رکھا۔ وہاں سے قندہار روانہ ہوئے اور تمام داستان لکھ کر اجمل کو بھیجی۔

میری نظروں کے سامنے پختونوں کی تمام تاریخ گھوم گئی۔ جنگ کی صورت میں اکٹھے ہوتے ہیں، فتح حاصل کرتے ہیں، لیکن مال غنیمت بٹورنے کا معاملہ فتح کو شکست میں تبدیل کر دیتا ہے۔

بلوچ محاذ

بلوچ پہاڑوں پر چڑھ چکے تھے اور پاکستان آرمی کے ساتھ اُن کی جھڑپیں جاری تھیں۔ افغان حکومت نے پختون اور بلوچ نوجوانوں کی تربیت کا آغاز کر دیا تھا۔ اجمل خٹک ان محاذوں کے عمومی انچارج تھے۔ بلوچوں نے اپنی طرف سے اجمل کی مدد کرنے کے لیے گل خان نصیر اور میر لونگ خان گھرانے کے فرد میر اکرم بلوچ کو نامزد کیا تھا۔ یہ عام طور پر عطاء اللہ مینگل اور غوث بخش بزنجو کے زیر اثر محاذوں کے رابطہ کار تھے۔ لیکن جنگ کا زیادہ اثر خیر بخش مری کے زیر اثر مری قبائل پر تھا۔ چمالنگ، تھڈری، ماوند، کوہلو اور دیگر مقامات پر شدید ہوائی بمباری کے نتیجے میں مری مہاجرین نے افغانستان کا رخ کیا۔ سب سے پہلے آٹھ سو مری افغانستان پہنچے اور کچھ ہی عرصے میں ان کی تعداد تین ہزار تک پہنچ گئی (آخر آخر میں ان کی تعداد سات ہزار تک پہنچ گئی تھی، جن میں کچھ غیر مری قبائل کے مہاجرین بھی شامل تھے)۔ وہ دو کیمپوں میں تقسیم کیے گئے۔ ایک کیمپ قندہار کے نزدیک 'کوکران' میں قائم کیا گیا اور دوسرا قلات میں بنایا گیا۔ قلات کیمپ تقریباً ایک سال بعد ہلمند منتقل کر دیا گیا۔ کوکران کیمپ کا کمانڈر میر یعقوب خان بجارانی تھا، جو خیر بخش مری کے مخالف بہرام خان بجارانی سے راہ و رسم رکھتا تھا۔ ان مہاجرین کی آمد کا یہ سلسلہ غالباً 1974ء میں خزاں کے موسم میں شروع ہوا۔

میر اکرم بلوچ کے ساتھ بہت جلد حکیم لہڑی جاملا۔ حکیم لہڑی مشکلات پیدا کرنے والا اور ہر کام کو الجھانے والا انسان تھا۔ پینے پلانے کا بہت شوقین تھا اور ہر وقت مخمور رہتا۔ احمد نواز بگٹی اور عبدالواحد کرد جیل سے باہر تھے، اس لیے ان کا تعلق اور رابطہ جیل سے باہر موجود راہنماؤں سے رہتا تھا۔ پختون زلمے کی قیادت ایک تھی۔ بلوچ اگرچہ نیپ کی کمان کے تابع تھے، لیکن اپنی قبائلی ساخت کی وجہ سے بہت منتشر تھے۔

مریوں کا معاملہ دوسرے بلوچوں سے مختلف تھا۔ ان میں موجود آزاد منش ٹراٹسکی رجحان کے بائیں بازو کے عناصر نے حالات کو مزید پیچیدہ بنایا ہوا تھا۔ یہ عناصر نہ صرف عملی طور پر مری جنگی سرگرمیوں کی راہنمائی کرتے تھے، بلکہ خارجی تعلقات بھی انہی کے توسط سے استوار کیے جاتے تھے۔ اسد رحمان، راشد رحمان، محمد علی تالپور، نجم سیٹھی، احمد رشید اور ان کی طرح کے اور لوگ

مریوں میں سرگرم عمل تھے۔ اسد رحمان، اس کا بھائی راشد رحمان، محمد بھابھا اور محمد علی تو ان کے ساتھ افغانستان میں بھی تھے۔ پہلے پہل محمد بھابھا جو مراد بلوچ کے نام سے جانا جاتا تھا، افغانستان میں اُن کی نمائندگی کے لیے بھیجا گیا تھا[۸]۔ بعد میں جب میر ہزار خان رحمکانی (بجارانی) آگئے تو اس بنیاد پر کہ وہ ایوب خان کے عہد سے بھٹو دور تک مری مزاحمت کے ماہر کمانڈر تھے، فضا کچھ تبدیل ہوئی۔ مگر موصوف بالکل ان پڑھ تھے اور انہیں بلوچی کے علاوہ کسی زبان پر عبور نہ تھا۔ ٹوٹی پھوٹی اردو بول لیتے تھے، یوں ان کی باگ دوڑ لیفٹ عناصر کے ہاتھ میں تھی۔

اصل گوریلا لڑائی بلوچ لڑ رہے تھے۔ انکے تقاضے، مطالبات اور خواہشات بہت زیادہ تھیں۔ افغانستان کے کمزور کاندھے اس قابل نہ تھے کہ کھلے بندوں اس جنگ کو آگے بڑھا سکیں۔ سردار داؤد کی حکومت کو ایک طے شدہ انجام یعنی Fait accompli کا سامنا تھا۔ یہ جنگ اُس نے شروع کی تھی اور نہ اُس کے مشورے سے شروع کی گئی تھی۔ یہ سب کچھ بھٹو کے فسطائی ذہن اور نیپ لیڈران کی مہم جوئی کی وجہ سے شروع ہوا۔ سردار داؤد اپنی دیرینہ خواہشات، سوچ اور قومی آرزوؤں کے ہاتھوں مجبور تھا، کہ ان لوگوں کا ساتھ دے۔ 1973ء کے آخر اور 1974ء کے مئی جون میں ولی خان کی دید باز دید نے داؤد کو مطمئن کیا تھا کہ گویا بھٹو کے خلاف واقعی ایک بہت بڑی مزاحمت جاری ہے۔ اور یہ کہ 1971ء کے بعد کا باقی ماندہ پاکستان اپنے کم تر مورال اور کمزور فوج کی وجہ سے اس قابل نہیں کہ پختون اور بلوچ کی مشترکہ جنگی قوت کا مقابلہ کر سکے۔ مگر حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، میر اکرم بلوچ کے بعد مری مہاجرین اور مجاہدین کے ساتھ محمد بھابھا اور میر ہزار خان بجارانی آئے تھے۔ میر اکرم کو 'میکروریان' (اس زمانے میں ایک ہی میکروریان ہوا کرتا تھا) میں ایک چھوٹا سا فلیٹ الاٹ کیا گیا۔ جب مراد آ پہنچا تو اس نے نسبتاً بڑا اپارٹمنٹ میکروریان میں کرائے پر لیا اور اپنے اہل خانہ کے ساتھ وہاں منتقل ہو گیا۔ میر ہزار کو بھی حکومت کی طرف سے دو کمروں کا ایک فلیٹ دیا گیا۔ میر ہزار کی فیملی قلات کیمپ میں تھی، جو بعد میں کیمپ کے ساتھ ہلمند منتقل ہو گئی۔

بہت جلد بلوچ مہاجرین اور گوریلاؤں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ جوں جوں افغان حکومت کی عملی امداد میں اضافہ ہوتا گیا، یہ سلسلہ آگے بڑھتا چلا گیا۔ ایک طرف پختون زلے کا محاذ

تھا اور دوسری طرف بلوچستان کا محاذ تھا۔ ان دونوں کو بیک وقت سنبھالنا آسان کام نہ تھا۔ انقلابی جمہوری محاذ کے دفتر کے ذمہ دار فرد کی حیثیت سے میرے روابط دونوں کے ساتھ تھے۔ اجمل کے بعد بلوچ رابطے اور ان کے روزمرہ مسائل میں ہی سنبھالتا تھا۔ مری محاذ پر قابض لیفٹسٹ یہ موقع نہیں دیتے تھے کہ میں ان کے مسائل میں دخل اندازی کروں۔ وہ اپنے مسائل براہ راست اجمل کو بتاتے اور وہاں سے حل کروانے کے خواہاں ہوتے۔ تاہم باقی ماندہ بلوچستان کے گوریلے اور ان کے کمانڈروں کی مشکلات میرے توسط سے ہی حل ہوتیں۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ میں باقاعدہ طور پر رابطہ کار یا انچارج تھا، لیکن اجمل کے ساتھ اس دفتر میں ہونے کی وجہ سے یہ مسائل میرے گلے بھی پڑتے تھے۔ یوں میں مجبور تھا کہ بلوچ پختون اتحاد کے تحت بلوچوں کے ساتھ اپنے تعلقات رکھوں اور ان کی وکالت کروں۔

یہ میں انتہائی اختصار سے اُن معاملات، مشکلات اور اشخاص کا جائزہ پیش کرنا چاہوں گا، جن کا سامنا ہمیں بلوچستان کے گرم محاذ کی وجہ سے کرنا پڑا۔ میری یہ تحریر تمام پہلوؤں کا احاطہ نہیں کر سکتی، کیوں کہ رپورٹ، گذارشات، اطلاعات اور سرگرم رابطہ اجمل کی ڈائریوں میں درج تھے۔ تاہم ضمنی طور پر یہ معاملات میرے حوالے کیے جاتے، اُس دور میں جو کچھ میں نے اپنی یادداشتوں میں لکھا، یا اب حافظے میں رہ گیا ہے، انہیں یہاں درج کرتا ہوں۔ بلوچ محاذ کی افغانستان میں فعالیت چونکہ کسی تاریخ کا حصہ نہیں بنائی گئی، اس لیے یہ سطور میں اپنی ذمہ داری اور تاریخ کی امانت سمجھ کر درج کر رہا ہوں۔

1974-75ء میں بلوچ مہاجرین کی آمد، ان کی رہائش اور خوراک کے مسائل، سکیورٹی اقدامات، کیمپوں کا نظم ونسق، گوریلوں کی تربیت اور ان کو اسلحہ کی فراہمی وہ بنیادی مسائل تھے، جن کا ہمیں سامنا تھا۔ اس کے لیے اجمل کو قندھار جانا پڑا اور وہاں سرکاری اہل کاروں سے رابطہ کر کے فیصلے لیے گئے۔ اس کے علاوہ کابل میں صدر داؤد کے دفتر سے بھی مسلسل رابطہ رہتا۔

10 مئی 1975: منظور بلوچ کابل پہنچ گیا۔ میر اکرم اور مراد بلوچ، دونوں نے موصوف کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ ہمیں بھی کسی جانب سے کوئی اطلاع نہیں۔ اس لیے اس معاملے میں ہم بہت احتیاط سے کام لے رہے ہیں اور کسی اہم بات میں اسے شریک نہیں کیا گیا۔

17 مئی: گل محمد ہوت بھارت پہنچ گیا، وہ بلوچوں کا گشتی سفیر ہے۔

21 مئی: اجمل قندھار گئے، وہاں عطاء اللہ مینگل کے بھائی مہر اللہ مینگل کی سربراہی میں چند بلوچ راہنما اور کمانڈر اپنے گوریلاؤں کے ساتھ آئے تھے۔ اُن سے ملے، بلکہ ساتھ ہی لے آئے۔

منظور بلوچ کی رہائش ہمارے گھر میں تھی، لیکن مراد بلوچ آیا تو اُس نے پہچان لیا کہ موصوف اصل میں محمد بھابھا ہے، ماؤسٹ ہے اور بین الاقوامی نیٹ ورک سے تعلق رکھتا ہے۔ چوں کہ ماؤازم پاکستان کی علاقائی سالمیت کا حامی، سوویت دشمن، بھارت دشمن اور افغانستان دشمن تحریک سمجھی جاتی تھی، اس لیے اس انکشاف نے ہمیں تشویش میں مبتلا کر دیا۔ یہ تشویش بجا ہے یا نہیں، یہ الگ سوال ہے۔ مگر اس وقت ہمیں کافی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ ہم یہی سوچتے رہے کہ موصوف کس طرح اور کس اختیار کے تحت افغانستان آیا ہے، یہ تشویش فطری بھی تھی۔

7 جون: [منظور بلوچ کے حوالے سے چند سطریں ڈائری میں درج ہیں] آٹھ دس دن ہوئے کہ منظور بلوچ کافی توقعات کے ساتھ یہاں آیا ہوا ہے، مگر اب مایوس نظر آتا ہے۔ موصوف کی توقعات اور شکایات بجا ہیں۔ مگر ہماری مشکل یہ ہے کہ ہم یہاں پر بلوچ لیڈرشپ کی اتھارٹی کے بغیر بلوچوں میں سے کسی کی مدد نہیں کر سکتے۔ اگر ایسا کیا تو بلوچ لیڈرشپ ناراض ہو جائے گی اور صدر داؤد بھی مشکوک ہو جائے گا۔ موصوف کا کہنا ہے:

۱۔ عبدالواحد کرد کی طرف سے خیر جان کو مارنے کی بہت کوشش کی گئی ہے۔

۲۔ ہمیں ایک کارتوس کی مدد بھی نہیں دی گئی اور دیدہ دانستہ محروم رکھا گیا۔

۳۔ بلوچ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے جن نوجوانوں نے یہاں تربیت حاصل کی ہے، آٹھ میں سے چھ بے کار بیٹھے ہیں، کیوں کہ اسلحہ نہیں ہے۔ جیل سے باہر لیڈرشپ کی کوشش ہے، کہ ہمیں تنہا کر دے۔ جیل میں لیڈروں تک رسائی صرف عبدالواحد کرد وغیرہ کو ہے۔

۴۔ سائیں عزیز اللہ اور عبدالخالق بلوچ پر قاتلانہ حملے کیے گئے۔ واحد کرد نے جس شخص کو ان کو مارنے کے لیے بم دیا تھا وہ خود ہمارے پاس آیا اور کہنے لگا کہ یہ بم مجھے عبدالواحد نے آپ لوگوں کو مارنے کے لیے دیا ہے۔

تبصرہ: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بلوچ تحریک کجروی کا شکار ہو کر خراب ہو رہی ہے۔ ایک طرف جو اسلحہ یہاں سے گیا تھا، وہ تمام بلوچوں کے لیے تھا لیکن اس کی تقسیم ٹھیک بنیادوں پر نہیں ہوئی۔

کچھ راستے میں پکڑا گیا، اور جو پہنچا اس کی تقسیم اپنے اور پرائے کی بنیاد پر ہوئی۔ نہ صرف یہ کہ یہ اسلحہ عمداً بی ایس او کے نوجوانوں کو نہیں دیا گیا، بلکہ بلوچ کمانڈروں کو بھی اس کی تقسیم قابلیت کی بنیاد پر نہیں کی گئی۔ کسی کو دیا گیا اور کسی کو بالکل محروم رکھا گیا۔ سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ بہت سے دشمن ہماری صفوں میں گھس آئے ہیں، اس لیے افغانستان جیسے حساس مقام پر ایک انتہائی حساس ڈیوٹی مراد بلوچ (محمد بھابھا) کو سونپی گئی۔

7 جون: خیر جان بلوچ، اسلم گچکی اور یوسف قندھار سے کابل آئے ہیں۔ ان کے باقی پندرہ ساتھی قندھار میں ہیں۔ بعد از ظہر میر اکرم، مہر اللہ مینگل، اس کا بھائی ضیاء اللہ مینگل، میر گوہر خان زرکزئی اور مراد بزنجو وغیرہ آئے۔ انہیں پغمان میں عسکری کلوپ (آرمی کلب) لے جایا گیا۔ مہر اللہ وغیرہ پہلے سے ہی پغمان میں مقیم ہیں۔

9 جون: خیر جان اور منظور کے ساتھ یہ فیصلہ ہوا کہ وہ میکروریان کے بلاک 53 اپارٹمنٹ 5 میں منتقل ہوں گے۔ اسلحے کا جو ڈھیر 'شوراوک' میں پڑا ہے، اس سے اسلحہ لیں گے اور کچھ مدت بعد محاذ سے اپنے نوجوان تربیت اور اسلحے کے لیے روانہ کریں گے۔ ان کے دیگر ساتھی جو کل کابل پہنچنے والے ہیں، بامیان ہوٹل میں ٹھہریں گے۔

مہر اللہ مینگل اور میر گوہر خان زرکزئی میکروریان میں اپنے لیے الگ الگ گھروں کا تقاضا کر رہے تھے۔ ان کے لیے دو گھر خالی ہوئے ہیں۔ یہ اُن گھروں میں اس وقت منتقل ہوں گے، جب گھریلو سامان خرید کر گھروں کو مال اسباب سے بھر دیا جائے۔

10 جون: خیر جان، منظور اور اسلم گچکی کے ساتھی قندھار پہنچ گئے۔ یہ ساتھی ترقی پسند گروپ سے وابستہ ہیں، ان میں بلوچستان کے بی ایس او لیڈر محمد خان مینگل بھی ہیں۔

11 جون: نئے آنے والے ساتھیوں کے لیے دس جوڑے کپڑے بازار سے خریدے، مگر پیسوں کی کمی کی وجہ سے آٹھ جوڑے رہ گئے۔ خیر جان نے مجھ سے کہا کہ مراد بزنجو دراصل ترقی پسند ساتھی ہے۔ گو بڑا زمیندار ہے مگر دیگر سرداروں اور نوابوں کے برخلاف اس نے اپنے مزارعین پر 'شیشک' معاف کیا ہوا ہے، یہی وجہ ہے کہ اپنے علاقے کے تمام کسان موصوف کی مدد کرتے ہیں۔ اور یہی نیپ کے راہنماؤں سے تضاد کا باعث بھی ہے۔ موصوف غوث بخش بزنجو کا رشتہ دار اور اس کے بڑے بیٹے بیزن کا سسر بھی ہے۔

مراد بزنجو ان دنوں ہم سے ناراض ہے۔ جب یہ آرہے تھے تو سائیں عزیز اللہ نے کہلوادیا تھا کہ اجمل خٹک اپنا ساتھی ہے۔ اب اس کا کہنا ہے "میرا تاثر غلط ثابت ہوا، کیوں کہ یہاں پر تو سرداروں یعنی مہراللہ اور میر گوہر سے امتیازی سلوک برتا جاتا ہے۔ میری ذات تو چھوڑیے، اپنے جن گوریلا ساتھیوں کو میں نے اور ہی تاثر دیا تھا، اب ان کی نظر میں بے اعتبار ہو گیا ہوں۔ وہ اس امتیازی سلوک سے مایوس ہوئے ہیں۔

ہم تو مراد کو عام کھاتے میں ڈالتے تھے۔ ہمارے پاس ایسی کوئی جادو کی چھڑی نہ تھی کہ ہم انہیں پرکھتے۔ مراد کے علاوہ شکاری بھی اچھا آدمی ہے اور اسلم گچکی اپنے فرنٹ کا کمانڈر رہے۔ مری علاقے میں وزیر خان بھی انھی سے وابستہ ہے۔ مراد بزنجو سارے علاقہ میں ہمارا مضبوط سہارا بن سکتا ہے، اس لیے فیصلہ کیا گیا کہ محمد خان مینگل علیحدہ محاذ کھولے گا۔

12 جون: خیر جان اور مراد بزنجو نے ببرک کارمل اور استاد میر اکبر خیبر سے ملاقات کی۔ مراد بزنجو کون ہے؟ کس سطح پر ساتھیوں سے بات کرسکتا ہے؟ اس کے ساتھ کیا رویہ رکھا جائے؟ یہ وہ سوالات ہیں، جن کا جواب ابھی ہمارے پاس نہیں۔ ہماری معلومات مکمل نہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ دوغلی پالیسی پر عمل کرے۔ سرداروں سے ایک بات کرے اور خیر جان وغیرہ سے دوسری۔ مگر کیا کیا جاسکتا ہے، کہ خیر جان اپنے پرانے فیصلے کے برخلاف منظور کی جگہ مراد کو خوش کرنا چاہتا ہے۔ وہ خود کو اور ہمیں افشا کرنے کے لیے راستہ ہموار کررہا ہے، اس لیے میں نے مذکورہ ملاقات میں شرکت سے اجتناب کیا۔

13 جون: اجمل خٹک بلوچوں کے مسائل کے حل کے لیے قندھار چلے گئے۔ میں ڈاکٹر حبیب اللہ حبیبی کے ساتھ پکنک منانے پغمان چل دیا۔

14 جون: سردار عطاء اللہ مینگل کا چھوٹا بھائی ضیاء اللہ مینگل لندن جانا چاہتا ہے۔ اس کے لیے ٹکٹ اور پاسپورٹ منظور کیے گئے۔ موصوف کے لیے پچاس پونڈ میں نے اپنے دستخط سے وزارت سرحدات سے وصول کیے جو قانون کی رو سے ہر مسافر اپنے ساتھ لے جاسکتا ہے۔ دستخط کرتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کوئی گناہ کررہا ہوں، کیوں کہ اس سے قبل کسی سے اس طرح پیسے نہیں لیے تھے۔ ویسے تو ضیاء اللہ دو سو پونڈ اور ساتھ تین سوٹ کا تقاضا کررہا تھا لیکن پانچ ہزار افغانی سے تین سوٹ نہیں بن سکتے۔ دوسرے روز موصوف کے لیے بازار سے دو سوٹ، ایک

جوڑا بوٹ، ٹائیاں، جرابیں اور شرٹ خریدیں۔

17 جون: خیر جان چاہتا ہے کہ میں اور مراد بزنجو اس کے ساتھ بیٹھ کر بلوچستان کی جنگی حکمت عملی، جنگی منطقوں کی تقسیم، اور طریقہ کار پر مشترکہ لائحہ عمل بنائیں۔ میں نے کہا کہ پہلے آپ لوگ بیٹھ کر فیصلہ کریں، اس کے بعد مجھے شامل کریں اور اکٹھے بیٹھ کر بات کریں گے۔ مجھے معلوم نہیں کہ مراد بزنجو کس کے ساتھ ہے، اس لیے احتیاط ضروری ہے۔ پھر ہم اپنے آپ کو اس طرح افشا نہیں کرنا چاہتے۔

19 جون: خیر جان کو مراد بزنجو نے کہا ہے:

۱۔ مہراللہ، گوہر خان اور میر اکرم اپنے لیڈروں کو لکھنا چاہتے ہیں کہ اجمل خٹک کمیونسٹ ہے، اور وہ اپنے ساتھیوں یعنی خیر جان وغیرہ سے امتیازی سلوک کرتا ہے اور ان ہی کو آگے لے جانا چاہتا ہے (خوئے بد را بہانہ بسیار!)۔

۲۔ مراد بزنجو کے ساتھیوں کو مہراللہ وغیرہ کے گروپوں کے بعد بھجوانا چاہیے، تاکہ ان کو خوش کیا جائے اور ان کی کپڑوں وغیرہ کے ساتھ مدد کی جائے۔

۳۔ خیر جان کہتا ہے مجھے دو وانچ بیرل والی مارٹر، دھماکہ خیز پلاسٹک مواد، 19 آدمیوں کے لیے چپل اور پانچ ساتھیوں کے لیے کپڑے دیے جائیں۔ (ہم کیا کریں، اپنے ہوں یا پرائے، سارے لوگ پیسوں سے خوش ہوتے ہیں اور ہم پیسے کہاں سے لائیں؟ ہم خود کھاتے ہیں اور نہ ہی اضافی خرچ کرتے ہیں، بلکہ انتہائی کفایت سے گزارہ چلا رہے ہیں۔ اس کے باوجود ہم دوسروں کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر اتنے مطالبات پورے کرنا ہمارے بس میں نہیں)

20 جون: [میرے تاثرات] جیلوں سے باہر بلوچ لیڈرشپ، معلوم ہوتا ہے کہ بے ایمان، سردار پرست، جھوٹے اور کچھ قوتوں کے ہاتھ کے کھلونے ہیں کیوں کہ:

۱۔ مراد بلوچ: نہ مری ہے اور نہ بلوچ بلکہ کراچی کا سیٹھ اور ماؤسٹ ہے۔ اسے یہاں افغانستان میں نمائندگی کے لیے بھیجا ہے۔

۲۔ خیر جان بلوچ اور اس کے بی ایس او کے ساتھیوں کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنا، ان کو مہاجروں کے ایجنٹ کا نام دینا۔ اور اسلحہ تو دور کی بات، انہیں کھانے پینے کی اشیاء تک سے

محروم رکھنا۔

۳۔ خیر جان جس وقت شہزادہ عبدالکریم کے بیٹے آغا سلیمان کے ساتھ ایک گروپ میں تھا، اسے حکم دیا تھا کہ اپنا اسلحہ آغا سلیمان کے حوالے کرے، کیوں کہ خیر جان وغیرہ کی کوئی ضرورت باقی نہیں ہے۔

۴۔ میر سفر خان کے ذریعے خیر جان کے مارنے کی کوشش کی گئی۔

۵۔ افغانستان کے علم کے بغیر اپنے لوگوں کو بغیر صلاح مشورے، بیرونی ممالک میں اسلحہ اور مالی امداد کے لیے بھجوانا۔

۶۔ جب اسلحہ طلب کیا گیا تو افغانستان نے مہیا کیا، لیکن وہ متعلقہ جگہوں تک نہیں پہنچایا گیا۔ خیر جان کو تو چھوڑیے اپنے ہی گروپوں کو نہیں پہنچایا گیا اور اس طرح ایک غلط تاثر قائم کرنے کی کوشش کی ہے کہ افغانستان نے بلوچوں کی کوئی مدد نہیں کی۔

۷۔ یہاں آئے ہوئے سردار جیسے مہر اللہ اور گوہر خان وغیرہ اپنی سرداری جمانا چاہتے ہیں۔ بے جا لمبے چوڑے مطالبات کرتے ہیں اور اس طرح کوشش کرتے ہیں کہ افغانستان کو ناراض کردیں یا خود افغانستان سے ناراض ہو کر چلے جائیں۔ حکیم لہڑی کی طرح کے غیر ذمہ دار لوگوں کو بھیجا گیا، جو پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ افغانستان نے بلوچوں کی کوئی مدد نہیں کی۔

۸۔ پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ افغانستان سب کچھ پختونوں کو دے رہا ہے، پختون بلوچوں کو برا سمجھتے ہیں اور عبدالصمد خان کاکا کی باتیں اپنی طرف سے دہرائیں، یوں پختون بلوچ اتحاد کے لیے ہماری کوششوں کو نقصان پہنچانا۔

۹۔ اس کوشش میں ہیں کہ صدر داؤد کو عبدالصمد خان کاکا کی باتوں پر قائل کریں اور نیپ کے موقف سے دور لے جائیں۔

۱۰۔ بی ایس او کے نوجوان تربیت کے بعد اپنے ساتھ اسلحہ واپس بلوچستان لے گئے، ان سے اسلحہ لے کر مراد (محمد بھابھا) اور آغا سلیمان کے حوالہ کیا گیا۔

۱۱۔ اُن آٹھ تربیت یافتہ نوجوانوں میں سے چھ غیر مسلح اور مایوس بیٹھے ہیں۔

۱۲۔ میر سفر خان اسلحہ لے گیا اور ساتھ ہی اسلحہ لادنے کے پیسے بھی وصول کیے۔ اسلحہ شوراوک میں رہ گیا، پیسے کھالیے گئے اور نتیجہ صفر رہا۔

20 جون: آج منظور بلوچ آیا اور کہنے لگا کہ ہمارا اپنے سرداروں کے ساتھ گزارہ مشکل ہے اور ڈر ہے کہ کہیں افغانستان ہمارا راستہ بند نہ کردے۔ میں نے بتایا کہ ہماری مشکل یہ ہے کہ ہم نیپ لیڈران کی نمائندگی کرتے ہیں۔ افغان حکومت صرف نیپ اور بلوچستان میں بلوچ لیڈرشپ یعنی خیر بخش مری، عطاء اللہ مینگل اور غوث بخش بزنجو کو تسلیم کرتی ہے۔ دوسری طرف ہمیں اپنے ساتھیوں کی طرف سے بھی بعض ذمہ داریاں دی گئیں ہیں۔ داؤد خان کو ہم کسی قیمت پر ناراض نہیں کرنا چاہتے اور نہ ہماری ترقی پسند سیاست اس کی اجازت دیتی ہے۔ البتہ واضح بات یہ ہے کہ ہم تین کشتیوں میں بیٹھے ہیں اور ہماری اصلی کشتی ساتھیوں کی کشتی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ بلوچستان کے حقیقی انقلابیوں کا راستہ کوئی نہیں روک سکتا۔ اگر اس طرح کا کوئی ناگوار وقوعہ ہوا تو پھر سوچیں گے اور دوسرا راستہ ڈھونڈیں گے۔ فی الحال گزارہ کرنا چاہیے اور ہماری مشکلات کو سمجھنا چاہیے۔

21 جون: محمد بخش، جو خاران ایریا میں سرگرمِ عمل ہے اس کے ساتھ پندرہ گوریلا ساتھی ہیں۔ افراد کی تعداد اسلحہ کی مقدار پر منحصر ہے۔ موصوف کے پاس کھانے پینے تک کا خرچ نہیں۔ قمردین کے ساتھ بیس آدمی ہیں، وہ جھالاوان ایریا میں یعنی بزنجو کے علاقے میں کارروائیوں میں مصروف ہے۔ اس کے پاس بھی کھانے پینے تک کا خرچہ نہیں۔ اسلم گچکی کے ساتھ چالیس آدمی ہمہ وقت موجود رہتے ہیں، وہ اس میں بہ آسانی ستر افراد تک اضافہ کرسکتا ہے۔ وہ مکران اور جھالاوان پائیں میں سرگرم ہے۔ محمود خان، جس نے ابھی تک باقاعدہ گروپ نہیں بنایا، کے ساتھ دس افراد ہیں۔ ابھی تک اس نے اپنے آپ کو کسی ٹھکانے میں فعال کرنے کے لیے کوشش نہیں کی۔ وہ فیصلہ کرنے کے بعد ہمیں اطلاع دے گا۔ وہ سندھ، بلوچستان کی سرحد پر جھالاوان بالا میں سرگرم عمل رہے گا، یعنی کرخ زہری ایریا میں۔ وزیر خان مری بہت سے لوگوں کو سرگرم عمل کرسکتا ہے۔ وہ مری علاقے میں ہے اور شیر محمد مری کا مخالف ہے۔ موصوف پر الزام لگتا ہے کہ وہ کارتوس بیچتا ہے۔ یہ الزام اس لیے لگایا جاتا ہے کہ اس کا تعلق خیر جان وغیرہ سے رہتا ہے اور سرداروں کا مخالف ہے۔

23 جون: خیر جان اور اس کے ساتھیوں کا پروگرام بن گیا۔ یہ لوگ میکروریان کے 26 ویں بلاک کے پانچویں اپارٹمنٹ میں منتقل ہو جائیں گے۔

آخر کار افغانستان حکومت آمادہ ہوگئی کہ بلوچوں کو راستے کا اور اسلحہ وسامان لادنے کا خرچہ

دے۔اس سے پہلے سفر جان کا تجربہ بہت تلخ ثابت ہوا تھا۔

تقابل: ہم اپنے گھر میں مستقل بیس افراد رہتے ہیں اور کھانا کھاتے ہیں۔کبھی کبھار یہ تعداد چالیس تک پہنچ جاتی ہے۔ہم ایک کلو گوشت بازار سے منگواتے ہیں اور سب اس پر گزارا کرتے ہیں۔تعداد کے لحاظ سے سالن میں پانی بڑھاتے جاتے ہیں۔مگر خیر جان وغیرہ بیس آدمی تھے جو روزانہ چار کلو گوشت منگواتے تھے۔سبزی اور ترکاری ان کو پسند نہیں۔عجیب بات یہ ہے کہ بے چارے عام بلوچ قدیم دور سے ابھی تک باہر نہیں نکلے۔مری لوگ تو آٹا ہانڈی میں پکاتے ہیں اور اس کے ساتھ کاک کھاتے ہیں۔مگر جب یہاں آجاتے ہیں تو ہر ایک کا دل عیش مانگتا ہے۔اپنے ہوں یا اجنبی، کوئی دوستی اور رفاقت کے نام پر کھاتا ہے اور کوئی زور زبردستی۔خیر جان نے پندرہ ہزار افغانی سے اپنے لیے شاٹ گن خریدی ہے!

25 جون: مراد بزنجو بعد از ظہر مراد بلوچ اور میر گوہر خان زرکزئی کے ہمراہ ہمارے ہاں آیا۔ مجھ سے تنہائی میں کہنے لگا کہ اجمل خٹک نے میر گوہر خان اور مہر اللہ مینگل کے سامنے کہا کہ سارے کمیونسٹ ایجنٹ ہیں۔اجمل کو میر گوہر خان وغیرہ کے سامنے ایسی باتیں نہیں کرنا چاہیے، کیوں کہ وہ کسی صورت اجمل پر اعتماد نہیں کرتے۔وہ جو باتیں اجمل کے بارے میں کرتے ہیں وہ میں زبان پر بھی نہیں لاسکتا۔

میں: یہ سارا معاملہ واقعی ہماری سمجھ سے باہر ہے۔مراد کو ہم ابھی تک نہیں جان پائے۔بلوچ عجیب لوگ ہیں، ان میں اپنے اور پرائے کی پہچان مشکل ہے۔لیکن اگر گوہر خان وغیرہ اجمل کے خلاف اس طرح زہر افشانی کرتے ہیں تو مراد پھر جھوٹ نہیں بناسکتا۔لیکن مراد کیوں اس معاملہ میں اتنی دلچسپی لیتا ہے اور ہم کیسے اس نازک موقع پر کابل جیسی حساس جگہ میں بلوچوں میں تفریق کریں؟

26 جون: مراد بزنجو کہتا ہے کہ مہر اللہ، گوہر خان اور مراد مری (بھابھا) کے ساتھ سیاسی راز و نیاز کی باتیں نہیں کرنی چاہیے کیوں کہ وہ پھر انہی باتوں سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں اور شکوک اور بڑھ جاتے ہیں جیسا کہ گزشتہ دن جو باتیں سندھیوں کے ساتھ تعلق، حکیم لہڑی کے بین الاقوامی تعلقات اور افغانستان کے سربستہ رازوں کے بارے میں ہوئیں، وہ اُن کے ساتھیوں کو نہیں کرنی چاہیے تھیں۔مراد بزنجو ناراض معلوم ہوتا ہے کہ اجمل ان جیسے لوگوں کی خوشی کی خاطر اپنے ہی ساتھیوں کی گردن پر چھرا چلاتے ہیں۔

28 جون: میں نے میر گوہر خان کے گھر کے لیے کراکری اور دوسرا متعلقہ سامان بازار سے خریدا۔پانچ ہزار افغانی خرچ ہوئے۔

یکم جولائی: اب کے رحمداد کو خدا صحت دے پھر کوپر پر جنگ ہوئی تو بے شک مرجائے

(پشتو ٹپے کا مفہوم)

۱۔ منظور بلوچ نے گذشتہ چند روز سے ڈھنگ کی روٹی نہیں کھائی، موصوف کے پاس پیسے نہیں تھے۔جب دوستوں کا یہی حال ہو تو پرایوں سے کیا گلہ؟ اس کو چاہیے تھا کہ ہمیں بتا دیتا۔ہم تو اتنے مصروف ہیں کہ ایک طرف میرا خیال اور تاثر تھا کہ مہر اللہ، میر گوہر خان کو جو 14 ہزار افغانی چند روز پہلے بلوچوں کے لیے دیے تھے، انہوں نے منظور کو بھی دیے ہوں گے۔کل جب منظور نے فون کیا تو میں نے ضمناً پوچھا اور اس نے بتایا کہ مجھے کسی نے ایک پیسا بھی نہیں دیا، مگر میرے پاس پیسے ہیں (میں نے یہی گمان کیا کہ خیر جان نے چھوڑے ہوں گے) البتہ میرے ساتھی اکبر کے پاس نہیں ہیں۔پھر شام کو اجمل اور میں موصوف کے گھر گئے تو وہ موجود نہ تھے۔اکبر کو سو افغانی دیے اور انتظار کیا کہ منظور آجائے تو اس کے ساتھ بات کریں اور پیسے بھی دیں۔

۲۔ تورلالی نے وزارت سرحدات سے 25 ہزار افغانی بلوچوں کے لیے وصول کیے۔وہ ہم میر گوہر کے پاس لے گئے کہ 8 ہزار گوہر خان کے لیے، 6 ہزار مہر اللہ کے گھر کے خرچ کے لیے، 2 ہزار مراد بزنجو کے لیے، 3 ہزار منظور اور اکبر کے لیے تھے۔باقی پانچ ہزار ہم نے اپنے پاس رکھے کہ میر اکرم جو قندھار میں تھا اور خیر جان کو دیں۔

نوٹ: بلوچ لیڈران بلکہ تمام بلوچ ادھر ناراض ہیں۔یہ تمام لوگ سردار ہیں۔بہت پیسے مانگتے ہیں۔ہمارے پاس اتنے پیسے نہیں اور افغان حکومت اس سے زیادہ دینے کو تیار نہیں۔افغان حکومت اور نہ ہی ان کی مرضی ہے کہ بلاواسطہ باہمی تعلق قائم کریں اور ہم پر الزام نہ آئے۔یہ لوگ بہت شاکی ہیں اور ساری ذمہ داری ہم پر آتی ہے۔اگر ناراض واپس چلے گئے تو بلوچ پختون اتحاد کے لیے ہم نے جو کوششیں کی ہیں، انہیں نقصان پہنچتا ہے۔ذمہ داری پھر ہماری ہوگی اور منطقی لحاظ سے یہ درست بھی ہے۔مگر ہم کیا کریں؟ ہمارے اختیار میں کیا ہے؟ ایسی حالت میں ہم کچھ بھی تو نہیں کرسکتے۔اسی لیے آغاز میں پشتو ٹپے کا مفہوم درج کیا۔

5 جولائی: اجمل سے معلوم ہوا کہ مراد بخش مری (محمد بھابھا) کے لیے لیڈران نے کہلا بھیجا ہے کہ جلد از جلد واپس آجائیں۔ یہ ہمارا بہت بڑا دردِ سر تھا۔ یہ ہمارے اس خط کا اثر ہے جو ہم نے ولی خان کو بھیجا تھا۔

مہر اللہ مینگل، میر گوہر خان زرکزئی، میر اکرم، مراد بزنجو وغیرہ کے لیے ماہوار 54 ہزار افغانی درکار ہیں۔ 25 ہزار افغانی حکومت فراہم کرتی ہے اور باقی ماندہ کا انتظام ہمارے ذمہ ہے۔ شائد ولی خان کی طرف سے ہدایت مل گئی ہے کہ ہر قیمت پر ان کو خوش رکھا جائے۔

منظور بلوچ کے بارے میں کہا گیا کہ قادر بخش نظامانی کے پاس لندن چلا جائے۔ یہی معلومات ہمارے پاس نہیں تھیں۔ انھی باتوں کے دوران جمال ڈاک لے آیا جس میں نظامانی کی طرف سے منظور کے لیے خط تھا۔ جب ہم نے کھولا تو واقعی نظامانی کو لندن جانے کے لیے خط لکھا تھا۔

بلوچ واقعی بہت عجیب لوگ ہیں۔ اعتماد کرنا مشکل ہے۔ اگر وہ اپنا رفیق بن جائے، تب بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ یہی ہمارا تجربہ ہے۔ اس لیے آج کے بعد سے ہم تمام بلوچوں کو ایک ہی کھاتے میں ڈالیں گے۔ جب تک مولانا (امام علی نازش) کی طرف سے واضح ہدایات نہیں آتیں، ہم بلوچوں میں تفریق نہیں کریں گے۔

اگر ان کے لیڈروں یعنی عبدالواحد کرد وغیرہ یا یہاں گوہر خان اور مہر اللہ کی مرضی ہوتی تو یہ لوگ کبھی بھی اسلحہ نہ لے جاتے۔ یہ ساری مدد ہم ہی کرتے ہیں۔ اس کے باوجود منظور اور خیر جان نہیں مانتے۔ خیر جان کی واپسی کا ارادہ تھا، مگر جب گوہر خان وغیرہ کے یہاں رہنے کے بارے میں سنا تو موصوف نے بھی رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ بھی سرداروں کی نقل کرتا ہے۔ سردار نہیں اور اپنے آپ کو سرداروں کا مخالف سمجھتا ہے مگر اپنی 'سرداری' دوسرے طریقے سے بناتا ہے۔

7 جولائی: مراد بزنجو نے فون کر کے کہا کہ جو پیسے ہمارے لیے مقرر کیے گئے ہیں، وہ ادا کیے جائیں۔ یہ بھی اضافہ کیا کہ منظور پاس بیٹھا ہے اور کہتا ہے کہ میرا پوچھتے بھی نہیں اور میری طرف آتے بھی نہیں۔ میں نے کہا کہ اگر ہم نہیں پوچھتے تو کچھ جواز بھی ہے یعنی مصروفیات۔ لیکن جب موصوف گلے شکوے کرتے ہیں تو تقریباً مہینہ ہوا کہ ہمارے گھر سے میکروریان منتقل ہوا ہے، اس کے بعد کبھی پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ گویا ہمیں بھول ہی گیا۔

8 جولائی: گل محمد ہوت مشرق وسطیٰ اور خلیج کے دورے کے بعد واپس کابل پہنچ گیا۔ موصوف

بیروت بھی گیا تھا۔ کہتا ہے کہ 5 مئی کو کراچی سے نکلا تھا اور کہتا ہے کہ عرب ممالک میں پاکستان کے خلاف پروپیگنڈا نہیں ہوتا۔ وہاں ہمارے مسائل کی وضاحت اور تبلیغ کی ضرورت ہے۔ دوسری طرف منظور نے لندن میں نظامانی کو آنے کے علاوہ یہ بھی لکھا ہے کہ کون کون لوگ کابل آئے ہیں۔

10 جولائی: بھابھا نے شکایت کی ہے کہ صوفی، بسم اللہ کاکڑ، منظور، عبدالحق علوی یا اجمل اور یاسب کے سب نے کہا ہے کہ مراد دراصل محمد بھابھا ہے اور اُس پر نظر رکھنی چاہیے۔ یہ باتیں وہ منظور کا حوالہ دے کر کرتا ہے جو مبینہ طور پر منظور نے کسی سے کہیں ہیں۔ عجیب ہی معاملہ ہے۔ مراد بھابھا ہے یا کوئی اور۔ ہمیں معلوم ہے۔ ایسی باتیں منظور نے کہی ہونگی اور یقینی طور پر کی ہوں گی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ منظور خود کس لباس میں اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے اور اس طرح وہ دوسرے بلوچوں (سرداران) کی نظر میں بھی برا معلوم ہوگا۔ وہ ہمارے کاموں میں بے جا مداخلت کرتا ہے اور مفت میں ہمیں افشا کرتا ہے۔ یہ ہمیں دنیا پر ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ ہم کون ہیں۔

20 جولائی: معلوم ہوا ہے، کہ منظور اور خیر جان اپنے ہی ساتھی ہیں۔

24 جولائی: خیر جان وغیرہ آئے، کہنے لگے کہ پیسے ختم ہو چکے ہیں اور ساتھ ہی مزید پیسوں کا مطالبہ کیا۔ عجیب بات ہے۔ رواں ماہ میں ان کو گھر کے خرچ کے لیے 12 ہزار افغانی دیے گئے، جب کہ محض دس ہزار منظور ہوئے تھے۔ یعنی یکم جولائی کو تین ہزار، سات کو تین ہزار اور نو (9) کو خیر جان کے آنے پر چھ ہزار دیے گئے۔ انہیں فیصلے کے مطابق خرچ کرنا چاہیے، افغان حکومت بہر حال ہمیں مقرر شدہ پیسے دیتی ہے۔

نازش نے لکھ بھیجا تھا کہ مراد بزنجو، منظور، کچکی اور خیر جان اپنے لوگ ہیں۔ ان کو ہم نے بلایا اور کہا کہ آپ لوگ ہمارے ساتھی ہیں۔ ابھی تک جو احتیاط اور کچھ غلط فہمیاں ہوئیں، وہ ہماری لاعلمی اور ڈسپلن کے تقاضوں کے تحت تھیں۔ اب ہمیں ساتھی بن کر بات کرنا ہوگی۔ اس کی سخت ضرورت ہے کہ ہم آپس میں بحث مباحثہ کریں، تنقید اور خود تنقیدی کے عمل سے گزریں اور فکر و عمل کریں:

۱۔ یہ جنگ آخر کار ہمارے کاندھوں پر آن پڑی ہے، کوئی خان، نواب یا سردار اسے آگے نہیں لے جا سکتا۔

۲۔ ہمیں تنظیم بنانا اور نظریہ پر مضبوط ہونا چاہیے۔

۳۔ اب اتحاد کی ضرورت ہے۔ بلوچوں کا متحدہ محاذ اور پختون بلوچ یونٹی کو نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔

۴۔ اس کے بعد ایجنڈا بناؤں گا اور بحث مباحثہ کیا کریں گے۔

خیر جان نے ایک عجیب واقعہ بیان کیا۔ تقریباً ڈیڑھ ماہ پہلے 13 جون کو جب اجمل، گوہر خان اور مہر اللہ کے ہمراہ بلوچوں کے مسائل حل کرنے کے لیے قندھار گئے تو اسی دن چینی سفارتخانے کا ایک سفارت کار، جو روانی سے پشتو بولتا تھا، اپنی سفارتی گاڑی میں قندھار گیا۔ گوہر خان کے ڈرائیور نے بتایا کہ یہی چینی سفارت کار آیا اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ 'آپ کے ساتھ کون کون آئے ہیں؟ بلوچ کمانڈران تو نہیں؟ ان کے نام کیا ہیں اور کس لیے آئے ہیں۔ حکومت انہیں کتنے پیسے اور کیا مراعات دیتی ہے اور کون سا اسلحہ لے کر جاتے ہیں؟ وغیرہ۔

ڈرائیور نے جواب دیا، کہ تم تو ایسے سوالات کر رہے ہو گویا پاکستانی ہو یا پاکستانی ایجنٹ۔ کہا جاتا ہے کہ یہی سفارت کار پھر قندھار ہوٹل گیا، جہاں گوہر خان وغیرہ رہائش پذیر تھے۔ اس نے مینیجر سے مہمانوں کی فہرست طلب کی اور اسے پڑھنا شروع کیا۔ ڈرائیور کا کہنا ہے کہ اس اثنا میں، میں بھی وہاں پہنچ گیا اور میں نے مینیجر کو خبردار کیا اور اس نے فہرست واپس لے لی اور اسے ہوٹل سے نکالا۔ گوہر خان زرکزئی نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے۔ موصوف کا کہنا ہے کہ پھر وہ میرے پاس آیا اور مجھ سے پیسوں کے بارے میں پوچھا، جو افغانستان ہمیں دیتا ہے۔ اتنی دیدہ دلیری؟ اور پھر گوہر خان کی عقل کو سلام، کہ ابھی تک یہ بات کسی کو نہیں بتائی۔

31 جولائی: ہم نے بلوچوں کے لیے 54 ہزار افغانی کا انتظام کیا۔ 25 ہزار جمع 4 ہزار گھر کا کرایہ وزارت سرحدات سے اور پانچ ہزار پاکستانی روپے اپنے کھاتے سے۔ 25 ہزار پر میر گوہر خان نے دستخط کیے اور پانچ ہزار پر میں نے۔ اصل میں چار ہزار ہونے چاہیے تھے، مگر خزانچی نے غلطی سے پانچ ہزار لکھ دیے۔ چوں کہ یہی ہندسہ کتاب سے کاٹنے سے شکوک پیدا ہوتے تو ڈپٹی منسٹر نے ویسے ہی رہنے دیا اور ہزار کو میرے کھاتے میں ڈال دیا۔ دستخط کی یہ ڈیوٹی تورلالی کی تھی، مگر وہ آج جلال آباد چلے گئے تھے تو مجبوراً مجھے دستخط کرنے پڑے۔

یکم اگست: میر اکرم نے اپنے مقرر شدہ پانچ ہزار افغانی میر گوہر خان کے ہاتھ واپس بھجوا دیے۔ موصوف ناراض ہے اور یہ پیسے اُسے بہت کم معلوم ہوتے ہیں۔

2 اگست: جمال خان جٹ آف قرہ باغ غزنی کو، جو چند ماہ پہلے جیل سے بھاگا تھا اور بہت

مقدمات میں ماخوذ ہے، حکومت پاکستان نے کوئٹہ میں جگہ دی ہے۔ موصوف کے بھائی کا اس کے پاس آنا جانا رہتا ہے۔ مری بگٹی ایریا میں حکومت پاکستان ایک منصوبے کے تحت افغان مہاجرین کو زمینیں دے رہی ہے۔ جمال خان کا بھائی آتا ہے، لوگوں کو لے جاتا ہے اور وہاں پر ان کو بسانے میں مدد دیتا ہے۔ بلوچ کہتے ہیں کہ یہ زمین ہماری ہے، حکومت اسے پختونوں کو کیوں دیتی ہے۔ اس کا مقصد پختون بلوچ، بلوچ افغان اتحاد میں نفاق ڈالنا اور توڑنا ہے۔

خیر جان دس اگست کو واپس جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ایک کیمرہ اور ایک ٹیپ ریکارڈر مجھ سے مانگ رہا ہے (میں یہاں پر پیسوں اور مطالبات کا قصہ اس لیے نہیں کرتا کہ کسی کی سبکی ہو اور میں اس طرح لکھنے سے اپنے آپ کو حقیر کروں۔ یہ اس لیے لکھا کہ پختون اس سے سبق حاصل کریں۔ اپنے اور افغانستان کے نحیف وضعیف کاندھے ان کو معلوم ہو جائیں۔)

7 اگست: پرسوں یعنی پانچ تاریخ کو خیر جان اور میں وزارت سرحدات کے ڈپٹی منسٹر عبدالہادی مکمل کے دفتر اس مقصد کے لیے گئے کہ خیر جان بمعہ اپنے ساتھیوں کے واپس جانے والا ہے۔ اسے کپڑے خریدنے کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی۔ پانچ ہزار افغانی خیر جان کو دیے گئے اور ساتھ یہ بھی کہا گیا، کہ چوں کہ خیر جان واپس جانے والے ہیں تو کیوں نہ اُن کو قرغہ میں دعوت دی جائے۔ کل چھ آدمی ہوں گے۔ وزارت مالیہ کے بجٹ ڈائریکٹر محراب الدین پکتیاوال بھی آجائیں گے۔ ہم نے دعوت قبول کی اور 5 اگست کی شام کو دعوت قرار پائی۔ 5 بجے مکمل صاحب ہمارے گھر آئے تو اعظم اور حاجی نادر خان کو بھی مدعو کر لیا۔ ہم یعنی خیر جان، منظور، اسلم لچکی، ڈاکٹر پکتیاوال، ڈپٹی منسٹر اور ڈاگئی گاؤں کے شہباز خان اور میں چل دیے۔ راستے میں مکمل صاحب نے اپنے بھانجے ڈاکٹر شکور کو بھی ساتھ بٹھا لیا، جو پل سرخ کے قریب رہتا ہے اور ننگرہار میڈیکل کالج میں استاد ہے۔

پہلے پغمان گئے اور پھر قرغہ آ گئے۔ مکمل صاحب نے چھ آدمیوں کا آرڈر دیا تھا، پھر آرڈر کو بڑھا دیا اور پینے پلانے کا سامان بھی منگوا لیا۔ ساروں نے حصہ لیا۔ شہباز خان اور میں ایک طرف بیٹھے کھانا کھاتے رہے۔ اس اثنا میں حاجی نادر خان، اعظم خان ہوتی، وکیل نیک محمد، اجمل اور تورلالی پہنچ گئے۔ پینے والوں نے خوب پیا اور ہم نے کھانے سے انصاف کیا۔ شب تقریباً دس بجے واپسی ہوئی۔ مکمل صاحب اپنی موٹر میں، اعظم خان اور نیک محمد، حاجی نادر خان کی موٹر میں

بیٹھ گئے۔ اجمل اپنی کار میں اور میں پکتیاوال کے ہمراہ اُن کی کار میں بیٹھ گیا۔ میرے کوٹ کی جیب میں کمرے کی چابی تھی، جو مکمل صاحب کے موٹر میں رہ گیا تھا۔ ہم نے مکمل صاحب کی گاڑی بلوچوں کے لیے چھوڑی، چوں کہ وہ میکروریان جانے والے تھے۔ مگر یہ نر کے بچے گھروں کی بجائے دوسری طرف ہولیے۔ صبح میں نے فون کیا کہ میرا کوٹ مجھے پہنچایا جائے تو مکمل صاحب کی بیوی نے تشویش ظاہر کی کہ اس کا شوہر تو اب تک گھر نہیں لوٹا۔ اس پر ہمیں بھی کافی تشویش ہوئی۔ پھر میر گوہر خان اور مراد بزنجو آگئے۔ گوہر خان کہنے لگا کہ آپ لوگوں نے بلوچوں کو ایک سازش تحت گم کیا۔ ہمارا خیال تھا کہ شائد زیادہ پینے پر یہ سب قرغہ میں ہی سو گئے ہوں گے، تاہم جب پکتیاوال صاحب نے قرغہ کے سپوگمئی ریسٹورنٹ فون کیا تو انھوں نے کہا کہ رات کابل ادا کرنے کے بعد وہ اسی وقت چلے گئے تھے۔

مکمل صاحب کی بیوی کو جو بھی فون کرتا، وہ بے چاری کوئی نہ کوئی بہانہ تراشتی، کیوں کہ اسے اپنے شوہر کی عادت کا علم تھا۔ سارا دن تشویش میں گزرا اور گوہر خان فون پر فون کرتا رہا اور یہی دہراتا تھا کہ خیر جان کو آپ نے سازش کے تحت کہیں چھپا دیا ہے۔ کبھی نجیب کے گھر جاتا اور اسے کہتا کہ جلدی خیر جان کو ڈھونڈ نکالو، کیوں کہ اسے خیر جان اور ڈاکٹر نجیب کے باہمی تعلقات کا علم تھا۔ یہ تعلقات گوہر خان کے علم میں کیسے آئے، اس بات نے ہماری تشویش میں اضافہ کیا۔ ہم سب پریشان رہے اور حکومت کے کارندے بھی بہت ناراض ہیں۔ اجمل متواتر مکمل صاحب کو میرے سامنے برا بھلا کہتے رہے اور بالواسطہ مجھے سنا رہے تھے، کیوں کہ پروگرام تو میں نے ہی بنایا تھا۔ میں کیا کرتا، میں تو خیر جان کی رفاقت میں صرف دعوت قبول کرنے کا مجرم تھا۔ الغرض سارا دن غصہ مجھ پر جھاڑتے رہے۔

6 اگست: رات ہم قوماندان گارد (جمہوریہ کے گارڈ کے کمانڈر) ضیاء مجید کے گھر گئے۔ وہ صبح ماسکو یاترا پر جانے والے تھے، اس کے جانے کی خوشی میں دعوت تھی۔ حکومت میں حاکم مرکزی کمیٹی کے بائیں بازو والے ساتھی بھی موجود تھے، جن میں وزیر زراعت جیلانی باختری بھی تھے۔ سب مجھے ملامت کرتے رہے اور کہتے تھے کہ یہ تو میری ذمہ داری تھی کہ میں سب پر نظر رکھوں۔ اتنے میں وزیر داخلہ فیض محمد خان محسود نے کندوز فون کیا اور ڈپٹی منسٹر صاحب وہاں سے برآمد کر لیے گئے۔ چوں کہ سب نشے میں تھے تو راستے میں گھروں کے بجائے یہ سالنگ سے ہوتے

ہوئے خنجان پہنچ گئے۔ وہاں پر چرس کے دم لگے اور اپنے آپ کو کندوز کے صحراؤں تک پہنچا کر دم لیا۔ کندوز کا گورنر اپنا دوست تھا اور وہاں پر دنیا و مافیہا سے بے خبر لیٹ گئے۔ وزیر داخلہ نے کندوز پولیس کمانڈر کو حکم دیا کہ راتوں رات انھیں رخصت کیا جائے۔ اس طرح آج صبح مکمل صاحب نے فون پر بتایا کہ ہم آگئے ہیں۔

عجیب ڈپٹی منسٹر بلکہ ایکٹنگ وزیر ہیں کہ گھر اور دفتر بغیر پوچھے اور بتائے چھوڑ کر ویرانوں کا راستہ لیا۔ اگر صدر داؤد کو بھنک بھی مل جائے تو موصوف فوری طور پر برطرف ہو سکتے تھے۔ پھر ساتھی کہیں گے کہ چوں کہ لیفٹسٹ تھا، اس لیے ہٹا دیا گیا۔ پھر خیر جان وغیرہ پر آفرین، دس تاریخ کو رخصت ہونے والے ہیں اور یہ غیر ذمہ داری۔ دوسری طرف گوہر خان وغیرہ اس پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں کہ چھوٹے سے سوراخ کو پورا غار بتا اور بنا کر دم لیں۔ انھیں نہ ساتھیوں، خیر جان اور نہ مقصد سے کوئی غرض۔ صرف ہماری بدنامی پر خوشی منانا ہے۔

14 اگست 1976ء: [نازش کے نام خط]

آپ کو بلوچ محاذ، افغانستان کی سیاسی صورتحال، اور ہماری مشکلات کا پتا چل چکا ہوگا۔ اس سلسلے میں یہاں موجود بلوچستان کے تمام کمانڈر ناراض ہیں۔ وہ نیپ کے لیڈروں سے بیزار، افغانستان سے مایوس اور نتیجتاً ہم سے بھی ناراض ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ان کے محاذوں کے مطابق ان کی مادی ضروریات پوری نہیں کر سکتے۔ مراد بزنجو اور اسلم گچکی بھی کافی مایوس ہیں اور بغیر کسی صلاح مشورے کے واپس جانے کی فکر میں ہیں۔ اس کے نتائج تحریک کے لیے کافی برے ثابت ہو سکتے ہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے، کہ چوں کہ بلوچستان میں ہر طرح کے ہاتھ موجود ہیں تو ہمیں ڈر ہے کہ وہ کہیں کسی کے 'ہاتھ' کا شکار نہ ہو جائیں۔

اس لیے ہم چاہتے ہیں، اور انہیں ہم نے اسی امید پر روک رکھا ہے کہ آپ ساتھیوں کی طرف سے، بہت جلد کوئی بااعتماد ساتھی آ کر ان کی مشکلات سے متعلق ان سے بات کرے گا اور مشورے کے نتیجے میں فیصلہ ہو۔

ابھی تک وہ خرچ لینے سے انکار کرتے رہے ہیں۔ ہم ان کو گزارے کے لیے ہر جگہ سے خرچ فراہم کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ابھی تک آپ کے انتظار میں ہیں۔ مگر آپ کی طرف سے کوئی بھی نہیں آیا۔ اس لیے آپ جلدی کسی کو روانہ کریں یا ان کی تسلی کے لیے کوئی پیغام بھیجیں۔

وگرنہ ان کو روکنے کے لیے ہمارے تمام حربے ناکام ثابت ہوں گے۔"

کل جمعہ کا دن ہے اور ہمیں لوگر میں 'مس عینک (عینک تانبے کی کان)' کو مدعو ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں میں نے میر گوہر خان کو فون کیا کہ آیا ہم آپ کی طرف سے بھی اس دعوت کو قبول کریں؟ موصوف نے جواب دیا کہ ہم باہمی مشورہ کر کے جواب دیں گے۔ پھر فون کیا کہ ہم دعوتوں میں نہیں جاتے۔ یہ جواب اس نوعیت کا تھا جس میں گلہ، شکوہ، احتجاج اور ناراضگی صاف معلوم ہوتی تھی اور اس کی وجہ معین سرحدات (ڈپٹی منسٹر سرحدات) کے ساتھ گم ہو جانے کا واقعہ ہے۔ یہ لوگ ویسے ہی بہانے تراشتے ہیں۔

18 اگست: آج میر گوہر خان کے گھر رات کی دعوت تھی۔

23 اگست: کل خیر جان اپنے ساتھیوں کے ہمراہ واپس جانے والا ہے۔ میں نے اسے پندرہ ہزار افغانی راستے کا خرچ اور تین ہزار کیمرہ اور ریڈیو خریدنے کے لیے دیے۔ ایک دوربین بھی آمر کشف عبدالحق سے لے کر اسے دی۔

یکم ستمبر: کل پغمان میں وزارت زراعت کے زراعتی فارم میں گوہر خان زرکزئی اور مہراللہ مینگل کی طرف سے دعوت ترتیب دی گئی تھی جس میں خوب 'بجی' پکی۔ اجمل کے لیے سب نے انتظار کیا، لیکن وہ ضروری کام کی وجہ سے دعوت میں شرکت نہ کر سکے۔ بلوچوں نے اس بات کا بہت برا منایا۔ اس دعوت میں مریوں کے محاذ سے تعلقدار، ایک فرانسیسی بائیں بازو کے ایک دانشور 'ژاں پیئر وینو Jean Pierre Viennot' نے بھی شرکت کی۔ [یہ بعد میں مریوں کے ساتھ بلوچستان کے پہاڑوں پر رہا اور پیٹ کی بیماری میں مبتلا ہو کر مرا۔]

آج کچلاک سے ملک عبدالعلی کاکڑ جو بلوچوں سے قریبی روابط رکھتے ہیں، کابل آ گیا اور یہ اطلاع بھی دی کہ گذشتہ ماہ گوریلاؤں نے سارا وان میں دو جیٹ طیارے مار گرائے۔ اسلم کچکی فوج کی طرف سے محاصرہ میں آ گیا، مگر اس نے جوابی کارروائی سے محاصرہ توڑ دیا اور آٹھ فوجیوں کو مار دیا۔ یہاں سے جو پچاس مری واپس گئے تھے انہیں کیمپ پہنچتے ہی فوج سے سامنا ہوا۔ ان کے پاس صرف بیس بندوقیں تھیں۔ انہوں نے مقابلہ کیا اور چند فوجیوں کو بھی مار دیا۔ آٹھ راشن کی فوجی گاڑیاں آر سی ڈی شاہراہ اور دیگر راستوں پر لوٹ لی گئیں۔ اسی طرح ایک اور جھڑپ میں آٹھ فوجی مارے گئے۔ دوسری جھڑپ میں تلی تنگی کے علاقے میں ستر سپاہی مار دیے گئے۔

8 ستمبر: ژاں پیئر وینو ہمارے گھر آئے۔ اس کے ساتھ خارجی دوستوں کے ساتھ تعلقات رکھنے اور مربوط بنانے کے متعلق گفتگو اور فیصلے ہوئے۔ یہ بھی فیصلہ ہوا کہ موصوف تین ماہ میں کوئی ایک کتاب یا پمفلٹ کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کریں گے اور اسے کسی نہ کسی قلمی نام سے شائع کرائیں گے۔ وینو ہمارے ساتھ رابطہ میں رہے گا۔ پرسوں یہ بھارت جانے والے ہیں اور پھر واپس کابل آئیں گے۔

میں سفیر عراق مقیم کابل سے ملنے گیا اور اس سے 3500 روپے گل محمد ہوت کے لیے کرائے کے مانگے۔ سفیر صاحب نے معذرت کی کہ بقول موصوف اسے اپنی حکومت کی طرف سے ہوت کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں۔

23 ستمبر: کل 23 بلوچ (مینگل) پیدل سپین بولدک آئے ہیں۔ صدر صاحب کہتے ہیں پیسے دوں گا اور نہ اسلحہ، واپس بھجوا دیے جائیں۔ مگر ہمارے تو گلے پڑ گئے ہیں، کھائیں گے کہاں سے اور راشن کہاں سے لائیں۔ صدر صاحب بیزار ہیں۔ داخلی دباؤ اور خارجی حالات موافق نہیں۔ اُنھیں نیپ کے لیڈران اور خاص طور پر ولی خان جھوٹے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر بیچ میں ہم پس رہے ہیں۔

5 اکتوبر: میر سفر خان زرکزئی، آغا سلیمان اور میر ہزار خان بمعہ 42 بندوں کے پرسوں قندھار پہنچ گئے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ کابل آئیں اور ان کی مدد کی جائے۔ یہاں پر حکومت مدد دیتی ہے اور نہ چاہتی ہے کہ یہ لوگ کابل آئیں۔ ان کو صرف سپین بولدک سے قندھار تک آنے کی اجازت دی ہے۔ یہ لوگ شوراوک کے راستے آئے ہیں اور ناراض ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم واپس جاتے ہیں اور یہ ناراضی بھی ہمارے سر آتی ہے۔ ہم انہیں یہ کیسے سمجھائیں کہ حکومت کی پالیسی تبدیل ہو چکی ہے۔ بہت پیچیدہ مسئلہ ہے۔ کابل میں بھی بلوچ لیڈران ناراض ہیں اور واپس جانے کے لیے پر تول رہے ہیں۔

6 اکتوبر: عیدالفطر کی مناسبت سے صدر داؤد نے مبارکباد کے پیغام میں پختونستانی بھائیوں کا ذکر کیا اور بلوچوں کا نام نہیں لیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پالیسی تبدیل ہو چکی ہے، خصوصاً بلوچوں کے لیے۔ شائد ایران سے بلوچستان پر سودابازی ہو چکی ہے۔

12 اکتوبر: میں قندھار گیا، جہاں پر میر ہزار مری، میر سفر خان، آغا سلیمان بلوچ گوریلاؤں

کے ساتھ آئے تھے اور مقصد یہی ہے، کہ ان کی مدد کی جائے۔ افغان حکومت نے مدد سے ہاتھ کھینچا ہوا ہے۔ اسی سلسلہ میں اجمل بھی یہاں آئے تھے اور ان سے بات چیت کے بعد صدر داؤد سے ملاقات بھی کی۔ میرے آج کے دورے کا مقصد یہی ہے کہ صدر داؤد صاحب کا جواب جو اجمل خٹک نے خط کی صورت میں درج کیا ہے ان تک پہنچاؤں۔

13 اکتوبر: مراد بزنجو کہتے ہیں کہ آغا سلیمان اور میر سفر خان کو عطاء اللہ مینگل نے بتایا تھا کہ افغانستان نہ جائیں۔ صرف میر ہزار خان کو خیر بخش کی طرف سے اجازت تھی کہ آجائیں اور کیمپوں میں پڑے مہاجرین کی دیکھ بھال کا کام سنبھالیں۔ مراد کہتا ہے کہ آغا سلیمان چاہتا تھا کہ کابل آکر خارجی دنیا کے سفراء اور سفارت کار عملے سے ملے، اپنی حالت سے ان کو آگاہ کرے اور افغان حکومت کے عدم تعاون کی شکایت کرے۔ مگر مراد بزنجو کہتا ہے کہ یہ کون ہوتا ہے ایسی باتیں کرنے والا۔

دوسری طرف میر سفر خان نے مجھ سے جھوٹ بولا کہ اسے سردار عطاء اللہ مینگل نے اس مقصد کے لیے بھیجا ہے کہ صدر داؤد ڈر گئے ہیں، ان سے ملوں اور مہر اللہ وغیرہ کی حالت زار بھی دیکھ لوں۔ وہ چاہتا تھا کہ مجھ سے اس موضوع پر کہ حکومت افغانستان کی پالیسی کیوں تبدیل ہوئی، بات کرے۔ میں اس حوالے سے کچھ کہنا نہیں چاہتا تھا، اس کے پیہم اصرار پر اتنا ہی کہا کہ مجھے بالکل درست طور پر کوئی اطلاع نہیں۔ ہم صرف قیاس آرائی کر سکتے ہیں، کہ ایران، اپنے خاندان یا کسی اور طرف سے دباؤ ہو۔ اصل وجہ مجھے نہیں معلوم ہے۔ جہاں تک افغانستان کے موجودہ رویے کا تعلق ہے تو یہی رویہ پختونوں کے ساتھ بھی روا رکھا جا رہا ہے۔ ہم نے قبائل اور نیچے کے پختون علاقوں میں تنظیم سازی کی، لوگوں کو آمادہ کیا، افغان حکومت کی تسلی کی بنیاد پر لوگوں سے وعدے وعید کیے، مگر اب سب کچھ اچانک اپنی جگہ تھم گیا ہے۔ لوگ اب ہمیں گالیاں دے رہے ہیں۔ اب ہمیں دھماکہ خیز مواد تک نہیں دیا جا رہا۔

سفر خان نے کہا کہ باقی باتیں رات کو کریں گے۔ رات میں دیر سے آیا تو اس سے بات نہ ہو سکی۔ اب صبح میں علی خان اور نعیم واپس کابل جانے والے ہیں۔ میر گوہر خان چند ہی دنوں میں ان کے ساتھ واپس جانے والا ہے۔ آج اپنے بیٹے شاہ بیگ اور ساتھیوں کو لینے اور اجمل سے اجازت لینے کابل روانہ ہوا۔

مراد کہتا ہے جو سامان گیا تھا اور میر سفر خان لے گیا تھا، زیادہ تر حصہ آپس میں تقسیم کیا گیا۔ یعنی 26 ہزار کارتوس آغا سلیمان کو دیے اور میر ہزار کا حصہ 55 ہزار کارتوسوں میں سے صرف 15 ہزار اسے ملے۔

جہاں تک خیر جان کا تعلق ہے تو اس نے اپنا کام خود کیا تھا اور دوسرے دورے میں کام پورا کیا۔ اس کے باوجود کہ میر اکرم نے اسے کچھ نہ دینے کا حکم دیا تھا، مگر شوراوک کیمپ میں شائستہ خان کے بھانجے افضل نے اسے دوسری کھیپ بھی دے دی تھی۔[9]

14 اکتوبر: واپس کابل پہنچ گیا اور میر گوہر خان کل جانے والے ہیں۔

15 اکتوبر: میر گوہر خان کو رخصت کیا۔ موصوف اس لیے آئے تھے کہ یہاں رہیں اور اپنے محاذوں سے رابطہ رکھیں اور ان کی مدد کریں۔ مگر اب واپس جانے کا فیصلہ اس لیے کیا کہ موصوف کا بھائی میر سفر خان آیا اور اسے افغان حکومت کی طرف سے حالیہ سلوک اور حالت کا علم ہوا تو اس نے سفر خان کے ہمراہ ہی واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ موصوف حکومت سے ناراض جا رہا ہے اور واپس جانے کا وقت مقرر نہیں کیا۔

اگست اور ستمبر کے مہینوں کے لیے بلوچستان کے واقعات کی رپورٹ درج ذیل ہے:

۱۔ ساراوان میں جوہان کیمپ پر حملہ۔ مرنے اور زخمی ہونے والوں کے بارے میں معلومات نہیں۔

۲۔ چشمہ چمن میں کیمپ پر حملہ، ایک مخالف زخمی۔

۳۔ مری گوریلاؤں نے ریل گاڑی پر حملہ کیا، جس کے نتیجے میں فوج نے مریوں کا تعاقب کیا، گھات میں بیٹھے مریوں نے 60 سے 70 فوجی مار دیے۔

۴۔ چور (جھالاوان) میں دو فوجی گاڑیوں پر حملہ، 40 مار دیے گئے اور بیس زخمی ہوئے۔ جنگی ہیلی کاپٹروں کی آمد کی وجہ سے سامان نہیں لوٹا جا سکا۔

۵۔ انجیر (جھالاوان) میں کیمپ پر حملہ، رات کی تاریکی کی وجہ سے مارے جانے والوں کی درست تعداد معلوم نہیں۔

26 اکتوبر: آج اجمل نے عجیب بات کہی کہ مراد (بھابھا) نے اسے اطلاع دی ہے کہ بلوچ مبارزین میں ایرانی ساواک کے افراد شامل ہو چکے ہیں۔ اس سلسلہ میں میر سفر خان اور آغا سلیمان نے ابھی ابھی خیر جان پر دوسری بار حملہ کیا ہے اور اس کا ایک ساتھی مار دیا ہے۔ ہو سکتا

ہے صدر داؤد نے یہ بات محسوس کی ہو اور بلوچوں کے بارے میں اپنے رویے پر نظرِ ثانی کی ہو۔ کیوں کہ یہ بات بہرحال انتہائی تشویشناک ہے۔

27 اکتوبر: میں نے اپنے دستخط سے مہر اللہ مینگل، میر اکرم اور مراد بزنجو کے پیسے لا کر دیے۔ گل محمد ہوت کو اپنے گھر کے خرچہ سے ایک ہزار افغانی دے دیے۔

9 دسمبر: کل گل محمد ہوت کے بھارت جانے کا فیصلہ ہوا ہے۔ آج میں نے ہوت اور اپنی تصاویر اجمل کے تعارفی خط کے ساتھ ہندوستانی رابطہ کار کے حوالے کیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مجھے بھی دہلی جانا پڑے گا۔

20 دسمبر: آج سارا دن میں نے گل محمد ہوت کے لیے پاسپورٹ، ٹکٹ اور خروجی ویزہ لینے میں صرف کیا۔

21 دسمبر: ہوت رخصت ہو گیا۔ موصوف کو دس ہزار روپے ٹکٹ اور 1230 راستے کے خرچ کے طور پر دیے گئے۔ ہوت پہلے استنبول، پھر بیروت، پھر دوبئی اور آخر میں بھارت جائے گا۔

یکم جنوری 1976: مراد بزنجو بھی رخصت ہو گئے۔ وہ بھی ناراض ہی واپس گیا۔ مراد کی کمر میں تکلیف تھی، وہ چاہتا تھا کہ علاج کے لیے باہر چلا جائے، مگر صدر داؤد نے اجازت نہ دی۔ دوسری طرف سیاسی وجوہ بھی تھیں یعنی ہماری تحریک سے مادی مدد ملنے کا معاملہ بھی کھٹائی میں پڑا تھا تو مراد اچھا خاصا نامراد ہو کر چلا گیا۔

رات ذوالفقار علی بھٹو نے بلوچستان کے جام غلام قادر کی کٹھ پتلی حکومت کو برطرف کر دیا اور گورنر راج کے نفاذ کا اعلان کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایران کے مشورہ سے بلوچستان میں ایک بڑے اور وسیع فوجی آپریشن کا ارادہ ہے اور بلوچستان کو بین الاقوامی سامراجی سازشوں کی آماج گاہ بنایا جا رہا ہے۔ [مراد بزنجو واپس آ گیا تھا یا گیا ہی نہیں تھا، میری ڈائری میں تفصیل نہیں ملتی۔ بہت سی باتیں اب بھول چکا ہوں۔]

11 اگست: آج نور محمد اچکزئی، مراد بزنجو، اسلم گچکی اور میں نے آپس میں بحث و مباحثہ کیا۔ یہ لوگ ناراض ہیں کہ افغان حکومت ہمارے ساتھ برا سلوک کر رہی ہے۔ مہمان کی حیثیت سے بھی ہمیں قبول نہیں کرتی۔ کھانا فراہم کرتی ہے نہ گھر۔ ساتھ ساتھ وہ اجمل سے بھی گلہ کرتے ہیں اور بے اعتمادی کا اظہار کرتے ہیں۔ مراد بزنجو بہت شاکی ہے۔ میں نے ان کو مندرجہ ذیل تجاویز دیں جو انہوں نے رد کر دیں:

۱۔ نور محمد، بسم اللہ کاکڑ، خیر جان، مراد بزنجو، اسلم گچکی اور میں کمیونسٹ پارٹی کا ایک گروپ بنائیں گے۔ محاذ کی مشکلات پر بحث کر کے فیصلے کریں گے۔

۲۔ پھر یہی فیصلے متفقہ طور پر اجمل کے سامنے رکھیں گے۔ اگر اس کے ساتھ اختلاف ہو تو بحث کریں گے اور اگر پھر بھی مطمئن نہ ہوئے تو اپنے نظریات پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی تک پہنچائیں گے۔

۳۔ کمیونسٹ پارٹی کا فیصلہ حتمی ہو گا اور سب کو وہ تسلیم کرنا ہو گا۔

۴۔ یہ گروپ صرف بلوچستان محاذ اور کمیونسٹ پارٹی تک محدود ہو گا۔ البتہ دیگر افراد جیسے میر اکرم اور میر ہزار وغیرہ کو یہ تاثر نہیں دیں گے بلکہ نیپ کی سطح پر اسلم اور مراد اُن کے ساتھ بحث کریں گے۔

یہ تجاویز انھوں نے اس لیے رد کر دیں کہ آخری فیصلہ اجمل کا ہی ہو گا اور ان پر تو اعتماد نہیں۔ مراد کہتا ہے کہ مجھے معلوم ہے کہ اجمل نیپ کی نمائندگی کرتا ہے اور نہ ہی کمیونسٹ پارٹی کی۔ ہمیں تو سمجھ ہی نہیں آتا کہ یہ حضرت کیا چیز ہیں۔ نازش کے جانے کے بعد میں سمجھا کہ رویہ بدل جائے گا کیوں کہ نازش نے اطمینان دلایا تھا کہ میں نے اجمل سے بات کر لی ہے۔ دس دنوں کے اندر پاسپورٹ دیا جائے گا، خرچہ بھی ملے گا اور باتیں بھی ہوں گی۔ نہ پاسپورٹ ملا نہ خرچہ۔ نازش نے یہ بھی بتایا تھا کہ اگر جولائی تک کوئی پاکستان سے پارٹی کی طرف سے نہیں آیا تو پھر آپ کی اپنی مرضی اور اپنا فیصلہ، رہنا چاہو تو رہو ورنہ چلے جاؤ۔ اسلم کا کہنا ہے کہ اجمل نیپ اور کمیونسٹ پارٹی نہیں بلکہ داؤد کی نمائندگی کرتا ہے۔

گویا ان سے جو بھی بات کی جائے اس کا آخری فیصلہ اجمل نے ہی کرنا ہے اور انھیں اجمل پر اعتماد نہیں رہا۔ تو چارہ کار کیا ہے؟ میں نے ان سے کہا آپ جو چاہیں فیصلہ کریں۔ نیپ کی طرف سے تو جواب نہیں آیا۔ اب اگر آپ اپنے طور پر جانا چاہتے ہیں تو چلے جائیں، مگر کم از کم اس کے لیے کمیونسٹ پارٹی سے مشورہ اور اس کی رضامندی تو لے لیں۔ کل اس کے نتائج جو بھی نکلیں اس کی ذمہ داری قبول کرنے والا کوئی تو ہو گا۔ اس بات کو انھوں نے تسلیم کیا اور کہا کہ میں اپنے ساتھیوں کو خط لکھوں کہ فوراً ایک آدمی افغانستان روانہ کریں، ہم دس پندرہ دن ادھر ہی ہیں۔

میر اکرم اور میر ہزار سے بات کریں گے۔ خط کے جواب میں کسی کے آنے کے منتظر رہیں گے۔ اگر ان کی طرف سے کوئی بھی آدمی یا جواب نہ آیا تو پھر واپس چلے جائیں گے (حالاں کہ یہ واضح تھا کہ اتنا جلد کمیونسٹ پارٹی کسی کو نہیں بھجوا سکتی تھی)۔ میں نے خرچے کے حوالے سے تسلی دی کہ جہاں سے ہو سکا اس کا انتظام کریں گے۔ کچھ پاکستان کی پارٹی سے لے لیں گے اور کچھ یہاں بندوبست کریں گے۔ لیکن انھوں نے یہ بات بھی تسلیم نہیں کی۔

شام کو حکیم لہڑی پہنچ گیا، پتا نہیں کیا لایا ہے۔ شاید نیپ کے لیڈران کی طرف سے اتھارٹی لایا ہوگا۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اجمل ہماری ملاقات صدر داؤد سے کرائیں، تاکہ صاف صاف بات ہو سکے۔ میں نے کہا مجھے نہیں معلوم کہ ایسا ممکن ہوگا یا نہیں اور اجمل اس کے لیے تیار ہوگا یا نہیں، لیکن اگر آپ اپنی بات داؤد کے کانوں تک پہنچانا چاہتے ہیں تو سب کچھ ایک خط میں لکھ دیں اور اس کے لیے ایسے بندے کا انتظام میں کردوں گا جو اسے داؤد تک پہنچا دے۔

نوٹ: حکیم لہڑی ایک معمہ ہے۔ موصوف بڑی مدت تک کابل میں رہا اور غوث بخش بزنجو کی نمائندگی کا دعویدار تھا۔ پینے کا بہت شوقین ہے۔ بہت سی ایسی حرکات کرتا رہا جو افغانستان کے تنگ ظرف معاشرے میں برداشت کرنا مشکل تھا۔ ہمارے ساتھ بھی کئی جھڑپیں ہوئیں۔ اس کا کوڈ نام 'جاوید' تھا۔ بلوچ پختونوں سے زیادہ فضول خرچ ہیں اور ان کو خوش رکھنا ایک مشکل کام ہے۔ جاوید دھتکارا گیا لیکن اب پھر آ گیا ہے۔

12 اگست: رات جب حکیم لہڑی پشاور سے براستہ تیراہ افغانستان آیا، نور محمد سے ملا۔ نور محمد کہتا ہے کہ موصوف کے پاس لازماً اتھارٹی ہوگی جو کہتا پھر رہا ہے کہ: 'میرے بعد کتنے ذلیل لوگ آ گئے۔ میں تو خراب تھا، مجھ سے سب نفرت کرتے تھے، مگر ان سب کو میں نے روک لیا تھا۔ اب پتا چل گیا ہوگا کہ کون کیا ہے'، سچ تو یہ ہے کہ یہ بات کچھ زیادہ غلط نہیں۔

آخر میں حکیم کی صدر داؤد سے ملاقات ہوئی تھی۔ ملاقات میں کیا ہوا؟ ہمیں معلوم نہ ہو سکا۔ مگر صدر صاحب نے فوری طور پر حکیم صاحب کو افغانستان سے باہر نکال دیا تھا۔

14 اگست: میں نے نازش کو بلوچوں کی ناراضی، حکومت افغانستان کا ان سے رویہ اور اپنی مشکلات کے بارے میں خط لکھ ڈالا۔ اسلم گچکی اور مراد بزنجو کے تحفظات کا بھی ذکر کیا۔ دیکھیے کیا جواب آتا ہے۔

8 ستمبر: آج میں نے مراد بزنجو اور اسلم گچکی کو یہ تجاویز دیں:

۱۔ آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ افغانستان کی سرحدات کے اندر یا باہر رہ سکتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں ہم آپ کے ساتھ ہزار افغانی فی نفر ماہوار یعنی کل 25 ہزار دیں گے۔

۲۔ آپ اپنے ساتھیوں سمیت افغانستان کے اندر تین کیمپوں میں سے کسی بھی کیمپ میں رہ سکتے ہیں۔ اس صورت میں ہم آپ کو کیمپ کے عام اخراجات کے علاوہ مناسب اضافی خرچ دے سکتے ہیں۔

۳۔ قندہار یا قلات میں اگر کوئی ایسا بڑا گھر ہو جس میں آپ ساتھیوں سمیت رہ سکتے ہیں تو اخراجات کی ذمہ داری ہماری ہوگی۔

۴۔ اگر شوراوک میں شائستہ خان وغیرہ کے ساتھ رہنا چاہیں تو خرچہ ہمارے ذمہ ہوگا۔

۵۔ آپ سب (میر اکرم، مراد، اسلم، شائستہ خان) اپنے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شوراوک میں رہنے کا فیصلہ کریں تو اس طرح بلوچستان کے ساتھ فعال رابطہ ہوگا۔ آپ سب کے لیے موجودہ 19 واں اپارٹمنٹ مشترکہ مہمان خانہ ہوگا۔ جب کسی کو کابل آنا ہوا تو وہ اس میں رہ سکے گا۔ لیکن مستقل قیام کی اجازت نہیں ہوگی۔

ان تجاویز میں اسلم کو پہلی تجویز پسند آئی۔ مگر مسئلہ پھر رابطے کا تھا تو موصوف نے کہا کہ شوراوک سے بہتر یہ ہے کہ اپنے ہی علاقے میں رہوں۔ اس میں بھی مسئلہ کابل کے ساتھ رابطے کا ہوگا تو اس لیے یہ تجویز عملی نہیں۔ البتہ ان میں تیسری تجویز یعنی 25 ہزار ماہوار خرچ پر اپنے ساتھیوں کے ساتھ قندہار میں رہوں اور کبھی کبھی کابل اکیلا یا چند ساتھیوں کے ساتھ آجایا کروں، عملی محسوس ہوتی ہے۔

مراد نے کہا کہ میں قندہار میں اسلم کے ساتھ رہ سکتا ہوں لیکن اس شرط پر کہ مجھے اپنا پورا خرچ بھی دیا جائے۔ اس کا کہنا ہے کہ میرا خرچہ کم از کم دس ہزار افغانی ماہانہ ہے۔ اس کی دلیل وہ یہ دیتا ہے کہ قبل ازیں اسے ہر ماہ پانچ ہزار کابل حکومت سے، تین ہزار اجمل سے ملتے تھے اور باقی وہ اپنی جیب سے پورے کر کے ماہانہ خرچ اٹھاتا رہا ہے۔ مراد کا موقف ہے کہ پانچ ہزار افغانی اس کے لیے ناکافی ہیں۔

میں نے جواب میں کہا کہ یہاں پر وزارتوں کے بڑے بڑے عہدیدار اور رئیس 4500

افغانی پر اپنے پورے خاندان کے ساتھ گزارہ کرتے ہیں، لیکن مراد کا کہنا ہے کہ وہ اکیلا بھی پانچ ہزار سے کم پر مہینہ نہیں گزار سکتا۔ یہ بھی کہا گیا کہ جلال آباد کیمپ میں ہمارے ساتھی گزارہ نہیں کرسکتے کیوں کہ ان کی عادات جدا ہیں، وہ تعلیم یافتہ ہیں اور ان کے خرچ خوراک جدا ہیں (حالاں کہ پختون زلمے کے نوجوان بہت حقیر جیب خرچ پر بہ خوشی گزارہ کررہے تھے)۔

یہ ہر قیمت پر کابل میں رہنا چاہتے ہیں لیکن کابل میں ایک اور گھر کرائے پر لینے کی اجازت نہیں۔ مراد کا خیال ہے کہ اصل میں اجمل نہیں چاہتا کہ ہم کابل میں رہیں، ورنہ ایک گھر کا انتظام کرنا بھلا اجمل کے لیے کیا مشکل ہے۔ اسلم کی تجویز پر میں کل اجمل سے بات کروں گا اور پرسوں ان کو جواب دوں گا۔ یہ کہتے ہیں کہ اگر ہماری معروضات قابل قبول نہ ہوں تو پھر ہم واپس جائیں گے۔

26 اکتوبر: آج میں اور نجیب کا بھائی احمد زے تورخم تک گئے۔ وہاں سے ہم دو لاکھ روپے جو بلوچ محاذ کے لیے مختص تھے اور ٹریڈ کمشنر اختر محمد خان نے نسیم بی بی کو دیے تھے، واپس لائے۔[۱۰]

یہ وہ مسائل اور مشکلات تھیں جن سے بلوچستان محاذ کے حوالے سے ہمیں واسطہ پڑا۔ اپنے لوٹے گئے گھر سے جو ڈائریاں میں بچا کر لا سکا، اس میں آخری ڈائری 10 جنوری 1977 کی ہے، جس میں لکھا ہے کہ خیر جان کابل پہنچ گیا۔ موصوف کے ساتھ بیس آدمی ہیں جو شوراوک میں شائستہ خان کے کیمپ میں ٹھہرائے گئے ہیں۔ اس مرتبہ یہ بندہ مطمئن نظر آرہا ہے۔ مصمم ہے اور اپنے علاقے میں اثر و رسوخ بڑھایا ہے۔ اس کے ساتھ کے لوگ جنگ کے لیے آمادہ ہیں، مگر پیسوں اور اسلحے کی ضرورت ہے جو مہیا کرنا بہت مشکل ہو چکا ہے۔

دیگر اہم بلوچوں کے نام جو کسی نہ کسی وقت ہمارے ساتھ رہے یا ہمارا اُن سے رابطہ رہا ان میں سے اکثر مجھے یاد نہیں رہے۔ جیسے لال بخش رند ہمارے باشعور اور ترقی پسند ساتھیوں میں سے تھے، انہیں بحث مباحثے اور گتھیاں سلجھانے کا سلیقہ تھا۔ شائد ڈائریوں میں ان کا ذکر اس لیے نہ آسکا کہ انھوں نے کبھی ہمارے لیے کوئی مسئلہ نہیں بنایا۔ موصوف صرف سیاسی کارکن تھے، کمانڈر یا گوریلا فائٹر نہ تھے۔

مریوں کے علاوہ باقی تمام بلوچ صدر داؤد خان کے جواب کے نتیجے میں جون 1977ء میں رخصت ہوگئے۔ ہم قندھار تک انہیں رخصت کرنے ساتھ چلے تھے۔

ایک مرتبہ محمد بھا بھا اور اس کے لیفٹسٹ ساتھیوں نے باہر دنیا میں اسلحہ خریدنے یا ڈھونڈنے

کی تجویز دی۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر افغانستان اجازت دے تو وہ یہ اسلحہ لا سکتے ہیں۔ مگر حکومت افغانستان نے اس کی اجازت نہ دی بلکہ یہ تجویز صدر داؤد کو بہت بری لگی تھی۔ انھوں نے فرانس سے گاڑیاں بھی منگوائی تھیں جن میں ایک فور بائی فور جیپ تھی اور ایک 'سیٹر ون Cetroen' چھوٹی گاڑی بھی شامل تھی۔ ان میں ساتھ آٹھ مری بھیڑ بکریوں کی طرح ایک دوسرے کے اوپر چڑھے سفر کرتے۔

آخر میں صدر داؤد نے سب کو واپسی کا حکم دیا۔ مریوں کے سوا سارے بلوچ، اجمل اور میرے سوا سارے پختون واپس ہوئے۔ مریوں کا کمانڈر میر ہزار لیت و لعل سے کام لیتا رہا اور ظاہر ہے اتنے ہزاروں مہاجرین کے ساتھ واپس جانے سے ڈرتا تھا۔ اسی اثنا میں انقلاب ثور وقوع پذیر ہوا اور میر ہزار بمعہ بلوچ مہاجرین کے نجیب کے دور کے آخر تک افغانستان میں رہا۔ بلکہ ببرک کارمل کے وقت نواب خیر بخش مری بھی کابل آ گیا۔ سیاسی اور عملی نمائندگی کی ذمہ داری موصوف نے سنبھالی۔ اگرچہ کابل۔ ماسکو خواہشات کے باوجود وہ پاکستان میں از سر نو لڑائی چھیڑنے سے کتراتے رہے۔ تاہم وہ بہت مزے میں اور ایک نواب کی حیثیت میں رہے اور ان کے بیٹے نواب زادوں کی طرح ماسکو میں پڑھتے رہے۔ دوسرے طالب علموں کے مقابلے میں اُن سے خاص طور پر امتیازی سلوک کیا جاتا۔

جی ایم سید کی 'سندھو دیش' تحریک کی میزبانی

نیپ کی شدت پسند تحریک کی بازگشت بہت دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ بلوچ پہاڑوں پر جا بیٹھے تھے، پختون زلمے کا اگر زیادہ زور نہ تھا تو کم از کم شور بہت زیادہ تھا۔ ولی خان کی تند و تیز دھمکیوں بھری تقاریر، افغانستان کی مدافعانہ پالیسی، ملکی فضا اور ساتھ ساتھ یہ امیدیں کہ مذکورہ تحریک کی پشت پر فعال بین الاقوامی اور علاقائی قوتیں کھڑی ہیں۔ ان سب نے جی ایم سید کو بھی شہ دی کہ وہ ہم تک پہنچیں اور ہمارے ذریعے حکومت افغانستان کے سامنے مدد کے لیے ہاتھ بڑھائیں۔

افغانستان میں پختون اور بلوچ نوجوان عسکری تربیت کے لیے آنا شروع ہو چکے تھے۔ ولی خان نے افغانستان کا کامیاب دورہ کیا تھا، جس میں صدر داؤد خان کے سامنے اپنی قوت کے بارے میں مبالغہ سے مملو لاف زنی کی تھی، یوں سیاسی میدان خوب گرم تھا۔ پختون زلمے کی تخریبی کارروائیوں کا آغاز ہو چکا تھا۔

1974ء میں جی ایم سید نے شاہ محمد شاہ، اسماعیل وسان اور بزرگ سائیں (نام بھول گیا اُن کا) ہماری طرف بھیجے۔ یہ صاحبان سیدھا ہمارے گھر تشریف لائے۔ پہلے پہل تو داؤد خان انھیں قبول کرنے پر آمادہ نہ تھا، کیوں کہ مرحوم کا موقف تھا کہ پختون اور بلوچ تو میرے بھائی ہیں۔ افغانستان پر اُن کا اور اُن کا افغانستان پر طبعی حق ہے۔ مگر پنجابی اور سندھی تو پاکستان کے لوگ ہیں۔ افغانستان ان پر اور نہ وہ افغانستان پر کوئی حق رکھتے ہیں۔ مگر ولی خان کے اصرار پر داؤد خان مان گیا اور یہ لوگ تقریباً ایک برس ہمارے گھر ہمارے ساتھ مقیم رہے۔

ہندوستان اور ہندوستانی سفارت خانے سے ہمارا تعلق تھا، جو فطری طور پر ان کے بھی کام آیا۔ جی ایم سید کی انگریزی کتاب 'سندھو دیش زنجیروں میں' (Sindhudesh In Chains) ہمارے ہی توسط سے بھارت میں شائع ہوئی۔ اگرچہ کتاب میں کتابت کی بہت سی غلطیاں رہ گئیں، لیکن اس کا شائع ہونا ہی بہت تھا کہ اس وقت پاکستان کے اندر ایسی کتاب کا شائع ہونا ناممکن تھا۔ اس کتاب کو ہم نے خفیہ طریقوں سے اور قسطوں میں بھجوایا۔ جی ایم سید نے بعد میں کتاب میں غلطیوں کی تصحیح کی اور دوبارہ اشاعت کے لیے بھیجی لیکن اس کی دوبارہ اشاعت ممکن نہ ہو سکی۔

ایک مرتبہ سید صاحب کے نائب قاضی فیض محمد جو پہلے عوامی لیگ میں رہے تھے، کابل

آئے۔ وہاں سے بھارت بھجوائے گئے اور واپسی کے لیے بھی اُنہوں نے کابل کا راستہ اختیار کیا۔ یہ پوری طرح یاد نہیں کہ اس سفر کے لیے اس نے کس پاسپورٹ کا سہارا لیا تھا۔

4 جون 1975: شاہ محمد شاہ اور جام شورو یونیورسٹی کے یونین کے جنرل سیکرٹری قمر الزمان راجپر کابل پہنچ گئے۔ یہ لوگ کراچی سے کوئٹہ تک جہاز کے ذریعے آئے، وہاں سے چمن تک ٹیکسی لی اور افغان چمن سے قندھار تک دوسری ٹیکسی پکڑی۔ یہ راستہ ایسی گھمبیر سیاسی صورتحال میں کافی عجیب لگا تھا۔ 9 جون کو وہ بھارتی سفارتی نمائندے سے ملے اور دوسرے ہی دن واپس پاکستان روانہ ہو گئے۔

13 اگست: شاہ محمد شاہ، اسماعیل وسان اور قمر الزمان راجپر ایک مرتبہ پھر وارد کابل ہیں۔

14 اگست: سندھی مہمانوں کو محراب الدین پکتیاوال تفریح کی غرض سے پغمان اور قرغہ لے گئے۔ اسی دن اپنے گھر دعوت بھی دی، جس میں نیک زاد، خلیل زمر، تورلالی کے فرزند صلاح الدین اور میں شامل تھے۔[11]

16 اگست: بھارتی رابطہ کار کو میں نے سندھیوں کی آمد کی اطلاع دی۔ چوں کہ ہمارے گھر جگہ نہ تھی، اس لیے ہم نے انھیں لودھی ہوٹل منتقل کیا۔

21 اگست: میں نے جئے سندھ کا ایک اعلامیہ ٹائپ کیا۔ (سندھی مہمان کچھ دن کابل رہے اور پھر واپس پاکستان چلے گئے۔ انھوں نے اپنے قیام کے دوران اجمل اور بھارتی سفارت کار سے بات چیت کی۔ اس بات چیت میں کیا فیصلہ ہوئے اور کیا لین دین طے پایا اس کی مجھے اطلاع نہ دی گئی۔

جس وقت باچا خان آخری مرتبہ ہندوستان میں بیمار پڑے اور کوما میں چلے گئے تو افغانستان میں صدر نجیب کی حکومت تھی، یہ غالباً 1987ء تھا۔ اُس موقع پر ہم اعلیٰ افغان عہدیداروں پر مشتمل وفد کے ساتھ دہلی گئے۔ اُس وقت وہاں جی ایم سید بھی آئے ہوئے تھے اور ایک ہوٹل میں مقیم تھے۔ موصوف نے ہم سے کہا کہ بھارتی حکومت سے اُن کی سفارش کریں کہ اُن کی بات مان لیں۔ وہ مطالبات کیا تھے، یاد نہیں رہا، مگر سید صاحب چاہتے تھے کہ اجمل خٹک ان کی سفارش کریں۔

غلام مصطفیٰ کھر کا قصہ

سندھودیش تو سندھی لوگوں کی ہماری تحریک سے وابستہ امیدوں کی کہانی تھی۔ لیکن ایک ایسی ہی کوشش پنجاب سے غلام مصطفیٰ کھر نے بھی کی۔ کھر صاحب پیپلز پارٹی کے بانی اراکین میں تھے۔ پی پی پی کی حکومت کے آنے سے پنجاب میں مقتدر گورنر بنے اور بھٹو کے بہت ہی معتمد ساتھی۔ لیکن جب انھیں سبکدوش کیا گیا تو وہ بھٹو کے شدید مخالف ہوگئے۔ یہ وہی کھر تھا کہ جب 23 مارچ 1973ء کو لیاقت باغ میں اپوزیشن کے جلسے پر گولیاں برسائی گئیں، اس میں حملہ آور اور جلسہ کے شرکاء دونوں طرف کے لوگ قتل ہوئے، گاڑیوں کو آگ لگائی گئی، تو اس کا الزام گورنر پنجاب کے سر تھوپ دیا گیا۔ اس حوالے سے نیپ بہت غیض وغضب کا شکار تھی۔ لیکن جب کھر بھٹو سے ناراض ہوا تو بغض معاویہ میں ولی خان نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

قلندر مومند جو اس وقت کے نازک حالات میں، جب ولی خان اور نیپ کے دیگر لیڈران بھٹو کی تیغ تلے تھے اور حیدرآباد ٹربیونل میں پھنسے ہوئے تھے، دفاعی وکلاء کے پینل میں شامل تھے۔ ولی خان نے اسے جیل میں سیاسی حکمت عملی کا اختیار دیا تھا۔ 1975ء کے اواخر میں کھر بھٹو کے خلاف ہو چکا تھا اور قلند مومند کو ولی خان نے کہا، کہ کھر کی مدد کرو۔ اس پر نوجوان قلندر مومند سے شدید ناراض ہوئے۔

جب کھر لندن گیا تو شائد ولی خان کی حوصلہ افزائی سے موصوف نے دو بار بیگ نامی ریٹائرڈ کرنل کو اجمل خٹک کے پاس بھیجا۔ اس کا مطالبہ تھا کہ داؤد خان کو قائل کریں کہ کابل میں ایک دفتر کھولنے کی اجازت دیں اور وہ لندن سے کابل منتقل ہو جائیں۔ لیکن مرحوم داؤد خان کی وہی پرانی منطق تھی کہ پختون بلوچ تو ہمارے بھائی ہیں اور ہمارا باہمی حقوق اور فرائض کا رشتہ ہے۔ لیکن باقی اقوام کو ہم کیوں سہولیات دیں، اس لیے داؤد خان نے یہ تجویز رد کر دی۔ بیگ صاحب جب بھی آتے، میں انہیں خوش آمدید کہتا اور کابل کے 'میٹروپول ہوٹل' میں ان سے ملتا۔ پھر وہاں سے انھیں اجمل سے ملانے گھر لے آتا۔ ملاقات کے بعد وہ واپس ہوٹل تشریف لے جاتے۔ آخر میں بیگ صاحب کا مشن ناکام ہوا۔ اس کی تفصیلات اجمل کی ڈائریوں میں درج ہوں گی۔

کمیونسٹ پارٹی، ہم اور پرچم

کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے سب سے پہلے سائیں عزیز اللہ اور رؤف وارثی ایسے وقت کابل آئے، جب پختون بلوچ نوجوانوں کی عسکری تربیت شروع ہو چکی تھی۔ یہ ساتھی چند مہینے دہمزنگ، کوٹہ سنگی روڈ پر واقع 'جمال مینہ' کے گھر آئے تھے۔ وہ خفیہ طور پر پرچم سے ملے۔ ہمارے ساتھ مسلسل بحث ومباحثہ رہا اور فیصلے بھی ہوئے۔ ایک فیصلہ کمیونسٹ پارٹی کے خارجہ امور کی کمیٹی کا قیام بھی تھا۔ انھوں نے اپنے زیر اثر نوجوان بھی عسکری تربیت کے لیے بھجوانے کا وعدہ کیا۔ یہ کمیونسٹ پارٹی کی پہلی کوشش تھی کہ اس تحریک کو اپنے رسوخ میں لائے۔ جس وقت مئی 1974ء میں ولی خان لندن سے کابل آئے اور ہمارے گھر تشریف لائے تو اجمل نے مرحوم کو سارے کمرے دکھائے، بجز اُس ایک کمرے کے، جس میں عزیز اللہ سائیں اور رؤف وارثی مقیم تھے۔

2 دسمبر 1974: آج سے چار دن پہلے اجمل خٹک کی دعوت پر میاں شاہین شاہ آچکے ہیں۔ میاں صاحب ایک تجربہ کار سیاسی کارکن، کسانوں میں کام کرنے کے ماہر اور کمیونسٹ پارٹی کے رکن ہیں۔ جب کمیونسٹ پارٹی میں پھوٹ پڑی تو موصوف بھاشانی نیپ کے ساتھ چلے گئے جو ماؤ نواز پارٹی تھی۔ اس کے بعد میاں صاحب سی آر اسلم کے ساتھ سوشلسٹ پارٹی میں شامل ہوئے، جو ہر لحاظ سے ماؤسٹ تھی۔ تقریباً ڈھائی سال پہلے سوشلسٹ پارٹی سے بھی استعفیٰ دے دیا۔ اب حالیہ دنوں میں موصوف نے ہمارے رفقا کی خواہش پر اپنے گاؤں میں کسان کانفرنس منعقد کی۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں کمیونسٹ پارٹی میں لیا گیا ہے۔ مگر اس بارے میں ہمیں پارٹی کی طرف سے باقاعدہ کوئی اطلاع نہیں آئی۔ موصوف کے تجزیے بہت درست ہیں اور ہمارے موقف کی تائید کرتے ہیں اگرچہ وہ اس کا اقرار کرنے سے ہچکچاتے ہیں لیکن، اپنے ماضی پر نادم ہیں اور اُن کا کہنا ہے:

- میں نے مفت میں اپنے ذہن، بچوں اور خود کو تباہ کیا اور وہ کچھ کیا جو مجھے نہیں کرنا چاہیے تھا۔
- نیشنل فرنٹ کو مضبوط کرنا چاہیے۔
- پاکستان ٹوٹتا ہے یا نہیں، ہمیں اسے ہر حال میں توڑنا چاہیے۔
- ہمیں ہر اس بات کی حمایت کرنی چاہیے، جس سے پاکستان ٹوٹے۔

- بنگش سامراج کا ایجنٹ ہے اور شعوری طور پر اُن کے لیے کام کرتا ہے۔
- آپ لوگ جو کہیں، میں ماننے کو تیار ہوں۔

2 دسمبر: ببرک کارمل سے میاں صاحب کے بارے میں ملا۔ وہ چاہتے تھے کہ میاں صاحب سے ملنے سے پہلے اس کی پارٹی حیثیت، موقف، فکر اور نظریے کے بارے میں درست معلومات حاصل ہوں، جن کی بنیاد پر بات کی جاسکے۔ ببرک کارمل نے کہا کہ ہمارے ساتھ زندہ رابطے کی ضرورت ہے۔ سائیں عزیز اللہ کے ساتھ فیصلہ ہوا تھا کہ وہ میرے ساتھ رابطہ رکھیں گے (افسوس کی بات ہے کہ مجھے کسی نے ایسی ذمہ داری نہیں سونپی)، مگر ایسا نہ ہوسکا۔

اجمل کے بارے میں ان کے اذہان میں شکوک وشبہات پیدا ہو چکے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ احتیاط اور لاپرواہی کی وجہ سے پرچم پر تنقید کرتے ہیں، خاص طور پر صدر صاحب کے سامنے۔ اجمل پر نیشنلزم کا غلبہ ہے اور قوم پرستانہ جدوجہد کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ اپنی پارٹی کی بنیادی ذمہ داری بھول چکا ہے۔ اپنے آپ کو بالکل داؤد خان کا ایجنٹ بنا رکھا ہے۔ ایک کمیونسٹ جیسا رویہ نہیں رکھتا، حتیٰ کہ ہمارے ساتھ بھی نہیں۔ تنظیمی باتوں کو بالکل اہمیت نہیں دیتا اور فضولیات میں وقت ضائع کرتا ہے۔ اس کی حد سے زیادہ احتیاط اور بے اعتنائی ساتھیوں کے اذہان میں شکوک و شبہات کو جنم دیتی ہے۔ اس سے موصوف کی اپنی ترقی پسندانہ حیثیت کو صدمہ پہنچ رہا ہے۔ اگر یہ معاملہ یوں ہی چلتا رہا تو اس کی قومی اور علاقائی پوزیشن خراب ہونے کا امکان ہے۔

اس لیے میری ذمہ داری لگائی گئی کہ اس کے علاج کے لیے اپنی سی کوشش کروں۔ اجمل کو فضولیات سے بچانے کی کوشش کروں۔ یہاں پر ساتھیوں سے رابطہ رکھوں، ایک دوسرے سے اطلاعات کا تبادلہ ہو اور بنیادی ذمہ داریاں آگے بڑھائی جائیں۔ وہ اپنے آمرانہ اور محتاط رویے چھوڑے، ایک بھرپور ساتھی کی حیثیت سے ہر ایک سے، اور حتیٰ کہ داؤد کے ساتھ بھی کھل کر دلیرانہ باتیں کریں۔ وہ اس سلسلے میں یہاں حکومت کی سطح پر ہمارے لیے بہت مددگار ثابت ہوسکتے ہیں۔

محترم رفیق کی بہت سی باتیں درست تھیں۔ میں نے اعتراف کیا کہ یہی مرض موصوف سے ہمیں بھی منتقل ہو چکا ہے اور یہ حالات کی وجہ سے ہے۔ کیوں کہ میں اس کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہتا ہوں۔ میں نے اُن کے ساتھ ایک ساتھی کی طرح سیاسی مسائل پر اور دیگر روزمرہ کے مسائل پر بحث، صلاح مشورہ، تنقید اور خود تنقیدی نہیں کی ہے۔

میں نے وعدہ کیا کہ ان کے ساتھ رابطہ اور وقتاً فوقتاً میٹنگ کروں گا اور اجمل سے بہت سے مسائل پر بات کروں گا۔ مگر مجھے یہی ڈر ہے کہ اجمل مجھے اس کا موقع نہیں دیں گے۔ کارمل صاحب کی یہ بھی خواہش تھی کہ نظریاتی تربیت کے لیے اگر نیچے سے کوئی آجائے تو ہم (پرچم) آمادہ ہیں۔ اگرچہ اس میں انتہائی احتیاط برتنی چاہیے، اس سے بہت سی غلطیوں کا ازالہ ہوسکے گا۔

2 دسمبر: میاں صاحب کی خواہش اور یہاں پر ساتھیوں سے صلاح مشورے کے بعد آج ہم نے ایک ساتھی کے گھر میں لائق صاحب، استاد میر اکبر خیبر اور کارمل صاحب سے ملاقات کی۔ یہاں کے ساتھیوں کی میاں صاحب سے بہت سی شکایات تھیں کہ چھ سال پہلے کیے گئے وعدے پورے نہیں کیے گئے اور ہم سے جھوٹ بولا گیا تھا۔

میاں صاحب نے ساتھیوں سے کہا کہ اب میں پارٹی تنظیم میں آچکا ہوں۔ میرا کابل آنا اجمل خٹک کی خواہش پر ہے، جو ذاتی حیثیت کا حامل ہے، اور یہ کہ میں کسانوں کا نمائندہ ہوں، کمیونسٹ پارٹی کے فیصلے پر نہیں آیا ہوں۔ میاں صاحب نے تنقید اور خود تنقیدی کی بنیاد پر اپنا موقف واضح اور برملا سب کے سامنے رکھا اور ساتھیوں کو قائل کیا۔ یہاں کے رفقاء کی تنقید کو سنا، جوابات دیے۔ ممکن ہے کچھ ذاتی کمزوریاں ہوں مگر یہ بندہ ایماندار اور مخلص معلوم ہوتا ہے۔

11 دسمبر: جاری جنگ مراعات یافتہ لوگ آگے نہیں لے جاسکتے۔ ہمیں ہی اسے آگے لے جانا ہے اور آخر کار یہی مراعات یافتہ لوگ ہمارے پیچھے آئیں گے۔ اس لیے میاں صاحب کے ساتھ بات ہوئی کہ قبائلی علاقوں میں اپنے مراکز ہونے چاہییں۔ نیچے ساتھیوں کو چاہیے کہ ہمارے یہاں ہونے سے فائدہ اٹھائیں، ہمارے ساتھیوں کی تربیت ہوجائے گی۔ پروپیگنڈے کا حل نکالا جائے۔ پیسوں کی مدد ہم کریں گے۔ اس تحریک کو اپنانا چاہیے۔ ساتھیوں کو چاہیے کہ قومی جمہوری انقلاب کے راستے میں قومی تحریک کا ہراول دستہ بن جائیں، یعنی اپنی حکمت عملی، کام اور عمل کی بنیاد پر لیڈرشپ حاصل کریں۔ میاں صاحب (خفیہ نام: پینده گل) کے ساتھ باجوڑ اور دیر کے گروپ ہوں گے۔ وہ سب سے پہلے چنگئی کے میاں شاہ جہان سے ملے گا، اس کے ساتھ مشورہ کرے گا اور اس بارے میں ہر فیصلہ اپنے لیڈران اور ساتھیوں کے مشورے سے لے گا۔

8 فروری 1975: حیات محمد خان شیرپاؤ کے قتل کے بعد حالات بہت خراب ہوئے۔ پکڑ دھکڑ شروع ہوئی اور پشاور یونیورسٹی میں پختون سٹوڈنٹس فیڈریشن کے ساتھی زیر عتاب آگئے۔

اس ضمن میں افراسیاب خٹک اور شیر محمد بھاگ کر آ گئے۔ انہیں ہم نے 10 مارچ کو میکروریان میں اپنے خفیہ گھر منتقل کیا، جہاں وہ کچھ عرصہ عام لڑکوں سے پوشیدہ رہے۔

11 مارچ: اطلاع آئی ہے کہ میاں شاہین شاہ آ گئے ہیں اور ڈاکٹر نجیب کے گھر قیام پذیر ہیں۔ نجیب کی باتوں سے مطلع ہوئے کہ بندہ بہت ناراض ہے اور طاقت سے بات کر رہا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اب کہ کمیونسٹ پارٹی کے نمائندے کی حیثیت سے آئے ہیں اور بعد از ظہر یہاں کے ساتھیوں سے میٹنگ ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ:

- اس سے پہلے جو فیصلے ہوئے ان پر کوئی عمل نہیں ہوا۔
- پچھلی مرتبہ کہا تھا کہ آپ ہمارے راہنما ہیں، جو آپ کہیں گے وہ کرنے کو تیار ہوں۔
- یہاں پرچم کے ساتھیوں سے ہماری اجازت سے ملا۔
- ہم سے بھی زیادہ تیز اور مستعد تھا۔
- مستقل رابطے کے بارے میں جو فیصلہ ہوا تھا، وہ فقط زبانی جمع خرچ ثابت ہوا۔

مگر اس بار معلوم ہوا ہے کہ موصوف دو دن پہلے کے آئے ہوئے ہیں۔ پرچمیوں نے رہائش دی ہے اور ہمیں آج معلوم ہوا ہے۔ ہم سے ملنے سے پہلے پرچمیوں سے میٹنگ بھی کی ہے اور وہ تمام باتیں ان سے کی ہیں جو ہماری پارٹی اور تنظیم سے متعلق ہیں۔ گویا ہم سے بدگمانی پیدا کر رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موصوف صرف پرچم والوں سے بات چیت کرنے آیا ہے، مگر ان کے انکار اور اصرار پر کہ اجمل کے بغیر کوئی بات یا فیصلہ نہیں ہو سکتا، اب ہم سے ملنے پر مجبور ہوا ہے۔

یکم اپریل: میاں صاحب سے ملا۔ موصوف سرحد (پختونخوا) کے ساتھیوں کے ایک فیصلے کے نتیجے میں آیا ہے۔ چاہتا ہے کہ رابطہ قائم کرے، مرکز کھولے، کام شروع کرے، پروپیگنڈے اور دیگر سرگرمیوں کو قومی تحریک کے ڈھانچے میں آگے لے جائے۔

3 اپریل: میاں صاحب: میرا سوشلسٹ پارٹی سے اختلاف قومی مسئلہ اور کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد پر تھا۔ دوسری طرف افضل بنگش کی سیاست نیپ مخالف اور چھوٹے بڑے مالکان اراضی کے درمیان جنگ کرانے پر مبنی تھی۔ یہی سیاست پی پی پی نواز اور سلیت پرست سیاست تھی جو میں تو پنجاب کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ میں نے جب آپ لوگوں کا پیغام کمیونسٹ پارٹی کو پہنچایا تو میں نے محسوس کیا کہ آپ لوگوں کی اور ان کی حکمت عملی میں فرق ہے۔ میں کسان تحریک اور قومی جمہوری

تحریک پر عقیدہ رکھتا ہوں۔ میں نے کوشش کی کہ پرچم کے ساتھیوں کے تعاون سے کمیونسٹ پارٹی اور کابل کو مربوط کروں۔

میاں صاحب کا مطلب یہ تھا کہ میں قومی جمہوری تحریک کے بننے کے لیے کابل کے ساتھیوں اور کمیونسٹ پارٹی کے سہارے پر انحصار کرتا ہوں۔ سید مختار باچا کو میں نے آپ کا خط پہنچا دیا۔ باچا نے کہا کہ میں یہی خط اپنی جگہ پہنچا دوں گا اور باقی لیڈران کی مرضی۔ اور یہ کہ میں آپ سے پارٹی کے نمائندے کی حیثیت سے بات نہیں کر سکتا۔

4 اپریل: افراسیاب، شیر محمد اور میاں شاہین کو خرچ کے لیے ایک ہزار افغانی ادا کیے۔

8 اپریل: میاں صاحب واپس چلے گئے۔ کوئی کام یا فیصلہ نہیں ہوا۔ عجیب آدمی ہے پہلے کہتا ہے کہ مرکزی کمیٹی کی طرف سے آیا ہوں اور پھر کہتا ہے کہ سرحد کے ساتھیوں نے بھیجا ہے۔ حقیقت میں کسی نے نہیں بھجوایا۔ ہم نے موصوف کو ساتھیوں کے نام ایک خط اور کچھ لٹریچر جس میں ڈیموکریٹک پاکستان جریدہ بھی شامل تھا، دے دیا۔ پختون سٹوڈنٹس فیڈریشن کی طرف سے لکھا گیا پمفلٹ 'سیاسی قاتل کون؟'، جو در اصل ہم نے تیار کیا تھا، بھی ساتھ لے گیا۔

یکم مئی: میاں شاہین اور سید مختار باچا پہنچ گئے اور شیر محمد اور افراسیاب کے ساتھ ٹھہرے۔

2 مئی: سید مختار نے اس لہجے میں مجھ سے بات کی، گویا بہت بڑی اتھارٹی کا حامل ہو۔ وہ ہمیں حکم دیتا رہا۔ بہت سی شکایات، تنقید اور گلے شکوے کیے۔ کبھی کبھی افراسیاب بھی اس کا ساتھ دینے کی غرض سے سر ہلاتا رہا۔ اس کا کہنا ہے:

- آپ لوگوں نے پارٹی تنظیم نہیں بنائی، باقی سب کام فضول ہیں۔ اگر داؤد خان ناراض بھی ہو، لیکن آپ کو پارٹی بنا کر مارکسسٹ تیار کرنے چاہیے تھے۔ (بے شک اس سے افغان حکومت مشکوک ہو جائے۔)
- موصوف کے بقول، اس کے افشا ہونے کی صورت میں تمام ذمہ داری میری ہوگی، (چاہے ایسا اس کی غلطی سے ہو۔)
- آپ لوگ رابطہ نہیں رکھتے (حالاں کہ حقیقت بر عکس تھی)
- ہمیں آپ سے رابطہ قائم کرنے سے زیادہ اہم مزدوروں، کسانوں، طلبہ کی تنظیمات ہیں۔ اس لیے مختار باچا کہتے ہیں کہ وہ رابطہ رکھنے کی فرصت نہیں رکھتے۔ یہ کام ان کا نہیں بلکہ

ہمارا ہے۔

- چوں کہ پارٹی تنظیم نہیں، تو اس لیے ہم آپ کے کاموں میں شرکت نہیں چاہتے ہیں۔

5 مئی: میاں صاحب چاہتے تھے کہ اس کے اور پرچم کے ساتھیوں کے درمیان کچھ شکوک پیدا ہوئے ہیں، وہ ہمارے ذریعے سے دور کریں۔ آج شائد اجمل کی معیت میں ببرک کارمل یا استاد خیبر سے ملیں گے۔

سید مختار باچا کے جانے کے لیے ہم نے یہ چیزیں تیار کیں: ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے ہفت روزہ اردو جریدہ 'حیات' کے چند شمارے، 'ڈیموکریٹک پاکستان' کے مارچ اور اپریل کے کچھ شمارے، ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے اردو زبان میں وضع کردہ چند کورسز، بلوچستان پر 'گارڈین' اخبار میں شائع ہونے والے مضمون کی نقول، امریکی کانگریس اراکین کے نام اجمل خٹک کے خط کی نقول، قبائل کو لکھے گئے 'قامی فیصلہ' نامی ہینڈ بل، آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر گامبریج کے نام اجمل کے خط کی نقول۔

5 مئی: ببرک کارمل کے ساتھ میٹنگ، جس میں اجمل، سید مختار، میں اور چند دیگر ساتھی شریک تھے۔ سید مختار نے کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے بنگش صاحب کے لکھے گئے پشتو کتابچے 'کسانوں کے اپنے پرائے' کے جواب میں لکھا گیا پمفلٹ بھجوانے کا وعدہ کیا۔

کارمل صاحب نے کہا کہ یہ اجلاس پرچم مرکزی کمیٹی کا ایک تاریخی اجلاس ہے۔ باوجود یہ کہ اس کی حیثیت نیم رسمی ہے، مگر مستقبل کی تاریخ میں یہ ضرور ثبت ہوگا۔ یہ فضا اس حقیقت کی آئینہ دار ہے کہ اس منطقے میں کمیونسٹ اثر بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ وقت قریب ہے جب عظیم تر وطن یعنی آمو سے اباسین (دریائے سندھ) تک ترقی پسند اور قومی جمہوری انقلاب کی ایک ہی پارٹی ہوگی۔ سامراجی، فیوڈل اور رجعت پسند حکومت، پرانے اور نئے نوآبادیاتی نظام نے افغانوں کو تقسیم کیا اور ان کو روند ڈالا۔ پختونوں پر رجعت پرستی کے گوناگوں ادارے مسلط کیے گئے۔ جن کے تاریخی تعلقات ہیں، ان کے خلاف عوام نے خودروجدوجہد کی ہے۔ اس کے جوہر ہم ہی تو ہیں، اس لیے موجودہ اجلاس اجمل کی زیر صدارت، جمہوری مرکزیت کی بنیاد پر کارروائی کرے۔

یہ تجویز قبول کی گئی۔

اجمل: تجاویز، مباحثے، ہم وحدت اور وحدت فکر کے نمائندے ہیں۔ اجلاس کا ایک

مشترکہ ایجنڈا بن گیا۔ منطقے کی سیاسی صورتحال، پالیسی، ہماری ذمہ داریاں، بنیادی مسئلہ، پارٹی ایجنڈا کے اجزا۔

بنیادی مسئلہ پارٹی ہے۔ عمل، تجربے اور تاریخ کی روشنی میں ایسی پارٹی کی تنظیم وجود رکھتی ہے۔ میں اس کی عوامی بنیاد یعنی ماس موومنٹ کے لیڈروں میں سے رہا ہوں، جو اس منطقے کی ہم منصب اور وسیع پارٹی ہے۔ یہ اصل میں متحدہ ہندوستان سے بچی پارٹی ہے۔ قومی آزادی کی تحریک کی برکت سے ہے اور نیپ کو کمیونسٹ پارٹی نے تشکیل دیا۔ آزاد پاکستان پارٹی کے پیچھے کمیونسٹ پارٹی تھی اور انھوں نے پھر نیپ کی تشکیل کی۔ نیپ کی تنظیم چھ پارٹیوں پر مشتمل تھی، لیکن اس کا منشور کمیونسٹ پارٹی نے بنایا۔ جس وقت مولانا بھاشانی نیپ کے صدر تھے تو مرکزی کمیٹی میں فیصلہ کمیونسٹ پارٹی کی مرضی سے ہوتا تھا، اس کی اتنی قوت تھی۔

مغربی پاکستان میں نیشنل کانفرنس کے نام سے رجعتی اجلاس کو ناکام بنانے میں کمیونسٹوں نے ایسا کردار ادا کیا کہ یہ اجلاس ہی منعقد نہ ہو سکا۔ انتخابات سے پہلے کمیونسٹوں نے فیصلہ کیا کہ اسمبلی قومی اسمبلی نہیں، بلکہ آئین ساز اسمبلی ہوگی اور پھر اسی طرح ہوا۔ شیخ مجیب کے چھ نکات کمیونسٹوں نے بنائے تھے۔ پہلے بھاشانی کو پیش کیے، اس نے انکار کیا تو شیخ مجیب کو دیے گئے اور اس نے قبول کر لیے۔ چھ نکات میں چوں کہ مغربی پاکستان میں ون یونٹ توڑنے کی بات نہ تھی، صرف بنگال تک محدود تھے تو پھر کمیونسٹ پارٹی کی وجہ سے گیارہ نکات پروفیسر مظفر احمد کے واسطے سے بنا دیے گئے۔ بنگلہ دیش کے معرض وجود میں آنے کے بعد پارٹی کمزور ہو گئی، لیکن پھر بھی نیپ کی مرکزی کمیٹی میں کیے گئے فیصلے کمیونسٹ پارٹی کے سیل سے نکلتے تھے۔ آئینی فارمولہ نیپ کی وجہ سے بن گیا تھا۔ ڈیک یعنی ڈیموکریٹک ایکشن کمیٹی کمیونسٹ پارٹی کی کوشش سے بنی۔ ولی خان کمیونسٹ پارٹی کے فیصلے پر نیپ کے صدر منتخب ہوئے۔ اسی طرح یو ڈی ایف (یونائیٹڈ ڈیموکریٹک فرنٹ) ساتھیوں کی مرضی سے بنا۔ اگرچہ تعداد میں کم ہیں، مگر پہل کاری اور کارکردگی کی لگام اکثر ہمارے ہی ہاتھ رہتی ہے۔ کمیونسٹ پارٹی اپنا اثر رکھتی ہے اور اب بھی اس قابل ہے کہ موجودہ حالات سے فائدہ اٹھائے۔

سید مختار: کوئی بھی جمہوری جدوجہد مزدور طبقے کی قیادت کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ہم تنظیمی طور پر کم ہیں، مگر اثر اور عمل ہمارا زیادہ ہے۔

کارمل: ماؤازم نے برصغیر میں بدبختی کو جنم دیا اور کمیونسٹ پارٹی کو کمزور کیا۔ بنگلہ دیش بننے کے بعد یہ اور زیادہ کمزور ہوگئی۔ اس سے پہلے مشرقی پاکستان کی پارٹی جدا تھی اور وہ قومی پارٹی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مغربی پاکستان میں ایسی مضبوط تنظیم والی پارٹی نہیں تھی۔

سید مختار: صرف سندھ میں صوبائی پارٹی تھی۔ ایک مرکزی رابطہ کمیٹی تھی۔ بنگلہ دیش کے بعد کوشش کی گئی کہ ایک پارٹی بنائی جائے۔ تین چار سال پہلے اس پارٹی نے بین الاقوامی سطح پر اپنے آپ کو پیش کیا۔ سندھ پارٹی مشرقی پاکستان سے مربوط تھی اور پھر رفتہ رفتہ پاکستان میں آرگنائزنگ کمیٹی بن گئی۔

کارمل: پختونوں اور بلوچوں کا مسئلہ تضادات کا مرکز ہے۔ تمام علاقائی قوتیں اس طرف متوجہ ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تمام سازشیں پختونوں کی تحریک کے خلاف ہوتی ہیں۔ پرچم سے دشمنی اس لیے کی جاتی تھی اور ہے کہ یہ داؤد خان کی حمایت کرتے ہیں اور داؤد خان پختونستان کے ساتھ مخلص تھا۔ ہند چین اور مشرق وسطیٰ کے بعد ہمارا منطقہ (بلوچستان اور پختونستان) عالمی قوتوں کی توجہ اور رقابتوں کا مرکز ہے۔ یہاں ایک قومی جمہوری تحریک جاری ہے۔ ہمارا بنیادی فرض ہے کہ یہاں پر ایک حقیقی کمیونسٹ پارٹی تشکیل دیں۔ کوشش ہونی چاہیے کہ فرقہ واریت (Sectraianism) اور عقیدہ پرستی (Dogmatism) کی بنیاد پر ہم تنہا نہ رہ جائیں۔

سید مختار: نیپ قومی جمہوری انقلاب کے لیے ایک جامع محاذ نہیں۔ اس میں جاگیردار مخالف عناصر کمزور ہیں۔ یہ قومی جمہوری انقلابی پروگرام سے عاری ہے۔ صرف کمیونسٹ پارٹی ایسا پروگرام رکھتی ہے۔ پختونوں کا مسئلہ ابھی قومی تحریک نہیں اور نہ ہی اس میں عوام کی اکثریت شامل ہے۔ ویت نام کی جنگ کے بعد مشرق وسطیٰ جنگ کا مرکز ہے اور پاکستان نے اسی حکمت عملی میں اپنے آپ کو فٹ کیا ہے۔ موجودہ تحریک کو قومی آزادی کی تحریک نہیں کہہ سکتے۔

کارمل: آیئے بہانہ بازی چھوڑیں، مشینی رویے اختیار نہ کریں، پاکستان میں جمہوریت، سیکولرازم، سوشلزم اور مساوی حقوق بذات خود پاکستانی قومیت کی نفی کرتے ہیں۔ پاکستان سے ایک جمہوری اور سیکولر ملک بنانا ناممکن ہے۔ قومی آزادی کی تحریک کے مرحلے میں ابھی پاکستان داخل نہیں ہوا۔ یہ الگ سوال ہے، بلکہ پہلے سے زیادہ مضبوط ہو چکا ہے۔ اصولاً طبقاتی جدوجہد اور قومی جمہوری محاذ کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے جسے کوئی بھی مارکسسٹ مسترد نہیں کرسکتا۔

کمیونسٹ حضرات نیشنلزم کی حمایت کرتے ہیں مگر خود قوم پرست نہیں ہوتے۔ این ایل ایم کبھی بھی طبقاتی جدوجہد سے الگ نہیں ہوئی۔ نیشنل لبریشن موومنٹ پھر طبقاتی جدوجہد پر تقسیم ہوتی ہے اگرچہ اس کا نعرہ طبقاتی نہیں ہوتا۔ یہ حالات پر منحصر ہوتا ہے۔ بھٹو کو ہم فاشسٹ کہتے ہیں یا نہیں؟ اگر کہہ سکتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ پنجاب ایک شاؤنزم ہے، جو باقی ماندہ قومیتوں پر ظلم کرتا ہے اور بھٹو اس کا نمائندہ ہے۔ یہاں پر نیشنلزم کا مسئلہ اولین ہے۔

پاکستان سوویت یونین کے مقابلہ میں اولین دشمن ہے، ہماری ذمہ داری ہے کہ اس کے خلاف جدوجہد کریں۔ پختونستان میں اپنے آپ کو کمیونسٹ پارٹی کی حیثیت سے شناخت کرانا مناسب ہے یا نہیں؟ معروضی حالات اس کے لیے آمادہ ہیں؟ [یہ بنیادی سوال کارمل صاحب نے چھیڑ دیا]

6-13 مئی: میاں صاحب، شیر محمد، افراسیاب، سید مختار اور میں نے عسکری تربیت حاصل کی۔

20 مئی: میاں صاحب اور سید مختار کا لٹریچر سلیم مہمند کے ذریعہ گوشتہ بھیج دیا گیا، وہاں سے مظفر کو کوڈاخیل مہمند ایجنسی بھیجا جائے گا جہاں سے متعلقہ علاقوں میں تقسیم کیا جائے گا۔

24 مئی: سید مختار اور میاں صاحب رخصت ہوئے۔ یہ پھر افراسیاب کو طلب کریں گے کہ محفوظ طریقے سے نیچے آسکے۔ سید مختار صاحب آئے تھے تو بہت غصے اور قہر سے بھرے تھے، ایسی باتیں کرتے تھے جیسے اجمل اور میں یہاں جھک مار رہے ہیں اور یہ تن تنہا پاکستان میں انقلاب لا رہے ہیں۔ مگر آج واپس جاتے ہوئے ان کے فکر و نظر میں کافی تبدیلی آچکی ہے۔ یہاں کے حالات سے متاثر ہیں۔ ہماری کام کی اہمیت سے آگاہ ہیں۔ پرامید واپس جا رہے ہیں، مگر دیکھتے ہیں کہ کراچی کے گروان سے کیا بات کرتے ہیں۔

7 جون: افراسیاب نے بسم اللہ سے تین غلط، جھوٹی اور عدم اعتماد پر مبنی باتیں کی ہیں جن کی اُس سے توقع نہ تھی۔ ناممکن ہے، کہ وہ واپس نیچے جا کر پاکستان میں ہمارے کام آسکے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ مسائل جو ہمارے یعنی باچا، میاں، اجمل اور اُس کے درمیان صاف ہو چکے ہیں، انہیں غلط استدلال کے ساتھ بسم اللہ کو کنفیوز کرنے کے لیے میدان میں لایا ہے۔ اُس کا کہنا ہے:

- پختون زلمے کی سرگرمیوں سے ہمیں اتفاق نہیں۔
- میں اپنے لیے جگہ بنا رہا ہوں اور کام کرتا ہوں، لیکن میرا ان کی تنظیم سے کوئی تعلق نہیں ہوگا اور میں آزاد رہوں گا (یہ بات اس کے ساتھ ہم پہلے ہی طے کر چکے ہیں)۔

- اجمل کہنے کی حد تک تو پی ایس ایف کا الگ کیمپ، جدا تربیت اور خود مختار حیثیت مانتا ہے مگر اس کے نتائج کے لیے آمادہ نہیں (سفید جھوٹ اور بہانہ!) بات عملی نوعیت کی ہے کہ عوام کس طرح پی ایس ایف اور پختون زلمے کی فعالیت میں فرق کریں گے۔ گولی کی آواز تو ایک جیسی ہے، چاہے پی ایس ایف چلائے یا پختون زلمے۔ آخر عوام کیسے فرق کریں گے کہ کون سا کام کس کا ہے۔ البتہ ہمارا خیال ہے کہ اگر وہ اپنی سرگرمی نیپ اور داؤد خان کے خلاف دکھائے تو یہ نہیں مان سکتے۔

یہ بندہ ایک طرف تو آزاد اور خود مختار نہیں، کمیونسٹ پارٹی کے گروؤں سے ڈرتا ہے، اس لیے محض بکواس کر رہا ہے اور دوسری طرف پی ایس ایف کی قوت پر اکڑ رہا ہے، یہ جانے بغیر کہ یہ قوت حالات کی دین ہے، اس میں اُس کا کوئی کمال نہیں۔ موصوف احساس برتری کا شکار ہے۔ نہیں جانتا کہ پہاڑوں پر اس کا ساتھ دینے کے لیے چند ہی لڑکے تیار ہوں گے۔ درحقیقت نیپ کا مخالف ہے، فرقہ پرستی کا شکار ہے اور نیپ سے ٹکر لینا چاہتا ہے۔ پختون زلمے کوئی باشعور تنظیم نہیں، اس لیے بینک، سینما میں دھماکے کرتے پھر رہے ہیں اور بے گناہوں کا خون کر رہے ہیں۔ یہ خود کنفیوز ہے، تو بہانے تراش رہا ہے اور پختون زلمے کی کارروائیوں کو مہم جوئی کا نام دیتا ہے۔

8 جون: شیر محمد اور افراسیاب اتمان خیلوں کے ایران شاہ کے ساتھ امبار چلے گئے۔ وہاں سے میاں صاحب کی مدد سے نیچے جائیں گے۔ 500 روپے، 1500 افغانی اور 25 بور کا پستول انہیں دیا گیا۔

18 جولائی: پرتشویش حالات کی وجہ سے کارمل صاحب سے ملاقات کی۔ میرا اور ان کا نکتہ نظر اور تجزیے تقریباً ایک جیسے ہیں۔ کارمل صاحب کا کہنا ہے کہ:

- حکومت افغانستان پر دائیں بازو کا دباؤ بڑھ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کل انقلاب کی دوسری برسی کے موقع پر آئین اور پارٹی کے بارے میں اعلان نہ ہو سکا۔ سردار نعیم نے دھمکی دی ہے کہ اگر آپ (داؤد خان) نے یہ حرکت کی تو میں الوداع کہنے پر مجبور ہوں گا، کیوں کہ مجوزہ پارٹی کو بائیں بازو والے اپنے اثر میں رکھیں گے اور کمیونسٹ عناصر اس پر قبضہ کرلیں گے۔
- حکومت کا جھکاؤ دائیں طرف ہے، لیکن یہ حالت قطعی نہیں اور دوبارہ بائیں طرف آنے کا امکان مسترد نہیں کیا جاسکتا۔

- حکومت کی مرکزی کمیٹی میں سارے مشورے دائیں بازو کے وزراء اور ارکان سے کیے جاتے ہیں، مگر یہ ایک عارضی مظہر بھی ہو سکتا ہے۔ اس طرح اگر لیفٹ کے ساتھ کانا پھوسی کی جاتی ہے تو یہ ایک چال بھی ہو سکتی ہے۔ درست معلومات کا حصول لازمی ہے۔ [۱۲]
- بہر حال داؤد خان کی حکومت کا متبادل نہیں۔ اس کی حمایت عملیت پسند اور شریفانہ فعل ہے۔
- داؤد خان ذہنی لحاظ سے سامراج دشمن ہے، اس پر امریکا کبھی اعتماد نہیں کر سکتا۔ تخت الٹنے کا خطرہ اب بھی قائم ہے، اگر ایسا ہوا تو یہ فعل دائیں بازو اور رجعت پسندوں کی طرف سے ہوگا۔
- ہمارے لیے اہم یہ ہے کہ حقیقی اور قطعی اطلاعات کا حصول ہی درست اور عملی نعرہ ہے۔
- انتظار کافی طویل ہو چکا ہے اور جانے کب تک یہ پیچیدہ حالات جاری رہیں گے۔ زیادہ اہم کام اپنی پارٹی کی تنظیم کو محفوظ رکھنا ہے اور یہ تب ہی ہو سکتا ہے جب ہم ایک سنجیدہ اور قطعی راہ اختیار کریں، یہ گومگو کی حالت ہمیں نقصان پہنچا رہی ہے۔
- حالات گزشتہ دو برس میں پیچیدہ ہو چکے ہیں۔ یہ دن بہ دن سادگی سے پیچیدگی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔
- سوویت یونین کے ساتھ تعلقات میں کوئی فرق نہیں آیا ہے اور وہ اب بھی صدر صاحب پر اعتماد کرتے ہیں۔

مگر اجمل کا کہنا ہے کہ اگر پارٹی کا اعلان ہو جاتا تو یہ حتمی طور پر رجعت پسندوں کے ہاتھ لگتی، کیوں کہ یہ عناصر بہت مضبوط ہیں۔ اب تو مرکزی کمیٹی میں دائیں بازو کے عناصر اکثریت میں ہیں۔ پارٹی کے اعلان کے نتیجہ میں افراتفری پھیلتی۔ شریف لوگ سازشوں، پیسوں، فتووں کے ذریعہ کافر، ملحد اور ایجنٹ گردانے جاتے۔ مطلب یہ ہوتا کہ حالت واپس پیچھے کی طرف چلے جاتے۔ ایسے معاشرے اور حالات میں پارٹی نہیں چاہیے، بلکہ صدر صاحب خود ایسے کام کرتے ہیں جو حکومت کی سماجی بنیاد معرض وجود میں لائیں گے، البتہ پرچم کو مشکل درپیش ہے۔ ان کو آرگنائزیشن کو قائم اور برقرار رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ یہ لوگ ایسی حالت میں پھنس گئے ہیں، کہ آگے کنواں پیچھے کھائی ہے۔ حکومت کے ساتھ مل کر اعلانیہ سرگرمی نہیں کر سکتے اور اگر ایسا کریں تو دائیں جانب کو شہ ملتی ہے کہ وہ فعالیت کریں۔ اگر کچھ نہیں کرتے تو تنظیم کمزور ہوتی جارہی ہے اور کارکن مایوس ہو رہے ہیں۔ صدر صاحب کو بھی تشویش ہے، وہ کچھ کرنا چاہ رہے ہیں

اور آئین کے مسودے پر کام جاری ہے۔ یہ بات غلط ہے کہ پارٹی کا دائیں جانب کے عناصر کے دباؤ پر اعلان نہیں کیا گیا۔ الٹا پارٹی کے اعلان میں ان کا مفاد تھا۔ یہ بات صحیح ہے کہ موجودہ حکومت سماجی بنیاد نہیں رکھتی۔ ایسے اقدامات کی ضرورت ہے کہ یہ بنیاد بن سکے وغیرہ وغیرہ۔ بہرحال حالات بہت پیچیدہ ہیں۔ موجودہ حالت کا دوام خطرناک ہے اور دیر تک نہیں رہ سکتے۔ یہی معاشرے کا قانون بھی ہے۔

18 جولائی: آج نجیب جان نے مجھ سے کہا کہ وکیل نیک محمد (نجیب کا بہنوئی) نے میر اکرم بلوچ اور مراد بزنجو کو گھر مدعو کیا تھا لیکن میرے (نجیب کے) جانے کی وجہ سے دعوت منسوخ کی اور انھیں خیبر ریسٹورنٹ لے گیا۔ اُن سے کہا آپ لوگوں کے ساتھ حکومت کا رویہ کیسا ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ مدد سے ہاتھ کھینچ لیا گیا ہے۔ اجمل تنہا رہ گیا ہے، لیڈروں کا اعتماد کھو چکا ہے اور اب کچھ نہیں کر سکتا۔ آپ لوگوں کے ساتھ اس کا سلوک کیسا ہے؟ اس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ حکومت اور اجمل کے ساتھ تعلقات اچھے ہیں، ہمیں ان پر کوئی اعتراض نہیں اور ہمیں ان پر مکمل اعتماد ہے۔ یہ باتیں بعد میں مراد نے نجیب کو بتائیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ نیک محمد یقیناً کسی سے وابستہ ہے اور اسے ذمہ داری سونپی گئی ہے کہ بلوچوں کو پختونوں اور افغانستان سے بدظن کیا جائے اور دشمن کا منصوبہ کامیاب بنائے۔ نیک محمد، نجیب سے لڑا اور کہا کہ آپ لوگ سوویت یونین کے ایجنٹ ہیں، لیکن اس مرتبہ ہماری باری ہے، پھر آپ سے سمجھ لیں گے۔ اجمل بھی کچھ نہیں کر سکتا، وہ پرچم کا ایجنٹ ہے۔ باچا خان سے موصوف (اجمل خٹک) کو میں نے متعارف کرایا اور اب وہ بڑی بڑی باتیں کرتا پھر رہا ہے۔

20 جولائی: آج امبار اتمان خیل سے ایران شاہ 'سرخ پرچم' (کمیونسٹ پارٹی کا اخبار) کے چند شمارے اور ساتھ نازش اور افراسیاب کے خطوط لایا۔ خطوط 22 جون کو لکھے گئے تھے یعنی ایک ماہ بعد ہمیں ملے۔ ان میں سپریم کورٹ میں جام ساقی، عطاء اللہ مینگل اور غوث بخش بزنجو کے حلفیہ بیانات شامل ہیں۔ نازش کا خط اجمل کے خط کے جواب میں ہے، جو اس نے اپنی ڈائری میں ثبت کیا ہے، تفصیلی خط بعد میں آئے گا۔ انھوں نے قلم خان (ہمیش خلیل) کی 14 جولائی والی بات کی تائید کی جو کہتا ہے کہ: پاکستان میں گیارہ جرنیلوں کا اجلاس ہوا، جس میں پیپلز پارٹی کے چند آدمیوں نے بھی شرکت کی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ بھٹو کی جگہ سامراج کی مدد سے چہروں کی تبدیلی

کی جائے اور کسی اور کو برسر اقتدار لائیں۔ اس میٹنگ کا مقصد ایک قومی حکومت تشکیل دینا ہے، جس میں متحدہ جمہوری محاذ اور نیپ کا دایاں بازو بھی شامل ہو۔ اس سب سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ بھٹو کے اوسان خطا ہو چکے ہیں۔ یو ڈی ایف کا کنونشن اس رجعت پرستانہ سازش کو عملی جامہ پہنانے کی طرف ایک قدم تھا، مگر یہ سازش بروقت ننگی ہو گئی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ حکمران طبقے کے اندر اختلافات کے نتیجے میں ہو رہا ہے۔

ایران شاہ کہتا ہے کہ افراسیاب اور شیر محمد اس کے ساتھ آٹھ دن تک رہے۔ پھر میاں صاحب کے بیٹے پرویز اور اس کے بھائی نے مل کر انھیں اکٹھا پڑانگ غار کے راستے میاں صاحب کے گاؤں تک پہنچایا۔ چونکہ میاں صاحب کی والدہ محترمہ فوت ہوئیں تھیں، اس لیے انھیں دوسری جگہ ٹھہرایا گیا۔

مظفر مہمند آیا، وہ سید مختار کا خط لایا ہے۔ اس نے مختصر الفاظ میں لکھا ہے کہ آپ لوگوں کی خواہش اور تقاضے کے پیش نظر ہم مہمندوں کے علاقے میں کام کرنا چاہتے ہیں، مگر اس سلسلے میں امداد کی توقع رکھتے ہیں۔ [وقت گزرنے کے بعد اس کام کا کچھ معلوم نہ ہوا کہ شروع بھی ہوا یا نہیں]

9 ستمبر: ڈاکٹر نجیب نے فون کیا کہ ایک مہمان آیا ہے۔ میں جب گیا تو میاں صاحب کا بیٹا شیر شاہ آیا ہوا تھا۔ کوئی پیغام لے کر نہیں آیا تھا، بلکہ باپ سے ناراض ہو کر یہاں اجمل خٹک سے مشورے کے لیے آیا تھا۔

16 ستمبر: میاں شاہین شاہ اپنے بیٹے شیر شاہ کے پیچھے آئے۔ وہ سلیم کوڈا خیل کے گھر مقیم ہو گئے۔ شیر شاہ کی شکایت یہ ہے کہ باپ مجھ پر ظلم کر رہا ہے، سارا کام میں کرتا ہوں اور وہ میری مدد کرنے کے بجائے میری راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں۔ گذشتہ سال میرا ٹریکٹر، ہل اور جیپ فروخت کر دی، اب بھلا میں زمینداری کا کام کیسے کروں؟ میاں صاحب کے ساتھ سیاسی مسائل الگ ہیں۔

17 ستمبر: میاں صاحب نجیب کے گھر منتقل ہوئے۔ ہم نے مل کر فلم 'زنجیر' دیکھی۔ میں اور شیر شاہ اپنے گھر آ گئے اور میاں صاحب وہیں رہ گئے۔ دوسرے دن ہم لیاقت چترالی کے گھر گئے۔

19 ستمبر: میاں صاحب سے بات چیت ہوئی۔ انھیں شکایت ہے کہ ہم انھیں عمداً تنہا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ میں نے موصوف سے کہا کہ آپ لوگ (سید مختار وغیرہ) سبوتاژ اور

تخریبی کارروائیوں کی مذمت کرتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ ولی خان اور بیگم نسیم ولی خان سی آئی اے کے ایجنٹ ہیں۔ پی ایس ایف کو ختم کرنے کی نیت سے حیات شیر پاؤ کو یونیورسٹی میں قتل کیا۔ حالانکہ شیر پاؤ کی موت سے نیپ پر پابندی لگی، ولی خان پھانسی کے تختے پر کھڑا ہے، بیگم نسیم ولی کی نگرانی کی جارہی ہے اور حکومت کی کوشش ہے کہ اس قتل میں انھیں ماخوذ کریں۔ اس پر میاں صاحب نے جواب میں کہا کہ نہیں آپ لوگ ہماری مدد نہیں کرتے۔ میں نے کہا کہ مدد تو اس قدر ہے کہ ہم اور بسم اللہ نے مشترکہ طور پر افراسیاب سے کہا کہ جاؤ اور قبائلی علاقے کو مرکز بناؤ، وہ امداد جو بسم اللہ سے کی جاتی ہے، آپ کو بھی دیں گے۔ آپ کی تنظیم بلاواسطہ ہم سے منسلک ہوگی اور پختون زلمے کا اس سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ البتہ ولی خان اور داؤد خان کی پالیسیوں کے خلاف عمل نہیں کروگے۔ چوں کہ وہ اپنے فیصلوں میں آزاد نہ تھا تو یہ سب قبول نہ کیا اور نجیب وغیرہ سے جھوٹ کہا کہ ہم اس کی مدد نہیں کررہے۔

خود آپ نے ہی ایک برس قبل شمس بونیری کو دھماکے کرنے سے منع کرنے کی کوشش کی تھی، جس پر میاں صاحب سیخ پا ہوگئے۔ پہلے کہا میں تو شمس سے بالکل ملا ہی نہیں ہوں، بعد میں اقرار کیا کہ ہاں ایک سال پہلے سید مختار والوں کے حجرے میں ملا تھا لیکن میں نے اس سے کوئی ایسی بات نہیں کی تھی اور آپ لوگ بھی ساتھیوں کی باتوں پر یقین نہیں کرتے اور فضول لوگوں کی بات فوراً مان جاتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ مجھے تنہا کررہے ہیں!

بہت بحث ہوئی، معلوم ہوتا ہے کہ میاں صاحب ناراض ہوتے جارہے ہیں۔ میں نے گفتگو کا موضوع بدل دیا اور کوشش کی کہ وہ خوش ہوکر اٹھیں۔ میں نے میاں صاحب کو یاد دلایا کہ بھٹو سے مخاصمت کی پالیسی بھٹو کے ساتھ آئینی سمجھوتہ کے مسترد ہوجانے کے وقت ہمارے ساتھیوں نے ترتیب دی تھی وراب اس مخاصمت کی خود مخالفت کررہے ہیں۔

28 ستمبر: میاں صاحب اور ان کے فرزند شیر شاہ کے ہمراہ وزارت زراعت کے کوآپریٹو کے ڈایریکٹر جنرل، نیک زاد کی جیپ میں صبح تڑکے جلال آباد کے لیے روانہ ہوئے۔ میاں صاحب اور شیر شاہ اپنے گاؤں کے لیے رخصت ہوئے اور میں واپس آگیا۔

17 اکتوبر: محمد نعیم کے ہاتھ میاں صاحب اور سرفراز کے نام خطوط بھجوائے۔

26 اکتوبر: کوڈاخیل، مہمند ایجنسی اپنے ساتھیوں کو انگریزی جریدہ 'ڈیموکریٹک پاکستان'،

پشتو جرائد 'وگمہ'، 'چلوا کئی ٹروَن' کے تین بنڈل بھجوائے۔

11 دسمبر: میاں شاہین شاہ اور شیر محمد پہنچ گئے۔

9 مئی 1976: آج میں نے سارا دن پرچم کے پیغامات کو ترجمہ کرنے میں گزارا۔ یہ برادر بین الاقوامی پارٹیوں پر 'خلق' کی اشتعال انگیز سرگرمیوں اور پیغامات کا اثر زائل کرنے کے لیے لکھے گئے تھے۔ رات ڈاکٹر پکتیاوال کے ساتھ کراچی میں 'پشتنی تجارتی بینک' کے مدیراعلیٰ حیدری صاحب کے گھر گئے، جو آرمی میں لازمی خدمت کے بھرتی کے سلسلے میں آیا ہے۔

14 مئی: جمعہ اور چھٹی کا دن۔ لوگ پکنک اور سیر وتفریح کے لیے جارہے ہیں۔ میری قسمت میں یہ سکون اور خوشحالی کہاں۔ آج صبح میر اسلطان علی کشت مند اور نور احمد نور سے وعدہ تھا۔ کچھ دنوں سے ان کے لیے لکھنے لکھانے اور تراجم میں مصروف ہوں۔ ترجمے کا کام مکمل ہو چکا، لیکن آج ٹائپسٹ کی مدد سے سب کو ٹائپ کررہا ہوں۔ مجھے چاہیے تھا کہ میں سٹنسل سے پہلے ٹائپ شدہ کاپیاں پڑھوں لیکن یہ کام بہت دشوار تھا۔ مجھے علم نہ تھا کہ یہ لوگ بھی اوروں کی طرح لکیر کے فقیر ہوں گے۔ میں نے ان کے ترجمہ میں متن کی روح کو سمونے کی کوشش کی تھی، لفظی ترجمہ نہیں کیا تھا۔ لیکن یہ فارسی متن کے ساتھ لفظ بہ لفظ انگریزی الفاظ دیکھتے رہے۔ صبح دس بجے کام شروع ہوا اور رات آٹھ بجے فارغ ہوا۔ کل کے لیے سوویت یونین پارٹی کو لکھے گئے ایک اور پیغام کا مسودہ تیار ہے، اُسے بھی ترجمہ کرنا ہے۔ فارغ ہوکر پھر نثار مظلوم صاحب کے گھر گیا۔ میں نے اس کی بیگم سے وعدہ کیا تھا کہ پانچ بجے فلم کو جائیں گے، لیکن میں پانچ کے بجائے آٹھ کے بعد پہنچا۔ لیکن اچھی بات یہ ہوئی کہ وہ بھی جب سروبی کی سیر سے واپس لوٹے تو ساڑھے پانچ بج چکے تھے اور سینما کا وقت گزر چکا تھا۔

22 مئی: نازش، سید مختار اور میاں صاحب پہنچ گئے، ناراض اور غضبناک ہیں۔

23 مئی: نجیب کے گھر مہمانوں کی خاطر گیا۔ گھر پہنچتے ہی نازش مجھ پر شکاری باز کی طرح جھپٹا۔ حملے، دھمکیاں، الزامات، ڈراوے اور انحراف اور دیگر طرح طرح کے الزام مجھ پر چسپاں کیے۔ کہہ رہا تھا کہ میں یہاں کابل میں جم گیا ہوں، شادی وغیرہ کا کوئی بندوبست ہوگیا نہیں؟ پاکستان آؤ، انڈر گراؤنڈ رہو، یہاں پر بھلا تم کیا ایسے بڑے کارنامے سرانجام دے رہے ہو۔ اور یہ کہ تم نے اپنی ذات، ساتھیوں اور پارٹی کو کچھ فائدہ نہیں پہنچایا ہے (تو کیا اب تک کی

خدمات اکارت تھیں؟) اور یہ کہ مجھے کہا گیا تھا کہ میں پاکستان آتا جاتا رہوں گا (جھوٹ اور سفید جھوٹ، ہمارے ساتھ زندہ رابطہ ہی نہیں رکھا گیا) اس کے ساتھ ایک ہی سانس میں یہ بھی کہا کہ: ''ہم آپ کو کھونا نہیں چاہتے'' پھر موصوف نے قوم پرستوں، ولی خان اور یوڈی ایف کو برا بھلا کہا۔ مسلسل الزامات کی ایسی بارش تھی کہ میرا تو سر چکرانے لگا۔

میں واپس گھر ٹیکسی کے ذریعے روانہ ہوا کہ ان مصیبتوں سے چھٹکارے کے لیے اجمل سے مل کر رہنے کا ٹھکانہ ڈھونڈوں۔ جب ٹیکسی گھر کے قریب پہنچی تو گیدڑ کے ذوالفقار کا بھائی مختار احمد آرہا تھا۔ ٹیکسی روک کر اسے ملا، معلوم ہوا مجھ سے ملنے آیا تھا، گھر میں مجھے نہ پا کر واپس جا رہا تھا۔ اس نے مجھے نعیم کے دو خط دیے جن میں سے ایک میں میرے والد محترم کے وفات کی بری خبر بھی تھی۔ (23 اپریل کو عشاء کی نماز کے وقت فوت ہوئے اور دوسرے دن بعد از ظہر دفن کیا گیا۔)

نازش کی باتوں نے مجھے ویسے ہی مضمحل کر رکھا تھا، اس پر یہ اطلاع ایک بجلی کی طرح مجھ پر گری۔ افضل نے والد کی علالت کی اطلاع دی تھی اور میں نے کوشش کی تھی کہ واپس جاؤں اور مل لوں۔ مگر اجمل نے اجازت نہ دی۔ باپ باپ ہوتا ہے اور میرے والد تو غیرت اور حمیت کے پتلے تھے۔ تن تنہا وہ محلے کے خانوں کا مقابلہ کیا کرتے۔ اپنی زمین بیچ کر ہمیں تعلیم دلائی۔ افسوس میں زندگی بھر ان کی کوئی خدمت نہ کر سکا۔ اس کا بھی صدمہ تھا کہ مجھے اپنے والد کے موت کی اطلاع بھی ایک ماہ بعد مل رہی تھی۔ مجھے اس وقت اجمل پر سخت غصہ آیا، میرا احساس اُس وقت لہولہو تھا۔ باپ کی وفات کی خبر، ساتھیوں کی دھمکی آمیز اور تلخ باتیں۔ اپنے اوپر غصہ آ رہا تھا کہ کیوں سیاست کے خار زار کا راستہ چنا۔ باپ کے جانے کے بعد ماں، بھائی، گھر، گاؤں اور مستقبل سب میری نظروں کے سامنے ایک سوال کی صورت میں آ کھڑے ہوئے اور آگے اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

24 مئی: مختار جلال آباد رخصت ہوا، وہاں سے پشاور جائے گا۔

25 مئی: [ایک سوچ اور تفکر] افغان حکومت کا جھکاؤ دائیں طرف اور پیچھے کو ہے۔ بھٹو کو آنے کی دعوت دینا کمزوری کو آشکارا کر رہا ہے۔ نیچے نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی میں پھوٹ، پی ایس ایف میں دھڑے بندی، ایسی صورتحال میں ہماری نازک پوزیشن، بظاہر نیپ کی نمائندگی اور پھر لیڈران کا ہمارے مشورے کے بغیر دائیں طرف جھکاؤ اور بائیں بازو کی انتہا پسندی، ان تمام باتوں نے

کنفیوز کر رکھا ہے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ سیاست سے مایوس اور مستقبل سے یقین اٹھا ہے۔ ایسی حالت میں یہاں رہنا فضول معلوم ہوتا ہے۔ لیکن نیچے پختونخوا میں انڈر گراؤنڈ رہ کر کام کرنا بھی مشکل ہے۔ نازش کا اصرار ہے کہ آجاؤ، مگر میں کراچی، پنجاب یا سندھ میں کام نہیں کر سکتا۔ اس سے بہتر یہ ہوگا کہ یہاں رہوں، قبائل میں رہوں اور سوویت دوستوں اور باہر کی دنیا سے تعلق رکھ کر ساتھیوں کی مدد کروں۔ البتہ اگر افغانستان پاکستان کے درمیان سمجھوتے کے نتیجے میں پاکستان میں کھلے بندوں کام کرنے کی اجازت ہو تو پھر اجمل سے مشورہ کر کے فیصلہ کروں گا۔

29 مئی: نازش کے ساتھ تفصیل سے بات ہوئی۔ موصوف مجھ سے میری سرگرمی کے متعلق تحریری رپورٹ طلب کر رہے تھے۔ خصوصاً سوویت یونین کے دوستوں کے ساتھ میری بحث و تمحیص، بات چیت، سوالات جوابات کے بارے میں رپورٹ۔ میں نے ایسی سرگرمیوں کی اطلاع پارٹی کو نہیں دی تھی جو اصولاً مجھے دینی چاہیے تھی۔ گذشتہ دو برس میں ایسی ملاقاتوں میں بہت ساری باتیں ہوئیں، سب تو یاد نہیں رہیں، البتہ جو کچھ لکھا ہوا ہے یا یاد رہ گیا ہے اس بنیاد پر ایک مختصر رپورٹ تیار کروں گا۔

کابل پارٹی سیل کے بارے میں بات چھڑی تو میں نے کہا کہ اس موضوع پر اجمل کی موجودگی میں بات کریں گے کیوں کہ تنظیمی مسئلہ ہے۔ نازش کا آج کا رویہ گذشتہ دن سے بدلا ہوا تھا۔ نازش کی مثال بھی بس سوڈا واٹر کی بوتل کی طرح ہے۔

30 مئی: [نازش کو دی گئی رپورٹ کا متن]

'میری پہلی ملاقات دوستوں کی خواہش پر 21 اکتوبر 1974ء کو ہوئی۔ اس کے بعد ہمارا ملنا جلنا مہینے میں ایک یا دو بار یا ڈیڑھ مہینے میں ایک مرتبہ باقاعدگی سے جاری رہا۔ چوں کہ میری ان سے یہ ملاقاتیں ایک دوست کی طرح باہمی ہمدردی اور تعاون کی بنیاد پر تھیں اور پارٹی کے ذمہ دار نمائندے کی حیثیت سے نہیں (اگرچہ دوستی کی بنیاد یہی نظریاتی اشتراک اور پرولتاری بین الاقوامیت کا رشتہ ہے) اس لیے ہماری ساری بحث معلومات کے تبادلے تک محدود رہتی۔ یہ معلومات کبھی میں انھیں لکھ کر دیتا ہوں اور کبھی میٹنگ کے دوران ان کے سوالات کا جواب دینے کی صورت میں بھی۔ معلومات کا زیادہ تر تعلق پختونستان، بلوچستان اور افغانستان کے حالات سے ہوتا ہے، کوئی نظریاتی بحث نہیں ہوتی۔

دی جانے والی معلومات کے درجے ہیں۔ کچھ معلومات ایسی ہوتی ہیں جو ہم نے سنی ہوتی ہیں، کچھ ایسی ہوتی ہے جو پوری ذمہ داری کے ساتھ آگے بڑھائی جاتی ہیں اور کچھ ایسی کہ میں افواہیں سن کر انھیں افواہوں میں شریک کر لیتا ہوں۔ عام طور پر یہ ساری ملاقات یک طرفہ یعنی معلومات کی فراہمی تک محدود ہوتی ہے اس لیے شاذ ہی مجھے کسی تبصرے یا تجزیے کی ضرورت پڑتی ہے۔

تمام عرصے میں میں نے اپنی طرف سے پوری ایمانداری اور فرض شناسی کے ساتھ انھیں معلومات دینے کی کوشش کی ہے۔ یعنی ہر وہ بات جو میرے علم میں آئے اور میرے خیال میں انھیں اس سے دلچسپی ہو سکتی ہے، تو میں انھیں ضرور بتاتا ہوں۔

وہ سوالات جو ان کی دلچسپی کے ہوتے ہیں وہ یہ ہیں:

- ہمارے گھر کون کون آتا ہے؟ پختونستان اور بلوچستان کے کس قسم کے لوگ اور کس لیے آتے ہیں؟ افغانستان حکومت کا ہمارے ساتھ رویہ کیسا ہے؟ حکومت افغانستان کی کون کون سی نمایاں شخصیات ہمارے گھر آتی رہتی ہیں؟ بلوچستان میں گوریلوں کی کیا حالت ہے؟ افغانستان کس قسم کی امداد انھیں دیتا ہے؟ دشمن کی فوج کیا کر رہی ہے؟ کیا پاکستان کی فوج میں امریکی مشیر پائے جاتے ہیں؟ پختونستان کے قبائلی علاقے میں پاکستانی فوج کیا کر رہی ہے؟ افغانستان تو کسی فوجی موومنٹ کا ارادہ نہیں کر رہا؟ افغانستان میں رجعت پرستوں کا کوئی منصوبہ تو نہیں؟ تخت الٹنے کے کسی منصوبے کے بارے میں کوئی اطلاع ہے؟ ساواک وغیرہ تو نہیں آئے؟ سوویت یونین کے بارے میں حکومت افغانستان کیا ارادے رکھتی ہے؟ یہاں پر پرچم، خلق اور دیگر پارٹیوں کی کیا صورت حال ہے؟ پاکستان میں اخوانیوں کی تربیت تو نہیں ہو رہی؟ افغانستان حکومت میں کیا ممکنہ تبدیلیاں ہونے والی ہیں؟ ایران بلوچستان میں پاکستان کی کیا مدد کر رہا ہے؟ افغانستان میں پاکستان اور ایران کی کوئی نئی سازش ہمارے علم میں تو نہیں؟ اجمل خٹک داؤد خان سے کتنے عرصے بعد ملتے ہیں؟ ملاقات کس کی خواہش پر ہوتی ہے؟ ملاقات کا سلسلہ منقطع تو نہیں؟ داؤد خان کی سوچ کیا ہے؟ پختونستان اور بلوچستان میں ہماری تحریک کی کتنی قوت ہے؟ مہاجرین کی حالت کیسی ہے؟ افغان حکومت کا رویہ مہاجرین کے حوالے سے بدلا ہے یا نہیں؟ یہ اور مختلف نوعیت کے دیگر سوالات!

بنیادی نوعیت کے باقاعدہ سوال و جواب ہمارے درمیان کچھ یوں رہے:

س: کیا بلوچستان میں کمیونسٹ پارٹی لڑ رہی ہے؟

ج: کمیونسٹ پارٹی نہ صرف خود لڑ رہی ہے بلکہ اپنی بساط کے مطابق امداد بھی کرتی ہے۔

س: بلوچستان میں اور کون لڑ رہا ہے؟

ج: مینگل، بزنجو، خیر بخش مری اور ان کے زیر اثر قبائل کے علاوہ وہاں پر مقیم تعلیم یافتہ بلوچ بھی بہت فعال انداز میں جنگ میں ملوث ہیں۔ البتہ مری علاقے میں شیر محمد مری کے ذریعے ایک ماؤسٹ گروپ بھی مصروف عمل ہے، جن کا نمائندہ محمد بھابھا ہے، جو نہ بلوچ ہے اور نہ ہی مراد، وہ ان کے نمائندہ کے طور پہ کابل میں مقیم ہے۔

س: ڈاکٹر ہنری کسنجر افغانستان کیوں آیا تھا اور یہاں اس نے کیا کہا؟

ج: کسنجر شائد پاکستان اور بھٹو کی صفائی پیش کرنے آیا تھا۔

س: پاکستان کے قبائلی علاقوں میں فوجی نقل و حرکت کیوں ہو رہی ہے؟

ج: پاکستان بہر صورت ڈیورنڈ لائن تک پہنچنا چاہتا ہے۔

س: آپ لوگوں کا اور کس کس سفارت خانے سے تعلق ہے؟

ج: ہم بھارت اور عراق والوں سے ملتے رہتے ہیں۔ کبھی وہ ہمارے گھر آتے ہیں، کبھی ہم وہاں چلے جاتے ہیں۔

س: افغانستان آپ کو کتنی اور کس حد تک مدد دیتا ہے؟

ج: افغانستان یہاں ہمارے کھانے پینے اور مہاجرین کے رہنے اور کھانے کا بندوبست کرتا ہے۔ ہمیں اسلحہ کی صورت میں تھوڑی بہت مدد دیا کرتا تھا، جواب بند کر دی گئی ہے۔ یہ امداد اکثر 303 بور رائفل، گولیاں، دھماکہ خیز مواد، چند کلاشنکوف، چند مارٹر اور چند کاندھے پر رکھ کر استعمال ہونے والے میزائل وغیرہ پر مشتمل ہوا کرتی تھی۔

پختونستان میں ہمیں چند پرانے پستول، چند رائفلیں اور دھماکہ خیز مواد ملتا تھا۔ اب افغان حکومت کے رویے میں سردمہری ہے، صرف کھانے پینے اور رہنے سہنے کی مدد دی جا رہی ہے۔ نہ ہمیں اسلحہ ملتا ہے اور نہ ہی بلوچوں کو۔

س: آپ کے گھر بلوچ محاذ سے کون کون آتا ہے؟

ج: خیر جان بلوچ، مراد بزنجو، مہر اللہ مینگل، میر سفر خان، اسلم گچکی، میر گوہر خان، شکاری،

میر اکرم، میر ہزار خان، محمد بھابھا، منظور بلوچ، آغا سلیمان وغیرہ آتے ہیں۔

س: کیا این ڈی پی، نیپ کی جگہ لے سکتی ہے؟

ج: ہمیں اپنے ساتھیوں کی طرف سے ابھی تک کوئی رپورٹ نہیں دی گئی۔ البتہ اخبارات اور شیر باز مزاری کے بیانات سے اندازہ ہوتا ہے، کہ این ڈی پی، نیپ کا نعم البدل نہیں۔ یہ رجعت پسند، قومی جمہوری فرنٹ کا مزاج بدلنے اور اسے دائیں جانب جھکانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

3 جون 1976: ریڈیو پاکستان نے اعلان کیا کہ ذوالفقار علی بھٹو سات سے دس جون تک افغانستان کا سرکاری اور دوستانہ دورہ کریں گے۔ آج مجھے پہلی مرتبہ شک ہوا، ہوسکتا ہے یہ بے بنیاد ہو یا محض اتفاق ہو، کہ ہماری نگرانی اور تعاقب کا سلسلہ جاری ہے۔ ظاہر ہے بھٹو آنے والا ہے، حکومت ہائی الرٹ ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ پہلے سے ہی ہماری سرگرمیوں پر نظر رکھی جاتی ہو۔

آج چار بجے اپنے گھر واقع 'کارتہ سہ' سے مہمانوں کی طرف جانے کے لیے نکلا۔ 'حبیبہ لیسہ' (ہائیر سیکنڈری سکول) کے سامنے ٹیکسی کے انتظار میں کھڑا تھا کہ ایک کریم کلر کی بینز (Benz) کار، جس میں ایک خوبصورت نوجوان بیٹھا تھا، نمودار ہوئی۔ میرے سامنے پہنچ کر اس نے گاڑی کی رفتار آہستہ کی، مجھے گھورتا رہا، اور پھر آگے بڑھ گیا۔ پھر چکر کھا کر واپس آیا اور یہی عمل دہرایا۔ جب میں میکروریان پہنچا تو سید مختار اور میاں صاحب نے بتایا کہ دوپہر کو جب اجمل خٹک نکل رہے تھے تو اسی طرح کی گاڑی ان کے پیچھے پیچھے چلتی رہی۔ میں نے موٹر میں بیٹھے اس آدمی کا حلیہ بیان کیا تو انھوں نے تصدیق کی کہ بالکل یہی نوجوان تھا۔ شام کو جب میں واپس اپنے گھر آنے کی نیت سے ٹیکسی کی تلاش میں بڑی سڑک پر میکروریان کی مارکیٹ کی طرف جا رہا تھا تو وہی بینز گاڑی میرے سامنے سے گزری اور آہستہ ہوگئی۔ اس کی نمبر پلیٹ '1133 ش' تھی۔ پھر یہی موٹر میکروریان کے بیچ سے نکلی اور میرے قریب سے گزر کر مارکیٹ میں روک دی گئی۔ اب میرا شک یقین میں بدل چکا تھا۔

دوسرے دن میں میکروریان سے سوویت دوست کی طرف جانے کے لیے ٹیکسی میں سوار ہوا تو پھر اسی طرح کی صورت حال کا سامنا تھا۔ ایک موٹر ہماری ٹیکسی کے آگے سے گزری تو ڈرائیور نے کہا کہ یہ بندہ پولیس والا ہے۔ قندھاری ہے، زانی اور عیاش ہے اور میکروریان میں قیام پذیر ہے۔ یوں میرا شک مزید پختہ ہوگیا۔

انھی دنوں ہمارا نجیب کے گھر جانا، سید مختار اور نازش کی وہاں آمد و رفت اور پھر پرچم لیڈران کی وقت بے وقت آمد و رفت بہت بڑھ گئی تھی۔ اس نے حکومت کو اور بھی مشکوک کر دیا۔ نجیب کے گھر کی نگرانی تو خیر فطری بات تھی، لیکن پرچم کے تمام لیڈران پر نظر رکھی جاتی ہے۔

4 جون کو جمعہ کے دن میکروریان میں کامریڈوں کے ساتھ تھا کہ میاں صاحب نے کانا پھوسی کرتے ہوئے یہ بات بتائی کہ این ڈی پی میں حالیہ پھوٹ کی وجہ ہمارے ہی ساتھی ہیں۔ اس نے کہا یہ بات میں ان کے سامنے کہوں تو یہ غلط مطلب لیں گے اور میں ڈسپلن کا پابند ہوں۔ میں اس موضوع پر ایک مفصل رپورٹ لکھ رہا ہوں، واپس جا کر بھجوا دوں گا یا خود لے کر آؤں گا۔

آج نازش نے پرچم لیڈران سے ملنے کا وقت مقرر کیا تھا اور وہ بھی نجیب کے گھر میں۔ میں نے بار بار سمجھایا تھا اور پرسوں نجیب کو اپنے ساتھی لیڈران کے پاس بھیجا تھا کہ یہ گھر اس کام کے لیے غیر موزوں اور غیر محفوظ ہے۔ پھر بعد میں سردار داؤد خان نے خود نجیب کے والد اختر محمد خان سے شکایت کی کہ تمہارے بیٹے دن رات حکومت مخالف سرگرمیوں میں ملوث ہیں، انھیں سمجھاؤ۔ اس کا مطلب کیا تھا؟ بے چارہ نجیب تو خود دو تین ماہ پہلے لازمی عسکری ملازمت میں تھا، اُس نے خود کوئی فعالیت نہیں کی تھی۔ یہ تو گذشتہ دنوں میں نازش کی آمد و رفت، وہاں قیام اور پرچم کی مرکزی کمیٹی کے اراکین کا متواتر آنا جانا اور پھر اجمل اور میرا وہاں پر جانا ایسے امور تھے جن کی رپورٹ صدر داؤد کو پہنچائی گئی تھی۔ تو اس کا مقصد اور کیا ہوسکتا ہے؟ ہمیں شرمندہ اور بے اعتبار کرنا ہے، جو ہمارے ہاتھ پاؤں باندھنے کے مترادف ہے۔ ہمیں اتنا ذلیل کرنا ہے کہ یہاں کابل میں ہماری جگہ بالکل نہ رہے۔

15 جون: مجھے تین سال بعد سید مختار سے معلوم ہوا کہ مجھے صوبائی کمیٹی کی رکنیت سے معطل کیا گیا ہے اور جب محترم واپس تشریف لے جائیں گے تو میری رکنیت کے بارے میں صوبائی کمیٹی سے فیصلہ لیں گے۔ اس سے پہلے صوبائی کمیٹی میں سید مختار، اجمل، افراسیاب اور میں تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پارٹی ان کی جیب میں ہے۔ جسے چاہیں معطل کریں، جسے چاہیں رکن بنائیں۔ میرے یہاں آنے کے دو ماہ بعد جب میں واپس گیا تو نازش سے ملا اور اس نے مجھے اس معطلی کی کوئی بات نہیں کی۔ پھر جب سائیں عزیز اللہ اور رؤف وارثی آئے تو ان کے ساتھ فیصلے ہوئے اور اس کے بعد تین مرتبہ میاں صاحب، دو مرتبہ افراسیاب اور خود سید مختار محترم

آئے لیکن کسی نے میری معطلی کا تذکرہ تک نہیں کیا۔ قاعدہ تو یہ ہوتا ہے کہ معطلی سے پہلے جواب طلبی ہوتی ہے اور اس کا جواب دیا جاتا ہے۔ اس قاعدے وطریقہ کار پر عمل نہیں کیا گیا اور مجھے میری معطلی کے بارے میں اطلاع بھی نہیں دی گئی۔ یہ بے اعتمادی کی انتہا ہے۔ اب میں اپنی سرنوشت کے بارے میں خود فیصلہ کروں گا۔ جن کا آسرا تھا، جب وہ ہی اس قدر بے اعتبار ہو جائیں تو پھر ان میں گھسے رہنے کا کیا فائدہ؟ ان تین سالوں میں میں نے کیا کچھ نہیں کیا!

ملک کی سیاست سے جڑا رہا اور سب سے زیادہ ذہنی اور جسمانی طور پر اس میں شریک ہوا۔ میں نے جس سے بات کی، ڈسپلن کا خیال رکھا۔ کیا پتا تھا کہ پیچھے سے اپنے ہی ساتھی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیں گے۔ میں تو درکنار، اجمل تک کو اس کی اطلاع نہیں دی گئی۔ اگر حالات یہی رہے تو یہ پارٹی صوبہ میں سید مختار اور کراچی میں چند احباب کی جیب کی گھڑی بن جائے گی۔ ان کے ساتھ نظریاتی طور پر آخر تک جانا بہت مشکل ہے۔ اب تین سال بعد یہ میری معطلی کے بارے میں ازسرنو غور کریں گے۔ میں اپنی معطلی سے مطلع ہوں اور نہ ہی بحالی کی درخواست دی ہے۔ ان کا جو جی چاہے کریں۔ مجھے ان کی اس لیے پروا نہیں کہ یہ قابل اعتبار لوگ نہیں۔

16 جون: میں نے نازش کو مرکزی کمیٹی کے نام ایک احتجاجی خط لکھا جس میں دریافت کیا کہ جب میں رکن ہی نہ تھا تو کس حیثیت میں ابھی تک سائیں عزیز اللہ، سید مختار، رؤف وارثی، میاں صاحب اور افراسیاب کے ساتھ میٹنگز کرتا رہا۔ کیوں میں نے عزیز اللہ، رؤف وارثی اور اجمل کے ساتھ مل کر پارٹی کا خارجہ امور کا سیل بنایا۔ پارٹی کے احکامات، ہدایات، اسناد اور لٹریچر مجھے کیوں بھیجا جاتا رہا۔ اور یہ کہ میں نے یہ سارے رابطے کیوں رکھے، جب کہ میں تو پارٹی کارکن ہی نہ تھا!

16 جون کو نازش، سید مختار اور میاں شاہین رخصت ہوئے۔ ہم ایک قبائلی سیل بنائیں گے جس کا ذمہ دار میں ہوں گا۔ میں وقتاً فوقتاً رپورٹ بھیجوں گا اور یہاں سوویت دوستوں سے ان کے ساتھی کی حیثیت سے اطلاعات کا تبادلہ کروں گا۔ بعض ساتھیوں کی تعلیم وتربیت بھی میرے ذمہ ہوگی۔ پرچم کے ساتھیوں کے ساتھ قریبی تعلق رکھوں گا۔

25 جون: نازش کے فیصلے کے مطابق ببرک کارمل سے ملاقات۔ آئندہ کے لیے اجمل کے ساتھ خفیہ ملاقاتوں کے لیے جگہ اور وقت کا تعین کرنے اور بیرونی دنیا کو محفوظ ڈاک بھجوانے کے

بارے میں کارمل صاحب سے بات چیت ہوئی۔ کارمل صاحب کا کہنا ہے کہ:

- ایسے اشارے مل رہے ہیں کہ افغانستان مغربی دنیا سے قریب ہوتا جا رہا ہے۔ سردار نعیم کا امریکا اور فرانس کا حالیہ دورہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔
- سوویت یونین کے ساتھ تعلقات اچھے ہیں، انھیں برا نہیں کہا جا سکتا۔ مگر بہت اچھے بھی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مزید خراب ہوں گے اس کی وجوہات یہ ہیں:

۱۔ ایران کا اثر بڑھ رہا ہے، ان کی امداد آتی ہے اور وہ اپنے ایجنٹ بنا رہے ہیں۔ باتوں کی حد تک تو حکومت اور داؤد خان ایران کو برا بھلا کہتے ہیں مگر عملاً بہت قریب آ چکے ہیں۔ یہاں پر زیادہ خطرہ پاکستان سے نہیں ایران سے ہے۔

۲۔ افغانستان کا شمالی علاقہ ابھی تک مغرب کی امداد اور منصوبوں سے محفوظ تھا۔ یہاں پر صرف سوویت منصوبوں پر اُن کے ماہرین مصروف عمل تھے۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امریکا دس مراکز صحت بنا رہا ہے اور تیل کی تلاش بھی جاری ہے۔

۳۔ داؤد خان تجربہ کار شخص ہے۔ یہاں تک کہ چند وزراء مثلاً قدیر نورستانی، عبداللہ اور وحید عبداللہ کے علاوہ دیگر وزراء اپنی حکومت کا دفاع نہیں کر سکتے۔ ایسی حالت ظاہر شاہ کی حکومت میں نہیں آئی تھی۔ رشوت، بدعنوانی، خیانت، عدم ذمہ داری، حکومتی اداروں میں انتہائی حد کو چھو رہی ہے۔ مہنگائی بڑھ گئی ہے اور عوام حکومت سے نالاں ہیں۔

۴۔ بھٹو کی آمد سے عام طور پر پختون ناراض ہیں، کہتے ہیں کہ پختونستان کا نام بھی بیچ ڈالا۔ غیر پختون بھٹو کے آنے سے خوش ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ حکومت سے بھی خوش ہیں۔

۵۔ ہماری (پرچم کی) آئینی تجاویز نے ایک بڑی حرکت کو جنم دیا ہے۔

۶۔ خلقی رجعت اور حکومت کے دائیں بازو کے ساتھ ہم آہنگی کی سازش میں مصروف ہیں۔ اس میں کوئی شک باقی نہیں رہا کہ وہ ایجنٹوں کا کردار ادا کر رہے ہیں۔

۷۔ اجمل ہماری موومنٹ اور نظریہ کی مظہر شخصیت ہیں، ان کی حمایت بہر صورت کرنی چاہیے۔

۸۔ آپ جیسے لوگوں کی برکت سے، ہم نے نازش جیسے محترم رہنما سے برادرانہ اور یک جہتی کے ماحول میں بے تکلف باتیں کیں۔

۹۔ ہم اجمل پر اعتماد کرتے ہیں۔ دشمن کی توجہ ان کی طرف ہے، حکومت ہم سے زیادہ ان کی نگرانی کرتی ہے۔

۱۰۔ عزیز اللہ واصفی (وزیر زراعت)، قیوم وردگ (وزیر تعلیم)، مجبی (یونیورسٹی وائس چانسلر) ہمارے اور اجمل کے شرمناک حد تک مخالف ہیں۔ نیپ کی بھی مخالفت کرتے ہیں اور یہاں تک کہ پختونوں کے نام سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔

۱۱۔ کوشش ہو رہی ہے کہ رجعت پسندوں اور دائیں بازو والوں کی مدد سے داؤد خان کی موجودگی میں یا اُس کو ہٹانے کے بعد ہم پر کاری ضرب لگائی جائے۔

۱۲۔ جنید اور اس کی بہن شریفہ شریف نے کہا ہے کہ ہمیں اجمل نے کہا ہے کہ پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی کی ضرورت ہے اور نیپ کو کمیونسٹ پارٹی میں تبدیل کر دیا جائے۔

۱۳۔ جنید کہتا ہے کہ مجھے داؤد خان نے بلایا تو میں نے اجمل کو بتایا کہ شائد داؤد خان مجھے دوبارہ بلائے۔ یہ سن کر اجمل نے بھری محفل میں کہا کہ اگر دوسری مرتبہ جاؤ تو مجھ سے مل کر جانا، میں تمہیں داؤد خان کی خصوصیات سے آگاہ کروں گا۔ کارمل صاحب کا کہنا تھا کہ جنید وزیر مخابرات عطائی (جاسوسی دفاعی امور) اور ریڈیو افغانستان کے اکرم عثمان کے ساتھ ایک حلقے میں شامل ہیں۔ وہ اپنے آپ کو جمہوریہ کی پارٹی کے بائیں بازو سے متعلق ظاہر کرتے ہیں۔ دراصل یہ لوگ اپنے آپ کو مارکسی کہتے ہیں مگر ہیں کمیونسٹ دشمن اور حکومت کے ایجنٹ۔

- چند دن پہلے ایران سے ایک وفد آیا تھا۔ بہت جرنیلوں سے ملا۔ وفد کے لیڈر ایرانی جرنیل نے کھلے عام کہا کہ کمانڈر انچیف حیدر رسولی ایک عظیم شخصیت، بڑا سیاستدان اور فوجی کمانڈر ہے۔ وہی حیدر رسولی جو حکومت میں رجعت پسند گروہ کا سرغنہ تھا۔
- آرمی میں کوشش ہو رہی ہے کہ سارے شریف عناصر، یعنی جو بھی باضمیر ہو اور اپنی ذمہ داریاں دیانت سے ادا کرتا ہو،، اسے ہٹایا جائے یا غیر اہم جگہوں پر تعینات کیا جائے۔ ان کی جگہ انتہائی بدعنوان، غدار، راشی اور ظالم عناصر کو نوازا جا رہا ہے۔ حکومت اور نعیم خان نے فیصلہ کیا ہے کہ اپنے آپ کو ایسے ہی عناصر کے ذریعے بچائیں۔

9 جولائی: ایران شاہ آیا۔ سرخ پرچم وغیرہ ساتھ لایا ہے۔ معلوم ہوا کہ ساتھی بخیریت پہنچ گئے۔ ایران شاہ کا کہنا ہے کہ اجمل خٹک نے مجھے ایک 'پنج پیری' سمجھا جب کہ میں ذاتی طور پر ایسی

باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔ البتہ میرے باپ نے ایک پنج پیری ملا کو پناہ دی تھی، جس سے بڑا ہنگامہ ہوا تھا۔ موصوف کہتا ہے کہ میں اکیلا اور نہتا آتا جاتا ہوں اور قبائلی علاقہ میں ہر وقت خطرہ رہتا ہے تو میرے لیے ایک پستول کا بندوبست کیا جائے۔

30 اگست: آج میاں شاہین تورخم کے راستے پہنچ گیا۔ موصوف نے پارٹی سے تین مہینے کی چھٹی اس مقصد کے لیے لی ہے کہ بیمار ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ پریشان بھی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں پر اس سے کوئی صلاح مشورہ نہیں کرتا۔ سارا کام سید مختار کرتا ہے اور اس پر اعتماد نہیں کرتا۔ دوسرے یہ کہ این ڈی پی کے ٹوٹنے پر ناراض ہے، اس کے ساتھ کسی نے مشورہ نہیں کیا۔ اب یہ یہاں مشورہ کرنے آیا ہے کہ اس کا طرز عمل کیا ہونا چاہیے۔

9 ستمبر: آج میں اور میاں صاحب نجیب کے گھر بیٹھے تھے کہ ریڈیو سے یہ خبر نشر ہوئی کہ ماؤزے تنگ طویل بیماری کے بعد چل بسے۔ ماؤ کچھ عرصے سے بیمار تھے اور بیرونی دنیا کے لیڈروں سے ملنا ملانا بند کیا تھا۔ اس سے پہلے جنوری میں 'چو این لائی' اور کچھ عرصے بعد 'چو تے' کا انتقال ہوا تھا۔ دونوں بلکہ تینوں چین کی عظیم ہستیاں تھیں۔ مگر ان میں 'ماؤ' کا قد کاٹھ سب سے بڑا تھا بلکہ اس صدی کی عظیم شخصیتوں میں سے تھے۔ آں جہانی ایسی شخصیت تھے کہ اس کی موت سے ایک وقت میں خوشی اور اداسی کے جذبات امڈ آئے ہیں۔ اس کے فکر و عمل کے مخالف خوش اور موافق رنجیدہ ہوں گے۔

'ماؤ' کون تھے؟ اس کی زندگی زحمت کشی، محنت، سختیوں، جدوجہد، عزم مصمم اور بلند حوصلے سے عبارت تھی۔ آں جہانی نے ایک افیمی اور گرے ہوئے چین کو اٹھا کر دنیا کے مہذب ممالک کا ہم پلہ بنا دیا۔ دنیا کی آبادی کا ایک چوتھائی حصہ بیدار کیا، ان کو اپنے حقوق کا شعور دیا اور اپنے آپ پر بھروسہ دلایا۔ اس تاریخ ساز شخصیت کے فکر و عمل سے، دشمن اور دوست دونوں انکار نہیں کر سکتے۔

مگر آں جہانی بین الاقوامی کمیونسٹ تحریک میں پھوٹ ڈالنے کے ذمہ دار گردانے جاتے ہیں اور یہ بہت بڑی تاریخی غداری ہے۔ اگر اس کے انحرافات نہ ہوتے تو ہوسکتا ہے کہ آج دنیا موجودہ حالت میں نہ ہوتی اور خاص طور پر، ہم جن محرومیوں اور عدم اطمینان سے نبرد آزما ہیں، یہ سب کچھ ایسا نہ ہوتا۔ سب بہت خوش اور مطمئن ہوتے۔

سوویت دشمنی نے آں جہانی کو عملاً سامراج کے ساتھ مصالحت اور گٹھ جوڑ کی طرف دھکیل

دیا۔ چلی، سوڈان، انڈونیشیا، انگولا، پختونستان، بلوچستان اور بنگلہ دیش میں اس نے امپیریلزم کی مدد کی۔ بہرحال اس کے موثر، منفی یا مثبت، عالمی کردار سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

باہر دنیا اور خاص طور پر چین میں اس کے دوستوں کی کوشش ہوگی کہ اُن ہی کی پالیسی، لائن اور فکر کو جاری و ساری رکھیں، تاہم مخالفین کو امید ہے کہ چین کی موجودہ عوام دشمن پالیسی میں تبدیلی آئے گی۔ امید ہے کہ چین مستقبل قریب میں از سرِ نو بین الاقوامی کمیونسٹ تحریک سے جڑ جائے گا۔ یہ کوشش چین میں اور تیز ہو جائے گی اور جو بھی صورت ہو، لیکن ان دو قوتوں کے باہمی ٹکراؤ سے چین بحران کا شکار ہوگا۔

[ڈاکٹر نجیب کے بارے میں ایک بات کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ جس وقت مرحوم میڈیکل کالج سے فارغ ہوا، ڈاکٹر بنا، ہاؤس جاب کی اور لازمی عسکری خدمات سرانجام دیں۔ وزارت صحت عامہ نے اس کی تعیناتی صوبہ بادغیس کے بالا مرغاب کے علاقے میں کی۔ مرحوم کے ذمہ کابل شہر کی پارٹی کمیٹی تھی۔ اس تعیناتی پر پرچم راضی تھا اور نہ وہ خود۔ مرحوم کابل میں ہی ڈاکٹری کرنا چاہتا تھا۔ ان دنوں فیض محمد محسود ابھی وزارت سرحدات کے غیر اہم وزیر تھے۔ انھیں سابقہ معتبر مقام سے گرایا جا چکا تھا۔ نجیب نے مجھ سے کہا کہ میں فیض محمد سے سفارش کروں کہ وہ وزیر صحت ڈاکٹر عمر کو اس پر آمادہ کریں، نجیب کابل میں ہی اپنی خدمات سرانجام دے۔ میں نے فیض محمد سے بات کی لیکن انھوں نے درست کہا کہ یہ کام عمداً اسی لیے کیا گیا ہے کہ نجیب کو کابل سے نکال کر چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ اس کے جواب میں نجیب نے بالا مرغاب جانے سے اجتناب کیا اور اپنے آپ کو فقط پارٹی امور تک محدود کر لیا۔]

افغانستان اور پاکستان:

تعلقات، اطلاعات اور معلومات

اب جب میں پیچھے پلٹ کر سوچتا ہوں تو اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ بھٹو حکومت کے خلاف نیپ اور خصوصاً ولی خان کی فعال جنگ کے بے تکے اور غیر سنجیدہ اقدام سارے منطقے اور خاص طور پر افغانستان اور بڑی حد تک پاکستان کے لیے انتہائی مشکلات پیدا کرنے کا باعث بنا۔ یہ سراسر نقصان ہی کا سودا ثابت ہوا۔ اس ضمن میں بہت سے واقعات ہوئے، جو سارے میں درج نہیں کر سکا۔ 1974ء کا سال تو عسکری تربیت، تخریبی سرگرمیوں اور شدت پسند اقدامات سے مملو تھا۔ اس دوران تحریک بظاہر آگے بڑھ رہی تھی، مگر اس سال کے واقعات قلم بند ہونے سے رہ گئے۔ میری ڈائری کے اکثر مندرجات 1975، 1976 اور کسی حد تک 1977 کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس عرصے میں کبھی کبھار میں اپنے خیالات اور موصولہ معلومات درج کیا کرتا تھا، اور انھی کو اب میں اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ اس حوالے سے اپنے اس عجز کا اظہار کر دوں کہ اپنے ڈائریوں کے اندراج کی تصدیق کے لیے میں نے دیگر اخبارات، کتب اور حوالے نہیں دیکھے۔ وجہ ظاہر ہے کہ میرا مقصد تاریخ نویسی نہیں، بلکہ صرف اپنے حصے کا سچ اور اپنے احساسات آپ تک پہنچانے ہیں۔ اس کی بنیاد پر تاریخ رقم کرنا اُن کا کام ہے، جو تاریخ نویسی کے شعبہ سے وابستہ ہیں۔

30 دسمبر 1974 : پاکستان اور افغانستان کے تعلقات انتہائی کشیدہ ہیں۔ اجمل اور میں وزارت خارجہ کے سیاسی امور کے ڈپٹی منسٹر (اس وقت وزارت کا عہدہ خود داؤد خان نے اپنے پاس رکھا ہوا تھا، مگر اس سے متعلق تمام امور اس کا بھائی سردار محمد نعیم چلا رہے تھے) وحید عبداللہ سے ملنے ساڑھے پانچ بجے بعد از ظہر وزارت خارجہ کے دفتر گئے۔ پاکستان کی کوششوں کے جواب میں موصوف نے لکھ بھیجا ہے کہ: ''اگر حسن نیت موجود ہو تو تمام امور پر فیصلے ہو سکتے ہیں اور پروپیگنڈا بند کیا جا سکتا ہے۔'' اس کا جواب ابھی تک پاکستان نے نہیں دیا۔

جناب سردار نعیم خان نے چین کے دورہ میں وزیر خارجہ سمیت کئی لیڈران سے بات چیت کی۔ چینیوں نے کہا:

- بلوچوں اور پختونوں کا مسئلہ امپیریلزم کی باقیات اور میراث ہے۔
- اس تنازعہ میں چین غیر جانبدار ہے۔
- افغانستان کو پاکستان کے ساتھ بلاواسطہ بات کرنی چاہیے۔

یہ تینوں باتیں بہت اہم ہیں۔ یہ براہ راست پاکستان کے موقف کی حمایت نہیں کرتیں، یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے خارجہ امور کے وزیر مملکت عزیز احمد، چین سے افغان وفد کی واپسی کے بعد، ٹوکیو سے، پہلے سے طے شدہ پروگرام کے بغیر، براہ راست بیجنگ پہنچے ہیں۔

پاکستان کے سرکاری دعوت نامے کے جواب میں افغانستان نے کہا ہے کہ یہ دعوت نامہ ہی حسن نیت پر مبنی نہیں ہے۔ اگر حسن نیت موجود ہو تو سب سے پہلے قیدیوں کو رہا کیا جائے، بلوچ اور پختون لیڈروں سے بات چیت اور مفاہمت کی جائے۔ بصورت دیگر ہم اسے محض ایک چال سمجھیں گے۔ پاکستان نے اس کا بھی ابھی تک کوئی جواب نہیں دیا۔

8 فروری 1975: افغانستان کے مشورے کے بغیر حیات محمد خان شیر پاؤ کے قتل نے پاکستان کو غضب ناک اور افغانستان کو ناراض کیا ہے۔ اس قتل نے خود ولی خان کی قوت اور اس کی مقدار کو ننگا کر دیا ہے۔ موصوف اور دیگر لیڈران کی گرفتاری اور نیپ پر پابندی پر، عوام تو دور کی بات، اس کے حمایتیوں نے کسی قسم کا ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ اس پر افغانستان نے بھی گیئر بدلنا شروع کر دیا ہے۔

26 اپریل: آج صدر مملکت محمد داؤد خان شہنشاہ ایران کی دعوت پر ایران کے سرکاری دورے پر روانہ ہوئے، یہ ایک اہم دورہ ہے جو افغانستان کی مستقبل کی سیاست پر گہرا اثر ڈالے گا۔ پاکستان سے مصالحت ہوگی یا جنگ، اس کا تعلق براہ راست اس دورے سے ہے۔ جنگ کے لیے ہم آمادہ نہیں اور مصالحت ہماری شرائط پر ہونا ممکن نہیں۔ خدا کرے کہ یہ دورہ ہمارے لیے سفارتی، سیاسی اور انقلابی کامیابیاں لے کر آئے۔

30 اپریل: چار روزہ دورہ ایران کے بعد صدر داؤد آج واپس ہرات پہنچ گئے۔ کل کابل آئیں گے۔ ایران چاہتا ہے کہ پاکستان اور افغانستان کا تنازعہ حل ہو جائے۔ مصالحت اگر ایک طرف ایران کے حق میں ہے تو دوسری طرف افغانستان کے استحکام کے لیے بھی وقت درکار ہے۔ مگر مصالحت کس کی اور کن شرائط پر؟ ایران کی خواہش تو ضرور ہوگی کہ پاکستان میں امن ہو، مگر ساتھ ساتھ بلوچ قومی تحریک بھی ختم ہو۔ دیکھتے ہیں کہ ایران میں کیا کھچڑی پک رہی ہے۔ اگر

باوقار مصالحت ہو جائے تو بری بات نہیں مگر اس کے لیے بھٹو آمادہ ہو، تب۔ اس کا انحصار ایران کے دباؤ اور اس کے حسن نیت پر ہے۔

صدر صاحب کا ہرات میں گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔ موصوف ایک عوامی لیڈر کی طرح عوام میں گھل مل گئے، مگر ان کی ہرات کی تقریر بائیں بازو والوں کو بری لگی۔ انھوں نے 'بیرونی نظریے' کے خلاف باتیں کی ہیں۔

یہاں ایک بات کا اضافہ کروں کہ کچھ عرصہ پہلے میں نے ایک ملاقات میں ایرانی سفیر کو ایک نشریہ دیا تھا۔ اس نے مجھے کہا کہ اصل میں بلوچوں اور پختونوں کے مسئلہ کے پردے میں ہم چاہتے ہیں کہ سوویت یونین کے لیے گرم پانیوں تک پہنچنے کے لیے ایک پل بنائیں۔

30 اپریل: ایک اہم واقعہ یہ ہوا کہ ویت نام کے دارالخلافہ سائگان ویت نامی حریت پسندوں کے سامنے سرنگوں ہو گیا۔ یوں امریکی سامراجیت کی ننگی جارحیت کا ایک سیاہ باب ختم ہوا۔ جس وقت سائیگان جنوبی ویتنام کے صدر جنرل بن کے حکم پر سرنگوں ہوا تو سارے شہر میں جشن برپا ہوا۔ شہر کا نام آزادی کے مرد مجاہد 'ہوچی منہ' سے موسوم کر دیا گیا ہے۔

13 مئی: صدر مملکت داؤد خان کے گھر میں ان سے ملاقات۔ اجمل، میاں شاہین، سید مختار، افراسیاب، شیر محمد اور میں۔ اس ملاقات میں ری پبلکن گارڈ کے کمانڈر ضیاء مجید بھی موجود تھے۔ ملاقات شام سات بجے شروع ہوئی اور ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہی۔ صدر صاحب نے بہت دلکش اور نصیحت آمیز باتیں کیں:

- ہندوستان کے اپنے مفادات ہیں۔ پاکستان کے ٹوٹنے کی صورت میں اگر افغانستان کی سرحد بھارت سے مل گئی تو یہ صورتحال افغانستان کے مفاد میں نہیں ہوگی۔ کیوں کہ بھارت اپنے لیے سب کچھ مانگتا ہے۔
- پاکستان ٹوٹنے کی صورت میں ایران خاموش نہیں رہے گا اور بلوچستان پر حملہ آور ہوگا۔ تاہم صدر صاحب کی نظر میں ایران میں اتنی قوت اور سکت نہیں کہ بلوچستان پر قبضہ قائم رکھ سکے۔
- جب تک قوم اپنے پاؤں پر کھڑی نہ ہو وہ دوست دشمن سب کے لیے اہمیت نہیں رکھتی۔
- میں رہوں یا نہ رہوں، افغانستان پختونستان کے مسئلے سے آنکھیں نہیں پھیر سکتا۔
- افغانستان کا وجود پختونستان کی قومی وحدت پر منحصر ہے، اگر ایک نہ رہا تو دوسرا بھی نہ رہے گا۔

- پاکستان کا وجود مصنوعی بنیادوں پر قائم ہے۔

موصوف افغانستان کی مضبوطی اور عوام کی فلاح پر زیادہ زور دے رہے ہیں، کہتے ہیں کہ ہمیں اقتصادی لحاظ سے مضبوط ہونا چاہیے، اور یہ انقلاب افغانستان کے ننگے بھوکے عوام کی بھلائی کے لیے آیا ہے۔

19 مئی: آج اطلاع آئی ہے کہ پاکستان نے خار، باجوڑ کے راستے چغر سرائے کے قریب چوٹی تک اپنی فوجوں کو تعینات کر دیا ہے، یعنی ڈیورنڈ لائن کے بالکل قریب پہنچ چکے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت پاکستان ہر قیمت پر ڈیورنڈ لائن تک پہنچنا چاہتی ہے۔

12 جون: آج معلوم ہوا کہ کل جو افغان فوجی یونٹ مشرقی سرحد کی طرف بھیجے گئے تھے، انھوں نے سات سٹریٹجک چوٹیوں پر قبضہ مستحکم کر لیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ افغانستان اور خاص طور پر داؤد خان پاکستان کی حالیہ اشتعال انگیزی اور قبائلی علاقوں میں آگے بڑھنے سے طیش میں آ چکا ہے، ممکن ہے کسی نے شہ دی ہو۔ جو کچھ بھی ہے، فضا میں گرما گرمی بہت ہے۔

13 جولائی: سنا ہے کہ افغانستان کی مرکزی انقلابی کمیٹی میں دائیں اور بائیں بازو والے اراکین کے درمیان اختلافات بڑھ گئے ہیں۔ کسی بھی وقت دونوں کے درمیان ٹکراؤ متوقع ہے۔ اگر ایسا ہوا تو سب کچھ پر، جو جمہوری انقلاب آنے سے حاصل ہوا، پانی پھر جائے گا۔ یہ بہت افسوس ناک صورت حال ہے۔

14 جولائی: ہمیش خلیل (عرف قلم خان) کے مطابق گذشتہ دنوں میں تعلیم اور صوبائی رابطہ کے وزیر عبدالحفیظ پیرزادہ کے ساتھ فوجی جرنیلوں نے خفیہ میٹنگ کی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ ایک قومی حکومت جس میں ساری پارٹیاں شامل ہوں، بنانی چاہیے۔ اس کے بعد بھٹو نے جیل میں باچا خان کے ساتھ رابطہ کیا۔ باچا خان نے جواب میں کہا کہ سیاسی باتیں ولی خان سے کریں، جہاں تک میرا تعلق ہے، مجھے خدمت کرنے کا موقع فراہم کیا جائے یا مجھے باہر جانے کی اجازت دی جائے۔ ورنہ مجھے آرام سے جیل میں سڑنے دیں۔ اس کے بعد ولی خان سے رابطہ کیا گیا، لیکن ولی خان نے کہا ہے کہ ایسی حکومت میں پختونوں اور بلوچوں کی کیا حیثیت ہوگی؟

16 جولائی: کابل میں متعین سفیر عراق نے اپنے قومی دن کے موقع پر ایک ضیافت کا اہتمام کیا تھا اور ہمیں (اجمل اور مجھے) بھی دعوت دی تھی، لیکن صدر داؤد خان نے ہمیں شرکت سے منع کر دیا۔

17 جولائی: آج جشن جمہوریت ہے۔ میں نے پریڈ میں شرکت سے اس لیے گریز کیا کہ گذشتہ برس کا تلخ تجربہ سامنے تھا۔ جب تک ایسی تقریبات میں وی آئی پی کے طور پر دعوت نہ ہو، رش اور بھگدڑ میں جانا اپنے آپ کو ذلیل کرنا ہے۔

جشن کی رات صدر مملکت نے اپنی تقریر میں گذشتہ دو برس کی تبدیلیاں گنوائیں، اور مستقبل میں کسانوں کے حق میں زرعی اصلاحات نافذ کرنے کا وعدہ کیا۔ پختونوں اور بلوچوں کے حقوق حاصل کرنے کی حمایت کا ایک بار پھر اظہار کیا۔ میں نے تقریر سننے کے بعد محسوس کیا کہ عوام کی توقعات تشنہ رہ گئیں۔ زرعی اصلاحات کے وعدے محض تقریر کی حد تک ہی ہیں، ٹھوس کام کچھ نہیں ہوا ہے۔

آئین اور پارٹی ابھی تک معرض وجود میں نہیں لائے گئے۔ صرف سال رواں میں آئین کے وجود میں لانے کی بات کی گئی ہے۔

تقریر میں دوست ملکوں کی امداد کا شکریہ ادا کیا گیا، مگر سوویت یونین کا نام نہیں لیا گیا۔

اپنی اولین تقریر یعنی 'خطاب بہ مردم' جس میں نئے نظام کے خدوخال بیان کیے گئے تھے، اس حوالے سے کچھ ارشاد نہ کیا۔

آثار و علائم بتا رہے ہیں کہ حکومت پر رجعت پسندوں کا دباؤ بڑھ گیا ہے۔ دایاں بازو غالب ہے۔ بایاں بازو ابھی تک پوری طرح سے تنہا نہیں کیا جا سکا۔ تاہم اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ حکومت پوری طرح دائیں طرف جھک گئی ہے۔ کیوں کہ ایسے حالات میں، ایسی حکومتیں یوں ہی چلا کرتی ہیں۔ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا یہ مستقبل بتائے گا۔ اب صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ بایاں بازو ناراض اور دایاں خوش ہے۔ ہمیں صرف اپنی جھونپڑی کی پڑی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ویران ہو جائے۔ اس لیے دست بدعا ہیں کہ نیپ کے ساتھ کوئی آبرومندانہ مصالحت ہو جائے۔

رات صدر مملکت نے بیرونی ممالک کے سفیروں کے اعزاز میں ایک ضیافت ترتیب دی تھی اور اس میں اجمل کو نہیں بلایا گیا جو بذات خود بہت معنی خیز ہے۔

27 جولائی: آج جلال آباد کے سیکیورٹی کمانڈنٹ کی ایک گاڑی میں جو 'اسمار' جا رہی تھی، دھماکہ ہوا۔ لغمان میں تخریب کاروں نے ایک پولیس افسر اور دو سپاہی مار دیے۔ سنا ہے کہ اور گون میں بھی اخوانیوں نے چند حکومتی کارندے، جن میں وزارت مالیہ کے افسران شامل تھے، قتل کیے۔

چند دن پہلے پنجشیر میں اسی طرح کا ایک بہت بڑا حادثہ ہوا جس میں 'اولسوال' (ڈسٹرکٹ سب گورنر) کو باندھا گیا تھا، پولیس اور فوجی عہدیداران اور افسران کو مار دیا گیا۔ 30 تخریب کار گرفتار کیے گئے ہیں جن سے اسلحہ اور بم برآمد ہوئے۔ ان سب نے پاکستان میں تربیت حاصل کیے جانے کا اعتراف کیا۔ تگاب، سروبی میں بھی دھماکے کیے گئے ہیں۔

یہ سب کس چیز کو ظاہر کر رہے ہیں؟ دشمن منظم ہو چکا ہے۔ مختلف طریقوں سے حکومت پر دباؤ ڈال رہا ہے، اس کا تختہ الٹنا چاہتا ہے یا اس کی سمت تبدیل کرنے کا خواہاں ہے، تاکہ وہ عوام کی ترقی کی راہ میں قدم نہ اٹھائے اور پختون بلوچ جدوجہد سے دستبردار ہو جائے۔ یعنی یہ سب کچھ ہماری جدوجہد کا ردعمل ہے۔

یہی سامراج کا طریقہ کار ہے، مگر ریاست کی طرف سے ایک قطعی اور فیصلہ کن اقدام کی ضرورت ہے۔ دوست اور دشمن کے درمیان تمیز ہونی چاہیے ورنہ حالات کا تلاطم سب کچھ ڈبو سکتا ہے۔ اسی دستگاہ (اسٹیبلش منٹ) سے انقلابی پاک سازی کا کام نہیں لیا جا سکتا۔ دوسری طرف حکومت کو عوام میں اپنی جڑیں بنانی ہوں گی۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو پھر افغانستان کا خدا ہی حافظ ہے۔

29 جولائی: [پنج شیر میں کارروائی] ماؤزے تنگ اور اخوان المسلمین (سید قطب، محمد قطب، مولانا مودودی) کی تصانیف ملک عظیم خان کے گھر سے برآمد ہوئی ہیں۔ اس کے گھر کے قریب ایک کھیت میں اسلحہ، بم، دھماکہ خیز مواد اور دوسرا جنگی سامان خفیہ طور پر چھپایا گیا تھا۔ وہ بھی سیکورٹی حکام کے ہاتھ لگا ہے۔ اسلحہ زیادہ تر پاکستانی، چینی اور امریکی ساختہ ہے۔ مارے گئے افراد کی شناخت، گرفتار کیے گئے کے اعترافات اور برآمد ہونے والی دستاویزات سے پتا لگتا ہے کہ اس تخریبی نیٹ ورک کے کارندے تعلیم یافتہ تھے۔ سب سے کم تعلیم کے حامل بھی دسویں بارھویں جماعت پاس تھے۔ باقی یونیورسٹی طلبہ، حکومتی کارندے تھے جن میں اکثریت وزارت پوسٹ اور مخابرات سے متعلق تھے۔ ایک قلیل تعداد ملکان کی بھی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ تخریب کاری کی شب کو امریکا اور برطانیہ کے سفراء پنج شیر علاقہ داری (تحصیل) گئے تھے اور وہاں سے گھوڑوں پر کہیں گئے، جن کا ابھی تک اتہ پتہ معلوم نہیں کہ کہاں ہیں۔ پولیس ان کی تلاش میں ہے۔

تخریب کاروں کے سرغنہ اخوان ہیں اور گمان کیا جاتا ہے کہ ان کے ساتھ شعلہ جاوید اور ستم

ملی کے ارکان بھی ہوں گے۔ برآمد ہونے والی دستاویزات سے عیاں ہے کہ ان کی منظم تنظیم ہے۔ پانچ پانچ افراد پر مشتمل ٹکڑیاں ہیں، جو سب ایک دوسرے کے وجود سے بے خبر رکھے جاتے ہیں۔ چند گروپوں کے اوپر ایک سردستہ ہوتا ہے جو دوسرے سردستوں اور گروپوں سے ناواقف ہوتا ہے۔ یہ سردستہ پھر سرحلقہ سے بندھے ہوئے تھے۔ سرحلقہ کے افراد کی تعداد معلوم نہیں۔

عظیم خان کے گھر سے برآمد ہونے والی دستاویزات سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت زیادہ پیسوں کا تبادلہ ہوا ہے۔ پکڑے گئے تخریب کاروں میں اکثریت نے پاکستان میں چار چار مہینے تربیت حاصل کی ہے۔ انھی دستاویزات میں جو نام ہیں وہ سب یونیورسٹی، کالج اور وزارت مخابرات یا ریزرو فوج سے وابستہ ہیں۔ ان کی گرفتاری کی کوشش جاری ہے، اکثر واپس پاکستان بھاگ گئے ہیں۔

آپریشن کے دوران حکومتی وائرلیس ایک نامعلوم اور طاقتور فریکوینسی والے وائرلیس کے ذریعے جام کیا جاتا رہا۔ سیکورٹی حکام (بالا حصار بریگیڈ) کو شک تھا کہ شائد امریکی یا پاکستانی طاقتور وائرلیس کے ذریعے رکاوٹ ڈال رہے ہیں اور اپنے گروپس کو ہدایات دے رہے ہیں۔

ایسے خطوط ہاتھ لگے ہیں، جن کے بارے میں قوی امکان ہے کہ پاکستان سے بھیجے گئے ہیں۔ اخوانیوں کے منصوبوں کے مطابق اس جنگ کو موسیٰ و فرعون، محمد ﷺ اور ابوجہل، ابراہیمؑ اور نمرود کے درمیان لڑائی کا نام دیا گیا ہے۔ انھی خطوط میں قرآنی آیات اور احادیث بھی نقل کی گئی ہیں، جو سادہ اور ان پڑھ مسلمانوں کے دینی جذبات کو ابھارنے کے کام آئیں۔ خطوط میں ایسے اشارے بھی ہیں کہ سازش کی کامیابی تک راز کو راز رکھا جائے۔ یہی تخریبی منصوبہ داؤد خان کی حکومت کا تختہ الٹنے اور ایک اسلامی نظام لانے کے لیے بنایا گیا تھا، جو ناکام ہو گیا۔ (ایک طرف دونوں ممالک کے درمیان مصالحت کی بات چیت چل رہی تھی اور دوسری طرف سازشیں بھی ہو رہی تھیں۔)

23 اگست: ایک اطلاع کے مطابق اب بھی پاکستان میں اخوانیوں کی تربیت ہو رہی ہے، جن کی تعداد دو سے تین سو تک ہے۔ ان میں وہ عناصر جو حالیہ تختہ الٹنے کی کوششوں سے پہلے زیر تربیت تھے، بعض بعد میں بھجوائے گئے اور بعض گرفتاریوں کے ڈر سے بھاگے ہیں، سب شامل ہیں۔

28 اگست: تین دن پہلے افغان حکومت نے تین والیوں (گورنروں) کو برطرف کر دیا۔ ان

میں بادغیس اور جوز جان کے گورنر اچھی شہرت کے ترقی پسند افراد تھے، البتہ لغمان کا گورنر فضول شخص تھا۔ لغمان کے گورنر کی جگہ ایک اچھے آدمی کو دی گئی ہے، مگر باقی دو گورنر شاہی حکومت ہی میں بدعنوانی کے الزام میں برطرف کیے گئے تھے۔ ان تبدیلیوں نے ذہنوں کو اور پریشان کر دیا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ ایسی شخصیات کے ہونے سے ہم جمہوریہ کا دفاع نہیں کر سکتے، کیوں کہ ہم ان کا تعارف عوام میں اچھے لوگوں کی حیثیت سے نہیں کروا سکتے۔

خدا خیر کرے، افغانستان کی کشتی ساحل سے بہت دور بیچ سمندر میں ہچکولے کھا رہی ہے۔ سمت کا علم ہے اور نہ ساحل کا۔ بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ناخدا بھی دیوانہ ہو چکا ہے اور قصداً کشتی کو ساحل سے دور کرتا جا رہا ہے۔

31 اگست: پختونستان کا دن منایا گیا۔ صبح پختونستان چوک میں قومی رقص (ملی اتنڑ)، پھر تلاوت قرآن، بعد میں کابل میئر کی تقریر، شعراء کی نظمیں، پرچم کشائی اور آخر میں اجمل کی فی البدیہہ تقریر، لوگوں نے تقریر کی تعریف کی۔ پھر شام سات بجے کابل ہوٹل میں وزارت سرحدات کی طرف سے ضیافت تھی، جس میں محفل موسیقی کا بھی پروگرام شامل تھا۔ پچھلے سال کے مقابلے میں انتظامات شاندار اور نسبتاً اچھے تھے، کھانا پینا وافر تھا، لوگ زیادہ تھے اور جگہ بھی وسیع تھی۔

14 ستمبر: داؤد خان کی پشیمانی۔ [صدر داؤد کی باتیں مجھے اجمل خٹک ملاقات کے بعد سناتے تھے، بعض اوقات فیض محمد خان محسود، ڈاکٹر پکتیا وال، حبیبی صاحب، پرچمیوں اور دیگر ذرائع سے بھی معلوم ہوتی رہتیں۔ ان میں سے کوئی اطلاع اہم یا دلچسپ لگتی تو ڈائری میں درج کر لیتا] اجمل سے ملاقات میں داؤد خان بول اٹھے: ''ولی خان بہت خوش فہم آدمی ہے۔ موصوف کا قول اور فعل دونوں ہی تیزی کا شکار ہیں۔ اپنی قوت کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا اور دشمن کی قوت کو گھٹا کر بیان کیا۔ حقیقت عیاں ہوگئی جب قید ہوا تو کسی نیپ والے نے بھی ردعمل کا اظہار نہ کیا۔ اگر خوش فہمی کا یہی حال رہا اور میرے مشورے کے بغیر بچگانہ کام، جیسے شیرپاؤ کا قتل، سرحدات کی تبدیلی پر لاف زنی، تشدد کی دعوت اور دیگر بدنظمیاں جاری رہیں تو میں ایک بھائی کی حیثیت سے صاف کہتا ہوں کہ میں آپ کی کسی قسم کی مدد نہ کر سکوں گا۔

باچا خان سچ کہتے ہیں کہ میں تشدد کن پر کروں؟ جو قوم تشدد نہیں کر سکتی، کس طرح ان کے ذریعے تشدد کراؤں؟ پختون قوم کی حیثیت سے تشدد کے لیے آمادہ نہیں۔ فقط ایک حصہ تشدد چاہتا

ہے، تو اس لیے عدم تشدد کا راستہ ہی صحیح راستہ ہے۔ تشدد اور پیش رفت تب ہی ممکن ہے کہ قوم بحیثیت قوم مزاحمت کرے، دوسرا یہ کہ ان کی پشت مضبوط ہو۔ پختون دونوں عناصر سے محروم ہیں۔ خود مزاحمت نہیں کرتی اور نہ کر سکتی ہے اور نہ ان کی پشت (افغانستان) مضبوط ہے۔ افغانستان اس لیے طاقتور نہیں کہ دشمن (چین، امریکا، پاکستان اور مغرب) اس کے مخالف ہیں اور دوست (سوویت یونین وغیرہ) مدد نہیں کرتے۔

اس صورتحال میں ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے اور وہ ہے مفاہمت کا۔ کیوں کہ ولی خان نے اپنی خوش فہمی کی بنیاد پر بغیر کسی پلان، پروگرام اور تنظیم کے تشدد کا راستہ اپنایا تو اس سے فائدے کی بجائے الٹا نقصان اٹھانا پڑا۔'' تو اس لیے صدر صاحب کا کہنا ہے کہ 'بغیر منصوبے کے عمل میں میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتا۔'

''افغانستان میں بہت افراتفری ہے۔ انقلابی دست و گریباں ہیں۔ رشوت، اقربا پروری بہت بڑھ گئی ہے۔ انقلاب سے پہلے تمام ساتھی انقلابی اور خالص معلوم ہوتے تھے، مگر جب اقتدار ملا تو چہروں سے نقاب اتر گیا۔ میں اب سوچتا ہوں کہ میں نے یہ انقلاب صحیح برپا کیا تھا یا نہیں؟'' اس نے یہ بات کئی مرتبہ دہرائی۔ یہ تھا داؤد خان کا ہماری تحریک کے بارے میں تجزیہ۔

14 ستمبر: بجٹ پریذیڈنٹ (وزارت مالیہ) محراب الدین پکتیا وال تیسری دنیا کی مالیاتی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے کل جانے والے تھے، کیوں کہ پرسوں کانفرنس شروع ہوگی۔ مگر موصوف کو ابھی تک ٹکٹ نہیں ملا ہے۔ عجیب صورتحال ہے، درخواست نہ منت، تقاضا نہ مطالبہ۔ یہ ڈیوٹی موصوف کو سونپی گئی۔ بے چارے نے بڑی تگ و دو سے اپنی تقریر، پاسپورٹ، صحت کا بین الاقوامی سرٹیفکیٹ اور دیگر لوازمات درست کیے اور نتیجہ ہیچ۔ عجیب حالت اور عجیب حکومت ہے۔ اگر اسی طرح یہ سب جاری رہا تو بنے گا کیا؟

15 ستمبر: ریپبلکن گارڈ میں آمر کشف (انٹیلی جنس افسر) عبدالحق علومی جنہیں 18 دیگر افسران کے ہمراہ برطرف کیا گیا تھا، آج پھر بحال کر دیے گئے ہیں۔

28 ستمبر: شنید ہے کہ حالیہ دنوں میں بھٹو نے اپنا آدمی ولی خان کے پاس بھیجا ہے، مگر ولی خان نے بھٹو سے ملنے سے انکار کر دیا۔ اس سے پہلے جس وقت غوث بخش بزنجو اور خیر بخش مری ہوائی جہاز کے ذریعے کوئٹہ بھجوائے گئے، تو ہوائی اڈے پر کوثر نیازی اور حفیظ پیرزادہ کھڑے تھے

اوران سے بات چیت کرنا چاہتے تھے۔ مگرانھوں نے انکار کردیا اور بتادیا کہ ولی خان سے بات کریں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ولی خان ملکی سیاست سے مطمئن ہیں۔

10 اکتوبر: [یہ اطلاع غالباً مجھے عبدالحیٔ حبیبی کے بیٹے ڈاکٹر حبیب اللہ حبیبی نے دی تھی۔ حبیبی صاحب بہت باخبر آدمی ہیں۔ مصنف، تاریخ دان، اور عالم ہیں۔ یہ باتیں لوئے ڈوپرے (Louis Dupree) نے ان سے کی ہیں اور پھر مجھ تک پہنچیں۔]

سنا ہے کہ امریکا کا ایک خفیہ نمائندہ جو بظاہر انتھرو پالوجسٹ ہے، اور امریکا کے سفارت خانے میں 1970ء سے مصروف عمل ہے، اکثر پاکستان آتا جاتا رہتا ہے اور اس کے بعد صدر مملکت سے بھی ملتا ہے۔ بقول موصوف، بھٹو نے اس سے کہا کہ آئندہ انتخابات سے پہلے ولی خان کو رہا کر رہا ہوں۔ بھٹو ولی خان کو شیر پاؤ کے قتل میں ملوث نہیں سمجھتا ہے، بلکہ اس قتل میں براہ راست اجمل خٹک کا ہاتھ خیال کرتا ہے اور اس کا الزام براہ راست حکومت افغانستان پر ڈالتا ہے۔

یہاں پر داؤد خان مصالحت کے لیے آمادہ ہیں۔ اجمل سے ناراض ہیں، کیوں کہ داؤد کہتا ہے کہ مجھ سے وعدہ کیا گیا تھا کہ کوئی کام اور سرگرمی افغان حکومت کے مشورے کے بغیر نہیں ہوگی۔ مگر شیر پاؤ کا قتل ایسا واقعہ ہے، جس کا داؤد خان کو قطعاً علم نہ تھا۔ اس لیے داؤد خان اسے خودسری گردانتا ہے۔ ڈوپرے کو یقین ہے کہ پاکستان اور افغانستان کی مفاہمت بہت جلد ہو جائے گی۔ یہ مفاہمت صوبائی خودمختاری پر ہوگی۔

19 اکتوبر: آج پاکستان کی قومی اسمبلی کی دو نشستوں اور صوبائی اسمبلی کی ایک نشست کے لیے انتخابات ہوئے۔ قبائلی علاقہ سے حاجی گل محمد کامیاب ہوئے۔ کراچی سے قومی اسمبلی کی سیٹ پر پیپلز پارٹی کے امیدوار نورالعارفین نے اپنے مدمقابل جمعیت العلمائے پاکستان کے محمد حنیف کو شکست دی۔ مگر ان دونوں سے زیادہ اہم اور تاریخی لاہور کے ایک حلقے سے صوبائی اسمبلی کے لیے پیپلز پارٹی کے شیر محمد بھٹی کا غلام مصطفیٰ کھر کو شکست دینا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ الیکشن میں دھاندلی ہوئی ہے۔ حکومت کی کوشش ہے کہ ہر قیمت پر اپنے امیدواروں کو کامیاب کرائے، بالخصوص لاہور میں۔

ڈاکٹر سرز مین کیمور (وزارت مالیہ میں کسٹم محکمے کے سربراہ) بتاتے ہیں کہ امریکا اور ایران نے باہم فیصلہ کیا ہے کہ ہر قیمت پر بھٹو کو مضبوط کیا جائے۔ کیوں کہ بھٹو کو کھر کے ہاتھوں بہت

مشکلات کا سامنا ہے۔ پاکستان چاہتا ہے کہ افغانستان پر حملہ کرے اور عوام کی توجہ اندرونی معاملات سے ہٹائے۔ اس میں افغانستان کا برسراقتدار ٹولہ بھی شریک ہے کہ وہ بھی غصہ اور ناراض ہیں اور قوم پرستوں کی توجہ ہٹانا چاہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں فوجی مشقوں کے بہانے ٹینک اور فوجی ہر روز پکتیا اور قندہار کی سرحدوں پر بھیجے جارہے ہیں۔ یہ بھی چاہتے ہیں کہ دونوں ممالک گتھم گتھا ہوں، تاکہ ایک طرف پاکستان مضبوط ہو اور دوسری طرف محمد زئی خاندان کا اقتدار مستقل ہو۔ انہوں نے ہم سے یہ بھی کہا کہ آپ حکومت کی نگرانی میں ہیں۔

ڈاکٹر پکتیا وال کا کہنا ہے کہ صدر مملکت کے حکم پر وزارت عظمیٰ سے ایک سرکولر تمام پولیس تھانوں کو صادر ہوا ہے، کہ سوشلسٹ ملکوں اور خاص طور پر سوویت یونین کے کارندوں پر کڑی نظر رکھیں۔ وزیر داخلہ قدیر خان نورستانی نے کہا ہے کہ ایک لاکھ پرچمی اور ان کے حمایتی ہیں، میں سب کے خلاف کیس بناؤں گا۔

20 اکتوبر: ڈاکٹر پکتیاوال نے اپنے وزیر مالیہ عبدالله سے یونیورسٹی میں پروفیسری اختیار کرنے کے لیے وزارت سے چھٹی لینے کی اجازت مانگی تو انھوں نے انکار کردیا۔

آج جب ہم اپنی ڈاک لینے پہنچے تو معلوم ہوا کہ تمام خطوط سنسر ہو کر آئے ہیں۔

26 اکتوبر: سمنگان صوبے کے گورنر نے جب پرانے گورنر خلیل اللہ ابوی سے چارج لیا تو کہا کہ میں غریب اور خان دونوں سے یکساں سلوک کروں گا، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہاں خانوں سے زیادتی کی گئی ہے۔

دیانی صاحب، جو کوئٹہ میں قونصل جنرل ہیں، پختون ہیں اور شریف انسان ہیں۔ کہتے ہیں کہ حکومت کی خفیہ پولیس اور سی آئی ڈی کے ہاتھوں بہت بیزار ہوں۔ سودا سلف خریدنے، ڈاکٹر کے پاس جانے اور علاج معالجہ کرنے اور کسی سے بھی ملنے میں بہت دقت پیش آتی ہے۔ جن سے ملیں، حکومت انھیں بعد میں تنگ کرتی ہے۔ میں اپنے گھر اور دفتر میں محصور قیدی کی زندگی گزار رہا ہوں۔

افغانستان کے خلاف پروپیگنڈا خصوصاً کوئٹہ اور پشاور میں بہت زیادہ کیا گیا ہے۔ دوسری طرف افغانستان اپنے پروپیگنڈے اور سلوک میں اب نرمی اختیار کر رہا ہے۔ پاکستان کو بھی جواباً نرم ہونا چاہیے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پنجشیر کے واقعات کے بعد سے افغانستان ڈر گیا ہے اور پاکستان نے محسوس کیا ہے کہ جتنی شدت سے پیش آئیں، اتنا ہی افغانستان ڈرتا ہے اور پسپائی

اختیار کرتا ہے۔اس لیے پاکستان نے جارحانہ پوزیشن اختیار کی ہوئی ہے، تاکہ افغانستان سرنڈر ہو جائے۔

28 اکتوبر: بھارتی وزارت خارجہ کا ایک اہل کار سرکاری دورے پر کابل آیا ہے۔وہ یہاں مذکرات کرے گا۔

30 اکتوبر: آج سپریم کورٹ نے نیپ پر لگائی گئی پابندی کو جائز قرار دے دیا۔اس کے بعد عام گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔

31 اکتوبر: آج بھٹو نے ریڈیو اور ٹی وی پر تقریر کی، جس میں موصوف نے کالعدم نیپ، حزب اختلاف اور افغانستان کو کھلی دھمکیاں دیں۔انھوں نے کہا ہے کہ پچھلی حکومتیں اور ہم کہا کرتے تھے کہ نیپ غدار پارٹی ہے۔اب سپریم کورٹ کے فیصلے نے مہر تصدیق ثبت کی ہے۔نیپ والے کہتے ہیں کہ یہ محض الزام ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ محض الزام نہیں تھا، بلکہ سچائی تھی جو ثابت ہو گئی۔

غداروں سے بات چیت نہیں ہوسکتی، البتہ میں دیگر حزب اختلاف سے بات چیت کے لیے آمادہ ہوں۔دستوری ڈھانچے سے باہر کی فعالیتیں اور سرگرمیاں برداشت نہیں کرسکتا۔حزب اختلاف کو کہتا ہوں کہ انھوں نے بائیکاٹ کیوں کیا اور پھر اس سے مکرے کیوں؟ میں پوچھتا ہوں، حزب اختلاف کیوں غداروں کی وکالت کرتی ہے اور کیوں ان کے ساتھ قومی اتحاد بنایا؟

افغانستان سے دوستی چاہتا ہوں۔پہلے داؤد خان کو آنا تھا، اب خیر میں ہی چلا جاتا ہوں۔مگر یہ بات چیت دونوں ملکوں کے تعلقات تک محدود ہو۔میں اپنے اندرونی معاملات میں افغانستان سمیت کسی کی مداخلت بھی برداشت نہیں کرسکتا۔میں افغانستان سے کہتا ہوں کہ آپ نے نیپ کی حمایت کی، تو نیپ کو اتنا نقصان ہوا اور اس طرح آپ کو بھی نقصان اٹھانا پڑا۔اگر مزید حمایت کرو گے تو اور نقصان بھی پہنچ سکتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

31 اکتوبر: آج اجمل جلال آباد گئے تاکہ پختون زلمے کے نوجوانوں سے نیپ پر پابندی کے بعد کی صورتحال پر بات چیت کریں گے۔مقصد یہ ہے کہ ان کا مورال نہ گرے۔پرسوں کابل لوٹیں گے۔

2 نومبر: وزارت دفاع میں انٹیلی جنس افسر اور ننگر ہار صوبے کے گورنر عبداللہ وردگ کے بیٹے نعیم نے آج خلاف معمول بنیادی باتیں چھیڑ دیں۔پتا نہیں کہ ان باتوں کے پیچھے کیا مقصد کارفرما

تھا۔کہہ رہا تھا کہ نیپ پر پابندی لگنے کے بعد اب پاکستان پر دباؤ ڈالنے کے لیے قبائل کو توپ کی طرح استعمال کرنا چاہیے۔اس توپ کو چلانے والی قوت نیپ کو بننا چاہیے۔قبائل بہت بڑی قوت ہیں، اگر قبائل کو خوش کریں تو تھوڑی محنت سے وہ قوم کی حمایت میں مزاحمت کرسکتے ہیں۔قبائل کو ناراض کیا گیا تھا۔اگر قبائل خوش ہوں تو پھر افغانستان میں کوئی بھی تخریب کاری نہیں کرسکتا۔قبائل افغانستان کا قلعہ ہیں، جن سے پاکستان ڈرتا ہے، ان کو پاکستان کے خلاف استعمال کرنا چاہیے۔اس مقصد کے لیے ایک منظم پروگرام بنانا چاہیے۔جس میں نیپ اور افغانستان شریک ہوں۔نیپ نیچے پاکستان میں تخریب اور سبوتاژ کرے گا اور قبائل اوپر سے حملہ آور ہوں گے اور افغانستان اپنی طرف سے اقدامات کرے گا۔قبائلیوں پر اتنا خرچہ نہیں آتا اور نہ وہ اتنے زیادہ پیسے مانگتے ہیں، جتنا پاکستان دیتا ہے۔اگر اس طرح پروگرام کو عملی جامہ پہناتے وقت افغانستان کی ترقی رک جائے تو وہ بھی گھاٹے کا سودا نہیں۔[۱۳]

3 نومبر: ڈاکٹر خورشید عالم، جو برطانیہ سے چار اکتوبر کو گاؤں گیا تھا، آج کابل آیا ہے اور اپنے ساتھ گاؤں، ملک اور لندن سے یہ تجزیہ لے کر آیا ہے کہ:

سید مختار باچا، ولی خان کے خلاف پروپیگنڈہ کرتا ہے۔کہتا ہے کہ اس سلسلے میں کراچی میں ایک ہینڈ بل چھپا تھا، جس کو تقسیم کرنے کی غرض سے موصوف ڈاکٹر شیر افضل کی دوکان پر لایا۔شیر افضل کو برا لگا تو اس نے ضائع کر دیا۔

ماسٹر خان گل کا بیٹا مصطفیٰ پختون سٹوڈنٹس فیڈریشن کو سپورٹ کرتا ہے۔ان کے لیے سستے نرخوں سے پمفلٹ اور اشتہارات چھاپتا ہے۔دوسری طرف ماسٹر صاحب پیپلز پارٹی میں ہیں، تو انھیں برا لگتا ہے۔اس لیے مصطفیٰ کو دھمکی دی ہے کہ یہ پرنٹنگ پریس میرا ہے۔یہی وجہ ہے کہ مصطفیٰ اس تلاش میں ہے کہ جرمنی سے اپنے لیے الگ سے پریس منگوائے۔

شیر افضل وغیرہ کہتے ہیں کہ افراسیاب ہمارا آدمی ہے، جبکہ مختار باچا کا دعویٰ ہے کہ ہمارا ہے (کیوں کہ دونوں کے ساتھ سر ہلاتا ہوگا)۔ڈاکٹر افضل کہتا ہے کہ اگر پاکستان رہتا ہے تو ہماری شرائط پر رہے، کیوں کہ یہ منفی بنیادوں پر بنا ہے اور مثبت بنیادوں کے ساتھ ہی کھڑا ہو سکتا ہے۔ورنہ اگر پاکستان ٹوٹتا ہے تو یہ منفی ملک ختم ہو جائے گا اور اس کی جگہ مثبت ریاستیں وجود میں آئیں گی۔

7 نومبر: اخوان والوں نے ایک اعلامیہ تقسیم کیا ہے کہ کسی قیمت پر داؤد خان کو تسلیم نہیں

کرتے۔ وہ ہمیں حالیہ تبدیلیوں سے فریب نہیں دے سکتا۔ کہا جاتا ہے کہ بعض افغان تخریب کار پاکستان سے افغانستان آچکے ہیں۔ لغمان میں سرگرمیاں شروع کی ہیں۔ ایک پولیس والے کو مارا ہے اور چار دیگر افراد کو زخمی کیا ہے۔ اس ضمن میں وزارت دفاع نے آرمی کو ایک سرکولر خط بھجوایا ہے، جس میں اخوانی تخریب کاروں سے خبردار کیا ہے۔

11 نومبر: ڈاکٹر کیمور چند دنوں سے امریکا اور مغرب کی حمایت میں پروپیگنڈہ کر رہا ہے۔ [۱۴] کہتا ہے کہ جب تک ہم ان طاقتوں کا اعتماد حاصل نہ کریں، پختون آزاد نہیں ہو سکتے۔ ہم اس لیے بے چارے ہیں کہ ولی خان وغیرہ نے امریکا کو ایک ہوّا بنایا ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کیمور کی ایک ڈیوٹی لگائی گئی ہے۔

28 نومبر: کیمور گھر آیا اور اپنا دیا ہوا ٹائپ رائٹر ساتھ لے گیا۔ کہہ رہا تھا کہ اسے ضرورت ہے۔ مگر یہ محض ایک بہانہ تھا، درحقیقت ناراض ہے اور ایک ایک چیز کی نشاندہی کرتا اور لے جاتا ہے۔ چند دن پہلے اپنا کیمرہ واپس لے گیا۔ شاید سوچتا ہے کہ ہم منت کر کے اسے راضی کرنے کی کوشش کریں گے۔ موصوف اس لیے ناراض ہے کہ چند دن پہلے اجمل نے انہیں خبردار کیا تھا کہ تم جو باتیں مجھ سے کرتے ہو، میرے نوجوانوں سے نہ کیا کرو۔ کیوں کہ وہ خواہ مخواہ بددل ہو جاتے ہیں۔ کیمور مغرب کے طرز تفکر کا بندہ ہے، بولتا ہے کہ نیپ، ولی خان اور ہم نے ویسے ہی اپنے لیے امریکا کو ایک ہوّا بنایا ہے۔ وہ ہمارے ساتھ سب کچھ کرنے کو تیار ہے، اگر ہم سامراج دشمنی چھوڑ دیں۔ یہ کہ بھٹو بہت مضبوط ہے، جس کے ساتھ ایران اور امریکا کھڑے ہیں۔ ان کے ساتھ مفاہمت ہونی چاہیے۔

9 دسمبر: صدر مملکت کے گذشتہ برس کے سرکاری دورے کے جواب میں آج سوویت یونین کا صدر 'پوڈگورنی' کابل آیا ہے۔ موصوف کا یہ دورہ محض چوبیس گھنٹوں کے لیے ہے، مگر بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ کیوں کہ 17 جولائی 1973ء کی 'کودتا' کے بعد سوویت یونین پہلا ملک تھا جس نے افغانستان کی نئی حکومت کو تسلیم کیا۔ پھر کچھ عرصے کے لیے افغانستان کی پالیسی بائیں بازو کی طرف مائل رہی اور سوویت یونین کے ساتھ تعلقات بہت مخلصانہ تھے۔ مگر داؤد خان کے ایران کے دورے کے بعد، جس میں ایران نے سات سو ملین ڈالر کا امداد دینے کا وعدہ بھی کیا، افغانستان رفتہ رفتہ دائیں بازو کی طرف مائل ہوتا چلا گیا۔ ہمارے ساتھ وہ پرانا رویہ نہ رہا۔ اپنی حکومت سے

تمام بائیں بازو والے انقلابی عناصر کو برطرف کیا گیا یا غیر اہم جگہوں پر تعینات کر دیا گیا۔ اس حالت نے سوویت یونین کو تشویش میں مبتلا کیا۔ باہمی گرم تعلقات ٹھنڈی ہواؤں کی نذر ہو گئے۔ پرچمی وغیرہ سب اسی حالات کا شکار ہوتے گئے۔

اب سوویت یونین کے صدر کا آنا دوسرے سوویت سربراہان سے مختلف ہے اور زیادہ اہمیت رکھتا ہے کیوں کہ سارے منطقے میں گڑبڑ ہے۔ ہند چینی میں شکست کے بعد امریکا اس علاقے میں بہت سرگرم دکھائی دیتا ہے۔ بنگلہ دیش میں افراتفری ہے، شیخ مجیب کے قتل کے بعد وہاں پر استحکام کا امکان کم ہے۔ ایران اپنی چالبازیوں میں مصروف ہے۔ بحر ہند اور خلیج فارس سرگرمیوں کے مراکز بن گئے ہیں۔ پختونوں اور بلوچوں کی تیز ہوتی جدوجہد عالمی قوتوں کے لیے تشویش اور دلچسپی کا باعث ہے۔ پاکستان سامراج کی جھولی سے اور قریب تر ہو گیا ہے۔ شاہی نظام کے خاتمے کے بعد افغانستان کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ رجعت پسند یہاں بھی بنگلہ دیش والے حالات پیدا کرنے میں مصروف ہیں۔ سوویت یونین اپنی آنکھیں ان سب حالات سے بند نہیں کر سکتا، اس لیے موجودہ دورہ پرانے دوروں کی باہمی روایت، دو طرفہ سرکاری دوروں اور اچھے پڑوسیوں کے دوروں کی نسبت مختلف ہے۔ سب ترقی پسند قوتوں نے اس کے ساتھ اپنی امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔

30 دسمبر: دو دن پہلے نیپ کی اسمبلیوں اور سینٹ کے تمام اراکین کو فارغ کر دیا گیا۔ ان میں نیپ کی مرکزی اور صوبائی قیادت اور مجلس عاملہ کے اراکین بھی شامل ہیں۔ یہ آئندہ پانچ برس کے لیے کسی بھی الیکشن میں حصہ نہیں لے سکتے۔

28 فروری 1976: ایک نائب صدر کے علاوہ پختون سٹوڈنٹس فیڈریشن کا پینل پشاور یونیورسٹی میں انتخابات ایسی حالت میں جیت گیا کہ نیپ پر پابندی لگی ہے۔ ولی خان اور دیگر لیڈران جیل میں ہیں، بہت سخت گھٹن ہے۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

28 مارچ: چوبیس ارکان پر مشتمل این ڈی پی کی ایک قومی کنونشن کمیٹی بنا دی گئی۔ اس کے کنوینر شیر باز مزاری، ڈپٹی کنوینر بیگم نسیم ولی، جنرل سیکرٹری سید قسور گردیزی، اور رابطہ سیکرٹری نفیس صدیقی ہیں۔ پنجاب کے کنوینر راؤ مہروز اختر، قومی کنونشن کمیٹی کے ارکان پنجاب سے حبیب جالب، سید خالد ایڈوکیٹ، محمد فاروق قریشی اور صفدر حسن صدیقی۔ سندھ سے کنوینر میر علی بخش تالپور اور ارکان

میں ڈاکٹر اعزاز نذیر، ڈاکٹر محبوب عالم، لال بخش رند اور رکن الدین قاسمی شامل ہیں۔ سرحد کے کنوینر حاجی غلام احمد بلور، جبکہ اراکین میں عبدالخالق خان، بیرسٹر ظہور الحق، بیگم محمودہ سلیم اور ابراہیم خان ہیں۔ بلوچستان کے کنوینر شہزادہ عبدالکریم اور ارکان میں محمد ہاشم غلزئی، جینیفر موسیٰ، ڈاکٹر عبدالحئی بلوچ اور صالح محمد مندوخیل شامل ہیں۔

9 مئی: بڑے عرصے سے اسلامی ممالک اور خاص کر لیبیا، ترکی اور ایران کوشش کرتے رہے کہ پاکستان اور افغانستان کے بیچ مصالحت ہو جائے۔ گذشتہ دنوں افغانستان میں زلزلہ آیا، پھر بارشیں ہوئیں اور سیلاب آئے۔ بہت زیادہ جانی اور مالی نقصان ہوا۔ افغانستان کے ریڈ کریسنٹ (سرہ میاشت) نے انٹرنیشنل ریڈ کراس سے مدد کی اپیل کی۔ جس کے نتیجے میں پاکستان کے ریڈ کریسنٹ نے دس لاکھ ڈالر امداد دینے کا اعلان کیا۔ بیس ہزار ٹن چاول کو چار ہزار پانچ سو ٹرکوں میں بھجوانے کا وعدہ کیا۔ کمبلوں، دوائی اور خیموں سے بھرا ایک طیارہ فوری طور پر کابل بھجوایا گیا۔ ساتھ ساتھ انھی دنوں افغانستان کے خلاف پروپیگنڈہ تقریباً بند کر دیا۔ یہ سب کچھ ایسی حالت میں واقع ہوا کہ گذشتہ دنوں ترکی کے ازمیر میں آر سی ڈی کی سربراہان (کراترک، رضا شاہ پہلوی اور بھٹو) کا اجلاس ہوا تھا۔ اس کے بعد بھٹو اور رضا شاہ نے ایک ہی طیارے میں ڈھائی گھنٹے اکٹھے سفر کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہنشاہ نے بھٹو سے کہا ہے کہ اس منطقے میں گڑبڑ نہیں چاہتے اور یہ کہ افغانستان سے مصالحت ہونی چاہیے۔ پاکستان کے متذکرہ حسن نیت کے بدلے افغانستان نے بھٹو کو سرکاری دورے کی دعوت دی۔ جس کا متن کچھ یوں تھا:

"حالیہ چند دنوں میں افغانستان کے مصیبت زدہ لوگوں کے ساتھ امداد اور مخالفانہ پروپیگنڈے پر پابندی اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ پاکستان میں افغانستان کے بارے میں حسن نیت پیدا ہوئی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ افغانستان کے ساتھ سیاسی اختلاف کو بات چیت کے ذریعے پر امن طریقے سے حل کرے۔ اگر ایسا ہے تو ہم بھٹو صاحب کو دعوت دیتے ہیں کہ افغانستان آکر مذکورہ سیاسی اختلاف پر بات چیت کریں تاکہ حل کا راستہ نکالا جاسکے۔"

یہ دعوت نامہ افغان ناظم الامور اپنے ساتھ اسلام آباد لے گیا۔ غالباً 7 مئی کو پاکستانی وزارت خارجہ نے ایک پریس نوٹ میں دعوت نامے کو بخوشی قبول کیا۔ 9 مئی کو وزارت خارجہ نے ایک بیان میں وضاحت کی جس سے مترشح ہوتا ہے کہ پاکستان بات چیت اور مصالحت کے لیے

تیار ہے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ فیصلہ پہلے ہی کیا جا چکا ہے۔ جو کچھ بھی ہو، یہ ایک حساس مرحلہ ہے۔ ہم مذاکرات پر خوش ہیں۔ حالات میں انجماد ہے۔ ہر چیز غیر واضح ہے۔ ہمارے دوست بھی اس علاقے میں گڑبڑ نہیں چاہتے اور نہ بھٹو کو ہٹانا چاہتے ہیں۔ اس طرف افغانستان کی حالت بھی خستہ ہے، بلکہ حالات روز بروز ہمارے خلاف ہوتے جا رہے ہیں۔ بات چیت کی کامیابی اور ناکامی الگ بات ہے، ایک بات یقینی ہے کہ جلد یا بدیر وضاحت ہوگی۔ یہاں میزبانوں کے بارے میں ہمارا ذہن کھل جائے گا کہ یہ کیا چاہتے ہیں، ان کی اصل نیت کیا ہے۔ دوسری طرف اگر مصالحت ہوگئی تو کم از کم لیڈران رہا ہو جائیں گے۔ سیاسی سرگرمیاں شروع ہو جائیں گی۔ پاکستان میں ہم اپنا کردار ادا کرسکیں گے۔ یہاں موجودہ گند اور جنجال سے چھٹکارا مل جائے گا۔ پختون زلمے کے نوجوان اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں گے۔ یہ مستقل ذہنی اذیت کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ اگر ایسا نہ ہوا، بات چیت کامیاب نہیں ہوئی تو دیکھیں گے کہ افغانستان کیا کرتا ہے۔ اگر واقعی کچھ کرنا چاہتا ہے تو سنجیدہ ہونا پڑے گا۔

یوں محسوس ہوتا ہے، یہ میرا تجزیہ ہے، جب تک افغانستان میں ایک حقیقی قومی جمہوری حکومت معرض وجود میں نہ آئے، اور شمالی ویتنام کی طرح، جو جنوبی ویتنام کی پشت پر کھڑا تھا، ہماری مدد کے لیے کھڑا نہ ہو، اُس وقت تک ہم یہاں افغانستان پر بھروسہ نہیں کرسکتے۔ پاکستان کے اندر سیاست کرنی چاہیے۔ ان لوگوں (افغانوں) پر اعتماد کرنا عبث ہے۔ البتہ اپنا تعلق ان کے ساتھ برقرار رکھنا چاہیے۔ جس کے پردے کے نیچے ہم افغانستان کی اصلی جمہوری تحریک کے ساتھ جڑے رہیں اور ایک دوسری کی مدد کرسکیں۔

اب تو یہ واضح ہوتا جا رہا ہے کہ ہمارے ساتھ تاریخی مذاق ہوا ہے۔ ولی خان کو تو جانے دیجیے کہ وہ بھٹو سے مزاحمت کے حق میں تھا، عملی طور پر بھی دکھا دیا اور خوش فہمی میں بھی تھا کہ دنیا ہمارا ساتھ دے گی، یا بھٹو ادھر اُدھر دھماکوں کے ڈر سے سرنڈر کر جائے گا۔ مگر ایسا نہ ہوا، البتہ اس نے خود کو غداری کے مقدمے کے ذریعے پھانسی کے پھندے تک پہنچا دیا۔ یہاں تک کہ افغانستان نے بھی اپنی بعض مجبوریوں، عادتوں اور اطوار کی وجہ سے کوئی خاص مادی مدد نہیں کی، نہ ہی پختونوں نے ساتھ دیا، وہ ولی خان، باچا خان اور ہماری حمایت پر آمادہ نہ ہوئے۔ الٹا پارٹی نے ہمیں گالیاں دینی شروع کی، ہمارے نوجوانوں کو پناہ دینے کے لیے کوئی تیار نہ تھا۔ تحریک ناکام

ہوگئی، اب اس موضوع پر لکھنے کے لیے وقت درکار ہے، تاکہ تاریخ کے لیے محفوظ ہو جائے۔

اس کا دوسرا اہم رخ یہ ہے کہ سب کچھ آئینی سمجھوتے کے مسترد کرنے کے بعد شروع ہوا جس میں ہمارے کمیونسٹ پارٹی کے ساتھی پیش پیش تھے، جو نہیں چاہتے تھے کہ بھٹو سے مفاہمت ہو۔ حالاں کہ بزنجو اور اس کے ساتھیوں کا موقف یہ تھا کہ ہم تنظیمی، مالی اور خارجی وجوہات کی بنا پر اس قابل نہیں کہ پاکستان اور بھٹو کا مقابلہ کر سکیں۔ اس لیے ہمیں مخاصمت سے گریز کرنا چاہیے۔ الٹا بزنجو کی اس لائن کو غداری سے تعبیر کیا گیا۔ جب مخاصمت شروع ہوئی تو ہمارے اپنے ہی ساتھیوں نے ہماری مدد نہیں کی، نہ ہمارے ساتھ باقاعدگی سے رابطہ رکھا۔ ہمیں بھلا دیا گیا، اپنے لٹریچر اور 'سرخ پرچم' وغیرہ میں ہمارا تذکرہ تک نہیں کیا جاتا تھا، کہ ہم بھی کوئی سیاسی جانور ہیں اور کوئی کردار ادا کر رہے ہیں۔ صلاح مشورہ تو درکنار، اب یہ نعرہ بلند کیا کہ 'چہرے نہیں سماج کو بدلو، ظلم وستم کے راج کو بدلو'۔ اگر ایسا ہے تو بزنجو کا موقف طبعی طور پر درست تھا اور یہ غلط تھے۔ اب اعتراف کیوں نہیں کرتے؟

24 مئی: این ڈی پی کی صوبائی تنظیم کا ڈھانچہ اس طور پر بنایا گیا ہے:

- عبدالخالق خان (چیف آرگنائزر)
- مہدی شاہ باچہ (جنرل سیکرٹری)
- عبدالمجید خان ایڈووکیٹ (جائنٹ سیکرٹری)
- حسین بخش کوثر (پبلسٹی سیکرٹری)
- خان سعد اللہ خان (فنانس سیکرٹری)
- سالار امین جان خان (چیف کمانڈر رضا کار تنظیم)

پراونشل آرگنائزنگ باڈی کے اراکین:

- رحیم داد خان (بنوں)
- قاضی اکرم (مردان)
- سید عاشق شاہ باچا (پشاور)
- حاجی تاج محمد خان (ایم پی اے)
- بابو اکرم خان (ایم پی اے)

- شیر دل خان (ایم پی اے)
- عمرا خان (ایم این اے)
- محمد یوسف خان (عمرزئی)
- محمد عالم خان (سوات)
- تیمر خان (تیمر گرہ)
- محمد یوسف خان (چراگاہ)
- ولی محمد خان ایڈووکیٹ (خویشگی)
- غازی خان (پبی)
- عبدالعزیز خان (زیدہ)
- عبدالقدوس خان (خوبئ)
- میاں عطاالدین کاکاخیل (نوشہرہ)
- مہردل خان (ہوتی)
- نصراللہ خان (بونیر)
- سالار یعقوب خان (بنوں)
- خوش دل خان (چارسدہ)

ضلعی آرگنائزرز

- ایڈووکیٹ تاج محمد خان (ہزارہ)
- چراغ حسین شاہ (چترال)
- سلطان باچا (دیر)
- کشور خان (سوات)
- نیک عمل (مالاکنڈ)
- دلبر خان (مردان)
- ارباب سیف الرحمان (پشاور)
- باز محمد خان ایڈووکیٹ (بنوں)

- نذیر خان شنواری (کوہاٹ)
- شاہنواز خان (ڈیرہ اسماعیل خان)

7 جون: آج صبح گیارہ بجے بھٹو صاحب کابل پہنچ رہے ہیں۔ افغانستان کے سیلاب زدہ عوام کی امداد کے اعلان اور بعد میں افغانستان کے خلاف یک طرفہ طور پر پروپیگنڈا بند کرنے کے نتیجے میں افغان حکومت کی دعوت پر آرہے ہیں، تاکہ سیاسی اختلاف پر بات چیت کریں۔ آج کل منطقے کی ساری قوتوں کی توجہ، چاہے دوست ہوں یا دشمن، افغانستان پر مرکوز ہے۔ کیوں کہ یہی بات چیت منطقے کی سیاست پر اثرانداز ہوگی۔ افغانستان کی آئندہ سیاست مذکرات کی کامیابی کے نکات پر منحصر ہے۔

ہم بھی مفاہمت چاہتے ہیں، جس کے نتیجے میں قیدی رہا ہوں اور سیاست کی آزادی ملے۔ اس لیے کہ اپنی قوت نہیں رکھتے، افغانستان اپنے ہی مسائل میں گھرا ہوا ہے۔ اور دن بہ دن مسائل بڑھتے جا رہے ہیں۔ سارا مسئلہ ایک ہی فرد سے وابستہ ہے۔ ہم اپنے ہی پختونوں کی برکت سے اپنی لنگوٹی بچانا چاہتے ہیں، خواہ مصالحت کے نتیجے میں بھٹو کی طرف سے ہمارا منہ کالا کرنا ہی کیوں نہ ہوٹھہرے۔ عجیب معلوم ہوتا ہے کہ بھٹو آنے والا ہے اور ہماری امیدیں اس کے موقف کو نرم کرنے سے وابستہ ہیں۔ جس کے ساتھ ہم آج تک جنگ کرتے رہے، طاقت کی باتیں کرتے رہے، اس کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے، دھمکیاں دیتے رہے، لعنت ہو ہم پر! تاریخ نے کیا عجیب مذاق کیا ہم سے۔

10 جون: فرانسیسی کمپنی ٹوٹال کو نیشنلائز کر دیا گیا۔ اب وزارت پلان کا حصہ ہے۔ غزنی اور کٹواز میں تیل کے ذخائر آٹھ دس ملین ٹن سے زیادہ نہیں اور انھیں نکالنا مہنگا پڑتا ہے۔ فراہ میں تیل کے ذخائر ڈھونڈنے کے لیے برطانوی کمپنی سے بات ہو چکی ہے۔

ایران کے وزیر تجارت نے ایک چارٹرڈ طیارہ دواؤں اور ڈاکٹر کے ساتھ بھجوادیا ہے۔ تاکہ وزیر پلان افغانستان علی احمد خرم کے بال بچے، جو ہلمند میں ایک حادثے میں زخمی ہوئے تھے ان کا معائنہ کریں اور اگر ممکن ہو تو انھیں علاج کے لیے ایران لے جائیں۔ چند دن پہلے ایرانی فوجی وفد آیا تھا، جنھوں نے مرکزی کور اور عسکری یونیورسٹی کا دورہ کیا تھا۔

میر اجان صاعقی (ڈائریکٹر کابل میونسپلٹی) بمعہ دیگر اخوانی عناصر کے گرفتار کر لیا گیا ہے،

ان میں فوجی افسران بھی شامل ہیں۔ افواہ ہے کہ ان میں دو امریکی بھی ہیں۔ جن کو امریکی سفیر نے کہا تھا کہ داؤد حکومت کا تختہ الٹنا چاہیے، امریکیوں کے بارے میں افواہ جھوٹی بھی ہو سکتی ہے۔

9 نومبر: تقریباً ایک سال سے کچھ اوپر ہو چلا ہے کہ ہم نے سرگرمیاں موقوف کی ہوئی ہیں۔ اتنی مدت ہم نے صرف 'انتظار' میں گزاری۔ انتظار صرف اس بات کا تھا کہ پاکستان اور افغانستان کے بیچ بات چیت کے ذریعے مصالحت ہو جائے گی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کباب میں ہڈی ہم ہیں۔ کیوں کہ افغانستان نے بھٹو کو بتا دیا ہے، اور دوسرا کوئی چارہ کار بھی نہ تھا، کہ ولی خان کو راضی کیا جائے۔

بھٹو نے ابھی تک ولی خان سے رابطہ نہیں کیا ہے۔ البتہ خیر بخش مری کو اپنے بھائی علی احمد اور عطاء اللہ کو احمد نواز بگٹی کے ذریعے پیغام بھجوایا ہے کہ پختونوں کو رہا کر دیں تو سب کچھ دینے کو آمادہ ہوں، لیکن بلوچ نہ مانے۔ اب بلوچ لیڈران کہتے ہیں کہ اصولوں پر مصالحت نہیں کرتے۔ محض اپنی رہائی کے بدلے اصولوں کا سودا نہیں کر سکتے۔ یہاں افغانستان ہر قیمت پر مصالحت چاہتا ہے۔ اس ضمن میں بھٹو سے زیادہ ہم سے ناراضی کا اظہار کرتا ہے۔ ہماری مشکل یہ ہے کہ کس طرح پختون بلوچ اتحاد کو قائم بھی رکھیں اور افغانستان کو بھی خوش کریں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افغانستان نے بلوچوں کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ دوسری طرف ہم یہاں بلوچوں سے وضاحت کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ حکومت افغانستان کا رویہ آپ کے ساتھ تبدیل ہو چکا ہے۔ اب ایسا لگتا ہے کہ تم لوگ ان کے سینے پر چڑھے بیٹھے ہو۔ بلوچ جب افغانستان سے ناراض ہوتے ہیں تو اس کا اظہار ہم پر کرتے ہیں۔ یہاں ہمارے پختون زلمے کے نوجوان وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نالاں ہوتے جا رہے ہیں، گلے شکوے کرتے ہیں۔ اگر مفاہمت کی امید بھی چھوٹ گئی تو پھر بہت مشکل ہوگا کہ اس گھونسلے کو بھی سالم حالت میں رکھ سکیں۔

افغانستان جیسے بہانے ڈھونڈ رہا ہے، اگر ہمارے اوپر واضح طور پر ناراض ہو گیا تو یہ موجودہ تھوڑی بہت پوزیشن جو قائم ہے، باقی نہ رہے گی۔ پھر یہاں روٹیاں توڑنے ہی کے لیے بیٹھے رہنا بے غیرتی کے مترادف ہوگا۔ اب ہمارے پاس کون سا راستہ باقی بچے گا؟ اپنے آپ کو پاکستان کے حوالے کریں گے؟ قبائلی علاقے چلے جائیں گے؟ پاکستان کے اندر انڈر گراؤنڈ رہیں؟ یا کسی اور ملک چلے جائیں؟ ایسے بہت سے سوالات اور پریشانیاں ہیں جو ہمارے ذہن پر دباؤ کا باعث ہیں۔

7 جنوری 1977: رات گیارہ بجے ریڈیو پاکستان نے بھٹو کی قومی اسمبلی میں تقریر کی خبر نشر کی۔ موصوف نے آئندہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے لیے انتخاب کی تاریخوں کا 7 اور 10 مارچ کو منعقد کرانے کا اعلان کیا ہے۔ دس جنوری کو اسمبلی آئین کے مطابق ٹوٹ جائے گی۔ 13 جنوری کو صوبائی اسمبلیاں تحلیل ہو جائیں گی۔

23 جنوری: بھٹو نے اپنی انتخابی مہم کا آغاز پنڈی میں لیاقت باغ میں جلسہ عام سے کیا۔ حزب اختلاف نے مہم کا آغاز کراچی میں ایک جلسے سے کیا۔ پاکستانی سیاست میں ہلچل پیدا ہو چکی ہے۔

2 مارچ: جناب عبدالحئی حبیبی سے کون واقف نہیں، موصوف پشتو زبان و ادب اور تاریخ کے محقق، استاد اور مصنف ہیں۔ علمی کتب میں ان کو بطور حوالہ درج کیا جاتا ہے اسی طرح وہ فارسی زبان و ادب پر بھی اتھارٹی ہیں، ساتھ ساتھ پختونوں کے قومی تشخص کی تاریخ سے بھی بخوبی آگاہ ہیں اور اس راستے بہت سے تجربات سے گزرے ہیں۔ پاکستان، بھارت اور ایران کے معاملات پر بھی گہری نظر ہے۔ افغانستان تو ان کا اپنا وطن ہے، گو نظریاتی طور پر قدیمی فکر اور کنزرویٹو ہیں، لیکن تجربہ کار انسان ہیں۔ آج میں نے ان سے دریافت کیا: آج تک ہم نے پاکستان میں دوغلی پالیسی چلائی ہے۔ سیاست پاکستانی سطح پر کی ہے، مگر پاکستان کو دل سے تسلیم کبھی نہیں کیا، یہ ہماری مجبوری تھی۔ یہ اس لیے کہ ہم پختونوں کی وحدت پر یقین رکھتے ہیں۔ افغانستان کو بھائی سمجھا ہے۔ افغانستان سے مدد کی توقع رکھی ہے۔ یہ اس لیے نہیں کہ پاکستان ہمیں قبول نہیں کرتا، بلکہ ہم پاکستان کو قبول کریں تو پھر ہماری وہاں خوب عزت ہے اور ابھی تک پیدا ہو بھی چکی ہوتی۔ اب ایسے مرحلے پر پہنچ چکے ہیں کہ اپنی سیاست سے تاریکیاں ہٹائیں گے۔ افغانستان میں کافی تجربہ ہو چکا ہے۔ افغانستان کی قوت، طاقت، حالت، اور حکمران طبقات آپ کو معلوم ہیں۔ داؤد خان آخری تیر تھا۔ یہاں کے پختونوں کی قوت اور حالت زار بھی آپ پر عیاں ہے کہ سرحدی افغانستان کا تمام دارومدار پشاور اور دیگر پاکستانی علاقوں پر ہے۔ بتائیں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

انہوں نے جواب دیا: افغانستان پر آپ نے جتنی ٹھوکریں کھائی ہیں، کافی ہیں۔ باچا خان کے یہاں رہنے کا تجربہ کافی تھا، لیکن آپ لوگ دوبارہ فریب میں آ گئے۔ افغانستان نے ہمیشہ اور یہاں تک کہ امان اللہ خان نے ہندوستان کی آزادی اور پھر پختون مہاجرین سے غداری کی ہے۔ اس لیے آئندہ کے لیے بھی آپ افغانستان سے (روس سے بھی) کبھی دھوکا نہ کھائیں۔ یہاں

پختونوں کی حالت زار پاکستان کے پختونوں سے بدتر ہے۔ داؤد خان اس مسئلہ کا بڑا مدعی تھا۔ اسے بھی آپ (ہم) لوگوں نے آزما لیا۔ اس کی حکومت جو شاہی حکومت کا دوسرا نام ہے، میں پشتو اور پختونوں کی جو حالت زار ہے، وہ بھی آپ کے سامنے ہے کہ اعلیٰ حضرت ظاہر شاہ کے دور سے بھی بدتر ہے۔ اب آپ لوگوں کو چاہیے کہ پاکستان یا بھٹو کے ساتھ کم ترین شرائط پر بھی مفاہمت کر لیں۔ پاکستان کی سطح پر صدق دل سے سیاست کریں، وہاں اپنے لیے جگہ پیدا کریں، مضبوط ہوں، پھر اگر ہو سکے تو افغانستان کے پختونوں کی مدد کریں۔ افغانستان کے وعدوں اور باتوں پر فریب کھانا بے وقوفی ہے۔ یہاں زندگی گزارنا، زندگی ضائع کرنے کے مترادف ہے۔

حبیبی صاحب کی باتوں سے معلوم ہوا کہ بھٹو نے محمود خان اچکزئی، کاکڑ قبیلے کے نوابوں (جوگزئی خاندان) اور بلوچستان کے دیگر پختون قبائلی مشران سے وعدہ کیا ہے کہ انتخابات کے بعد وزیرستان سمیت بلوچوں اور سرحد کے پختونوں سے الگ، پختونوں کا صوبہ بنام پختونستان یا پختونخوا بنایا جائے گا۔ اس نئے صوبے کا مرکز کوئٹہ ہوگا۔ بلوچستان کا مرکز قلات بنے گا۔ اس ضمن میں بھٹو نے بعض بلوچ سرداروں سے بھی بات کی ہے، وہ بھی راضی ہیں۔ دوسری طرف اس طرح کرنے سے بھٹو افغانستان کے لیے بھی 'آٹے کی ناک' بنائے گا۔ کہ پختونستان کا صوبہ تو بن گیا۔ حبیبی صاحب کہتے ہیں کہ یہی اطلاعات مصدقہ معلوم ہوتی ہیں۔

اس طرح ہو بھی سکتا ہے، کیوں کہ حبیبی صاحب کا مرحوم ایوب خان اچکزئی اور دیگر پختون حلقوں سے قریبی تعلق رہا ہے۔ اگر ایسا ہو گیا تو یہ پختون بلوچ اتحاد کو پارہ پارہ کر دے گا اور پختون بھی آپس میں گتھم گتھا ہو جائیں گے۔ کوئٹہ شہر پر بلوچوں کے ساتھ ایک مستقل تنازعہ کھڑا کر دیا جائے گا۔ قبائل کی طرح پختونستان یا پختونخوا کا یہ نام نہاد صوبہ دیگر پختونوں کے خلاف استعمال کیا جائے گا۔ حبیبی صاحب کی باتوں سے یوں لگ رہا ہے کہ وہ ایسی کوششوں کے حق میں ہیں۔ کیوں کہ بلوچ یوں بھی پختونوں سے الگ ہوں گے، وہ اپنے لیے آزاد بلوچستان مانگتے ہیں۔

7 جون: آج کل قومی اتحاد اور حکومت کے مابین انتخابات کے بعد پیدا ہونے والے بحران کے حل پر مذاکرات کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ بحران اس وقت وقوع پذیر ہوا، جب سات مارچ کی قومی اسمبلی کے لیے انتخابات میں بھٹو حکومت نے بڑے پیمانے پر دھاندلی اور جعل سازی کی۔ اس کے بعد قومی اتحاد نے دس مارچ کو صوبائی اسمبلی کے لیے ہونے والے الیکشن کا بائیکاٹ کر دیا۔

حزب اختلاف نے سپریم کورٹ اور فوج کی نگرانی میں از سرنو قومی اور صوبائی انتخابات کرانے، الیکشن کمیشن کو از سرنو تشکیل دینے اور بھٹو کے استعفے کا مطالبہ کردیا۔ سارے ملک میں احتجاج کا سلسلہ شروع ہوا۔ احتجاج میں عوام کی اکثریت نے اتنے جوش وجذبے اور وسیع پیمانے پر شرکت کی کہ پاکستان کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ ابھی تک بھٹو کا رہنا فوج اور فوجی جرنیلوں کی حمایت کا رہین منت تھا۔ اس ایجی ٹیشن میں سینکڑوں، بلکہ ہزاروں لوگ مار دیے گئے۔ ہزاروں زخمی ہوئے۔ ایک لاکھ افراد کو پابند سلاسل کردیا گیا۔ حکومت نے کراچی، حیدر آباد، لاہور، سیالکوٹ، لائل پور، ملتان میں مختلف اوقات پر مارشل لاء اور کرفیو کا نفاذ کیا۔ مگر لوگوں نے کرفیو کی پروانہ کی اور اپنا احتجاج جاری رکھا۔ یہ واضح کیا کہ عوام کسی قیمت پر بھٹو کو نہیں مانتے۔

اس دوران معیشت کو اربوں روپے کا نقصان پہنچا۔ کاروبار، تجارت، کارخانے، سکول، کالج بند رہے۔ پاکستان کے بحران نے دنیا کو تشویش میں مبتلا کردیا۔ بھٹو نے سارا الزام امریکا پر لگایا۔ گویا امریکا حزب اختلاف کی مالی اور پروپیگنڈے کی مدد کرتا ہے۔ اس طرح سے اس نے امریکا سے اختلاف کا فرضی یا حقیقی تاثر دیا۔ دوسری طرف سوشلسٹ دنیا نے حزب اختلاف کے انتہائی رجعت پسند، ملائیت پرست حاوی بازو پر تنقید کی اور اپنے پروپگنڈے میں بھٹو کی حمایت کا تاثر دیا۔ اس سے زیادہ تشویش اسلامی دنیا میں پیدا ہوئی۔ لیبیا، کویت، عرب امارات، سعودی عرب اور فلسطینی الفتح نے حزب اختلاف اور حکومت کے درمیان مفاہمت کی کوشش کی۔ خاص طور پر سعودی عرب کی بار بار کوششیں بارآور ثابت ہوئیں۔ طرفین کو وہ مذاکرات کی میز پر بٹھانے میں کامیاب ہوگئے۔

تین جون کو مذاکرات شروع ہوچکے ہیں۔ زیادہ تر قیدی رہا کیے جاچکے ہیں۔ بعض ابھی اندر ہیں۔ کل قومی اتحاد اور حکومت نے الگ الگ دو فارمولے پیش کیے ہیں۔ اس پر غور کے لیے کل قومی اتحاد کی جنرل کونسل کا اجلاس ہوا۔ اس طرح بھٹو نے بھی اپنی پارلیمانی پارٹی سے گفتگو کی۔ آج پھر میز کے گرد بیٹھیں گے اور دونوں فارمولوں پر غور ہوگا۔ اگر حکومت کی نیت صاف ہو، واقعی مجبور ہو کہ مفاہمت کی جائے، تو مصالحت دور نہیں۔

ذاتی تاثرات: معاملات اور مشکلات

صدر داؤد کے ہنگامہ خیز دور میں جب پختون زلمے اور بلوچستان کی تنظیموں کی آمد و رفت اور مطالبات جاری تھے، میں کبھی کبھی اپنی ذاتی یادداشتیں قلم بند کرتا رہا، جس میں اُس عہد کے سیاسی اور ذاتی احوال کے علاوہ مشکلات کا بھی ذکر آجاتا۔ جیسا کہ اہل کابل کی کہاوت ہے کہ ’مارا از درون سوختناند، مردم را بیرون‘ یعنی اندر سے ہمیں جلا دیا اور باہر لوگ بھسم ہوگئے۔ تو یہ وقتاً فوقتاً لکھی گئی تحاریر ہیں۔ اُس وقت میرے ذاتی حالات بہت برے تھے، بلکہ مجھے کبھی ایک جانب اور کبھی دوسری جانب سے استعمال کیا گیا۔ اُس عہد کی تحریر کردہ یادداشتوں سے چند اقتباسات آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

15 مئی 1974:

مجھے یہاں آئے ساڑھے آٹھ ماہ اور چند دن ہوچکے۔ میں نے اس عرصہ میں کیا کیا؟ ایسا کون سا خاص فرض تھا جو اس دوران پایہ تکمیل تک پہنچایا؟ دوستوں کے لیے کیا کیا اور مستقبل کے لیے کیا کیا؟ اپنے آپ اور نظریات کو Assert کرنے کے لیے کون سا کارنامہ انجام دیا ہے؟ میں نے نفع کمایا یا نقصان؟ میرا یہاں آنا زیادہ مفید رہا یا وہیں رہنا بہتر تھا؟ میں یہاں تحریک کے لیے کوئی ٹھوس خدمت سرانجام دے رہا ہوں یا محض ایک شخصیت کے لیے اپنا سب کچھ مٹی کرنے جارہا ہوں؟ یہ اور ایسے اور بہت سے سوال، ہروقت میرے ذہن میں گھومتے رہتے ہیں اور مجھے بچھوؤں کی طرح ڈستے رہتے ہیں۔

یہ میں تسلیم کرتا ہوں کہ بعض اوقات میں ایک بہت اچھے پیغام رساں کا کام کرتا ہوں۔ فلاں فلاں کے پاس جاکر پیغام پہنچاتا ہوں۔ لیکن پیغام ہوتا کیا ہے؟ وہ جس کا اکثر مجھے بھی علم نہیں ہوتا۔ کیا یہ مجھ پر اعتماد کی کمی ہے یا اختیارات کی مرکزیت یا کچھ اور؟ لیکن پھر سوچتا ہوں کہ یہ کام تو ’تورلالی‘ بھی کرسکتا ہے۔ مجھ میں اور اُس میں کیا فرق ہے؟ محض یہ کہ میں کچھ لکھ پڑھ سکتا ہوں اور وہ یہ کام نہیں کرسکتا۔ لیکن یہ ترجمے اور لکھنا لکھانا تو سب معمول کے کام ہیں۔ کوئی اساسی، بنیادی اور مخصوص کام میرے سپرد نہیں۔

16 مئی 1974:

دل چاہتا ہے، واپس لوٹ چلوں، کیونکہ یہاں ذاتی طور پر مطمئن ہوں اور نہ سیاسی طور پر۔

ذاتی بے اطمینانی کی وجہ یہ ہے کہ جیسی محتاجی کی زندگی اب میں گزار رہا ہوں، شائد ہی کبھی دیکھی ہو۔ چھوٹی سے چھوٹی چیز کے لیے دوسروں پر انحصار ہے، پیسوں کی سخت کمی ہے، ہفتے کے سو افغانی ملتے ہیں اور وہ بھی اکثر اجمل کے کاموں کے سلسلے میں خرچ ہو جاتے ہیں۔ کپڑے بنانا تو دور کی بات، میرے پاس تو اتنے پیسے بھی نہیں ہوتے کہ میں شیونگ کریم یا بلیڈ خرید سکوں۔ یہ غنیمت ہے، کہ میرے لیے گاؤں سے کپڑے بھیجے گئے ہیں اور ایک کوٹ پتلون کا سوٹ بنا ہے تو وہ بھی نعیم کی بدولت کہ وہ گاؤں سے میرے لیے پیسے لے آیا تھا۔ میری حالت پر اُسے ترس آیا۔ پیسوں کی اتنی کمی ہے کہ کبھی کبھی تو کام کے لیے بھی ایک افغانی جیب میں نہیں ہوتا۔ اگر کبھی کبھار سینما جاتا ہوں یا ہوٹل میں بیٹھنا نصیب ہوتا ہے تو وہ بھی میر صاحب (میر اکرم) کی برکت سے۔

سیاسی رخ اس سے بھی افسوسناک ہے۔ مجھے تو اکثر یوں محسوس ہوتا ہے گویا میں محض پولیس سے فرار ہوا ہوں، میرے کرنے کے لیے کوئی کام ہے ہی نہیں۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ یہاں کوئی سیاسی کام نہیں ہو رہا، بلکہ محض یہ کہ میرا اُس میں کوئی کردار نہیں۔ سب کچھ بالا ہی بالا ہوا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات میں عام سے معلومات تک سے ناواقف رہتا ہوں۔ کوئی اہم کام میرے حوالے نہیں۔ سیاسی صلاح مشورہ تک نہیں لیا جاتا، سیاسی حالات پر تبصرہ اور بحث تو خیر بہت دور کی بات ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے گویا میں سیاسی کارکن نہیں محض ایک نوکر ہوں۔ ایسے ایسے لوگ جنہیں میں کسی قابل نہیں سمجھتا، اُن سے بھی سیاسی صلاح ومشورہ کیا جاتا ہے لیکن مجھے اس سے دور رکھا گیا ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ مجھے کسی بات کی اطلاع نہیں۔ ہوتی ہے، لیکن میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو اُسے اتنی ہی معلومات ہوتیں۔ نیپ تو دور کی بات، اپنے لوگوں کی نمائندگی بھی نہیں ہوتی (یا شائد یہ بات ہے کہ وہ بہت کمزور ہیں)۔

اس کی بہت ساری وجوہات ہوسکتی ہیں۔ اول یہ کہ اعتماد کی سخت کمی ہے، اختیارات کی مرکزیت ہے، یا طریقہ کار کی غلطی ہے۔ اس لیے جو بھی آیا ہے اور ہمارے ساتھ رہا ہے، یہاں سے مطمئن نہیں گیا۔ سیاسی لحاظ سے اور نہ ہی ذاتی لحاظ سے۔ اعتراض اور تنقید پر تو اجمل خٹک

ناراض ہوتے ہیں اور شکوک کا اظہار کرتے ہیں، جبکہ غلامانہ تابعداری (Passive Submission) ناقابل برداشت ہے۔

31 مئی 1974:

ہمارا گھر بھی سردار صاحب کی حکومت کی طرح ایک شخصی نمائش (One-man Show) ہے۔ یہاں دیگر ساتھیوں کی موجودگی محسوس ہی نہیں ہوتی، کیونکہ کسی کے پاس کوئی اختیار ہے نہیں۔ جو کچھ ہے بس 'تورلالی' ہے۔

میں سب کچھ چھوڑ چکا ہوں اور سب کچھ کے لیے تیار ہوں۔ لیکن مجھے کرنا کیا ہے، میرے اوپر اعتماد کہاں ہے؟ یہ سب دیکھتا ہوں تو اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ 'تورلالی' مجھ سے زیادہ بااعتماد، انقلابی، عقل منداور بہت بہت کچھ ہے۔ میری یہاں کیا ذمہ داری ہے اور میری سیاسی حیثیت کیا ہے؟ میں یہاں ایک ذاتی نوکر سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ لیکن وفادار ذاتی نوکر پر تو لوگ پھر بھی اعتماد کرتے ہیں، لیکن مجھ پر؟ چلو میں اپنا تقابل 'تورلالی' سے کرتا ہوں:

سیاسی: 'تورلالی، اس کے ساتھ ہر جگہ جاتا ہے، اُسے معلوم ہوتا رہتا ہے کہ کس کس سے گفتگو کی جا رہی ہے، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کیا گفتگو ہو رہی ہے، وہ لوگ جن کی آمد ورفت کا مجھے علم ہوتا ہے، مجھ سے پہلے وہ جانتا ہے، وہ اُن کے ساتھ 'راز' کی باتیں بھی کرتا ہے، یہ حال تمام اہم بیرونی دوستوں کا ہے۔ اب ذرا اندر کے حالات دیکھتے ہیں۔ وہ تمام وزرا کو جانتا ہے، اُن کے ساتھ راز ونیاز کرسکتا ہے، اُن کے سامنے مطالبات رکھ سکتا ہے، یعنی جو پس پردہ سفارت کاری ہوتی ہے، چاہے اس کا تعلق افغانستان سے ہو یا بیرونی دوستوں سے، 'تورلالی اس سے باخبر رہتا ہے۔

ذاتی زندگی: 'تورلالی' تمام گھر کا مالک ہے۔ اگر پہلے نمبر پر اجمل ہے تو دوسری حیثیت اُس کی ہے۔ نوکروں کو رکھنا نکالنا اور تمام انتظامات اُس کے ہاتھ میں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک باورچی تک ہمیں انسان نہیں سمجھتا، کیوں کہ سارے اختیارات اُس کے پاس ہیں۔ اگر ہم بیمار پڑ جائیں، پیٹ میں سخت درد ہو تو اتنا اختیار نہیں رکھتے کہ اپنے لیے پرہیزی کھانا تیار کرائیں، لیکن وہ بغیر کسی پرہیز کے اپنے لیے الگ کھانا پکواتا ہے۔ اور ہاں، اگر موٹر کا اختیار ہے تو وہ بھی سارا اُسی کے پاس ہے۔ اگر میں کام سے جاتا ہوں تو پیدل یا پھر بس سے۔ ٹیکسی کے پیسے کون دے گا؟ اگر

غلطی سے کوئی ایسا کام درپیش ہو کہ موٹر کے بغیر انجام نہ دیا جاسکے تو وہ الگ سے ایک بے عزتی ہے۔ ڈرائیور سے میں اتنا نہیں کہہ سکتا کہ میرے لیے گاڑی نکالے، کیونکہ اگر کہوں اور اردگرد کوئی موجود ہو تو میرے لیے سخت خجالت کا باعث بنتا ہے۔ کیوں کہ اُس کا پہلا جواب یہ ہوتا ہے کہ اچھا جاتا ہوں، پہلے 'تورلالی' یا اجمل خٹک سے پوچھ کر آتا ہوں۔ میری اتنی حیثیت نہیں کہ اپنے گاؤں سے رابطہ رکھ سکوں اور نہ ہی کسی کو تحفہ دے سکتا ہوں، لیکن وہ اپنے گھر، گاؤں اور عزیزوں کو تحفے بھیجتا رہتا ہے۔

مختصر یہ کہ میری حیثیت یہاں کسی کے ذاتی ملازم سے زیادہ نہیں۔ سیاسی حالات موافق ہیں اور نہ ذاتی۔ اس کی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ یہ بھی ہے، کہ ہر شخص ذاتی وفاداری پسند کرتا ہے۔

30 مارچ 1975:

رات بارہ بج کر دس منٹ ہو چکے۔ میں گوریلا جنگ پر کتاب پڑھ رہا ہوں اور ساتھ ساتھ اس سے یادداشتیں قلم بند کر رہا ہوں۔ گھڑی نے دس منٹ پہلے تاریخ بدل دی۔ جنجوعہ کو خط لکھ دیا ہے، کل پوسٹ کر دوں گا۔

اطلاع ملی ہے کہ ولی خان کا ڈرائیور 'شامران' سی آئی ڈی کا بندہ ہے کیونکہ اُس نے ہر خطرناک جگہ سے اپنے آپ کو بہ حفاظت نکالا ہے۔ جس دن ولی خان پر گولیاں چلائی گئیں، اُس دن موصوف موٹر نہیں چلا رہے تھے، اس کے بعد کئی معمولی کارکنان گرفتار کیے گئے، لیکن اُسے گرفتار نہیں کیا گیا۔ یہ اطلاع رجڑ سے تعلق رکھنے والے فتح خان نے دی ہے۔

8 اپریل 1975:

اسد اللہ (بھولتا ہوں کہ کون تھا، شائد اسد آفریدی) سوال جواب کا ذمہ دار تھا، کل رخصت ہو رہا ہے۔ کہنے گا کہ دیوانہ بابا کا بندہ ہوں یا دیوانہ بابا سے آیا ہوں۔ لٹریچر کی ذمہ داری دوست محمد کی ہے، یہ فیصلہ اُس کے ساتھ مل کر جہانزیب کرے گا کہ کس طرح، کس کے ذریعے اور کہاں یہ لٹریچر پہنچایا جائے گا۔

25 اپریل 1975:

کل فلک شیر کو جلال آباد کیمپ سے بلایا گیا ہے۔ آج وزیرستان جا رہا ہے اور میران شاہ تک

جائے گا۔ مجھے فخر ہے کہ میرا ایک رشتے دار اور عزیز میرے راستے کا راہی ہے۔ یہ اپنے آپ کو کیموفلاج کرے گا، واپس جائے گا اور حکومت کی بظاہر مدد کرے گا۔

27 اپریل 1975:

اجمل خٹک جلال آباد چلے گئے۔ وہاں کیمپ میں ایسی باتیں، اختلافات اور گروپ بنے ہیں کہ ہدایت باچا کے بس اور قوت فیصلہ سے باہر ہیں۔ میں اکیلا ہوں۔ گھر کی مسئولیت میرے ذمہ ہے۔ عاصی جو غمازوں (انور باچا اور امجد باچا) کے نگران ٹھہرائے گئے تھے، ریڈیو اسٹیشن گئے ہیں۔ ارباب فرید اور فدا بھی وہیں گئے ہوئے ہیں۔ مجھے اُن کی فکر ہے۔ یہ فلم جانا چاہ رہے ہیں، لیکن ابھی عاصی نہیں لوٹے۔ انہیں پیسوں کی بھی ضرورت ہے۔

28 اپریل 1975:

کل میرے منع کرنے کے باوجود جمال (اجمل خٹک کا فرزند) اور غلام حبیب (تورلالی کا بیٹا) غمازوں کے ساتھ فلم دیکھنے گئے اور رات بہت دیر سے لوٹے۔ اگر کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آجاتا تو ذمہ دار کون ٹھہرایا جاتا، یہ ظاہر ہے!

30 اپریل 1975:

آج صبح مظلوم اس حالت میں آئے کہ سانس پھولی ہوئی تھی۔ پوچھا اجمل خٹک کہاں ہے؟ میں نے بتایا کہ جلال آباد گئے ہیں، آج لوٹ آئیں گے۔ اس نے کہا کہ 'زرک' کی ماں یعنی اُس کی بیوی اپنے بھانجے کے ساتھ آئی ہے اور غزنی ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہے، جو رہنے کے قابل جگہ نہیں۔ اس نے بہت جلدی جلدی یہ بھی کہا کہ بس میں بھی واپس چلتا ہوں۔ میں نے پوچھا کہاں؟ اس نے بتایا: پاکستان! وہاں میں اپنے آپ کو حکومت کے حوالے کر دوں گا۔

میں اکیلے اس مسئلے کو کیسے حل کروں؟ مظلوم اتنے پختہ نظریے والا ساتھی نہیں اور بے چارہ اپنی بیوی کو یہ نہیں ظاہر کر سکتا کہ وہ ایک اچھے، رعب دار اور بلند مرتبہ جگہ میں عزت دار زندگی گزار رہا ہے۔ وہ ایک امیر اور بلند رتبہ خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ یہ کیوں نہیں سمجھتا، کہ اس حکومت سے ہمارا تعلق کتنا نازک ہے۔

میں نے سرحدات کے نائب وزیر کو اس بارے فون کیا۔ اُس نے کہا کہ لودھی ہوٹل کو اٹھ

آئیں۔ آخر وہ سب 'پلازہ ہوٹل' کو منتقل ہو گئے۔ مظلوم چونکہ ریڈیو افغانستان، کابل میں بشیر کے ساتھ مل کر پشتو اور بلوچی پروگرام کرتے تھے، اس لیے بہت جلد انہیں 'میکروریان' میں گھر مل گیا اور وہ وہاں چلے گئے۔

30 اپریل 1975:

آج وزارت سرحدات کے ڈائریکٹر اطلاعات، ظاہر خان مہمند میرے پاس آئے۔ یہ 'خلقی' ہے۔ آیا اور بات یوں شروع کی کہ وزیر صاحب 'عبدالہادی مکمل' آپ سے بہت خوش ہیں، کہتے ہیں اِس میں بہت تقویٰ ہے۔ پھر محترم نے افغانستان کے داخلی حالات، انقلاب، خارجی روابط، پختونستان، صدر داؤد کے دورہ ایران اور مصالحت پر گفتگو شروع کی اور چاہا کہ میری رائے اور تجزیہ حاصل کریں۔ پتا نہیں محترم کا اس سب سے کیا مقصد تھا؟ یوں تو ہم دو سال سے متعارف ہیں لیکن پہلے کبھی اس طرح انہوں نے مجھ سے گفتگو نہیں کی، شاید کسی نے یہ فریضہ انہیں سونپا ہو۔ لیکن یہ طے ہے کہ میرے ساتھ اس ساری گفتگو کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور تھا۔

یکم مئی 1975:

آج انور اور امجد آ گئے، کہنے لگے سو روپے دو۔ میرے پاس نہیں تھے، اس لیے میں نے انکار کیا۔ محسوس ہوا جیسے وہ ناراض ہو گئے۔ پینے کی بوتل کی درخواست بھی اُن کی رد ہو گئی۔ انہوں نے بہت اصرار کیا کہ اُن کے لیے یہ مہیا کی جائے۔

10 جون 1975:

سرحدات کے وزیر صاحب نے دفتر کے لیے دو الماریاں مہیا کیں، جنہیں میں نے دفتر میں لگا لیا ہے۔

16 جون 1975:

آج سوات خان کو علی آباد ہسپتال کے اعصابی ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ان صاحب کا حقیقی نام نہیں لکھ رہا۔ اس بے چارے کا دماغ چل گیا ہے۔ یہ سب عدم مطابقت Maladjustme کا شاخسانہ ہے۔ بے چارے کا ماحول جو بدل گیا ہے، اپنے گاؤں کے خان کا لاڈلا بیٹا تھا، جس نے کبھی گھر گاؤں سے باہر قدم نہیں رکھا تھا، نوکر چاکر تھے، زمینیں بہت، آسائش کا سامان بہ افراط،

کسی چیز کی کمی نہ تھی اور نہ ہی بے چارہ سیاسی بندہ تھا۔ اچانک انقلاب نے آ گھیرا اور بے وقت مسافری کرنی پڑی۔ گھر اور بچوں سے دور ہے۔ اس لیے دماغ پر ان سب حالات کا اثر ہوا ہے۔ مجھے فکر ہے کہ کہیں اور بگڑ نہ جائے اور سچ مچ پاگل نہ ہو جائے۔ اس کا ماحول بدلنا اور اسے اپنے گاؤں بھیجنا ضروری ہے۔

23 جون 1975:

عصر کو وزارت سرحدات کے ڈائریکٹر اطلاعات ظاہر خان مہمند تشریف لائے۔ بہت سی باتیں کیں، لیکن اُن سے غیریت کی بو آ رہی تھی۔ اگرچہ باتیں بہت میٹھی کر رہے تھے، لیکن خیالات منتشر تھے۔

فلم 'مغل اعظم'، جس کی میں بہت تعریف سنتا آ رہا تھا، آج ڈاکٹر حبیبی کے ساتھ فرخی سینما میں دیکھ لی۔ (ڈاکٹر حبیب اللہ حبیبی، عبدالحیٔ حبیبی کے بڑے صاحبزادے ہیں۔)

24 جون 1975:

دن چڑھتا ہے، رات آتی ہے، پھر صبح ہو جاتی ہے اور بس یہی ہو رہا ہے۔ ساری زندگی اسی بے لذت معمول میں گزر رہی ہے۔ کچھ تبدیلی، تحول، مزہ اور لذت محسوس نہیں ہوتی۔ سارا دن جذبات اور احساسات جاگتے اور پھر سو جاتے ہیں۔ اگر سچ کہوں تو یہ جوانی بھی ایک مصیبت محسوس ہوتی ہے۔ کہاوت ہے کہ 'وہ کیا پودا جو بہار میں بھی سر سبز نہ ہوا'۔ خیر یہ تو سب ایسی باتیں ہیں جن کی تسکین کا تصور بھی کفر ہے، لیکن انسان کیا کرے۔ وہ وقت بھی آتا ہے جب وہ اپنے وجود کے جواز کو بھی چیلنج کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے، جب زندگی اور موت میں فرق ختم ہو جاتا ہے۔

آج سارا دن میں نے کیا کیا؟ فارغ وقت بھی نہیں گزارا۔ سارا وقت دفتر میں رہا، مطالعہ کیا، کچھ لکھا، کچھ ٹائپ کا کام کیا، لیکن ایسا کوئی نمایاں کام یاد نہیں آ رہا جو یہاں لکھ سکوں۔ ویسے تو اپنی سستی کے باعث کئی اہم چیزیں ڈائری میں لکھنے سے رہ جاتی ہیں اور کئی بے کار کی باتیں بھی لکھی جاتی ہیں۔

انجنیئر غلام محمد نے Rape of Bangladesh نامی کتاب کے چند ابواب کا ترجمہ کیا ہے۔

مجھے پڑھنے کے لیے دی ہے، لیکن اب تک میں نہیں دیکھ سکا۔ ایک تو وقت نہیں ملتا اور دوسرا ایسی کڑا کے دار کابلی پشتو میں ترجمہ کیا ہے کہ خود اُس کا ترجمہ کرنے کی ضرورت ہے۔

25 جون 1975:

قلم خان خلیل (ہمیش خلیل) کو شعر کا جواب شعر میں بھجوا دیا گیا۔

27 جون 1975:

بروز جمعہ کوہ دامان میں وکیل نیک محمد خان کی دعوت تھی، جس میں آر یو بی، ہم، بلوچ یعنی مہر اللہ، گوہر خان، مراد، منظور اور اُن کے دوست مدعو تھے۔ ہماری طرف سے اجمل، میں، حاجی نادر خان، اعظم خان، بلا خان، شہباز، جمال، غلام حبیب، تور لالی، انور خان، ایاز، فرید اور صلاح الدین نے شرکت کی۔

29 جون 1975:

سوات خان صاحب کی طبیعت آج بحال تھی۔ عصر کو میں نے انہیں ایک لیکچر دیا، اُن پر بہت اثر ہوا۔ کہنے لگے کہیں گھومنے چلتے ہیں۔ کہہ رہے ہیں کہ چغر سرائے جانا ہے اور وہاں سے 'شاہ جہاں' کے پاس جاؤں گا۔

29 جون:

رؤف اور حمید کی ہاؤس جاب مکمل ہوگئی، اب گاؤں جا رہے ہیں۔ میں نے انہیں بھائی افضل کے بارے میں پیغام دیا کہ زیارت خان کو نثار لالہ بتا دیں، کہ اُسے بھجوا دیں۔ کیونکہ ایسے سیکھنے کے مواقع (ماسکو کا دورہ) بار بار نہیں ملتے۔ نعیم کو بھی پیغام بھجوایا ہے کہ پاسپورٹ پر آئے۔

30 جون:

حاجی نادر خان کو قلندر مومند کو بھیجنے کے لیے 'دولت خان لوانی' کا دیوان اور پروفیسر اسلانوف کی لکھی کتاب 'پیر روشان کی قومی تحریک' دے دیں۔

2 جولائی:

'گوریلا جنگ' کا پشتو میں ترجمہ مفید ثابت ہوگا۔ آج جرمنی سے 'دخیبر وگمہ' (خیبر کی مہک

کے جون کا شمارہ پہنچ گیا۔

یہاں حکومت ہر معاملے میں بدنظمی کا ثبوت دے رہی ہے۔ بالخصوص ہمارے معاملے میں اس کا سلوک ایسا لاابالی باپ کا سا ہے جس کا بیٹا جوان ہوگیا ہے، کالج جا رہا ہے، اور اُس سے کتابوں اور باقی ضروریات کا مطالبہ کر رہا ہے۔ لیکن جواب میں وہ کہتا ہے کہ ہمارے زمانے میں تو پیر محمد کاکا کا بیٹا مدرسے جاتا تھا تو دو کتابیں، ایک تختی اور ایک دوات اُس کو خرید کر دی جاتی۔ وہ تو اس میں خوب گزارا کرتا تھا۔ یہ تم اتنی بہت ساری چیزوں کا مطالبہ کیوں کرتے ہو؟

یہ تو ہوا تحریک کا حال۔ نئے زمانے کے نئے تقاضے ہیں اور اس میں ایک تحریک کو چلانے کے لیے بہت کچھ درکار رہتا ہے۔ یہاں ماضی میں پختونستان کی تحریک کو غیر علمی بنیادوں پر کچھ ملکوں یعنی مشران وغیرہ نے چلایا۔ خیر ہمیں تو حکومت کی تمام تکالیف کا احساس ہے، لیکن بلوچ اور پھران کے سردار، وہ پیسے چاہتے ہیں، بہت مانگتے ہیں اور بروقت چاہتے ہیں۔ لیکن یہاں حکومت میں اتنی سکت نہیں کہ ان سب کا انتظام کر سکے۔ کیا ہوگا، اگر ان پر مہینے کے دس بیس ہزار افغانی زیادہ خرچ کر دیے جائیں، ورنہ یہ ناراض لوٹ جائیں گے اور بلوچ پختون اتحاد کے لیے جو کوششیں ہم نے کی ہیں ان پر پانی پھر جائے گا۔ ساری ذمہ داری ہم پر ہی آئے گی۔ کل یہ عذر کوئی تسلیم نہیں کرے گا کہ ہمیں مشکلات درپیش ہیں، اور اس سلسلہ میں ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ اگر چند ملک اپنے پیسے بلوچ سرداروں (گوہر خان اور مہر اللہ وغیرہ) کے لیے مخصوص کر لیں تو یہ اتنی بڑی بات نہیں، لیکن اس طرف کس کی توجہ ہے۔ ہمارا اپنا بس بھی نہیں چلتا بس یہی دعا کرتے ہیں کہ:

رحمداد کو خدا اچھا کرے اس مرتبہ
دوبارہ کو پر پر جنگ ہوئی تو بے شک مر ہی جائے

3-5 جولائی 1975:

ولی خان کا حلفیہ بیان ٹائپ ہوگیا۔ دو بجے کے بعد میں، ڈاکٹر پکتیاوال، نیک زاد اور خلیل زمر بامیان کی طرف روانہ ہوگئے، راستے میں نیک زاد کی 'کو پر اتیف' جیپ دھکوں سے آگے بڑھتی رہی، بلندی کی طرف چلنے سے انکار کر دیا تو اُسے تبدیل کرنا پڑا۔ دوسری جیپ حاصل کی، لیکن وہ بھی خراب نکلی۔ بہت مشکلات کے بعد 'چاریکار' تک پہنچے۔ جیپ مستری کے پاس

کھڑی کی، جو کہیں جا کر سات بجے چلنے کے قابل ہوئی۔ چونکہ اب کافی تاخیر ہو چکی تھی اور بامیان کا راستہ بھی کچا تھا، اس لیے یہ فیصلہ کیا گیا کہ جبل السراج کے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرا جائے۔ لیکن بد قسمتی سے جمعہ کا دن ہونے کی وجہ سے یہ گیسٹ ہاؤس صوبے کے پولیس کے سربراہ نے اپنے لیے مخصوص کیا ہوا تھا۔ اس لیے گلبہار کی ٹیکسٹائل مل کے گیسٹ ہاؤس چلے گئے۔ رات وہاں رہے۔ چار جولائی کی صبح جمعہ کے دن غور بند کے درّے اور شیبر کوتل کے راستے بامیان کی طرف چل پڑے۔ بارہ بجے سے کچھ اوپر وہاں پہنچے۔ کھانا مارکوپولو ریسٹورنٹ میں کھایا۔ کچھ آرام کیا اور پھر دو بجے سے کچھ اوپر بند امیر کی طرف چل پڑے۔ وہاں پر مختلف جھیلیں جیسے ذوالفقار بند، پودینہ بند، پنیر بند اور ہیبت بند کا نظارہ کیا۔ چائے صوبہ بامیان کے پولیس سربراہ کے بھائی کے ہوٹل میں پی، لیکن ان سے اپنا تعارف نہیں کرایا۔ ساڑھے پانچ بجے واپس بامیان کو چلے اور تقریباً ساڑھے سات بجے وہاں پہنچ گئے۔ شہر کی رونق رات کے اندھیرے میں دیکھی۔ رات مارکوپولو ریسٹورنٹ میں گزاری۔ وہاں مہاتما بدھ کی عظمت دیکھی، قدیم تہذیب کے آثار کا مشاہدہ کیا۔ صبح پانچ جولائی کو بامیان کے شہر ضحاک اور حاجی گگ کی طرف روانہ ہوئے۔ 'سبز آب' درے میں معدنی چشمہ تھا، جس کا پانی بہت گرم تھا۔ موسم بہت سرد تھا اور اردگرد کے پہاڑ برف سے ڈھکے ہوئے تھے، لیکن چشمے کا پانی خوب گرم تھا۔ ہم سب اُس میں نہائے، بہت مزا آیا۔ دروں میں ڈرائیونگ کے بعد حاجی گگ کے مہمان خانے پہنچے۔ وہاں سے حاجی گگ کے لوہے کی کان کے پہاڑ کا منظر بہت واضح نظر آ رہا تھا۔ راستہ بہت خراب تھا اور جیپ نہیں چل سکتی تھی۔ ہم نے کوشش بھی کی، لیکن وہ پیچھے کی طرف لوٹ آتی تھی۔ 'کوہ بابا' سے بھی گزرے، جہاں بہت زیادہ برف پڑی تھی۔ ضلع بہسود کے پہلے حصے میں داخل ہوئے۔ وہاں سے ایک راستہ ضلع بہسود کے دوسرے حصے اور 'پنجر ان' کی طرف جاتا ہے، جبکہ دوسرا راستہ 'سرچشمے' کے راستے وردگ کے صوبے یعنی میدان کے بیچ سے گزر کر کابل اور قندھار کی سڑک تک جاتا ہے۔ سرچشمہ میں دوپہر کا کھانا کھایا۔ دو بجے کابل پہنچے۔ یہ راستہ بہت مشکل، سخت لیکن پر کیف تھا۔ ہزارہ والوں کے گاؤں، گھر اور سبز درے دیکھے۔ لوہے کے ذخائر سے بھرے پہاڑ دیکھے، معدنی چشموں میں نہائے، آبشاریں، سرد سرد نہریں اور درّے دیکھے، لیکن جب واپس لوٹا تو بہت زیادہ کام جمع ہو گیا تھا۔ اخباروں کا مطالعہ، جنجوعہ کو ڈاک کی ترسیل، ولی خان کا حلفیہ بیان پڑھنا، 'گوریلا جنگ' کا ترجمہ وغیرہ...... جنجوعہ کے لیے ڈاک اُسی

رات تیار کر لی، کیونکہ کل لندن کے لیے جہاز روانہ ہونا تھا۔

6 جولائی:

حاجی ہرات خان کے ساتھ شام کی چائے پی جو چائے سے زیادہ کھانا تھا۔ دنبہ ذبح کیا تھا۔ اگلے دن اُس کا بھائی محمد رفیق (لواڑگی) کو جا رہا تھا اس لیے میں نے اسے ہمیش خلیل کے لیے ولی خان کے سپریم کورٹ والے حلفیہ بیان کی ٹائپ شدہ کاپی دی تاکہ قلندر مومند اردو ترجمہ اور کتابت کرائے۔ سارا خرچ ہم برداشت کریں گے۔ اس کے ساتھ ایمنسٹی انٹرنیشنل کو بھیجے گئے فارم بھی دیے جس میں بے گناہ قیدیوں کی تفصیل اور مقدمات کی نوعیت درج تھی۔ تاکہ ان قیدیوں کو ضمیر کے قیدی قرار دیا جا سکے۔

9 جولائی:

شہباز خان نے فائل ترتیب دینے کا کام شروع کیا ہے۔ لیکن کہہ رہا ہے کہ دفتر کا کام نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ میرے وہ دوست جنہیں میں نے اکٹھا کیا اور کہا کہ سختی نرمی میں تمہارے ساتھ رہوں گا، اب میرے پیچھے باتیں بنائیں گے کہ خود کابل میں بیٹھ گیا اور ہمیں ان پہاڑوں میں خوار کرنے کو چھوڑ گیا۔ شہباز خان کیمپ کمانڈروں کے ساتھ ناچاقی کے باعث کابل میں دفتری کام سنبھالے ہوئے تھا۔

16 جولائی:

میں نے اپنے جشن میں شرکت کا کارڈ 'زڑہ ور خان' (نواگی)، جو قندوز میں رہتا ہے، کو دے دیا کہ جشن میں شرکت کرے۔ اس کے لیے وزارت سرحدات سے درخواست کرنا مجھے مناسب محسوس نہیں ہوا۔

19 جولائی:

آج عصر کے وقت میں ڈاکٹر حبیبی کے ساتھ فٹ بال میچ دیکھنے غازی اسٹیڈیم گیا۔ پہلا میچ سوویت یونین اور ایران کے درمیان تھا، دوسرا کابل اور ترکی کے درمیان۔ پہلا میچ برابر ہو گیا، ہر ٹیم نے دو دو گول کیے۔ دوسرے میچ میں کابل نے تین گول سے شکست کھائی۔ ایک بات کا بہت افسوس ہوا کہ پہلے میچ میں کابلیوں کی اکثریت اپنی ہمدردی ایران کے ساتھ ظاہر کر رہی تھی۔ اس

میچ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ افغانستان میں اور خصوصاً کابلیوں پر ایران کا کتنا زیادہ اثر ہے۔

24 جولائی:

آج انور اور امجد پہنچ گئے۔

7 اگست:

پروہودت، جو وینوبا بھاوے کا چیلا ہے، آ گیا اور میرے کمرے میں ٹھہرا ہے۔ رات ڈاکٹر حبیبی کی دعوت میں گیا۔

9 اگست:

میرا خان (تور) اور سید جوہر آ گئے، وہ سعودی عرب کو عمرے کی ادائیگی کے لیے جا رہے تھے۔ جوہر بس لایا تھا، جس میں 'پینده خان' (مرچکے) خاطر غزنوی اور جاسوسی کے محکمے کے ڈی ایس پی عبدالمجید سوار تھے۔ میرے لیے نعیم کا خط اور ایک جوڑہ چپل لائے تھے۔ مجھے تین سو روپے بھی دیے، جو مجھ سے فوراً شہباز اور عالمزیب نے لے لیے۔ کافی وقت ٹھہرنے کے بعد قندہار کو روانہ ہو گئے۔

15 اگست:

صبح بنگلہ دیش میں اقتدار پر قبضے کی خبر سنی۔ ایک اطلاع یہ ہے کہ شیخ ...ب کو مار دیا گیا ہے، جبکہ دوسری خبر یہ ہے کہ اُسے گرفتار کر لیا گیا ہے۔ سابق وزیر تجارت اور عوامی لیگ کے نائب صدر خوندکر مشتاق احمد کو نیا صدر نامزد کیا گیا ہے۔ یہ بھی خبر ہے کہ بنگلہ دیش کو عوامی جمہوریہ کی جگہ اسلامی جمہوریہ قرار دے دیا گیا ہے۔ اقتدار پر یہ قبضہ فوج اور پولیس کی مدد سے کیا گیا ہے۔ یہ بہت افسوس کا مقام ہے کہ رجعت پسند اور فرقہ پرست قوتیں پھر سے سر اٹھا رہی ہیں۔ شام کی خبروں سے معلوم ہوا کہ شیخ مجیب اور وزیر اعظم منصور علی دونوں کو قتل کر دیا گیا ہے۔

26 اگست:

کل اتمانزئی کے پیر محمد کے منہ سے سنا کہ سلیم نے شادی کر لی ہے۔ بہت خوشی ہوئی، اب مکمل انسان بنا ہے۔

10 ستمبر:

رؤف اور حمید آ گئے۔ میرے لیے چپل لائے ہیں۔

11 ستمبر:

حمید اور حبیب اللہ گھر آئے۔ بتا رہے تھے کہ عید کے بعد نثار لالہ کی شادی ہے۔ لالہ بوڑھا ہو گیا ہے، لیکن اب تک شادی نہیں کی تھی۔ چونکہ میرا انتہائی قریبی دوست ہے، اس لیے شادی کا سن کر خوشی ہوئی۔ اچھا ہے کہ خوش اور آباد رہے۔ رؤف اور حمید ڈاکٹر بن گئے ہیں۔ ہاؤس جاب مکمل ہو گئی ہے۔ چاہتے ہیں کہ مشرق وسطیٰ چلے جائیں ملازمت کے لیے، لیکن وہاں جانے میں ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ اجمل خٹک نے اُن سے جرمنی جانے میں مدد دینے کی بات کی، کہ وہاں تعلیم بھی حاصل کریں گے اور تحریک کے لیے کام بھی کر سکیں گے۔

یہاں میں یہ اضافہ کرنا چاہوں گا کہ چونکہ ہم پاکستان کے خلاف تسلیم کردہ مرکز تھے، اس لیے ہم نے کئی لڑکوں کو جرمنی بھیجا۔ انہیں ہم دفتر کی جانب سے ٹائپ شدہ سفارشی چٹھی دیتے۔ یہ سفارشی چٹھی انہیں جرمنی میں قانونی اور سیاسی پناہ گزین ثابت کرتی اور انھیں پولیس سے بچانے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ اس چٹھی کے حامل شخص کے بارے میں یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ اسے پاکستان میں خطرے کے سبب مہاجرت کی اجازت دی گئی ہے۔

12 ستمبر:

حمید نے بتایا کہ فرید سی آئی ڈی کا بندہ تھا، وہ آٹھ ماہ یہاں رہا۔ اعظم خان کا ہم پیالہ و ہم نوالہ تھا اور اُسی کی وجہ سے جلال آباد کیمپ میں رہ رہا تھا۔ اس لیے اُسے ہر ایک سے زیادہ معلومات تک رسائی تھی۔ پہلے اس کی مردان میں دکان تھی، جو خالی پڑی رہتی تھی۔ پہلے گھر میں ایک وقت کے کھانے کی امید نہ تھی، لیکن اب جو لوٹا ہے تو دکان سامان سے بھری پڑی ہے اور موٹروں میں سفر کرتا ہے۔ کبھی کبھی سی آئی ڈی کے دفتر کا چکر بھی لگاتا ہے۔

عجیب بات ہے کہ اگر ایسا کوئی کام ہم سے غلطی سے بھی سرزد ہو جاتا تو جانے ہمارا کیا حشر کیا جاتا۔ کیا کہہ سکتے ہیں، وہ کہاوت ہے نا کہ بس 'ذلت کی نوکری میں ماخوذ ہیں'۔ آج اجمل خٹک کے لیے پختونستان کے دن کی تقریر انگریزی میں ٹائپ کر دی۔ جمال کے ہمراہ 'یادوں کی

برات، فلم دیکھی۔ شام مظلوم صاحب کے گھر بھی گیا۔

13 ستمبر 1975:

یہ ہمارا تاریخ سے یا تاریخ کا ہم سے سنگین مذاق ہوگا۔ تاریخ کا پہیہ کبھی الٹا نہیں چلتا۔ یہ نہ ہو کہ نیچے والے ہمارا مذاق اڑائیں کہ ہمیں خراب کردیا۔ یعنی علی خان کی بات کہ ایک مرتبہ ہندوؤں نے دھوکا دیا اور دوسری مرتبہ کابلیوں نے۔ یا پھر ہم نے اپنے آپ کو دھوکا دیا اور انہیں نقصان پہنچادیا۔

افضل بھائی گاؤں سے آ گیا ہے، میں نے اُسے بلایا تھا کہ 15 اگست سے پہلے پہلے پہنچ جاؤ کہ ماسکو جانا ممکن ہو۔ لیکن یہ اب پہنچا ہے۔ اس نے سارا الزام نعیم پر دھر دیا ہے کہ مجھے صحیح پیغام نہیں پہنچایا تھا۔ میں نے دونوں کو ڈانٹا، اتنی غیر ذمہ داری!

14 ستمبر:

سارا دن پریشانی میں گزرا۔ افغانستان کی سیاسی حالت، محسوس ہوتا ہے، کہ خراب ہوتی جارہی ہے۔ تمام وطن پرستوں اور بائیں بازو کے لوگوں پر مصیبت اور مشکلات کا وقت ہے، جبکہ دائیں بازو والوں سے کوئی امید نہیں رکھی جاسکتی۔ یہ نہ ہو کہ حالات مایوسی کا باعث بنیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان حالات کی ذمہ دار ہماری بے تکی تحریک بھی ہے، اسی وجہ سے آج سارا دن جگر خون کرتا رہا۔

15 ستمبر:

میاں شاہجہان کو خط لکھا ہے، کہ یہ معلوم کرے کہ وہاں رؤف اور حمید کی نوکری اور تعلیم کے امکانات ہیں یا نہیں۔

18 ستمبر:

آج پی ایس ایف کے اکبر شاہ، جو طب کا طالب علم ہے، کا داخلہ وزارت خارجہ کی جانب سے اس بنیاد پر مسترد کردیا گیا کہ وہ درست طریقہ کار یعنی قونصلیٹ کے راستے نہیں آیا۔ حیرت ہے کہ فدا حسین، جو پاکستانی سفارتخانے میں انٹیلیجنس کا اہلکار ہے، اس کی بیٹی اور بھانجی اس جمہوریت میں کابل کے میڈیکل کالج میں پڑھ رہی ہیں۔ وہ بھی نہ ان ضروری مراحل سے گزری ہیں اور نہ ہی ان کا تعلق پختونستان سے ہے۔ انہیں وزارت خارجہ نے داخل ہونے کی اجازت

دے دی، لیکن ہمارے ایک مفرور کارکن کے داخلے کے لیے بہانے تراش رہے ہیں۔

23 ستمبر:

آج افضل کو آئے آٹھ دس دن ہو چکے۔ نہ اُسے کہیں گھمانے لے جا سکا اور نہ اُسے معقول پیسے ہی دے سکا۔ یہ سب میرے بس سے باہر کی باتیں ہیں، میری جیب خالی ہے۔ کچھ دنوں میں رخصت ہونے والا ہے، سمجھ میں نہیں آرہا کہ اُس کے لیے کیا خریدوں۔

حالات بہت پیچیدہ ہیں اور مایوسی پھیلی ہوئی ہے۔ افغانستان میں حالات بگڑ رہے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ پختونستان کے معاملے پر انہوں نے امریکا یا ایران سے ساز باز کر لی ہے۔ ولی خان پھانسی کے تختے پر کھڑا ہے اور نیپ پر پابندی لگی ہے۔ جوان جیلوں اور ٹارچر سیلز میں ہیں۔ بوڑھوں، خواتین اور جوانوں کی بے عزتی کی گئی اور کی جارہی ہے۔ کئی جوانوں نے گھر، بال بچے اور گاؤں چھوڑے ہیں۔ وہ سب امید رکھتے ہیں جبکہ یہاں ہمارے ساتھ 1947ء کی طرح ہندوؤں کے جیسا سلوک جاری ہے۔ ہدایت باچا نے کہا ہے کہ ولی خان نے پیغام بھیجا ہے کہ جو جوان اِن میں سے پڑھ سکتے ہیں، انہیں داخلہ دلوایا جائے۔ (اگر ایک کام کی صلاحیت نہیں تو اسے شروع ہی کیوں کرتے ہو؟)

آج بختیار (فرزند بشیر) کی سالگرہ تھی۔ ایک گرم سوٹ اور ایک روسی ٹینک کا کھلونا اُسے لے کر دیا۔ ہم رات اُن کے گھر مہمان رہے۔

24 ستمبر:

آج کا دن غمزدہ اور منحوس ہے۔ کرنے کو کوئی کام ہے اور نہ ہی کام کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے، کہ رفتہ رفتہ ہمیں بھی 'حباب خان کاکا' اور 'ایوب اچکزئی' بنانے کی کوشش ہورہی ہے۔ اجمل خٹک کی ہمیشہ ایک ہی بات ہوتی ہے، لیکن عملاً سب کچھ الٹ ہورہا ہے۔ بائیں بازو والے حکومت سے الگ کیے جارہے ہیں اور دائیں بازو والے اور پختونستان کے مخالفین کو جگہ دی جارہی ہے۔ گذشتہ دن سرحدات کے معاون وزیر کو موقوف کر کے ایک گمنام وردگ، محمد عثمان واحدی کو نائب وزیر بنالیا گیا ہے۔ فیض محمد خان جیسے لوگوں کی خدا خیر کرے۔

اجمل خٹک بھی پریشان ہیں، یہ پشتون قوم پر سب سے سخت وقت ہے۔ لڑکے اور جوان

مایوس ہوتے جارہے ہیں۔ قبائل ہاتھوں سے نکلتے جارہے ہیں اور یہاں کا پہیہ الٹا چل رہا ہے۔ ان سب کا ذمہ دار تاریخ ہمیں ٹھہرائے گی۔ ہمیں کہا جائے گا کہ اگر ایک کام تمہارے بس کا نہ تھا تو شروع ہی کیوں کیا؟ ہم کس طرح اپنے دوستوں، عزیزوں، پارٹی کے لوگوں اور دشمنوں سے آنکھیں ملائیں گے۔

لیکن خیر ہوسکتا ہے، یہ برے حالات کسی اچھے مستقبل کی نوید لائیں۔ ہوسکتا ہے یہ تاریخ کا ایک اور امتحان ہو۔ یہاں بھی سب کچھ جوانوں کے ہاتھ میں ہے اور افغانستان پوری دنیا کے نقشے پر چمکے گا۔ اللہ کرے ایسا ہی ہو۔

29 ستمبر 1975:

آج معلوم ہوا کہ کل سردار ولی اور موسیٰ شفیق وغیرہ عدالت کے سامنے پیش ہونگے۔ غالب گمان ہے کہ انہیں بالکل آزاد کردیا جائے گا، یہ اچھا ہوگا۔ لیکن اِن کی آزادی کے ساتھ موجودہ ڈرامے (بائیں بازو کے لوگوں کو الگ کرنا اور رجعت پسندوں کو آگے بڑھانا) کے پلاٹ کی تکمیل ہوجائے گی۔ اور شائد اس کا ڈراپ سین تب مکمل ہوگا، جب داؤد خان کو صدارت سے الگ کردیا جائے یا قتل کردیا جائے گا۔ کیونکہ یہی کچھ کمبوڈیا اور ابھی ابھی بنگلہ دیش میں آزمایا جاچکا ہے۔ امپیریلسٹ پہلے حکومت سے دھونس اور دباؤ کے نتیجے میں بائیں بازو کے لوگوں کو الگ کراتے ہیں اور جب انقلابی یا قومی جمہوریت پسند اکیلے رہ جاتے ہیں تو اُن پر حملہ کیا جاتا ہے، انہیں الگ کردیا جاتا ہے یا پھر قتل کردیے جاتے ہیں۔ 1970 کی دہائی میں سامراج نے شہزادہ سہانوک کو کھمر وج سے لڑادیا۔ جب وہ شریفوں کی حمایت سے محروم ہوگیا تو اس پر حملہ کیا اور ملک بدر کرادیا۔ اسی طرح بنگلہ دیش میں مجیب کو تاج الدین اور عبدالصمد آزاد وغیرہ سے دور کرکے تنہا کردیا گیا اور پھر اُسے قتل کرادیا گیا۔

آیا یہ خوف حقیقت ثابت ہوگا یا نہیں، لیکن یہ بات یقینی ہے کہ حکومت رجعت پسندوں کے قریب جارہی ہے۔ ترقی پسندوں اور انقلابیوں کی ساری توقعات دم توڑ چکیں۔ حتیٰ کہ پختونستان بھی، شاہ کے دور کی طرح، اب محض ایک نعرہ رہ گیا ہے۔

یکم اکتوبر:

یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہاں محمد زئی قبیلہ بطور خاص اور کچھ دیگر گھرانے، جو درحقیقت ایجنٹوں کا ایک ٹولہ ہے، ہمیشہ سے اپنے مفاد اور اقتدار کی خاطر پشتونوں کو فرنچ لیدر کی طرح استعمال کرتے آئے ہیں۔ یہ ان کی اقتدار کی مکمل تاریخ سے ثابت ہے۔ اگر تاریخ کے ورق الٹے جائیں تو اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکے گا۔ انہوں نے تمام لیڈرشپ اپنے گھرانے تک محدود رکھی ہے۔ کوئی اور لیڈرشپ پیدا کرنے کے لیے کوئی کوشش کی گئی ہے اور نہ ایسی کسی کوشش کے آغاز کی اجازت دی گئی ہے۔ یہ پختونستان یا پختونوں کا اتحاد اس لیے نہیں چاہتے کہ:

۱۔ زیریں علاقوں کے پختونوں میں شعور، تنظیم، تعلیم اور سمجھداری زیادہ ہے۔ اگر پختون اکٹھے ہوگئے تو اُن کا کلچر، زبان اور اثر یہاں کے رہنے والے پختونوں پر پڑے گا اور ان کے ایرانی کلچر کو ننگا کردے گا، اسے خطرے سے دوچار کردے گا۔

۲۔ وہاں لیڈرشپ بہت مضبوط ہے۔ اگر آج بھی رائے شماری کی جائے تو یہاں کے پختون بھی انہیں لیڈروں کو اپنا راہنما مانیں گے اور ان کی لیڈرشپ ختم ہوجائے گی۔ یوں بھی وہاں کی لیڈرشپ طبعی، تاریخی، بااستعداد اور نیچے سے اوپر کی بنیاد پر سامنے آئی ہے، جبکہ یہاں لیڈرشپ محلاتی سازشوں کے نتیجے میں سامنے آئی ہے۔

۳۔ جیسا کہ اوپر لکھا، یہ ایک ایجنٹ ٹولہ ہے، اس لیے یہ پختون کے مقابلے میں رجعت پسندی، امپیریلزم کے ساتھ ہیں۔ یہ اتحاد نہیں چاہتے۔ جوان اور ان کے آقاؤں کے لیے خطرے کا باعث ہے۔

لیکن ہم بھی اندھے ہیں، جو دیکھتے ہوئے بھی آنکھیں بند کررہے ہیں۔

2 اکتوبر:

افضل کل یا پرسوں واپس جارہا ہے۔ یہ میرے بلانے پر آیا تھا کہ ماسکو جائے اور اپنی تعلیم مکمل کرے، مگر وقت مقررہ سے بہت لیٹ آیا، اس لیے واپس جارہا ہے، اگلے سال پھر داخلے کے لیے آئے گا۔

4 اکتوبر:

افضل رخصت ہوگیا۔ وزارت سرحدات میں چھوٹی عید کی مناسبت سے گیا، گھر کے خرچ کے لیے پانچ ہزار افغانی ملے۔ حزب اللہ جو یہاں ہاؤس جاب کرتا ہے، حمید اور رؤف کے ساتھ پشاور گیا تھا، واپس آیا تو رؤف کا یہ پیغام لایا ہے کہ یہاں میڈیکل کالج میں دولڑکے مشکوک ہیں۔ ان کا داخلہ مشکوک طریقے سے ہوا ہے۔ لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں؟

5 اکتوبر:

نعیم آگیا، لیکن افضل جا چکا ہے۔ اگر آمنے سامنے بات ہو جاتی تو اچھا تھا تاکہ معلوم ہوتا کہ افضل کو بروقت اطلاع کیوں نہیں دی کہ وہ بروقت یہاں پہنچ سکتا۔ البتہ اِس کے آنے پر یوں خوش ہوں کہ یہ اطلاع لایا ہے کہ جانس خان جب پارٹی چھوڑ کر گیا ہے تو اپنے عزیز رشتہ داروں نے بھی اس سے قطع تعلق کر لیا ہے۔

6 اکتوبر:

آج عید تھی، چھوٹی عید۔ کوئی فرق نہ تھا۔ اُسی طرح بے کیف نحوست زدہ دن۔ نہ عزیز، یار دوست نہ وہ گاؤں کی گہما گہمی۔ نہ وہ عید کی مبارکباد۔ صرف نعیم میرے ساتھ تھا۔ دوپہر کا کھانا 'بختہ جان اور تین وزیر (قبیلے) کے دوستوں کے ہاں، ان کے دستور کے مطابق کھایا۔ شام کو میکروریان گئے۔ کچھ وقت بشیر صاحب کے گھر بتایا۔ پھر سابقہ وزیر 'معین عبدالہادی مکمل' کے گھر گئے، لیکن وہ گھر پر نہ تھے۔ اس کے بعد نجیب جان کے گھر گئے، دو گھنٹے وہاں رہے۔ معین صاحب کا دوبارہ پوچھا، لیکن نہ تھے۔ رات کا کھانا مظلوم صاحب کے گھر کھایا۔

7 اکتوبر:

سارا دن نعیم اور جمال کے ساتھ شہر میں مٹرگشت کی۔ 'شہرنو' میں آئس کریم کھائی۔ پھر شہر میں کھانا کھایا۔ پھر 'رام اور شیام' فلم دیکھی۔ اجمل خٹک اور تورلالی جلال آباد چلے گئے۔

8 اکتوبر:

اکتاہٹ کا دن۔ اجمل خٹک واپس آگئے۔

10 اکتوبر:

ڈاکٹر حبیبی کے ساتھ میں اور نعیم 'کارزمیر' گئے اور فوٹوگرافی کی۔

11 اکتوبر:

جنجوعہ کو ڈاک اور ڈاکٹر خورشید کو آٹھ نسخے 'چپلوا کی تڑون' (کتاب) روانہ کر دی۔ صدر صاحب کے اے ڈی سی 'مجید خان' کو 'قصر گل خانہ' میں اجمل خٹک کا خط دے دیا۔ یہ خط صدر صاحب کے لیے تھا۔

17 اکتوبر:

نعیم رخصت ہوگیا، اُسے خطوط دے دیے۔ ڈاکٹر نجیب کے والد اور پشاور میں افغانستان کے تجارتی قونصلر 'اختر محمد خان' گھر آگئے، اِسے صدر صاحب نے بلایا ہے۔

21 اکتوبر:

دن آیا اور گزر گیا، بے کار تھا اور نہ ہی کوئی مصروفیت۔ دوپہر تک حسب معمول دفتر میں تھا۔ دوپہر کو اجمل خٹک کی دوائی اور عمران (فرزندِ بشیر) کے لیے کھیلنے کی موٹر لینے تورلالی کے ساتھ شہر گیا۔ اس دوران شاہ جہان کو 'چغر سرائے' کے لیے رخصت کیا۔ عصر کو یونس غرنے آگیا۔ شام کو بشیر کے گھر گئے۔ کھانا وہیں کھایا، عمران اور بختیار کے ساتھ کھیلتے رہے۔ انہیں موٹریں دیں۔

30 اکتوبر:

آج سپریم کورٹ آف پاکستان نے حکومت کی جانب سے نیپ پر لگائی گئی پابندی کو جائز قرار دے دیا۔ اس سے پہلے بہت کچھ کہا جا رہا تھا کہ حمودالرحمٰن (چیف جسٹس) نے ریٹائرمنٹ سے پہلے نیپ کے حق میں فیصلہ کیا ہے۔ لیکن اب یہ فیصلہ آنے کے بعد معلوم ہوا کہ یا تو اطلاع غلط تھی یا پھر دباؤ کے باعث سپریم کورٹ نے نیپ کے خلاف فیصلہ کیا ہے۔ جلال آباد سے خبر آئی ہے کہ نیپ کے راہنما اور کارکنوں کی بڑی تعداد میں گرفتاریاں شروع ہوگئی ہیں۔ اس موجودہ فیصلے سے ایک بات یقینی ہے: کچھ کو گرفتار کر لیا جائے گا اور باقی بھاگ جائیں گے۔ کچھ یہاں اُٹھ آئیں گے اور کچھ کے ذہن میں ہوگا کہ جوان موجود ہیں، سنبھال لیں گے۔ وہ افغانستان میں یونہی تو نہیں بیٹھے ہونگے۔ افغانستان خود بھی کچھ نہ کچھ کرے گا۔ لیکن حقیقت میں

جوانوں کی ساری اکڑفوں نکل چکی۔ افغانستان اپنی مصیبت میں مبتلا ہے۔ اُس کی سوچ اب الٹ ہے اور جو کچھ کہا یا کیا ہے، اُس پر بھی شرمندہ ہے۔ دوسری طرف وقت ہم سے کسی تحریک کا مطالبہ کر رہا ہے، ورنہ ہم مٹنے والے ہیں۔ بہت حساس مرحلہ ہے، دیکھتے ہیں کہ ہمارے یہ یار کیا کرتے ہیں۔

5 نومبر:

ڈاکٹر خورشید کو لندن رخصت کر دیا۔ ہندوستانی دوست سے پیسے لے آیا۔ دوپہر کے بعد بخار نے آلیا اور سردی لگ رہی ہے۔

6 نومبر:

ہدایت اللہ باچا جلال آباد سے شام ہمارے گھر آیا۔ ہندوستان کے سفارتخانے کا ربطہ سفارت کار ہمارے گھر آیا۔ نیپ پر پابندی کے بعد کے حالات کو سمجھنا چاہ رہے ہیں۔ دوپہر کا کھانا مکمل صاحب اور رات کا کھانا مظلوم کے ساتھ کھایا۔

آج بی بی سی نے اطلاع دی ہے کہ شیر باز مزاری کی سربراہی میں پاکستان میں ایک نئی جماعت 'نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی' کے نام سے بنائی گئی ہے، یہ اعلان اسلام آباد میں شیر باز مزاری نے کیا ہے۔ اس نے کہا کہ اس پارٹی میں سابق نیپ کے عہدیداروں اور کارکنان کے علاوہ آزاد اراکین بھی شامل ہونگے۔ بی بی سی نے یہ بھی بتایا کہ NDP کا مزاج اسلامی ہوگا۔ نیپ سے این ڈی پی اور سیکولر سے اسلامی؟ آگے جانے کے بجائے مراجعت، سختی کی بجائے نرمی! ولی خان کی جگہ شیر باز مزاری۔ اب بتاؤ صوفی! نفع کمایا یا نقصان؟؟

یکم دسمبر 1975:

آج پہلی برف باری ہوئی، اب تک خشکی کی وجہ سے فلو اور دیگر امراض بہت زیادہ تھے۔ اب خیریت رہی تو لوگ اس مصیبت سے چھوٹ جائیں گے۔

8 دسمبر:

میرا خان 6 دسمبر کو آیا تھا، آج واپس لوٹ گیا۔ فیض محمد خان، فلک شیر اور سید وہاب بھی اجمل خٹک کی اجازت کے بعد اپنے گاؤں لوٹنے کی نیت سے جلال آباد کو رخصت ہو گئے۔

12 دسمبر:

آج بڑی عید کا دن ہے، اجمل خٹک اور تور لالی جلال آباد گئے ہوئے ہیں۔ گھر میں باورچی اور خدمت گار بھی نہیں۔ باورچی خانہ بند ہے اور کھانے پینے کا کوئی انتظام نہیں۔ میں، جمال، غلام حبیب، امجد اور انور گھر میں اکیلے ہیں۔ دوپہر کا کھانا ہوٹل میں کھایا۔

اصل پروگرام یہ تھا کہ ہم بھی نیک زاد کی جیپ میں ڈاکٹر پکتیاوال کے ساتھ جلال آباد جائیں گے اور وہاں رہیں گے۔ کونڑ کا علاقہ دیکھیں گے اور شام کو اجمل خٹک واپس آئیں گے۔ کل مظلوم اور بشیر بمعہ خاندان کے لشکر گاہ جائیں گے، کچھ دن رہیں گے۔ لیکن اچانک ڈاکٹر پکتیاوال کی طبیعت خراب ہوگئی اور یوں ہم بدنصیبوں کا سارا پروگرام مٹی میں مل گیا۔ اب ہم گھر میں تنہا اور بے کار بیٹھے ہیں۔ میں سو گیا، امجد بھی سو گیا، انور باچا بچوں کی طرح پتنگ بازی میں مصروف ہے۔ وہ اڑا رہا ہے اور اپنا دھیان ہٹا رہا ہے۔ ہر ایک کو اپنے عزیزوں، گاؤں، ماں باپ اور خاندانی دوست یاد آرہے ہیں۔ میں بھی ان سے الگ نہیں۔ مجھے بھی گھر، ماں، باپ، بھائی، بہنیں، بھانجے، بھتیجے بہت یاد آرہے ہیں۔ دوستوں کی صورت بھی آنکھوں کے آگے پھر رہی ہے۔ لیکن وہ جو کہاوت ہے کہ 'قبر چاہے جتنا بھی مشکل مقام ہے، مردے کی تو مجبوری ہے'۔ میرا تو یہاں سانس بند ہو رہا ہے۔ سماجی زندگی نہیں ہے، سیاست پر پابندی ہے، اردگرد کا ماحول مشکوک لگتا ہے، وہ جو کہاوت ہے کہ دیواروں کے بھی کان ہیں، یہاں سچ ثابت ہوتی ہے۔ ہماری تحریک کے لیے کوئی مثبت کام نہیں ہو رہا، محض ہمیں بہلایا جا رہا ہے۔ پارٹی پر پابندی، راہنما قید، جوان در بدر اور مایوس۔ اے خدا! آخر ہوگا کیا؟ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اگر امید اور توقع رکھنی بھی ہے تو کم از کم اس جگہ سے رکھنا بے کار ہے۔ ہمیں توجہ اپنے ملک پر مرکوز کرنی چاہیے۔

14 دسمبر 1975:

آج عید کا تیسرا دن ہے اور شائد ہمارے پختونخوا پایاں میں اور ہمارے گھر گاؤں میں آج عید کا پہلا دن ہوگا۔ آج ہم موت کے منہ سے معجزانہ طور پر بچ گئے۔ قصہ یوں ہوا کہ کل ہم محراب الدین پکتیاوال کی عیادت کو ان کے گھر گئے، کیونکہ موصوف کی وجہ سے ہمارا عید کے دن جلال آباد اور کونڑ کا پروگرام رہ گیا تھا۔ اس موقع پر میں نے ڈاکٹر پکتیاوال کو میاں صاحب اور شیر

محمد کی آمد کی خبر دی۔ پکتیاوال صاحب نے مجھے کہا کہ کل (یعنی آج) نیک زاد کی جیپ لے کر مہمانوں کو لے کر کہیں گھومنے نکلیں گے۔

اس پروگرام اور فیصلے کے مطابق میں، شیر محمد، نیک زاد، میاں صاحب، پکتیاوال اور خلیل زمر 'سروبی' روانہ ہوگئے۔ کچھ وقت وہاں دریا کے کنارے گزارا۔ 'نغلو' کی طرف گئے لیکن ڈیم کی طرف جانے کی اجازت نہ تھی۔ خیر قریباً تین بجے واپسی کا سفر شروع ہوا۔ شیر محمد نے اپنی کلان کاری سے کام لیا، خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور بہت تیز چلانے لگا۔ 'سروبی' اور نغلو سے ادھر جب کچھ موٹروں کو پاس کر رہا تھا تو جیپ چڑھائی کی طرف چلی گئی۔ سامنے ہی ایک مسافر بس آرہی تھی۔ شیر محمد نے چاہا کہ اس بس کو بھی کراس کر لے، لیکن چونکہ بہت تیز رفتار تھی، اور بس کراس کر رہا تھا کہ سامنے سے ایک اور موٹر آگئی۔ اب ڈرائیور صاحب کے اوسان خطا ہوگئے۔ جیپ کبھی ایک طرف اور کبھی دوسری طرف لہرا رہی تھی۔ آخر بے قابو ہوئی تو میں ساتھ بیٹھا تھا میں نے کہا بریک لگاؤ۔ لیکن اُس کے اوسان خطا تھے۔ آخر جیپ سڑک سے اتر کر گہرائی کی طرف گرنے لگی۔ موت یقینی محسوس ہونے لگی۔ یہ اچھا ہوا کہ یہ حادثہ قدرے پہلے یا بعد میں نہ ہوا ورنہ ان گہری گھاٹیوں سے ہماری لاشیں کون نکالتا۔ اُسی لمحے جیپ الٹ کر قلابازیاں کھانے لگی۔ یہ یواین کے نمبر پلیٹ والی جیپ تھی، جو وزارت زراعت کے پاس تھی۔ اس کے شیشے، باڈی اور کھڑکیاں ٹوٹ پھوٹ گئے۔ میرا سر اور داہنی ران زخمی ہوئی۔ نیک زاد کا پاؤں اور سر خون سے سرخ ہوگیا۔ شیر محمد کا پاؤں جیپ کے نیچے پھنسا ہوا تھا۔ بسوں، ٹرکوں اور گاڑیوں میں جانے والے لوگ اکٹھے ہوئے۔ جیپ اٹھائی، شیر محمد کے جسم کو، جس کے بارے میں موت کا خدشہ تھا، جیپ کے نیچے سے نکالا گیا۔ اس کے پاؤں سے لوہے کی سلاخ آر پار ہو چکی تھی اور پسلیوں پر زور پڑا تھا۔ اتنے میں ٹریفک پولیس کی جیپ بہت جلد پہنچ گئی۔ باقی تینوں (پکتیاوال، زمر اور میاں صاحب) کو معمولی خراشیں آئیں تھیں۔ ٹریفک والے ہمیں 'سروبی' لے گئے لیکن عید کے باعث وہاں ڈاکٹر نہ تھا، اس لیے بہت تیز رفتاری کے ساتھ وہ ہمیں دوسری محکمہ ٹریفک کی ویگن میں 'وزیر اکبر خان ہسپتال' لے گئے۔ وہاں ڈاکٹروں نے ہماری پٹیاں کیں۔ اسے کہتے ہیں 'بلا تھی' لیکن برکت نہ تھی'۔ رات 'میکروریان' میں گزاری۔ صبح 'گل محمد ہوت' نے مجھے اپنے کپڑے دیے کیونکہ میرے کپڑے خون میں لت پت اور پھٹ چکے تھے۔

24 دسمبر:

آج باچا گل صاحب 105 سال کی عمر میں کابل میں دارالامان سڑک پر واقع اپنے گھر میں وفات پاگئے۔ مرحوم نے باجوڑ جنگ کی رہبری کی تھی۔ وہ حاجی صاحب ترنگزئی کے بیٹے تھے۔[۱۵]

یکم جنوری 1976:

آج سال 1976ء کا اولین دن ہے۔ نیا سال شروع ہوگیا۔ گذشتہ برس کئی لحاظ سے ہمارے لیے مایوسی کا سال تھا۔ نیپ پر پابندی لگی، ہمارے ملی راہنما قید ہوئے، جوانوں کو ٹارچر کیا گیا اور لوگوں کو بے عزت کیا گیا۔ اس کے خلاف ہم کچھ ردعمل ظاہر نہ کر سکے، بلکہ جہاں تک پہنچ سکے تھے، اُس سے بھی پیچھے ہٹ گئے۔ یہ الگ بات کہ یہ سب کچھ ہمارے بس میں نہ تھا۔ ایسا کیوں تھا؟ یہ ایک لمبی داستان ہے۔ اس میں کچھ افغانستان کی اندرونی اور بیرونی مشکلات شامل تھیں، کچھ داؤد خان کے موہوم خدشے اور کچھ ہماری لیڈر شپ اور پارٹی کی کمزوریاں۔ لیکن یہ ایک الگ بحث ہے۔ اب لوگ نئے برس کی خوشیاں منا رہے ہیں۔ ہر کوئی نئے برس سے اپنی زندگی کے لیے اچھی اور خوش کن امیدیں وابستہ کرتا ہے، ہم بھی ایسی ہی امیدیں رکھتے ہیں۔ اللہ کرے یہ سال میرے لیے ملی اور ذاتی زندگی، دونوں لحاظ سے خوشحالی کا پیغام لائے۔

ماحول اتنا غمزدہ اور حالات اتنے غیر واضح اور مایوس کن ہیں کہ اور چیزیں تو دور کی بات، مجھ سے ڈائری بھی نہیں لکھی جاتی، حالانکہ ارادہ یہ تھا کہ ہر روز لکھا کروں گا۔

3 جنوری:

گاؤں سے بھائی رسول خان آگیا ہے۔ اُس کی خواہش ہے کہ دوبئی یا بحرین جائے لیکن اُسے معلوم نہیں کہ اول تو اِن کے سفارتخانے یہاں موجود نہیں، اور دوسرا یہ کہ ہم یہ کام کر بھی نہیں سکتے۔ یہ شیخ ہمارے مخالفین ہیں۔ افضل نے لکھا ہے کہ بی اے میں سیکنڈ ڈویژن سے پاس ہوگیا ہے۔ لاء کالج میں داخلہ لیا ہے اور ہاسٹل نمبر 6 میں کمرہ نمبر 37 میں رہ رہا ہے۔ ریڈیو اور کوٹ کے کپڑے کی فرمائش کی ہے۔

5 مارچ:

آج اقبال آفریدی پشاور سے میرے بھائی افضل کا خط لایا ہے۔ اور باتوں کے علاوہ 'داجی' (والد) کی بیماری کا تذکرہ کیا ہے۔ لکھا ہے کہ 20 فروری کو لیڈی ریڈنگ ہسپتال کے سی وارڈ میں داخل کیا ہے۔ مجھے لکھا ہے کہ آؤ اور دیکھ لو، ورنہ تمہارے سامنے چلا ہے، یہ بھی لکھا ہے کہ تمہیں یاد کرتا ہے اور پچھلی مرتبہ بھی تم دیکھنے نہیں آئے تھے۔ خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ والد کی طبعیت ٹھیک نہیں۔ خدا نہ کرے لیکن موت کا احتمال عمر اور بیماری کی وجہ سے بڑھ گیا ہے۔

رات میں نے اجمل خٹک سے جانے کی بات کی، لیکن انہوں نے بالکل مشورہ نہیں دیا۔ دوسرا میں ایسی مصیبت میں گرفتار ہوں جو اجمل خٹک کے بس سے باہر کی بات ہے۔ یہ خطرہ اجمل خٹک مول نہیں لینا چاہتے، البتہ میں سوچ رہا ہوں کہ چلا جاؤں۔ اگر کل کلاں کو والد وفات پا گئے تو اپنے پرائے طعنہ دیں گے کہ ڈرپوک تھا، ورنہ فلاں فلاں کے خلاف وارنٹ تھے لیکن وہ تو آ گئے تھے۔ کوئی میرے کام کی حقیقت، نوعیت اور نزاکت سے واقف نہیں۔ ایک طرف والد ہے اور دوسری طرف طعنہ۔ اے خدا میں کیا کروں؟ اس امتحان سے بھی گزر جاؤں گا اور سینے پر پتھر رکھ دوں گا۔ مجھے اپنی بے بسی پر افسوس ہوتا ہے۔

شاہجہان، جو تین چار دن پہلے جرمنی سے آیا تھا، گاؤں چلا گیا ہے۔ میں نے اسے گھر، افضل اور نعیم کے لیے خط دیے۔ اُسے ہدایت کی کہ نعیم سے خود ملو اور اس سے جرمنی جانے کے بارے میں تفصیل سے بات کرو۔

14 مارچ:

گزشتہ رات بہت بے آرامی میں کٹی۔ خواب میں دیکھا کہ والد صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ آنکھ کھلی اور پھر سویا تو دوبارہ یہی خواب دیکھا۔ اس کے علاوہ اور بھی غمزدہ خواب دیکھے جو اب بھول گئے۔ معلوم نہیں یہ میری ذہنی کیفیت ہے یا کیا ہے۔ میرا معدہ بھی ہر وقت خراب رہتا ہے۔ جانے یہ اُس کا نتیجہ ہے یا سچ مچ میں کوئی غم کی خبر ہے۔

زندگی کا یہ تلخ اور لمبا سفر اکیلے گزارنا میرے لیے ناممکن ہو گیا ہے۔ لیکن کیا کروں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ پھر بھی ایک آئیڈیل محبوبہ کا انتظار ہے۔ لیکن جب حقیقت پر نظر کرتا ہوں تو سخت بے

قرار ہو جاتا ہوں۔

2 مارچ:

جنجوعہ صاحب کو ایک ہزار ڈالر 'پشتنی تجارتی بینک' کے ذریعے لندن ویسٹ منسٹر بینک کو بھجوا دیے۔

14 مارچ:

بی بی سی سے معلوم ہوا کہ این ڈی پی کے بعض لیڈر گرفتار کر کے حیدرآباد بھیج دیے گئے ہیں۔ پاکستان کے وزیر قانون نے کہا ہے کہ ان پر سازش کا مقدمہ چلایا جائے گا۔ اُس دن معلوم ہوا کہ حاجی غلام احمد بلور اور امیر زادہ خان گرفتار ہو گئے ہیں اور ارباب سکندر اور افضل خان کے ساتھ حیدرآباد جیل بھیج دیے گئے، جہاں ولی خان بھی قید ہیں۔ بلوچستان سے غوث بخش بزنجو، عطاءاللہ مینگل، گل خان نصیر اور ہاشم غلزئی، پنجاب سے حبیب جالب اور قسور گردیزی، اور سندھ سے عزیز اللہ شیخ کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔

اپریل کے پہلے ہفتے میں ڈاکٹر رشید پشاور میں سیمینار میں شرکت کرنے کے بعد یہاں سے واپس چلے گئے۔ ہمارے ساتھ تین دن گزارے۔ بات چیت ہوئی اور پھر کینیڈا چلے گئے۔

افضل کا خط آیا ہے کہ 'داجی' کو ہسپتال سے گھر لے آئے ہیں اور اُس کے مطابق صحت پہلے سے بہتر ہے، علاج گھر پر ہو رہا ہے۔

شہباز کے گاؤں کے رہنے والے شخص کے ہاتھ جو خط عبدالعزیز کاکا اور نعیم کے نام بھجوائے تھے وہ تورخم پر پکڑے گئے۔ دونوں غیر سیاسی خط تھے۔ نہ لکھنے والے کا نام درج تھا نہ کسی اور کا، اس لیے اس کا ردعمل نہیں ہوا۔

حیدرآباد جیل میں نیپ راہنما سازش کیس کے خصوصی ٹریبونل کے سامنے پیش ہو گئے۔ تمام بڑے اس مقدمے کے لیے اس جگہ اکٹھے کیے گئے ہیں۔

3 مئی:

کل مجھے امجد نے جاگنگ سوٹ خریدنے کو کہا۔ میں نے کورا جواب دے دیا، کہ خرید لو مجھے کیوں کہہ رہے ہو؟ اس میں انور باچا نے مداخلت کی کہ یہاں بدمعاشی سے کام لیا جا رہا ہے۔

شرافت سے کوئی کام نہیں ہوتا۔ (بے چارے اس معاملے میں قصور وار بھی نہیں ٹھہرائے جا سکتے) میں نے انہیں کہا میں نہ کسی کا کمانڈر ہوں نہ لیڈر۔ اگر کسی کام کو میرا جی چاہے گا، تو کروں گا ورنہ نہیں۔ اس نے کہا تم تنظیم کے سیکرٹری ہو اور تنظیم کی بات ماننے کے پابند ہو۔ جسے اجمل خٹک سے کچھ کہنا ہو، پہلے تمہیں کہے گا۔ میں نے کہا میں اجمل خٹک کا سیکرٹری ہوں اور انھی کو جوابدہ ہوں۔ اگر تم خود کہہ رہے ہو کہ میں تمہیں کچھ نہیں سمجھتا، تو پھر یہ لڑائی کس بات پر ہے؟ اگر میرے خلاف کوئی شکایت کرنی ہے تو جاؤ اجمل خٹک سے کہو، مجھ سے الجھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس نے کہا اگر تم تنظیم کی بات نہیں مانتے تو پھر تم یہاں نہیں رہ سکتے۔ مجھے یہ سن کر ہنسی آ گئی (کہ انور اور تنظیم!) بہت سی باتیں ہوئیں۔ اس نے دھمکیاں بھی دیں، لیکن میں نے کہا میرا تم سے کوئی سروکار نہیں۔ تم جانتے ہو کہ میں بھی پشتون ہوں اور تم بھی، لہٰذا بہت ہو چکا، اب خاموش ہو جاؤ۔

4 مئی:

کل کی چھیڑ چھاڑ کے وجہ سے صبح جب میں سیڑھیوں پر اوپر آ رہا تھا تو انور نے پوچھا تم پشتون ہو؟ یہ کہتے ہی پیچھے سے مجھ پر پنجہ مارا اور مجھے نیچے گرا دیا۔ میں اس کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ جس وقت میں نے جواب دینے کی کوشش کی تو باورچی، تورلالی اور عسکر آ گئے اور ہمیں الگ کرایا۔ میں نے اُسے کہا اس گھر میں یا تم رہو گے یا میں۔ وہ باہر چلا گیا، بعد میں معلوم ہوا کہ میرے ساتھ لڑائی محض بہانہ تھی، غصے کی اصل وجہ کچھ اور تھی۔ کیونکہ ان دنوں ایاز (اعظم کا بھانجا) بھی ناراض اور غصے میں تھا۔ دونوں پر گھر میں داخل ہونے پر پابندی لگائی گئی تھی۔ دونوں بی بی شیرین کے گھر مقیم تھے۔

اے خدا کس بدمعاشی کو پورا کریں؟ بھٹو کے ساتھ یا ان کے ساتھ؟ بدنامی تحریک اور بڑوں کی ہوتی ہے، ورنہ ان کا علاج اتنا مشکل نہیں۔ اگر یہی بدمعاشی کرنی تھی تو اپنا علاقہ اور گاؤں برا نہ تھا، بس بھٹو کو بڑا بدمعاش تسلیم کرنے کی دیر تھی۔ یہ کڑوے گھونٹ اپنے مقصد کی خاطر پینے پڑیں گے۔ بے عزت لوگوں کے ساتھ بے عزت ہوتے رہیں گے۔ یہ بے چارے بھی تو پانچویں سوار ہیں۔

22 جون:

کئی دن سے پریشان ہوں، کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا۔ اپنا مستقبل مجھے مایوس کن لگ رہا ہے،

اس کی کئی وجوہات ہیں: پاکستان اور افغانستان کے تعلقات بحال ہونے کے بعد میں کیا کروں گا؟ یہاں رہوں گا یا واپس جاؤں گا؟ یہاں رہوں یا جاؤں، یہ سوال بار بار سامنے آتا ہے کہ کروں گا کیا؟ پہلی بات تو یہ کہ شادی کرنی ہے کہ بغیر محبت زندگی بہت مشکل لگ رہی ہے۔ کیونکہ ہمارا معاشرہ اپنے جذبات کی تسکین کے کسی اور راستے کی اجازت نہیں دیتا۔ دوسری بات یہ کہ بے روزگاری میں کیا کروں گا؟ اگر یہاں رہ گیا تو چلو کھانے کا انتظام ایک یا دوسرے راستے سے ہو جائے گا۔ لیکن اگر باپ کی وفات کے بعد پیچھے (پختونخواہ پایاں) گیا اور شادی کی تو الگ گھر کی ضرورت ہوگی، پیٹ بھرنے کا انتظام بھی کرنا ہوگا۔ ایک طرف تو اتنی زمین نہیں کہ جاگیرداروں کی طرح ہم بیٹھے رہیں اور کمائی کھاتے رہیں۔ پھر بھائی اس بات کی اجازت نہیں دیں گے کہ میں ان پر بوجھ بن کر کھاتا رہوں، یوں بھی بھائی چھوٹے ہیں، ابھی کمانے کے قابل نہیں۔ بڑا بھائی اپنے بچوں کو لے کر الگ ہو چکا ہے۔ اگر سیاست کروں گا تو خرچ اور بھی زیادہ ہوگا۔ کسی کو جگہ دینی ہوگی، رات ٹھہرانے کا انتظام کرنا ہوگا، چائے کھانا دینا ہوگا اور یار دوست ہونگے۔ اس کے لیے ذرائع کی ضرورت ہے، جو مجھے فی الوقت کہیں نظر نہیں آ رہے۔ دوسرا یہ کہ این ڈی پی میں جو دراڑ آئی ہے، تو اب جو سیاست کروں گا تو ایک راستہ اپنانا ہوگا۔ دائیں بازو کی سیاست میرا ضمیر، ذہن اور شعور تسلیم نہیں کرتا۔ بائیں بازو کی سیاست زیاں مانگتی ہے، کیونکہ بہت ناپختہ کار اور کمزور ہیں۔ بغیر شادی، گاؤں، یار دوست کے تمام عمر انڈر گراؤنڈ سیاست ممکن نہیں۔ یہ بھی قبل از وقت ہے، کیوں کہ کھلے بندوں سیاست کی اجازت بھی ہوگی یا نہیں، اس کی کیا خبر۔

باپ کی وفات کے بعد مجھے اپنا گھر بار، بھائی، والدہ، گاؤں بہت یاد آتا ہے۔ اپنے گھر کی حالت میری آنکھوں کے سامنے پھرتی رہتی ہے اور ساتھ یہ لوفرانہ سیاسی زندگی جو کسی کروٹ نہیں بیٹھ رہی۔ دوسرا اپنی پارٹی اور دوستوں کی سیاست سے، اگرچہ اُن کی سیاست بالکل درست راستے پر بھی ہو، زیادہ امید نظر نہیں آتی۔ وہ ایک انسان کو جوش دلانے کی صلاحیت سے محروم ہے، اُن کے ساتھ میکانکی سی زندگی گزارنی ہوگی۔

اگر اجمل یہاں رہ گئے تو وہ چاہیں گے کہ میں بھی ساتھ رہ جاؤں، لیکن اب یہ تنہا اور مجرد زندگی کاٹنا بہت دشوار ہے۔ اپنے جذبات اور احساسات کو کچلتے رہنا مجھے ظلم لگتا ہے اور نہ ہی میں اس پر قادر ہوں۔ اس لیے حیران ہوں کہ کیا کروں؟ کیا فیصلہ کروں۔ کس راستے پر چلوں۔ اور اس

سے بھی اہم یہ کہ میرے لیے کونسے راستے کھلے ہیں اور وہ بھی کن شرائط پر؟ یہ سب دیکھتا ہوں تو پریشان ہو جاتا ہوں۔ کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا، غمزدہ ہو جاتا ہوں، مایوسی سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔ کوئی ساتھی نہیں کہ تسلی دے، دل ہی دل میں اپنے آپ کو کھاتا رہتا ہوں۔ میرا انجام کیا ہوگا، مجھے کچھ نہیں معلوم۔

22 جون:

پرسوں جلال آباد سے 'روز گل' آیا ہے۔ یہ نیچے (پختونخوا پایاں، پاکستان) چھپ کر گیا تھا۔ اجمل خٹک نے باچا خان کی طرف بھی بھجوایا تھا۔ ڈیڑھ مہینہ وہاں گزارا اور سات آٹھ دن ہوئے یہاں آیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ نیچے کے علاقوں کی سیاست کے بارے میں اس سے بات کی جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک سنجیدہ سیاسی کارکن ہے۔ ترقی پسند کتابوں کا مطالعہ بھی خوب کرتا ہے اور بڑی تعداد میں منگواتا بھی رہتا ہے۔ اس لیے میں نے اسے 'سرخ پرچم' کے چند شمارے اور کمیونسٹ پارٹی کی چند دستاویزات مطالعہ کے لیے دیں۔ لیکن میں حیران رہ گیا کہ اس نے گھنٹہ ڈیڑھ مطالعہ کیا اور پھر انہیں چھوڑ دیا۔ جبکہ ایسی مطبوعات کے مطالعہ میں ہم دنوں مصروف رہتے ہیں۔ یا تو پارٹی کے نام اور تنظیم اور کام سے ڈر گیا ہے، یا یہ کہ ڈسپلن کے خلاف ہے، یا پھر یوں ہے کہ اس کی ترقی پسندی محض فیشن ہے، یا کسی سے رقابت کی وجہ سے ہوگی، یا پھر یہ ترقی پسندی محض انا پسندی کے اظہار کے لیے ہے۔ پھر بھی کوشش کر رہا ہوں کہ کسی طرح اسے اپنے منتر سے رام کر ہی لوں۔

25 جون:

کل عالم زیب کے ساتھ سرسری طور پر سیاست، این ڈی پی کی تقسیم، بائیں بازو کے لوگوں کو ہٹائے جانے، اپنے موقف اور اُس میں ہمارے کردار پر بات ہوئی۔ وہ بھی یہی رائے رکھتا ہے کہ یہ وقت تقسیم کا نہیں۔ یہ قوم پرستوں سے ناراض ہے، کہ کیوں بائیں بازو کو نکال باہر کیا۔ یہ بھی عقیدے کے لحاظ سے بائیں بازو کا ہے، ایماندار اور سمجھدار ساتھی بن سکتا ہے۔

23 جولائی:

17 جولائی کو افغانستان کی جمہوریت کا جشن تھا۔ آج جشن کا چھٹا دن ہے۔ باقاعدہ جشن گزر گیا۔ اب دس دن تک غیر رسمی جشن جاری رہے گا۔ یہ جشن گذشتہ تمام جشنوں سے کئی لحاظ سے مختلف ہے:

- اس مرتبہ جلال آباد میں ہمارے کیمپ سے اسی کے اسی نوجوانوں کو کابل کے 'پیلوری مہمان خانے' دارالامان لایا گیا ہے۔ انہیں، ہم سب کو، اور ہمارے قبائلی دوستوں کو جشن میں شرکت کے کارڈ بمعہ مارچ پاسٹ پریڈ کے کھلے دل سے تقسیم کیے گئے ہیں۔ ٹرانسپورٹ کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اسٹیڈیم کی خصوصی نشستوں کے کارڈ بھی ہمارے کئی دوستوں کو دیے گئے ہیں۔
- دو جیپیں ہمارے کمانڈروں اعظم اور باچا کے گھر والوں کے لیے مخصوص ہیں۔ ان کے گھر والوں کو میکروریان کے گھروں میں ٹھہرایا گیا ہے۔
- اسی طرح واضح طور پر اچھا سلوک بلوچوں کے ساتھ بھی کیا گیا ہے۔
- اس دوران ہمارے اکرام میں وزیر داخلہ، وزیر زراعت، وزیر اطلاعات و کلچر (دائیں بازو والا)، وزیر سرحدات اور کمانڈر انچیف کی جانب سے محافل موسیقی منعقد کی گئیں۔
- وزارت زراعت کی جانب سے کیمپ کے کارڈ تمام نوجوانوں کو مفت دیے گئے۔
- اچھی اور پر تکلف مرغن دعوتوں میں ہمیں مہمان بنایا گیا۔ ہم سب کی تعداد ایک سو چالیس افراد سے کم نہ تھی۔ ٹرانسپورٹ بھی حکومت کی جانب سے فراہم کی گئی تھی۔

یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہاں کی حکومت نے سوچا ہے کہ یوں بھی ان لوگوں کے یہاں آخری دن ہیں اور پاکستان کے ساتھ تعلقات کی بحالی کی صورت میں انہیں یہاں سے جانا ہے، اس لیے بہتر ہے کہ انہیں خوش کر کے بھیجا جائے۔ کیونکہ ان مہربانیوں کی کوئی اور ظاہری وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ [کچھ مدت بعد مجھے معلوم ہوا کہ مسلح اپوزیشن اس کوشش میں تھی کہ داؤد خان کا تختہ الٹ کر اس جشن کو اپنے جشن میں تبدیل کر دیں، لیکن مخالفین ناکام ہو گئے، اس لیے ہماری اتنی آؤ بھگت کی گئی اور جشن کو اتنا طول دیا گیا کہ اس کے پیچھے یہ سازشیں کارفرما تھیں۔]

نثار لالہ اور حبیب اللہ بھی لیاقت حیات چترالی کے گھر آئے تھے، کہ جشن دیکھیں۔ انہیں دنوں میں ذوالفقار کا بھائی مختار اپنے داخلے کے سلسلہ میں نعیم اور افضل کے خطوط کے ساتھ آیا۔ جشن میں ہمارے عزیز شوکت بھی عالم زیب کے سگے بھائی اور کزن کے ساتھ آئے تھے۔ افضل

نے مجھ سے 'داجی' کی قبر کے لیے سنگ مرمر کے کتبے کی فرمائش کی ہے۔ کل یعنی 22 جون کو ہم ہندوستان کے سفیر کی دعوت پر اُن کے گھر ہندوستانی فنکاروں اور موسیقاروں کی محفل میں مدعو تھے۔ پدم شری انعام یافتہ 'اوماشری' کا کتھک ڈانس دیکھا، بہت لطف آیا۔

6 اگست:

خان بہادر خان کے دو بیٹوں کو، جو ٹور کے لیے کابل آئے ہوئے ہیں، اپنے گھر لایا اور ان کی خاطر مدارات کی۔[۱۶] ہندوستانی فلمی گانوں کی کیسٹیں انہیں تحفہ میں دیں۔

14 اگست:

آج سلیم راز کے ساتھ محمد گل ٹھیکیدار دو دوستوں سمیت آئے۔ یہ باجوڑ سے مہمندوں کے راستے جلال آباد آئے تھے۔ سلیم راز پرانا نظریاتی ساتھی ہے۔

25 اگست:

آج میری والدہ اور بھائی رسول خان آئے۔ والدہ پاسپورٹ پر آئی ہیں اور رسول خان کو ویزہ نہیں ملا، اس لیے بغیر پاسپورٹ کے آیا ہے۔

7 ستمبر:

آج میں نے بھائی اور والدہ کو رخصت کر دیا۔ کل میں رسول خان کے ساتھ تورخم مدیر گمرک (کسٹم ڈائریکٹر) شامحمود خان کو اس لیے ملنے گیا کہ رسول خان بغیر پاسپورٹ آیا تھا، اس لیے وہ کل ماں سے پہلے ٹرک میں پشاور چلا گیا۔ آج والدہ کو اس کے پیچھے میں نے افغانستان کی پوسٹ نامی گاڑی میں بھجوا دیا۔ کل رسول خان کو رخصت کرنے کے بعد میں رات 'تورخم' کے مدیر کے پاس رہا۔

22 ستمبر:

بیس ستمبر کو صبح سوا سات بجے کے قریب پیر محمد خان، جو اپنی عادات اور گپ شپ کی وجہ سے 'انکل' کے نام سے مشہور تھے، دل کی بیماری کے باعث اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ خدا اسے جنت عطا فرمائے۔

کہا جاتا ہے کہ انکل کل (19 ستمبر) جلال آباد اپنے سینے کی تکلیف کی تشخیص کرانے اور فرید (تھانہ) کے میڈیکل کالج کے طالب علم کے کسی کام کی غرض سے کابل کو دیر کے محمد علی سیکرٹری کے ہمراہ آئے تھے، رات تین بجے انہیں بے آرامی محسوس ہوئی۔ ریاستی ہسپتال لے جائے گئے، چونکہ یہ اُن کے ساتھیوں کے لیے معمول کی بیماری محسوس ہوئی اس لیے ہمیں اطلاع نہیں دی گئی۔ پھر صبح حاجی نادر خان کو معلوم ہوا اور انہوں نے فون پر مجھے اطلاع دی، جب محترم کی زندگی کے آخری چند لمحے باقی تھے۔ جب میں پہنچا تو پیر محمد خان رخصت ہو چکے تھے۔ اس وقت اجمل خٹک گھر پر نہیں تھے، جلال آباد سے ابھی واپس نہیں آئے تھے۔ خیر انکل کی میت کو میں اور رشید 'علی آباد شفاخانے' محفوظ کرنے کی غرض سے لے گئے۔ وہاں سوا ایک بجے تک ان کے نہلانے، کفنانے اور محفوظ کرنے کا عمل مکمل ہوا۔ تابوت میں ڈالنے کے بعد انہیں ہم تورخم لے گئے۔ دوسری طرف سے اُس کے بھائی دوست محمد اور باقی عزیز آئے ہوئے تھے۔ جنازہ تورخم سے تقریباً 6 بجے دوسری طرف منتقل ہوا۔ دوسرے دن جلال آباد کی جامع مسجد میں مرحوم کے لیے فاتحہ خوانی کی گئی۔

الغرض مرحوم کی مجھ سے دس سال سے کچھ زیادہ کی شناسائی تھی۔ دنیا جو کچھ کہے اور اُس کی ذاتی عادتیں اور کمزوریاں جو کچھ بھی تھیں، مجھے وہ خوش خو، خندہ رو، گپ شپ کرنے والا، چھوٹوں کے ساتھ چھوٹا، بڑوں کے ساتھ بڑا اور بلند ہمت انسان کے طور پر محسوس ہوتا تھا۔ ہمارے دوستوں میں انہی عادتوں کی وجہ سے مقبول تھا۔ جب کسی کا کسی بھی جگہ کوئی کام ہوتا، یہ کسی ذاتی غرض کے بغیر اس کے لیے بھاگتے۔ ہر ایک کی بیماری اور تکلیف میں شریک ہوتے۔ افسوس یہ دنیا سے چلا گیا، لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ ایک بہادر مرد کی طرح اپنے مورچے پر ڈٹے ہوئے، پشتونوں کے راستے پر کھڑے اور ہر مشکل کے لیے تیار ایک غازی کی طرح اس دنیا سے رخصت ہوا۔ مرحوم غیرت کی موت مرا، یہ پہلی میت تھی، جس کے کپڑے میں نے اپنے ہاتھوں سے اتارے، اور نہانے، ملاحظے کے لیے سٹریچر تک چڑھایا۔

24 ستمبر:

آج جمعہ کا دن تھا، چھوٹی عید کا دن۔ شکر ہے، رمضان ختم ہوا۔ دوپہر اجمل خٹک جلال آباد کے لیے رخصت ہوئے۔ کل پاکستان اور گاؤں میں عید ہوگی۔ لیکن عید کا کیا فائدہ، جب گھر سے باہر ہوں۔ عزیزوں اور دوستوں سے جدا، وطن سے دربدر، دوسروں کی زمین پر اپنی جگہ ساکت، راستہ اندھیرا، منزل تھکی ہوئی، دوستوں سے بیزار، گذشتہ غلطیوں پر نادم، بھائی پر اعتماد

نہیں، رکاوٹوں کا سامنا اور اپنی جان کا دشمن بیٹھا ہوں۔ اللہ اس کاررواں پر رحم کرے، جس کے راہنما سے راستے کا انتخاب غلط ہو گیا ہو۔ ہر کوس کے ساتھ راستہ لمبا ہوتا جا رہا ہے۔ مسافر تھک چکے ہیں اور مایوس ہیں۔

کل سلیم راز اور محمد گل ٹھیکیدار رخصت ہو گئے۔ سلیم راز نیچے علاقوں میں شاعروں اور ادیبوں کے اجلاس کرے گا اور انہیں متحد کرے گا۔ محمد گل مجھ سے ریڈیو اور ٹیپ لے گیا۔ سلیم راز تورخم کے راستے جائے گا اور محمد گل اپنے گاؤں 'بدان' باجوڑ جائے گا۔

21 اکتوبر:

آج جہانگیر اور نثار کے ساتھ عبدالخالق لالہ گاؤں سے واپس پہنچ گئے۔ یہ جلال آباد کچھ دن پہلے، گاؤں سے جہانگیر کے ساتھ آئے تھے۔ موصوف نے تین سال روپوش گزارے اور اب بھی روپوش ہیں۔

23 اکتوبر:

ایک عجیب مذاق یا اتفاق: سات بجے شام ہندوستانی دوست سے ملنے کا وعدہ تھا، لیکن بھول گئے اور بشیر کے گھر چلے گئے۔ جب یاد آیا تو پونے آٹھ بجے تھے۔ پریشان واپس آئے۔ اُس دن ملاقات نہ ہو سکی۔ پھر فون آیا کہ 25 کو آٹھ بجے پھر ملیں گے۔ ڈیڑھ گھنٹا انتظار کیا لیکن وہ نہ آیا۔ رات تشویش میں گزری۔ ملاقات 26 کو ہوئی تو سکون آیا۔

11 نومبر:

آج صبح نو بجے کے قریب ایوب خان اچکزئی ریاستی ہسپتال (جمہوریت روغتون) میں وفات پا گئے، ان کی عمر 64 سال تھی۔ کچھ عرصے سے وہ دمہ کے مرض میں مبتلا تھے۔ دو مرتبہ اس کے علاج کے لیے ہندوستان گئے تھے اور اس مرتبہ بھی لے جانے کا ارادہ تھا، لیکن موت نے موقع نہ دیا۔ ایوب خان کون تھا، یہاں کیوں آیا تھا، اور یہاں آ کر اُس نے کیا پایا، یہ سب بہت طویل اور الگ بحث ہے۔ یہ بھی لمبی بحث ہے کہ باچا خان کے کیوں اور کس طرح مخالف ہوئے اور اُسی نظر سے ہمیں کیوں دیکھتے تھے۔

لیکن پھر بھی ہمارے نام پر یہاں آیا تھا، ان کی ہماری عزت ایک تھی۔ ان کی نیک نامی ہماری نیک نامی تھی۔ مرحوم کی یہ بات کبھی نہ بھلا پاؤں گا، کہ 'اعلیٰ حضرت سے ادنیٰ حضرت تک سب کو آزما لیا، نتیجہ کچھ نہ نکلا'۔ [اعلیٰ حضرت سے مراد بادشاہ اور ادنیٰ سے مراد عام افغان تھا] قافلے اور کارروان کا کیا بنے گا؟ یہ تو الگ بات ہے، لیکن اُن کے انجام میں ہمیں بھی آئینہ نظر آ رہا ہے۔

12 نومبر:

ایوب خان کاکا کو 'شہدائے صالحین' میں دفن کر دیا گیا۔ [۱۷] جنازہ میں حکومت کی جانب سے صدارت کے معاونین، وزراء اور بڑی شخصیات نے بھی شرکت کی۔

یکم جنوری 1977:

آج نیا سال شروع ہو گیا اور پرانا سال اپنے سارے واقعات کے ساتھ دفن ہو گیا۔ گذشتہ سال ہر لحاظ سے ہمارے لیے غموں سے بھرا اور منحوس ثابت ہوا۔ نئے سال سے بہت توقعات اور امیدیں ہیں۔ گذشتہ سال قومی، سیاسی اور ذاتی، ہر لحاظ سے نقصان دہ رہا۔ گذشتہ برس:

- نیپ کے راہنماؤں پر غداری کا مقدمہ شروع ہوا۔
- ایک مرتبہ بھٹو کابل اور ایک مرتبہ داؤد خان اسلام آباد تعلقات کی بہتری کے لیے آئے گئے، لیکن حالات جوں کے توں رہے۔ بڑوں کے ذہن میں مفاہمت کے جو 80 فیصد امکانات تھے، اب وہ 30 فیصد رہ گئے ہیں۔
- میرے والد میری عدم موجودگی میں وفات پا گئے۔
- پیر محمد خان انکل یہاں ہمارے سامنے، دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔
- سال کے آخر میں افغان حکومت کا تختہ الٹنے کی پانچویں ناکام کوشش کی گئی۔
- باچا خان جیل سے چھوٹ گئے، لیکن آزادی کے وقت جو حسن نیت ہم پاکستان کے لیے محسوس کر رہے تھے، وہ دم توڑ گئی۔
- مولانا بھاشانی (نیپ کے سابقہ بنگالی صدر) وفات پا گئے۔
- چواین لائی، چوتے اور سب سے بڑی بات یہ کہ ماؤزے دونگ وفات پا گئے۔ چین میں نئی تبدیلی کے لیے گڑبڑ جاری ہے۔ ماؤ کی بیوی کے ساتھ تین اور انقلاب پسند زیر عتاب ہیں، اور یہ مسئلہ ابھی حل نہیں ہوا۔

- دیر میں حکومت کے ساتھ عوام کی جنگ ہوئی، دونوں طرف خوب نقصان ہوا۔ نہ ہونے کے برابر امداد کے ساتھ پاکستان کی جدید اور مسلح فوج کا جواب دینا مشکل تھا۔ لیکن بے چارے پھر بھی لڑ رہے ہیں۔
- ہمارے ذہن میں افغانستان کے حوالے سے کئی سوال پیدا ہوئے کہ یہ ہمارے ساتھ کیا کر رہے ہیں؟
- شہباز کے سات آٹھ ساتھی جلال آباد کیمپ سے ناراض لوٹ گئے۔ صوابی کے تپہ رزڑ سے آئے ہوئے پارٹی کے بزرگوں نے جرگوں اور مذاکرات کے ذریعے انہیں واپس منایا۔ یہ اپنی ضد اور باتوں دونوں سے پھر گئے۔ یہ ضد کمانڈر رہا چا اور بالخصوص اعظم کی غلطیوں کی وجہ سے تھی۔
- کمیونسٹ پارٹی کے دوست پاکستان سے آ گئے اور شکوک ختم ہو گئے۔ تاہم پھر بھی واپسی کے بعد خطوط آنا شروع ہو گئے اور وہ مسائل، جن پر فیصلہ ہو چکا تھا پھر بحث کی ابتدا ہو گئی۔
- نیپ پر پابندی کے بعد، این ڈی پی بنی، لیکن اسے نیپ کا وارث نہیں سمجھا گیا۔ این ڈی پی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی، دائیں اور بائیں۔ یہ سب سے خطرناک اور افسوسناک پہلو تھا۔
- مظلوم اور بشیر ناراض ہو کر چلے گئے، تاہم بشیر واپس لوٹ آیا۔ مظلوم حد سے آگے بڑھ گیا تو اسے اپنی دوستی کے حلقے سے باہر کر دیا۔
- علی خان محسود کے لیے افغانی پاسپورٹ بنایا اور اسے مغربی جرمنی بھیجا گیا۔
- میری والدہ اور بھائی رمضان میں آئے اور کچھ دن ٹھہر کر واپس چلے گئے۔

الغرض 1976ء ایک منحوس اور مایوس کن سال ثابت ہوا۔

3 جنوری:

یہ دن بھی معمول کے مطابق، لیکن ذہنی پریشانی میں گزارا۔ صبح اٹھا، کچھ وقت ورزش کرنے کے بعد نہایا اور پھر چائے پی۔ چائے کے بعد اجمل خٹک کا نیپ کے راہنماؤں کے نام لکھا گیا ایک طویل خط ٹائپ کیا۔ گیارہ بجے خط لکھنے اور نظر ثانی سے فارغ ہوا۔ پھر دوپہر کو نجیب کی بیوی (فتانہ) کی ماں کی دعوت پر کابل ہوٹل میں مہمان تھا، وہاں گیا۔ کھانا کھانے کے بعد دو بجے

واپس لوٹا۔ کچھ وقت کمرے میں رہا کہ تورلالی موٹر کی خرابی کی فریاد لے کر آیا۔ فریاد یہ تھی کہ کچھ دن پہلے موٹر کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا اور ابھی ابھی اس پر تقریباً پندرہ ہزار روپے خرچ کیے جا چکے ہیں۔ لیکن اب یہ پھر شور کر رہی ہے۔ مستری کو دکھایا تو اُس نے کہا کہ اس کے بیرنگ پگھل گئے ہیں۔ تین مہینے پہلے موٹر کی بورنگ ہوئی تھی تو اب یہ مستری خانے کا قصور تھا کہ بیرنگ جل گئے تھے، بہت ڈھیلے یا بہت سخت فٹ کیے گئے تھے۔ لیکن مستری خانے کو دکھانے کے بعد بتایا گیا کہ موٹر میں موبل آئل نہیں ڈالا گیا، اور اسی وجہ سے بیرنگ جواب دے گئے۔ یہ ڈرائیور کی غلطی تھی۔ مستری نے بتایا کہ اگر اور موٹر چلائی جاتی تو ممکن تھا پورا انجن ہی جل جاتا اور پچاس ہزار کا نقصان ہوتا۔ تورلالی نے اجمل خٹک کی اجازت کے بغیر گاڑی مستری کے حوالے کر دی، تورلالی کو یہ شرمندگی تھی کہ گاڑی کا ایکسیڈنٹ اُس نے کیا تھا، اس لیے یہ ارادہ کیا کہ اس کی مرمت کا خرچ اپنی جیب سے دے گا۔

میں کمرے میں بیٹھا ریڈیو سن رہا تھا کہ آنکھ لگ گئی۔ پانچ بج گئے اور وزیر صاحب فیض محمد خان، اجمل خٹک سے ملاقات کے بعد میرے کمرے میں آئے اور مجھے جگایا، تھوڑی دیر میں رخصت ہو گئے۔ اس وقت ایک امریکی سیاح کا فون آیا، جو شکاگو کمیونٹی ریڈیو کے لیے اجمل خٹک کا انٹرویو ریکارڈ کرنا چاہ رہا تھا، اس کے ساتھ باتیں ہوئیں۔

شام اجمل خٹک موٹر کے معاملے سے مطلع ہوئے تو بہت ناراض ہوئے۔ ان کی ناراضی بجا تھی کہ یہ گاڑی ہر وقت خراب ہوتی ہے اور ہمیشہ ہمارے ساتھ ہی خراب ہوتی ہے۔ جب اور کسی کے پاس ہو تو خراب نہیں ہوتی۔ وہ دوسری بینز گاڑی پر دو لاکھ افغانی خرچ آیا تھا۔ یہ بہت شرم کی بات ہے۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ موٹر کی ذمہ داری اب وزارت اور ڈرائیور کو سونپی جائے۔ اس مرتبہ اس کی مرمت ہو جائے تو اس مسئلہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنا ہے۔ اکٹھے کھانا کھایا، پھر کمرے میں خبریں سنیں۔ پھر نیچے اترا، کیرم بورڈ کھیلتا رہا۔ ساڑھے دس بجے وائس آف امریکا پر خبریں سنیں اور اب یہ ڈائری لکھ رہا ہوں۔

یہ تو روداد تھی، ایک تھکا دینے والے بیزار کن دن کی، اگر اس سے بھی برے حالات نہ آئے تو، کبھی اس سے اچھا دن نہیں گزرتا۔ لیکن دن تو دن ہوتا ہے گزر ہی جاتا ہے، چاہے اچھا ہو یا برا۔ میرے اوسان تو رات کے لیے خطا ہو جاتے ہیں کہ وہ کیسے کٹے گی۔ نیند کیسے آئے گی۔ رات

تکلیف، مصیبت، غموں، سوچوں اور فکروں سے بھری ہوتی ہے۔ میرا سب سے بڑا مرض میری تنہائی ہے۔ کوئی یاد تو نہیں آتی، لیکن جوانی کے تقاضوں کی تسکین میرے لیے مسئلہ ہے۔ یہ ایسی تکلیف ہے، جس میں کسی کو شریک کرسکتا ہوں اور نہ اس کا کوئی حل سوجھتا ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جنسی ضرورت بھی روٹی کی طرح ہے، جس کا مہیا ہونا ضروری ہے۔ اور زندگی میں ایک جیون ساتھی کی ضرورت بہت فطری ہے جسے عقل، فکر، انقلاب اور دل بھی منع نہیں کرسکتا۔ یہ ایسا ہی کہ جیسے پیشاب آیا ہو تو چاہے آپ انقلابی ہوں کہ مذہبی، عقل مند ہیں یا کم عقل، لیکن پیشاب تو کرنا پڑتا ہے۔ اسی آگ میں جل رہا ہوں۔ ڈرتا ہوں کہیں بدنام نہ ہو جاؤں کیونکہ یہ بھوت کبھی کبھی مجھ پر سوار ہو جاتا ہے۔ میں اس بھوت سے نجات حاصل نہیں کرسکتا اور میری راتیں آرام کی بجائے تکلیف اور مصیبت کی راتیں ہوتی ہیں۔

5 جنوری:

آج شام بھٹو نے زرعی اصلاحات کے حوالے سے چند ایسے اقدامات کا اعلان کیا ہے کہ اگر اُس کی جگہ ہمارے راہنما برسراقتدار ہوتے، جن کے لیے ہم نے اپنی زندگی دربدر کی ہوئی ہے، مجھے امید نہیں کہ ایسے اقدامات کرتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کی پوری زندگی، فکر اور نفسیات فیوڈل ہیں۔ وہ اقدامات یہ ہیں:

- انفرادی ملکیت کی حد: نہری 100 ایکڑ اور بارانی 200 ایکڑ اور اگر دونوں یعنی نہری اور بارانی ہو تو حساب لگایا جائے گا اور اُسی تناسب سے زمین کی ملکیت کی حد طے کی جائے گی۔
- زائد زمین چار ماہ میں حکومت کے حوالے کی جائے گی، جس کا معاوضہ دس سال میں بانڈ کی صورت میں دیا جائے گا۔ جس پر سود بینک اور عام ریٹ سے ایک فیصد زیادہ دیا جائے گا۔ معاوضہ 30 روپے فی پیداواری یونٹ ہوگا اور انکم ٹیکس کی طرح زراعت کی آمدن پر بھی ٹیکس لگایا جائے گا۔
- 25 ایکڑ نہری اور 50 ایکڑ بارانی زمین پر انکم ٹیکس معاف ہوگا۔
- زائد حاصل ہونے والی اراضی کو حکومت 76-1975 میں کسانوں کو کاشت کے لیے مفت فراہم کرے گی۔ اگر ایسا نہ ہوا تو یہ زمین اسے دی جائے گی جس کی اپنی زمین 12 ایکڑ سے

کم ہو اور خود کاشت کرتا ہو۔

- وہ پیسے جو ٹریکٹر، ٹیوب ویل، زمین کی ہمواری یا تخم کی خریداری پر خرچ ہونگے، وہ قابل کاشت آمدنی سے منہا کی جائے گی اور اس پر ٹیکس معاف ہوگا۔
- ٹیکس دو اقساط میں 15 دسمبر یا 15 جون تک ادا کیا جائے گا...... وغیرہ
- 2 فیصد زمیندار زرعی انکم ٹیکس دیں گے اور 44 ہزار سے کچھ زیادہ کسانوں کو زمین مفت دی جائے گی۔
- ہمارے صوبے میں 5 لاکھ 38 ہزار ایکڑ زمین حکومت کو ملے گی۔

یہ تو اعلان کے بڑے بڑے نکات تھے جو مجھے سمجھ آئے۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ یہ اعلان ہمارے اُس مخالف کی جانب سے کیا گیا ہے جسے ہم کسی قیمت پر ماننے کو تیار نہیں اور ہر قیمت پر اُسے نقصان پہنچانے کے درپے ہیں۔ یہ تسلیم کرلیتے ہیں کہ بھٹو سامراج کا ایجنٹ، شہنشاہ ایران کا حواری اور بہت رجعت پسند ہے، لیکن ہم جن کی مدد کررہے ہیں، آیا عوام کے لیے وہ اصلاحات میں اس حد تک جاسکتے ہیں یا نہیں؟ اس لیے کہ زرعی اصلاحات نرم ہوں یا سخت سماج کو آگے بڑھانے کا باعث بنتی ہیں۔ اور اگر یہ لوگ اس حد تک نہیں جاسکتے تو 'دھرمسال میں لپائی' (کارلاحاصل) سے کیا فائدہ؟ یا ہمیں تاریخ کے مذاق نے ہمیں اس جگہ پہنچا دیا ہے کہ بغض معاویہ رکھیں۔ ہم تو یہ بھی کرنے کو تیار ہیں، اگر کوئی حقیقی 'علی' ہو...... کیا کریں؟ یہ سوال ہے! جھڑتا جا اور بکھرتا جا!!

6 جنوری:

یوں محسوس ہوتا ہے کہ تاریخ کے مذاق کا نشانہ ہم ہیں۔ عمر کارعبث، بے نتیجہ، بلکہ نتائج کے مخالف اور زندگی سخت تنگی سے گزر رہی ہے، باہر نکلنے کا طریقہ مجھے نہیں آتا۔ جن کی نمائندگی کر رہے ہیں، ان کی سیاست پر اعتماد نہیں رہا۔ اب رفتہ رفتہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ماہیت میں بھٹو اور ان میں کوئی فرق نہیں۔ پالیسی، سیاست سب بہت غیر واضح ہیں۔ کشتی طوفان میں گھری ہے اور منزل کی سمت معلوم نہیں۔ معلوم نہیں کہیں پہنچے گی بھی یا ان سمندری اور طوفانی لہروں میں غرق ہو جائے گی۔ نیچے (پاکستان) کی سیاست بھی بے سمت (کنفیوزڈ) ہے۔ ہمارے دوست کسی اور

طرف جا رہے ہیں، یوں محسوس ہوتا ہے وہ حکومت کے قریب ہونے کی پالیسی ذہن میں رکھتے ہیں۔ اگر یہ حالات رہے کہ این ڈی پی کی پالیسی، پروگرام پیچھے کی طرف جا رہے ہیں اور بھٹو کے اقدامات آگے کی طرف بڑھ رہے ہیں تو کہیں ہم لاشعوری طور پر رجعت پسندی کی حمایت تو نہیں کر رہے؟ ایسے بہت سارے سوالات غیر مربوط انداز میں جذباتی اور عقلی دونوں سطحوں پر ابھرتے رہتے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ ہماری مایوسی کا عکس ہے؟ لیکن مایوسی دور کرنے کی بھی تو کوئی راہ نہیں سوجھتی۔ سیاست بھی مفت میں چلی گئی اور اپنی ذاتی زندگی کا احوال بھی کچھ ایسا ہی ہے۔

12 جنوری:

میرا ذاتی خیال ہے کہ افغانستان کچھ نہیں کر رہا۔ پاکستان میں بھی ہماری کوئی اہمیت نہیں رہی، محض ہمیں سرنڈر کروانا باقی ہے۔ اس پوری تحریک کا آغاز غلط اور بنیاد غلط اندازوں اور خراب تجزیوں پر رکھی گئی۔ یہ محض اندھیرے کا تیر تھا۔ اگر یہی حالات رہے تو دن بہ دن مایوسی بڑھے گی اور یہ جو ہم باہر نکلے ہیں تو رفتہ رفتہ یہ جذبہ بھی بکھر جائے گا۔ اس صورت میں ہماری سب سے بڑی کامیابی یہ ہوگی کہ یہ سب لوگ سلیقے سے اکٹھے واپسی کریں، نارمل طریقے سے زندگی کے معمولات کا حصہ بن جائیں اور جسے سیاست کا موقع ملے وہ سیاست شروع کردے۔

10 فروری:

ہندوستان کے نمائندے کے پاس گیا اور ولی خان کے خط کی انگریزی نقل اُسے دی۔

اجمل خٹک تورلالی کے ساتھ جلال آباد چلے گئے۔ وزیر فیض محمد خان نے فون کیا کہ تقریباً چار بجے پہنچ جاؤں گا اور چھ بجے کے آس پاس ہم بھی جلال آباد کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ کیونکہ میں اکیلا ہوں، اس لیے میں نے اجمل خٹک کو اجازت کے لیے فون کیا، لیکن انہوں نے کہا کہ نہیں غائب ہو جانا۔ [۱۸]

عصر کو 'کونڑ' کا شمس الہدیٰ اور اس کے ساتھ ایک اور دوست بھی ہمراہ آیا۔ اُن کے ساتھ بات چیت ہو رہی تھی کہ فیض محمد خان آ گئے، اس کے فوراً بعد پکتیاوال صاحب بھی آ گئے۔ دونوں نے میرے کمرے میں گفتگو کی اور وزیر صاحب کے ساتھ رخصت ہو گئے۔ پکتیاوال، میں، بسم اللہ اور عبدالرحمٰن اکٹھے بیٹھے تھے۔ کھانا اکٹھے کھایا۔ پھر آریانا سینما وہ فلم دیکھنے گئے جو 'لویہ جرگہ'

کے بڑوں کو دکھائی گئی تھی۔ اس طرح آج کا دن گزرا۔

22 فروری:

آج نعیم آیا اور ہم نے انتخابات کے نتائج پہ بحث کی: ۱۔ اگر بھٹو جیتے گا۔ ۲۔ اگر قومی اتحاد جیتے گا۔ پہلی صورت میں افغانستان پاکستان کے درمیان مفاہمت کا عمل آگے بڑھتا ہے تو ہماری واپسی کا راستہ ہموار ہوگا، تاہم اس میں وقت لگے گا۔ دوسری صورت میں بھی نیپ کے لیے راستہ ہموار ہوگا اور ہم واپس جائیں گے۔ تب میں فیصلہ کروں گا کہ میں کیا کروں:

۱۔ اجمل خٹک چاہیں گے کہ مجھے اپنے ساتھ روک لیں۔

۲۔ میں نیچے (پاکستان) جاؤں گا؟

۳۔ میں باہر جاؤں گا؟ میرا یہاں رہنے کا کوئی جواز نہیں۔ باہر جانے کا بھی شائد کوئی امکان نہ بن پائے۔ باقی رہا واپس جانے کا معاملہ تو واپس جا کر کروں گا کیا؟ اپنی زندگی کیسے گزاروں گا؟ کسی پر بوجھ بھی نہیں بن سکتا۔ لیکن شادی کرنا اور گھر بھی بسانا ہے، اس صورت میں آمدنی کے ذرائع ڈھونڈنے ہوں گے۔

ایسے بہت سارے سوال میرے ذہن میں تھے جو میں نے اس کے ساتھ شیئر کیے۔

5 مارچ:

پرسوں قومی اسمبلی کے انتخابات ہیں۔ دو باتیں ہو سکتی ہیں، بھٹو جیتے گا یا قومی اتحاد (اور فوجی مارشل لاء کے امکانات بھی رد نہیں کیے جا سکتے)۔ اگر بھٹو جیتا تو افغانستان سے اپنے مذاکرات کو آگے بڑھائے گا۔ ہو سکتا ہے قیدی رہا ہو جائیں اور ہم واپس چلے جائیں۔ دوسری صورت قومی اتحاد کی ہے، جس کی جیت کے نتیجے میں قیدی فوراً رہا کر دیے جائیں گے، ساتھ ہی ہم اور بلوچ مہاجرین آزاد ہو جائیں گے۔ پہلی صورت میں اس سارے عمل میں کچھ وقت ضرور لگے گا۔

دونوں صورتوں میں مسائل سامنے آئیں گے۔ پہلا مسئلہ سیاست کا ہے، نیچے کی سیاست گڈمڈ ہے۔ یہ موجودہ رجعت پسند سیاست کرنا اپنے آپ کو دھوکا دینا اور قوم سے خیانت ہے (پی این اے کی کامیابی کی صورت میں ہو سکتا ہے، نیپ سے پابندی اٹھالی جائے اور ترقی پسند سیاست کی راہ پھر ہموار ہو جائے)۔ اگر نیچے جانا پڑا تو کس نظروں سے جائیں گے؟ وہاں کیا کریں گے؟

اجمل خٹک کا فیصلہ کیا ہوگا؟ میں اُن کے ساتھ یہاں رہوں گا یا باقی سب کے ساتھ نیچے جاؤں گا؟ اگر یہاں رہنا ہوا تو گزران کے ذرائع کیا ہونگے؟ زندگی کے ان چار سالوں کا تسلسل یوں قائم رکھنا تو بہت مشکل ہے۔ اگر نیچے نہ جائیں تو کیا کریں؟ آیا سیاست کریں گے یا نہیں؟ اور یہ افغانستان میں کیسے ہوگی؟ اگر نیچے جانا پڑا تو میں اکیلے سیاست کروں گا تو کیسے اور کس کے ساتھ؟ زندگی گزارنے کے وسائل کہاں سے آئیں گے؟ انتظام تو لازمی طور پر کرنا ہوگا اور اگر ایسا ہے تو کیا میں نوکری کروں گا؟ یا پیسے کمانے کے اور راستے اختیار کروں گا؟ اگر اقتصاد کے چکر میں نہیں پڑتا اور صرف سیاست کرتا ہوں تو ابتداء میں بوجھ ہوگا اور بوجھ آسان تھا، اگر جاگیردار یا سرمایہ دار ہوتا۔ تو پیسہ کہاں سے آئے گا؟ اگر یہاں رہنا پڑا تو پیسوں اور شادی کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ تیسرا امکان باہر جانا ہے۔ لیکن باہر کیسے اور کس کے پاسپورٹ پر جاؤں گا؟ اور اگر چلا گیا تو کروں گا کیا: نوکری، سیاست، تعلیم؟ اگر نوکری کروں گا تو پرایا نوکر بن کر رہوں گا اور اگر سیاست کے راستے پر جاؤں تو پیسا کہاں سے آئے گا؟ یہ زندگی اسی طرح عبث بھی نہیں گزاری جاسکتی۔ شادی کیسے کروں گا؟

سوویت دوستوں سے تعلق

یوں تو ترقی پسند سیاست اور پاکستان کمیونسٹ پارٹی سے تعلق کی بنیاد پر سوویت دوستوں سے ہمارے تعلقات فطری تھے، کیونکہ تمام اشتراکی عناصر اور پارٹیاں بین الاقوامی یک جہتی کے تحت ایسے روابط استوار، مضبوط، اور دیرپا بنانے کے لیے کوشش کرتے تھے اور خود سوویت دوستوں کی بھی کوشش تھی کہ زیادہ سے زیادہ تعلقات وسیع کیے جائیں اور انہیں اپنے فائدے کے لیے استعمال کریں۔ بین الاقوامیت کے نام سے بُنے گئے روابط کے نتیجے میں حاصل ہونے والی معلومات یوں بھی سوویت یونین کو سستی پڑتی تھیں کہ باقی مغربی ممالک ایسی معلومات اکٹھی کرنے کے لیے بہت پیسے خرچ کرتے تھے۔ اجمل خٹک نے بھی یہ تعلقات بنائے تھے اور انہیں نبھاتے تھے۔ لیکن جب پختونخوا اور بلوچستان میں ہماری سرگرمیاں بڑھ گئیں اور اجمل خٹک سے خفیہ طور ملنا دو چند مشکل ہو گیا تھا، کیونکہ موصوف ہمیشہ افغانستان حکومت کی نظر اور کڑی نگرانی میں تھے، اس لیے سوویت دوستوں کو ضرورت محسوس ہوئی کہ حالات اور واقعات سے باخبر رہیں۔ اس کے لیے انہوں نے ایک خاص نمائندہ کو مخصوص کیا اور انقلابی جمہوری محاذ (ہم اس نام سے پروپیگنڈا کرتے تھے) کی جانب سے اس فرض کے لیے مجھے نامزد کیا گیا۔ یہاں ایک اہم بات بتانا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ جب 1974ء میں ولی خان نے افغانستان کا دورہ کیا تھا تو اس وقت روسی سفیر سے ایک خفیہ ملاقات بھی کی تھی اور اس ملاقات کا انتظام اجمل خٹک نے کیا تھا۔ یہ ولی خان کا غالباً روسیوں سے اولین براہ راست رابطہ تھا۔

21 اکتوبر 1974:

پہلی ملاقات: آج ایک مہمان کے ساتھ بریکوٹ سینما کے پیچھے مقررہ وقت اور طے شدہ نشانی کے ساتھ ملا۔ یہ ہمارے دوست ملک کا نمائندہ ہے اور نام والنٹین ہے (بہت عرصے بعد میں جان گیا کہ شائد اس کا نام والنٹین نیژلسکی تھا)۔ میرا خیال ہے کہ ان کی خواہش ہے کہ ہماری تحریک سے رابطہ قائم کریں۔ میں یہاں کس حیثیت میں ہوں؟ کس کی نمائندگی کر رہا ہوں؟ اور ہمارے دوستوں کی پختونستان کے بارے میں کیا طے شدہ پالیسی ہے؟ میں یہ سب نہیں جانتا۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ نہ ہو پاکستان میں ہمارے دوست انہیں کچھ کہیں اور میں یہاں بیٹھا

انہیں کچھ اور بتاؤں۔ ایسا تضاد مجھے جھوٹا ثابت کر دے گا اور جو اعتماد کیا جا رہا ہے، اسے نقصان پہنچے گا۔ سارا دن یہی سوچتا رہا کہ کیا چھپاؤں اور کیا بتاؤں۔ کیونکہ یہاں جمہوری انداز میں بات چیت کے ذریعے کوئی فیصلہ کیا جاتا ہے اور نہ ہی جمہوری مرکزیت کے اصول پر عمل ہوتا ہے۔ بلکہ ایک بورژوا تنظیم کی طرح میرے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جاتا ہے، جو تنظیم کے تحت باقی لوگوں کے ساتھ روا رکھا جا رہا ہے۔

بہر حال دوست سے ملاقات کے بعد یہ معلوم ہوا کہ وہ صرف سننا چاہتے ہیں اور اپنے آپ کو باخبر رکھنا چاہتے ہیں۔ اپنی طرف سے کوئی فیصلہ، نظریہ یا تجویز نہیں دینا چاہتے اور میرے ساتھ رابطے کمیونسٹ پارٹی ڈسپلن کی ہدایات پر نہیں رکھے جا رہے۔ یہ محض اس لیے آئے ہیں کہ افغانستان اور پاکستان کے درمیان تنازعہ اور ہماری مبارزت کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

یہ محض تعارفی ملاقات تھی، سو تفصیلی بات نہ ہو سکی۔ دوست نے پوچھا، کہ پختونستان کے بارے میں ولی خان اور اجمل خان کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے یا نہیں؟ میں نے کہا اس معاملے میں دونوں کا نکتہ نظر ایک ہے، باقی دیگر سماجی معاملات میں دونوں میں فرق ہو سکتا ہے اور ہے۔

(شروع شروع میں ایسی ملاقات کو بہت اہم اور سنجیدہ نوعیت کی سمجھا کرتا تھا، لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا، میں اسے معمول کے کاموں کے ذیل میں شمار کرنے لگا۔ یہ ہمارے دوستوں کے لیے اطلاعات اکٹھی کرنے کے لیے ایک اور قابل اعتبار اور براہ راست معلومات کے ذریعے کی حیثیت رکھتا تھا۔)

29 اکتوبر:

آج پھر سوویت رابطہ کار سے پرانی جگہ ملاقات ہوئی۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گیا (اس کا گھر کارتہ سہ میں ہے)۔ انہیں یہ تجسس ہے کہ پختونستان اور بلوچستان میں کیا ہو رہا ہے اور اب تک کی پیش رفت کیا ہے؟ مختلف قوتوں کی سرگرمیاں کیا ہیں اور اس میں افغانستان کا کردار کیا ہے؟ اس کے کئی سوالوں کا میرے پاس واضح جواب نہ تھا اور نہ ہی میرے فرائض اور اختیار کی حدود میں تھا۔ تمام باتیں عمومی نوعیت کی ہوتی ہیں۔

اس کے اکثر سوالات ایسے تھے:

۱۔ پختونستان میں کیا ہو رہا ہے، کیا پیش رفت ہوئی ہے اور نئی سرگرمیاں کیا ہیں؟

۲۔ بلوچستان میں کیا ہو رہا ہے، جنگ کی شدت میں اضافہ ہوا ہے، نئے واقعات کیا ہوئے ہیں؟

۳۔ پاکستان میں عام حالت کیا ہے؟

۴۔ اجمل خٹک کے پاس کون کون آتا ہے؟ افغانستان سے کون آتا ہے اور پختونستان سے کون آتا ہے؟ حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں میں سے کون آتا ہے؟ صدر صاحب سے کب اور کتنے عرصے بعد ملاقات ہوتی ہے؟

میں نے اسے بتایا کہ افغانستان سے ہر کوئی اور ہر پارٹی کے لوگ آتے ہیں اور سب سے گفتگو ہوتی ہے۔ پختون زلمے بھی آتے ہیں۔ وزیر بھی آتے ہیں اور صدر محترم سے بھی ملاقاتیں ہوتی ہیں لیکن کبھی جلد اور کبھی دیر سے، اس کا انحصار حالات پر ہوتا ہے۔

میں نے اسے اپنے فرائض کی نوعیت بتائی اور کہا کہ میرا تعلق صرف پروپیگنڈا، سیاست اور بیرونی روابط سے متعلق ہے۔ جہاں تک پختون زلمے کی تربیت اور اسلحے کا تعلق ہے تو چونکہ میں اس کا انچارج نہیں، اس لیے ذمہ داری کے ساتھ کچھ نہیں بتا سکتا۔ البتہ جو کچھ میرے علم میں تھا اور جو بیان کرنا مناسب تھا، وہ میں نے اسے بتا دیا۔ اس کے اِس سوال پر کہ آیا عراق کچھ مادی اور اسلحے کی صورت میں مدد کرتا ہے یا نہیں، میں نے لاعلمی ظاہر کی اور اس سے بالکل انکار کر دیا، کیونکہ اس بارے میں مجھے کچھ علم نہیں تھا۔ البتہ محمد حسین (عراق میں بلوچوں کے جنگجو) کے کام کی نوعیت اور تعلق میں نے اسے نہیں بتایا۔

مجھ سے میرے کام اور مصروفیات کے بارے میں بھی پوچھا گیا اور اجمل خٹک کے گھر والوں کی حالت کے بارے میں بھی پوچھا گیا۔

میرے اس سوال پر کہ بھٹو کے حالیہ (24 تا 26 اکتوبر) دورہ روس کے سلسلے میں کیا مثبت پیش رفت ہوئی اور میرے اس خیال پر کہ بھٹو کچھ مثبت نہیں حاصل کر پایا، اُس نے اپنی لاعلمی ظاہر کیا اور اتنا کہا کہ میں نے مشترکہ اعلامیہ نہیں پڑھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ صرف معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں اور کوئی کوارڈینیشن نہیں کرنا چاہتے، نہ کوئی تعلق قائم کرنا چاہتے ہیں۔ صرف واقعات سے دلچسپی ہے۔ ہمدردی بھی ہے، لیکن اس وقت اپنے آپ کو commit نہیں کرنا چاہتے۔

میں نے انہیں اجمل خٹک کی یوم پختونستان کی تقریر (پاکستان میں قومی جمہوری انقلاب) نامی پمفلٹ اور یوسف لودھی کے کارٹونوں کی کتاب Bhutto My Master دی، بہت خوش ہوا۔ آئندہ ملاقات میں ان واقعات کی تفصیل جو پختونستان اور بلوچستان میں ہوں گے، اُسے دینے کا وعدہ کیا۔

آئندہ ملاقات کے لیے 5 نومبر کی تاریخ طے کی ہے۔ اس لیے کہ اسے دلچسپی ہے کہ ڈاکٹر کسنجر جو یکم نومبر کو افغانستان کے دورے پر آ رہا ہے، وہ افغان حکومت سے کیا کہے گا اور کیا تجاویز لائے گا۔ کسنجر کی یکم نومبر آمد کی اطلاع مجھے اُسی کی زبانی معلوم ہوئی۔

5 نومبر:

وعدے کے مطابق شام چھ بجے اس سے ملاقات ہوئی۔ (ہماری ملاقاتیں اکثر شام کے بعد رات کے وقت ہوا کرتی تھیں)، بہت ساری عام سیاسی گفتگو ہوئی۔ ہمارے دوست کی سب سے زیادہ دلچسپی کسنجر کی آمد اور اس کی باتوں میں تھی۔ لیکن چونکہ اس معاملے پر اجمل خٹک متعلقہ لوگوں سے نہیں ملے تھے، اس لیے میں نے معذرت کر لی اور آئندہ 13 تاریخ اس حوالے سے پھر ملنے کی ٹھہرائی۔

میں نے اسے Pakistan Vs Bhutto کے عنوان سے لکھا گیا وہ مقالہ دیا جو ہم نے یعنی متحدہ جمہوری محاذ کے ٹیلیگراموں اور یاداشتوں کے ساتھ وزارت خارجہ افغانستان کو سائکلو سٹائل اور طباعت کے لیے دیا تھا۔ اس کے ساتھ اجمل خٹک کا پمفلٹ 'پاکستان میں قومی جمہوری انقلاب' کے دس نسخے دیے۔

13 نومبر:

آج وعدے کے مطابق اس سے ملوں گا، لیکن حیران ہوں کہ کہوں گا کیا؟ کیونکہ اجمل خٹک کہہ رہے ہیں کہ میں کسنجر سے متعلق کسی شخص سے نہیں ملا اور نہ کسی نے کچھ بتایا ہے۔ سچ کہہ رہے ہیں یا نہیں، مجھے اس سے غرض نہیں لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ میری سوویت دوست سے ملاقات کا ایک مقصد ہے، کہ وہ ہمیں اطلاعات فراہم کرے اور ہم انہیں۔ ظاہر ہے اس کے علاوہ ہماری ملاقات کا دوسرا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔

وعدے کے مطابق کسنجر کے بارے میں میرے پاس کوئی اطلاع نہ تھی، اس لیے یہ بات یہیں رہ گئی۔ میں نے اسے Pakistan Vs Bhutto کا نظر ثانی شدہ اور نرم اسلوب میں لکھا گیا نسخہ دیا۔ اس کے ساتھ قاضی فیض محمد کی کتاب 'جیے سندھ تحریک' بھی دی۔ پاکستان کے ٹوٹنے پر بحث ہوئی، میں نے اسے اپنے تجزیہ اور امکانات سے آگاہ کیا کہ پاکستان کس طرح ٹوٹے اور کیوں۔ دوست نے پاکستان ٹوٹنے کے امکانی تجزیے کے ذیل میں ولی خان کا نکتہء نظر اور افکار معلوم کرنے چاہے اور اس کے بعد امکانات۔ میرا جواب یہ تھا کہ پختونستان افغانستان کے ساتھ مل جائے گا، یہ راہنماؤں کا بھی خیال ہے۔ جہاں تک بلوچوں کا تعلق ہے یہ ان پر منحصر ہے کہ وہ ہمارے ساتھ کیا تعلق قائم کرنا چاہتے ہیں۔ البتہ ولی خان کی رائے یہ ہے کہ بلوچوں کو بلینک چیک دے دیا جائے، جبکہ ہماری رائے یہ ہے کہ بلوچستان کی بھلائی اس میں ہے کہ ہمارے ساتھ کسی میکنزم کے ذریعے بندھے رہیں۔ میرے خیال میں سندھ اور پنجاب بھارت کے ساتھ مل جائیں گے۔

دوست کی اس بات میں دلچسپی تھی کہ ہمارے دیگر ملکوں کے سفراء یا نمائندوں سے کوئی تعلق ہے یا نہیں اور کون کون سے ممالک ہمارے معاملے میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ میرا جواب یہ تھا کہ حسن التہامی کی آمد اور ایران کے وزیر خارجہ کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہت سارے اسلامی ممالک اس میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ میں نے اُسے سعودی سفیر کی آمد کے بارے میں بھی بتایا کہ وہ چاہتا ہے کہ ہمارے قریب آئے اور پاکستان کے ساتھ پاکستان کے اندر کچھ مصالحت ہو جائے۔ عراق اور ہندوستان کے ساتھ اپنے بلا واسطہ رابطوں کے بارے میں، میں نے اسے کچھ نہیں بتایا۔ اُس کے اِس سوال پر کہ بلوچ مہاجرین کی آمد پہلے سے طے شدہ تو نہ تھی، میں نے بتایا کہ ایسا نہیں تھا۔ البتہ باہمی انڈرسٹینڈنگ تھی اور وہ بھی بلوچ عوام کے ساتھ۔ کیونکہ افغانستان اُن کا ہمدرد ہے تو اس لیے وہ یہاں آئے اور ان کے پاس کوئی دوسرا راستہ تھا بھی نہیں۔ ہاں اس کے بعد جو آسانیاں افغان حکومت نے انہیں فراہم کیں تو اس کے بعد دیگر بلوچوں کو بھی شوق ہوا کہ وہ جو پاکستان کے ظلم سے تنگ آئے ہوئے ہیں، یہاں آ جائیں۔

میری اس بات پر کہ بھٹو پر ماسکو کے دورے میں کچھ دباؤ ڈالا گیا یا نہیں، اس نے بتایا کہ جو کچھ بلوچستان میں ہو رہا ہے، ان کی حکومت اس پر ناراض ہے، اور بھٹو سے کہا گیا کہ یہ سب بند کرے۔ اگر بھٹو نے آپ کا مشورہ نہ مانا تو آپ کا ردعمل کیا ہوگا؟ میرے اس سوال کے جواب

میں اُس نے کہا، بہت سارے امکانات ہوسکتے ہیں۔ الٹی میٹم دیا جاسکتا ہے، وارننگ جاری کی جاسکتی ہے، سفارتی دباؤ ڈالا جاسکتا ہے۔ کیونکہ بھٹو اچھی طرح جانتا ہے کہ ہماری پالیسی کیا ہے۔ افغانستان یا ہندوستان کے ساتھ ممکنہ جنگ کی صورت میں اس نے بتایا کہ ہم غیر جانبدار نہیں رہیں گے۔

بلوچستان اور پختونستان کی حالت زار کے بارے میں اور پاکستان کے عمومی حالات کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ غیر ملکی اخبارات اور پریس ایجنسی کے نمائندوں کے حوالے سے بتایا کہ صحافیوں کے ساتھ اکثر متعلقہ سفارتخانوں کے پریس اتاشی بھی آتے ہیں، جیسے ہندوستان اور فرانس۔

میرے اور میرے خاندان کی اقتصادی حالت اور اُن سے متعلق امور پر گفتگو ہوئی۔

میں نے اسے پیٹرس لوممبا یونیورسٹی میں چند پشتون لڑکوں کے داخلے کے لیے بات کی اور اس نے وعدہ کیا کہ وہ پوچھ کر بتائیں گے۔ اگلی ملاقات کا وعدہ بیس نومبر کا ہے۔

(ایک اہم بات کا یہاں اضافہ کرتا چلوں کہ چونکہ روسی دوست سے پہلی ملاقات بریکوٹ سینما کے سامنے ہوئی تھی، اس لیے اجمل خٹک اور میرے درمیان اس کا خفیہ نام 'سینما والا' یا 'سپین' (گورا) تھا۔ جبکہ ہندوستان کے نمائندے کا خفیہ نام ہم نے 'غٹ' (موٹا) رکھا ہوا تھا۔ اس لیے میں لوگوں کے سامنے اجمل خٹک کو بتاتا کہ سپین، یا غٹ سے ملاقات ہوئی۔ غٹ سے ملاقات کے لیے تو براہ راست سفارتخانے آیا جایا کرتا تھا اور وہ بھی آزادانہ ہمارے گھر آیا کرتا تھا لیکن سپین کے ساتھ ملاقات بہت خفیہ ہوا کرتی تھی)

20 نومبر:

طے کردہ وقت اور مقام۔ اس بات کا اضافہ کردوں کہ ہمارے ہر ملاقات کے لیے الگ وقت اور گلی طے ہوتی اور پھر وہاں سے محترم مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر گیراج میں اتارتے۔

کسنجر کے بارے میں کیے گئے سوال کا میں نے ادھورا سا جواب دیا۔ کیونکہ مجھے جو اطلاعات دی گئی تھیں وہ یہ تھیں کہ ہنری کسنجر کے ساتھ کوئی فیصلہ یا بات نہیں ہوئی۔ البتہ وہ ذوالفقار علی بھٹو اور اُن کی پوزیشن کی صفائی دینے آیا تھا۔

بلوچستان کی حالت میں نے میر سفر خان (کمانڈر) کی آمد اور اس کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں فراہم کیں۔ ہماری آئندہ کتاب Bullet For Bullet (گولی کا جواب گولی) کا مواد

اس کے حوالے کیا۔ وزارت خارجہ افغانستان کی جانب سے سائیکلوسٹائل پر تیار کی گئی Pakistan vs Bhutto کا نسخہ، جس میں جابجا یوڈی ایف کے ٹیلیگرام شامل ہیں، اُسے مطالعہ کے لیے دیا۔

پاکستان کی موجودہ حالت، اقتصادی، سیاسی اور عالمی انتشار اور کمزوری کے باوجود بھٹو کے اب تک ٹکے رہنے کے عوامل بیان کیے اور کہا کہ ابھی عالمی سورماؤں نے متبادل تیار نہیں کیا۔

افغانستان کی اندرونی حالت، آئندہ آئین اور آنے والی پارٹی کے بارے میں اپنے نظریات سے اُسے آگاہ کیا۔ لوممبا یونیورسٹی کے بارے میں میرے ساتھ اتنا وعدہ کیا کہ صرف میرے بھائی کو داخلہ مل سکتا ہے لیکن اور پشتون جوانوں کے لیے وعدہ نہیں کیا، ان کے لیے کوشش کرنے کا وعدہ کرلیا۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ صرف اطلاعات اکٹھی کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری تحریک کی مدد کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتے اور نہ اپنی آئندہ پالیسی واضح کرنا چاہتے ہیں۔ 27 نومبر کو اگلی ملاقات ہوگی۔

27 نومبر:

طے کردہ وقت، طے کردہ مقام، ملاقات گھر میں ہوئی۔

پاکستان کے عام حالات پر بات ہوئی، بلوچستان کے بارے میں بات چیت ہوئی۔ افغانستان میں بلوچ مہاجرین کے مسائل اور حالت پر گفتگو ہوئی۔ اجمل خٹک کا مہاجرین کے مسائل کے لیے دورہ قندھار۔ مہاجرین کی زبانی معلوم ہونے والے ظلم و استبداد کے قصے۔ بلوچستان میں عسکری نقل وحرکت۔ ایران کی جانب سے بلوچوں کے خلاف حکومتی اقدامات کی حمایت اور خصوصاً مالی مدد۔

پاکستان کی کوشش کہ پختونستان اور بلوچستان کی افغان سرحد کے ساتھ فوجی کیمپ اور میزائل اڈے بنائے۔

پختونستان میں قبائلیوں کی جانب سے پاکستان کی مذمت اور حکومت کی جانب سے سڑکیں بنانے کی مزاحمت۔ قبائل کا عزم کہ اپنے علاقوں میں پاکستان کو بڑھنے سے روکیں گے۔

آج سے آٹھ دن پہلے (19 نومبر) ولی خان نے چوک یادگار پشاور میں تقریر کی۔ تقریر

بہت جارحانہ اور تیز تھی، اس سے یوں محسوس ہوتا تھا کہ ولی خان کسی طاقت کے مرکز سے بات کر رہا ہے۔ تقریر جوش سے بھری ہوئی تھی جس میں انقلاب زندہ باد کے نعرے بھی لگائے۔ تقریر میں قراردادیں اور دھمکیاں شامل تھیں اور انتقام لینے کے ارادے اور عزم کا اظہار کیا۔ تقریر میں ولی خان نے سرحد تبدیل کرنے یعنی تورخم کی زنجیر اٹک پر لٹکانے کی دھمکی بھی دی تھی۔

آج جو جرمن نامہ نگار 'ورنر آدم' آیا تھا، اس کی دلچسپی کے بارے میں باتیں ہوئیں۔

میرے بھائی اور جمال کی بہن کی روس میں تعلیم کے بارے میں گفتگو ہوئی۔

میں نے اسے Bhutto vs Pakistan کا نیا اور مکمل پمفلٹ دیا، جو وزارت خارجہ افغانستان نے سائیکلوسٹائل کر کے دیا ہے۔

ہمارے دوست والنتین کا خیال ہے کہ محسوس نہیں ہوتا کہ بھٹو اپنی پالیسی تبدیل کریں گے، کیونکہ وہ دلیل کی بات سننے کو تیار ہیں اور نہ ہی ایسے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے۔ ان کی زیادہ دلچسپی بلوچستان میں ہے اور وہ پختونستان کو اتنی اہمیت نہیں دیتے۔ اس لیے زیادہ تر سوال بلوچستان کے بارے میں ہوتے ہیں۔ میں نے اسے پختونستان میں جوانوں کو ٹارچر کیے جانے والے طریقوں کی اطلاع دی۔

• سندھودیش کے بارے میں بھی پوچھا۔ میں نے اسے اس جگہ کے بارے میں اطلاع دی۔ سندھودیش کی تحریک، نوعیت، لیڈرشپ اور محدودیت پر گفتگو کی۔ بلوچستان میں سرکاری اقدامات کا پنجاب اور سندھ پر اثر زیر بحث آیا۔ اگلی ملاقات دس دسمبر کو ساڑھے سات بجے ہونا قرار پائی۔

10 دسمبر:

آٹھ دسمبر کو دوست راستے میں نظر آیا، مصروفیت کا بہانہ کر کے اس نے اگلی ملاقات 22 جنوری کو رکھی ہے۔

22 جنوری 1975:

اس ملاقات کی یادداشت لکھنے سے رہ گئی۔

14 فروری:

والنتین سے ملاقات۔ میں نے سفید جھوٹ بولا کہ شیر پاؤ کو ہم نے قتل نہیں کیا، حکومت

پاکستان نے قتل کیا ہے، اس لیے کہ اس بہانے اپنے مخالفین کو ختم کر سکے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ زخمی عبدالحمید، جس کی حالت اخبارات اور ریڈیو میں خطرے سے باہر بیان کی گئی وہ پنڈی سی ایم ایچ میں مشکوک حالت میں مرا ہے۔ بھٹو نے نیویارک میں بغیر کسی ثبوت اور عدالتی جواز کے اس قتل کا ذمہ دار ہمیں اور افغانستان کو قرار دیا ہے۔

حکومتی ماتمی جلوس درحقیقت فیڈرل سیکیورٹی فورس اور پولیس کی جانب سے نکالے جا رہے ہیں۔ وہ ہمارے اور دیگر مخالفین کے گھر اور دفتر جلا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ جو باتیں میں نے اسے لکھ کر دیں، ان کا تذکرہ اجمل کی ڈائریوں میں ہے۔

اس نے اپنا نظریہ اور موقف واضح نہیں کیا۔ لیکن اتنا کہا کہ ہم بلاتفریق ہر جگہ دہشت گردی کی کارروائیوں کے مخالف ہیں اور اس کی مذمت کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ شیر پاؤ کی موت کا ذمہ دار ہمیں سمجھتے ہیں اور اسے اچھا نہیں سمجھتے۔ البتہ موجودہ حالات میں نیپ پر پابندی اور راہنماؤں اور کارکنوں کی گرفتاریوں وغیرہ پر انہیں تشویش ہے۔ اپنا موقف وہ مجھ پر واضح نہیں کر رہا تھا۔ بس میری گفتگو سنتا رہا، اپنی رائے نہیں دی۔ اس کی وجہ وہی ہے کہ میرے سے ملاقات کا مقصد ان کا صرف معلومات کا حصول اور افغانستان کے حالات کو سمجھنا ہوتا ہے۔

28 فروری:

'وہی امام، وہی تراویح' (ڈھاک کے وہی تین پات)، معلومات اور اطلاعات دینا۔ اپنی طرف سے کچھ نہیں بولتا یا واضح کرتا۔ دلچسپی اور تشویش دونوں بہت زیادہ ہیں، لیکن گڑبڑ نہیں چاہتے۔ کوئی ٹھوس بات نہیں کرتے، وہ بھی ایسے حالات میں، جب بھٹو صاحب نے مکران کا ساحل اور بلوچستان پلیٹ میں رکھ کر امریکا کو دے دیا ہے۔

کتنا عرصہ گزر گیا، میں نے اسے کتابوں، رسالوں اور اخبارات کے لیے کہا تھا۔ اس میں بھی سیاست اور احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ حالانکہ ان سب چیزوں کی حیثیت خفیہ نہیں، عام بازار سے کسی بھی وقت خریدی جا سکتی ہیں۔ ملاقات میں کوئی قابل ذکر بات نہیں ہوئی۔ بزنجو صاحب کا نکتہ نظر بالکل درست تھا، کہ یہ بھٹو صاحب کی حکومت کے ساتھ گڑبڑ کرنا نہیں چاہتے۔ اگلی ملاقات 14 مارچ کو طے پائی ہے۔

14 مارچ:

اس ملاقات میں کیا ہوا تھا میں درج نہ کرسکا اور اب حافظے سے محو ہو چکی۔

30 مارچ:

پروگرام کے مطابق ملاقات ہوئی۔ صدر سردار داؤد خان کے ہندوستان، بنگلہ دیش اور عراق کے دورے اور ان کے ممکنہ نتائج پر بات ہوئی۔

ہندوستان:

۱۔ صدر صاحب کی پرجوش پذیرائی کی گئی۔
۲۔ ہندوستان کو بلوچستان کے معاملات پر تشویش ہے۔
۳۔ ہندوستان ایران کی دوستی سے مطمئن ہے۔
۴۔ ہندوستان کا تجزیہ ہے کہ بھٹو صاحب حملہ کرنے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔
۵۔ بھٹو ناقابل اعتبار ہے، وہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔
۶۔ پاکستان کی جانب سے افغانستان پر جارحیت کی صورت میں ہندوستان، افغانستان کی مدد کرے گا۔
۷۔ ہندوستان کو پاکستان کے حالات پر بڑی تشویش ہے۔ ان کے مطابق اگر حکومت جاتی ہے تو مارشل لاء آئے گا اور حالات مزید بگڑیں گے۔
۸۔ ہندوستان نے صدر صاحب سے پوچھا، کہ تم کیا کرنا چاہتے ہو؟ ہم تمہاری مدد کو تیار ہیں۔

بنگلہ دیش:

بنگلہ دیش اپنے مسائل میں گھرا ہوا ہے اور اس قابل نہیں کہ مادی مدد کر سکے۔ البتہ افغانستان کی سیاسی اور اخلاقی مدد کرسکتا ہے۔

عراق:

۱۔ عراق نے سربراہ مملکت کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔
۲۔ عراق افغانستان کی مدد کرنے کو تیار ہے۔
۳۔ عراق بلوچستان کے بارے میں تشویش رکھتا ہے اور ان کا موقف ہے کہ یہاں جتنے بلوچ

آئے، بے اعتبار نکلے۔ نام قوم کا لیتے ہیں، لیکن اپنے ذاتی مفادات کے لیے کام کرتے ہیں۔
۴۔ اُن کی اطلاعات کے مطابق تہران میں ایک سفارتکار خلیل مہران اخوند نے پاکستان کے خلاف نوٹ لکھا ہے اور افغانستان سے پناہ کی درخواست کی ہے۔ میرے پاس اس بارے میں کوئی معلومات نہ تھیں کہ یہ بات درست ہے یا غلط۔
۵۔ افضل اور جمال کے فارم اور دوسرے لوازمات پورے کرنے کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ کل تک یہ تمام فارم، سرٹیفکیٹ، تصاویر اور میڈیکل سرٹیفکیٹ تیار کرنے ہوں گے۔
۶۔ اس کا کہنا تھا کہ امریکا کو ویت نام اور کمبوڈیا میں مشکلات، یورپ میں ناکامی اور مشرق وسطیٰ میں کسنجر کی جانب سے امن مشن کی ناکامی کا اثر ہمارے خطے پر نہیں پڑے گا۔ ایسا نہیں کہ وہ ان تمام علاقوں سے نکل کر تمام توجہ ہمارے خطے پر مبذول کرنے والا ہے۔

13 اپریل:

وعدے کے مطابق ملاقات ہوئی۔ پاکستان کے حالات اور بالخصوص بلوچستان اور پختونستان کے بارے میں جو معلومات مجھے حاصل تھیں، اسے دیں۔ امریکا اور کانگریس کے نمائندوں کے نام جو خط ہم نے بھیجا ہے، اُس کی نقل بھی دی۔ اُن کا خیال تھا اور درست تھا کہ یہ خط بہت طویل ہے۔ کانگریس کے نمائندوں اور سینیٹرز کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ اتنا لمبا خط پڑھیں۔ انہیں ایک وقت میں ایسے بہت سارے خط اور اپیلیں آتی ہیں۔ اس کا مشورہ یہ تھا کہ اس خط کے ساتھ ایک مختصر، جاذب نظر خط ہر نمائندے کے نام کے ساتھ بھیجا جائے۔ اگلی ملاقات 28 اپریل کو ساڑھے سات بجے ہونا طے پائی ہے۔

28 اپریل:

ان امور پر گفتگو ہوئی: ۱۔ دیر کی گڑبڑ۔ ۲۔ بلوچستان کے حالات۔ ۳۔ پاکستان کے عمومی حالات۔ ۴۔ نیپ کے راہنماؤں کو سہالہ ریسٹ ہاؤس میں جمع کرنے کے بارے میں۔ ۵۔ افغانستان کے عمومی حالات اور سردار داؤد کا دورہ ایران۔

اس کی رائے تھی: سوویت یونین اس وقت پاکستان کے ٹوٹنے کے لیے تیار نہیں، ۱۔ مستقبل قریب میں پاکستان کے ٹوٹنے کا کوئی امکان نہیں۔ ۲۔ ایران اور ہندوستان، دونوں نہ پاکستان

کے ٹوٹنے کے لیے تیار ہیں اور نہ ہی ایسا چاہتے ہیں۔ ۳۔ افغانستان اور پاکستان کے درمیان مصالحت کا امکان نہیں۔ ۴۔ روس مصالحت چاہتا ہے۔ ۵۔ روس بحرہند بالخصوص بلوچ خلیج میں امریکی اثر کو نظرانداز نہیں کرسکتا۔ اگلی ملاقات 14 مئی، آٹھ بجے طے پائی۔ [لیکن یہ ملاقات نہ ہوسکی]۔

22 مئی:

۱۔ میاں شاہین شاہ، سید مختار باچا اور افراسیاب کے بارے میں گفتگو، افراسیاب کو واپس بھیجنے کے بارے میں تبادلہ خیال۔ ۲۔ صدر مملکت سے ملاقات اور اس ملاقات میں ان کے نظریات اور مشورے۔ ۳۔ پاکستان کی حکومت نے خار باجوڑ تک اپنے فوجی بھیج دیے ہیں، یہ انیس میل کے محیط میں ڈیورنڈ لائن سے ایک میل کے فاصلہ پر موجود ہیں۔ ۴۔ بلوچ گوریلا یعنی مہراللہ خان مینگل اور میر گوہر خان زرکزی کی آمد کے بارے میں معلومات۔ ۵۔ مراد بلوچ کے بارے میں معلومات دیں کہ وہ اصل میں محمد بھا بھا یعنی منحرف بائیں بازو والا (ماؤسٹ) ہے۔ (اُس وقت تک ہماری بھا بھا کے بارے میں معلومات یہ تھیں کہ ماؤسٹ ہے، بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ٹراٹسکائیٹ تھا)۔ ۶۔ صدر افغانستان کا دورہ ایران، نتائج اور اثرات۔ ۷۔ شیرپاؤ کے قتل کے مقدمے کی سماعت۔ ۸۔ نیپ کے راہنماؤں کا مقدمہ، وقت اور نوعیت۔ ۹۔ ہماری 'پرچم' کے لیڈر سے ملاقات۔ اگلی ملاقات آٹھ جون کو آٹھ بجے۔

8 جون 1975:

۱۔ خیرجان اپنے دوستوں کے ساتھ پہنچ گیا۔
۲۔ افراسیاب آج واپس چلا گیا۔
۳۔ مراد بلوچ اصل میں محمد بھا بھا ہے، اس بات کی آج تصدیق ہوگئی۔
۴۔ آج بینکوں کو قومیا لیا گیا، معاوضے کی ادائیگی اور اس کے تعین کا فیصلہ ابھی نہیں کیا گیا۔
۵۔ 'ڈیموکریٹک پاکستان' کے پانچ شمارے اسے دے دیے۔
۶۔ پاکستان آرمی ڈیورنڈ لائن کے قریب آنے کی کوشش کر رہی ہے۔ باجوڑ اور ماموند میں موجودہ واقعات اسی کوشش کا ایک رخ ہیں۔
۷۔ شاہ محمد شاہ اور قمرالزمان راجپر جی ایم سید کی طرف سے آئے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ کابل

ریڈیو میں انہیں سندھی زبان میں نشریات کے لیے اجازت دی جائے، لیکن اس بات پر داؤد خان راضی نہ ہوا۔ البتہ ہم ان کے ساتھ سیاسی پارٹی کی حیثیت سے مدد کرنے کو تیار ہیں، لیکن پہلی شرط یہی ہے کہ ہم سے نظریاتی ہم آہنگی پیدا کریں۔

22 جون:

آج خلاف معمول دیر سے پہنچا۔ ٹھیک وقت پر پہنچ جاتا، لیکن راستہ غلط ہوگیا تھا۔ اس لیے تنبیہ کی گئی۔ یہ معلومات دیں:

۱۔ افغان فوج کی باجوڑ کی طرف ڈیورنڈ لائن تک حرکت
۲۔ پاکستان کی ڈیورنڈ لائن تک پہنچنے کی کوشش۔ خاص طور پر وزیرستان میں رزمک سے شوال تک۔
۳۔ بلوچستان کے حالات۔
۴۔ افغانستان کے حالات، ہماری پوزیشن اور ہماری طرف ہر طرح کے لوگوں کی آمد۔
۵۔ ہماری مشکلات۔
۶۔ بلوچوں کی مدد کی نوعیت۔
۷۔ بموں کے دھماکے۔
۸۔ ولی خان اور نیپ کے مقدمے کا آغاز۔

بہت تاکید سے کہا گیا کہ درست جگہ اور درست وقت پر آیا کروں۔

8 جولائی:

کیونکہ موسم کے لحاظ سے اُس کی جگہ جانا مناسب نہ تھا، اس لیے گاڑی میں راستے ہی راستے میں چند باتیں کیں۔ اُنہوں نے مطالبہ کیا کہ آئندہ پختونستان، بلوچستان اور افغانستان کے بارے میں اُنہیں تحریری رپورٹ دیا کروں۔ اور یہ بھی کہ ہمارے گھر کون کون اہم شخصیات آتی ہیں۔ ان کی آمد، ملاقاتوں اور اہم باتوں کو بھی درج کیا جائے۔ میں نے کہا، ہم چاہتے ہیں کہ حالات حاضرہ پر اپنا ایک تجزیہ لکھیں اور پھر آپ سے رائے لے لیا کریں۔ اُنہوں نے یہ مان لیا اور اُنہیں اچھا لگا۔

اُن کی دلچسپی اِن امور میں ہے:

کے ٹوٹنے کے لیے تیار ہیں اور نہ ہی ایسا چاہتے ہیں۔ ۳۔ افغانستان اور پاکستان کے درمیان مصالحت کا امکان نہیں۔ ۴۔ روس مصالحت چاہتا ہے۔ ۵۔ روس بحر ہند بالخصوص بلوچ خلیج میں امریکی اثر کو نظرانداز نہیں کرسکتا۔ اگلی ملاقات 14 مئی، آٹھ بجے طے پائی۔ [لیکن یہ ملاقات نہ ہوسکی]۔

22 مئی:

۱۔ میاں شاہین شاہ، سید مختار باچا اور افراسیاب کے بارے میں گفتگو، افراسیاب کو واپس بھیجنے کے بارے میں تبادلہ خیال۔ ۲۔ صدر مملکت سے ملاقات اور اس ملاقات میں ان کے نظریات اور مشورے۔ ۳۔ پاکستان کی حکومت نے خار باجوڑ تک اپنے فوجی بھیج دیے ہیں، یہ انیس میل کے محیط میں ڈیورنڈ لائن سے ایک میل کے فاصلہ پر موجود ہیں۔ ۴۔ بلوچ گوریلا یعنی مہراللہ خان مینگل اور میر گوہر خان زرکزی کی آمد کے بارے میں معلومات۔ ۵۔ مراد بلوچ کے بارے میں معلومات دیں کہ وہ اصل میں محمد بھا بھا یعنی منحرف بائیں بازو والا (ماؤسٹ) ہے۔ (اُس وقت تک ہماری بھا بھا کے بارے میں معلومات یہ تھیں کہ ماؤسٹ ہے، بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ٹراٹسکائیٹ تھا)۔ ۶۔ صدر افغانستان کا دورہ ایران، نتائج اور اثرات۔ ۷۔ شیر پاؤ کے قتل کے مقدمے کی سماعت۔ ۸۔ نیپ کے راہنماؤں کا مقدمہ، وقت اور نوعیت۔ ۹۔ ہماری 'پرچم' کے لیڈر سے ملاقات۔ اگلی ملاقات آٹھ جون کو آٹھ بجے۔

8 جون 1975:

۱۔ خیر جان اپنے دوستوں کے ساتھ پہنچ گیا۔

۲۔ افراسیاب آج واپس چلا گیا۔

۳۔ مراد بلوچ اصل میں محمد بھا بھا ہے، اس بات کی آج تصدیق ہوگئی۔

۴۔ آج بینکوں کو قومیا لیا گیا، معاوضے کی ادائیگی اور اس کے تعین کا فیصلہ ابھی نہیں کیا گیا۔

۵۔ 'ڈیموکریٹک پاکستان' کے پانچ شمارے اسے دے دیے۔

۶۔ پاکستان آرمی ڈیورنڈ لائن کے قریب آنے کی کوشش کررہی ہے۔ باجوڑ اور ماموند میں موجودہ واقعات اسی کوشش کا ایک رخ ہیں۔

۷۔ شاہ محمد شاہ اور قمرالزمان راجپر جی ایم سید کی طرف سے آئے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ کابل

ریڈیو میں انہیں سندھی زبان میں نشریات کے لیے اجازت دی جائے، لیکن اس بات پر داؤد خان راضی نہ ہوا۔ البتہ ہم ان کے ساتھ سیاسی پارٹی کی حیثیت سے مدد کرنے کو تیار ہیں، لیکن پہلی شرط یہی ہے کہ ہم سے نظریاتی ہم آہنگی پیدا کریں۔

22 جون:

آج خلاف معمول دیر سے پہنچا۔ ٹھیک وقت پر پہنچ جاتا، لیکن راستہ غلط ہوگیا تھا۔ اس لیے تنبیہ کی گئی۔ یہ معلومات دیں:

۱۔ افغان فوج کی باجوڑ کی طرف ڈیورنڈ لائن تک حرکت

۲۔ پاکستان کی ڈیورنڈ لائن تک پہنچنے کی کوشش۔ خاص طور پر وزیرستان میں رزمک سے شوال تک۔

۳۔ بلوچستان کے حالات۔

۴۔ افغانستان کے حالات، ہماری پوزیشن اور ہماری طرف ہر طرح کے لوگوں کی آمد۔

۵۔ ہماری مشکلات۔

۶۔ بلوچوں کی مدد کی نوعیت۔

۷۔ بموں کے دھماکے۔

۸۔ ولی خان اور نیپ کے مقدمے کا آغاز۔

بہت تاکید سے کہا گیا کہ درست جگہ اور درست وقت پر آیا کروں۔

8 جولائی:

کیونکہ موسم کے لحاظ سے اُس کی جگہ جانا مناسب نہ تھا، اس لیے گاڑی میں راستے ہی راستے میں چند باتیں کیں۔ اُنہوں نے مطالبہ کیا کہ آئندہ پختونستان، بلوچستان اور افغانستان کے بارے میں اُنہیں تحریری رپورٹ دیا کروں۔ اور یہ بھی کہ ہمارے گھر کون کون اہم شخصیات آتی ہیں۔ ان کی آمد، ملاقاتوں اور اہم باتوں کو بھی درج کیا جائے۔ میں نے کہا، ہم چاہتے ہیں کہ حالات حاضرہ پر اپنا ایک تجزیہ لکھیں اور پھر آپ سے رائے لے لیا کریں۔ اُنہوں نے یہ مان لیا اور اُنہیں اچھا لگا۔

اُن کی دلچسپی اِن امور میں ہے:

١۔ پختونستان، بلوچستان اور افغانستان کے علاقوں میں۔

٢۔ افغان حکومت میں تبدیلیوں پر ہمارا موقف۔

٣۔ ہمارے ساتھ بڑی شخصیات کا تعلق۔

٤۔ نیچے کے علاقے (پاکستان) سے آنے والے۔

٥۔ افغان حکومت کی جانب سے جشن کے موقع پر پروگرام کا اعلان اور نوعیت وغیرہ

22 جولائی:

لکھی ہوئی معلومات اس کے حوالہ کیں۔ افضل اور جمال کا کام ہو گیا ہے، اگر 15 اگست تک تمام دستاویزات، پاسپورٹ وغیرہ تیار ہو جائیں۔ وقت بہت کم ہے، افضل کا 5 اگست کو امتحان شروع ہو رہا ہے۔ مشکل لگتا ہے کہ اس کے ماں باپ اُسے اجازت دیں۔ ویسے ہی میں ذمہ دار ٹھہرایا جاؤں گا، لیکن دیکھتے ہیں، کیا بنتا ہے۔

28 جولائی:

کل سینما جاؤں گا، یعنی سوویت دوست سے ملوں گا۔ شائد اطلاعات لکھ کر لے جاؤں اور اگر وہ تیار نہ ہو سکیں تو جانے کا فائدہ نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اطلاعات کہاں سے لاؤں؟ اطلاعات تو سب اجمل کے پاس جمع رہتی ہیں۔ بڑی شخصیات اور صدر صاحب سے ان کی ملاقات ہوتی ہے۔ پختونستان اور بلوچستان کے بارے میں اطلاعات انہیں ملتی ہیں، جو وہ مجھے نہیں بتاتے۔ میری حیثیت واقعی ایک قابل اعتماد سیکرٹری کی سی ہے، جو وہ حکم دیتے ہیں، میں ایک فوجی کی طرح بجا لاتا ہوں، نہ بحث، نہ میٹنگ اور نہ ایک رفیق کا سا تعلق۔ میں بس اس کا ایک 'چھوٹا' ہوں اور بس۔ یہ نہیں کہ اعتماد کی کمی ہے، لیکن ہمارے چھوٹے بڑے ہونے کا تعلق سیاست کے معاملے میں حائل ہے۔ اگر کچھ پوچھتا ہوں تو بات بدل دیتے ہیں۔ میرے ساتھ بات کرنا یا تو انہیں بے کار محسوس ہوتا ہے یا پھر مجھ سے چھپاتے ہیں۔ لیکن میں اسے بے اعتمادی اس لیے نہیں کہہ سکتا کہ یہی باتیں جن کی مجھے ضرورت رہتی ہے، بے کار لوگوں کے ساتھ کرتے رہتے ہیں۔ بہر حال یہ حالت نا قابل برداشت ہے۔ یا تو میں اس 'مشروٹی' (بلاوجہ بڑا بننا یعنی دوستوں سے ملنا) چھوڑ دوں یا یہ طریقہ بدلا جائے۔

29 جولائی:

لکھی ہوئی معلومات نے میرا کام تو بہت آسان کر دیا لیکن نقصان یہ ہوا کہ اس کی نقل میں اپنی ڈائری میں نہیں لکھ سکا۔ تاہم جو یاد ہے، وہ یہ کہ افغانستان بالخصوص پنجشیر، ارگون، لغمان، سرخرود، بٹ کوٹ، آسمار اور پکتیا وغیرہ میں تخریب کار تنظیموں کی مختصر رپورٹ دی۔ بھائی اور جمال کے داخلے کا معاملہ اب بھی اٹکا ہوا ہے اور شائد نہ ہو پائے۔

11 اگست:

لکھی اطلاعات حوالہ کیں۔ افضل اور جمال کی روانگی کے سلسلے میں دیگر مشکلات اور پاسپورٹ کی عدم موجودگی ہے، اس لیے اس کی داخلہ سیٹ منسوخ ہو جائے گی۔ بہت افسوس کا مقام ہے کہ اتنا اچھا موقع اور اتنی بے قدری۔

19 اگست:

تحریری اطلاعات حوالہ کیں۔ یہ جاننا چاہ رہے ہیں کہ پاکستان آرمی میں امریکی عملہ بھی موجود ہے یا نہیں۔ دو ماہ بعد ملاقات آٹھ بجے طے ہوئی۔ میرے ہاتھ میں نیوز ویک کے شمارے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے آئیدہ والینٹن کی جگہ دوسرا دوست لے لے، بہت وقت نہ تھا۔

24 اکتوبر:

افغانستان کے دائیں جانب جانے کی بابت بات ہوئی۔ ہماری مالی امداد روکنے اور افغانستان اور پاکستان کے داخلی امور پر باتیں ہوئیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ افغانستان میں موجودہ رجعت پسند تبدیلیوں کی اصل وجوہات سمجھنا چاہتے ہیں۔ یہ ہماری مادی امداد روکنے کی اصل وجوہات بھی سمجھنا چاہتے ہیں۔

وہ یہ بھی سمجھنا چاہتے ہیں کہ وہ خط و کتابت جو بھٹو اور کرٹ والڈ ھائم (سیکرٹری جنرل اقوام متحدہ) اور داؤد اور کرٹ والڈ ھائم کے درمیان ہوئی تھی، وہ اب اتنے عرصے کے بعد کیوں شائع کی جا رہی ہے۔ دو دن پہلے یہ اشاعت کے لیے دی گئی ہیں۔

11 نومبر:

یہ ان امور کو سمجھنا چاہتے ہیں:

۱۔ ساواک والی بات کی اصل حقیقت کیا ہے؟ وہ آئے ہیں یا نہیں؟ ان کے لوگ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟

۲۔ صدارت عظمیٰ کی جانب سے جاری کردہ اُس سرکلر کی حقیقت، جس میں سوشلسٹ ممالک کے نمائندگان پر نظر رکھنے کو کہا گیا ہے۔

۳۔ رجعت پسندوں کے مزید ارادے اور داؤد کے ارادے۔

۴۔ 'پرچم' اور 'خلق' پارٹیوں کے ساتھ حکومت کے نئے تعلقات اور رویے۔ یہ اور اس طرح کی دیگر معلومات۔

30 نومبر:

لکھی اطلاعات حوالے کیں۔ میں نے سنا کہ صدر پوڈ گورنی کابل ایک رسمی دورے پر آرہے ہیں۔ خدا کرے یہ سفر خوش بخت اور مفید ثابت ہو۔ یہ چاہتے ہیں کہ موصوف کے دورے کے بارے میں یہاں کے مختلف طبقات، حلقوں، گروپوں اور گروہوں کی رائے، سوچ اور فکر معلوم کریں، تاکہ رجعت پسندوں کی سازشوں کے بارے میں اندازہ لگایا جاسکے۔

9 دسمبر:

آج بھی حسب سابق لکھی اطلاعات دیں۔ میں نے اُن سے لندن منتقل ہونے کے بارے میں مشورہ چاہا۔ انہوں نے جواب دیا کہ سوچ کر جواب دیں گے۔ (اصل میں بات یوں تھی کہ لندن میں ڈیموکریٹک پاکستان کی سربراہی اور نشر و اشاعت ایم کے جنجوعہ کے حوالے کی گئی، تو داؤد خان چاہتا تھا کہ میں وہاں چلا جاؤں اور یہ کام سنبھالوں۔ کیونکہ DP کی اشاعت کا مالی بوجھ افغانستان اٹھاتا تھا۔)

23 دسمبر:

لکھی معلومات دیں۔ ایک بات واضح ہوگئی کہ صدر پوڈ گورنی نے صدر داؤد سے داخلی امور پر بھی گفتگو کی ہے۔ اسے کہا گیا کہ قومی امور میں وسیع تر شرکت کو یقینی بنایا جائے۔ بائیں بازو کی قوتوں کو ناراض کرنے کے بجائے سیاسی عمل میں شریک کیا جائے۔ داؤد خان نے خود بھی داخلی امور پر اپنے عدم اطمینان کا اظہار کیا۔ عمومی طور پر دورہ کامیاب رہا اور اپنے مقاصد حاصل کر لیے۔

میرا لندن جانے کا ارادہ روسیوں کو اچھا نہیں لگا اور ان کا کہنا ہے کہ میرا یہاں افغانستان میں رہنا زیادہ مفید ہے۔

12 جنوری 1976:

حسب وعدہ ملاقات ہوئی۔ دینے کے لیے کوئی خاص معلومات نہ تھیں۔ دوسری طرف عالمی، علاقائی اور داخلی امور پر تجزیے کا جو تقاضا کیا تھا وہ بھی پورا نہ ہوسکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری خواہش ہوتی ہے کہ ایک جدید نظری (Theoratical) تجزیہ کیا جائے، اس پر بحث کی جائے اور پھر ان کے حوالے کی جائے۔ یہ بھی حقائق سے پُر ایک نظری تجزیے کے طلبگار ہوتے ہیں۔

آج پھر میرے لندن جانے کا تذکرہ خود اس نے چھیڑا اور اس کے مقاصد اور طریقے کے متعلق دریافت کیا۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ انہیں ہم سے کوئی خاص دلچسپی پیدا ہوگئی ہے۔ افغانستان کے بارے میں بہت زیادہ پوچھتے ہیں۔ یہ ان کی دلچسپی، بیداری اور کسی عمل کی تیاری ظاہر کرتے ہیں، بہت الرٹ دکھائی دیتے ہیں۔

ہم سے تجزیہ طلب کرنا بھی اہم بات ہے۔ ان میں سے کوئی ایک بات ہے:

۱۔ ہمارے خیالات جاننا چاہتے ہیں۔

۲۔ ہمارے تجزیے کی بنیاد پر اپنے عمل کے ستون کھڑے کرنے چاہتے ہیں۔

۳۔ محض معلومات جمع کر رہے ہیں اور مستقبل کے لیے مواد جمع کر رہے ہیں۔

۴۔ کسی عمل کا ارادہ ہے۔

18 فروری 1976:

تھیسس ان کے حوالے کیا، یوں محسوس ہوتا ہے کہ پریشان ہیں۔ لیکن بے پروا نہیں، تشویش رکھتے ہیں۔

17 مارچ:

'وہی امام، وہی تراویح' اطلاعات وصول کیں اور افغانستان، بلوچستان اور پختونستان کے مختلف علاقوں پر گفتگو۔

28 اپریل:

ملاقات بہت مختصر تھی۔ میرے پاس لکھی اطلاعات کچھ نہ تھیں۔ صرف اجمل خٹک کے باہر جانے کی ان سے بات کی۔ لیکن وقت اور ملک کے بارے میں ابھی کچھ طے نہیں پایا تھا اس لیے میرا اندازہ تھا کہ یہ اس میں دلچسپی نہیں لیں گے۔ میرا خیال تھا وقت اور جگہ کے بارے میں انہیں دلچسپی ہوگی لیکن انہوں نے بالکل توجہ ہی نہ دی۔ مجھے مایوسی ہوئی۔ اگلی ملاقات 19 مئی کو آٹھ بجے طے پائی۔ اور اگر یہ تاریخ آگے پیچھے ہوگئی تو ہر ماہ کے اولین جمعہ کو بریکوٹ سینما کے سامنے ملنا ہوگا۔

19 مئی:

۱۔ پشتونوں اور بلوچوں کے انقلابی محاذ کی حالت زار کے بارے میں مختصر رپورٹ حوالے کی جو پشتو میں اجمل خٹک کی ڈائری میں لکھی تھی۔

۲۔ افغانستان اور پاکستان کے درمیان موجودہ حسن نیت کے مظاہرے۔ بھٹو کا آر سی ڈی (ریجنل کوآپریشن کونسل) کے سربراہی اجلاس میں شرکت کے بعد ازمیر سے تہران تک شہنشاہ ایران کے ساتھ ایک ہی طیارے میں ملاقات اور بھٹو کا یک طرفہ پروپیگنڈا کرنا۔ افغانستان میں زلزلہ اور سیلاب کے آفت زدہ افراد کے لیے امداد کا اعلان اور نیک خواہشات کا پیغام اور اس کے جواب میں افغانستان کی طرف سے بھٹو کو دونوں ممالک کے درمیان ’سیاسی مسائل‘ کے حل کی دعوت کے بارے میں مختصر رپورٹ دی۔ اُنہوں نے کہا کہ بھٹو نے جو ایک ملین ڈالر امداد کا اعلان متاثرین کے لیے کیا ہے، یہ اُنہیں ایران نے دیے ہیں۔

انہیں بھی موجودہ واقعات پر تشویش، توجہ، توقعات، خطرات اور امیدیں ہیں۔ اصولی طور پر یہ ایسی باتوں کے حق میں ہیں، لیکن کن شرائط اور نکات پر؟ یہ ’نکتے‘ اور مفاہمت کہ اگر افغانستان کو مغرب کی طرف لے جاتا ہے تو انہیں خوف اور تشویش ہے۔ لیکن اگر اس کے نتیجے میں پاکستان اور افغانستان کی عوام کو واقعی فائدہ پہنچتا ہے، تو یہ اس کا خیر مقدم کریں گے۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ وہ ان مذاکرات کے پیچھے متحرک ہاتھوں کی جانب متوجہ ہیں اور اس پر تشویش محسوس کرتے ہیں۔ وقت بہت حساس محسوس ہو رہا ہے۔ بھٹو کابل آنے والا ہے، اس کے ساتھ افغانی کیا بات کریں

گے اور اس کے نتیجے میں ہم پشتون، بلوچ اور پھر یہاں ہمارے مہاجرین کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا؟ یہ وہ سوالات ہیں جو سوویت دوست پوچھ رہے ہیں۔ انہیں بہت کچھ معلوم ہے، لیکن ہم سے ہمارا موقف جاننا چاہتے ہیں، خود منہ سے کچھ نہیں کہتے۔ یہ واضح ہے کہ ان کا زیادہ زور معاہدے کے نکات پر ہے اور اس کے نتیجے میں مثبت یا منفی اثرات پر ہے۔ کیونکہ سرمایہ دار اور اشتراکی ممالک کے درمیان Detente (دیتاں: عارضی صلح) سے یہ کچھ اور معنی لیتے ہیں۔ جبکہ ان کے علاقے میں دو یا دو سے زیادہ غیر اشتراکی ممالک کے درمیان دیتاں کا مطلب کچھ اور ہوتا ہے۔ ان دونوں میں یہ فرق رکھتے ہیں۔

حالات چونکہ نزاکت کی طرف بڑھ رہے ہیں اس لیے رابطے اور فوری رابطے کے لیے انہوں نے ایک خفیہ کوڈ دیا ہے، وہ یہ کہ صبح ساڑھے سات بجے ڈاکٹر سلیم (کوڈ نیم) مجھے فون کریں گے تو میں بتا دوں گا کہ میں موجود ہوں یا نہیں، اور اگر اجمل خٹک ہوں تو بتا دیں گے کہ باہر گیا ہوا ہے۔ اس دن مقررہ مقام پر آٹھ بجے ملاقات ہوگی۔

2 جون:

بلوچستان کی گوریلا تحریک کے بارے میں معلومات فراہم کیں، جس کا پشتو متن اجمل خٹک کی کاپی میں درج تھا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ انہیں بھٹو اور داؤد مذاکرات کے حوالے سے بہت تشویش ہے۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ:

۱۔ ان مذاکرات کے پیچھے کون ہے؟

۲۔ ان کا نتیجہ کیا نکلے گا؟

۳۔ ان مذاکرات کے نتیجے میں ہمارا کیا بنے گا؟

۴۔ ہم واپس جائیں گے یا رہیں گے؟

۵۔ سمجھوتا کن نکات پر ہوگا؟

۶۔ اندر اور باہر کون سی قوتیں اس سمجھوتے کے حق میں ہیں اور کون مخالف ہے؟

۷۔ داؤد خان اپنے موقف سے پیچھے ہٹے گا یا نہیں؟

۸۔ دونوں ممالک کس حد تک جانے کو تیار ہیں؟ ۔۔۔ یہ اور ایسے بہت سے دیگر سوالات۔

یہ سب وہ سوالات ہیں، جن پر ہمیں بھی تشویش ہے، لیکن ان کا یقینی جواب ہمارے پاس بھی نہیں۔ البتہ ایک بات میں نے انہیں بتائی کہ اگر مذاکرات ناکام رہے تو پھر افغانستان ہمیں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہاں سے نکل جائیں، اس صورت میں انہیں اندرونی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ تاہم اگر مذاکرات کسی حد تک کامیاب ہوئے تو بھٹو ہماری واپسی کی شرط رکھ سکتا ہے اور ہوسکتا ہے کہ یہ مان جائیں۔ لیکن پھر بھی ان میں بہت سے فریق، جیسے پاکستان، افغانستان، نیپ اور کمیونسٹ پارٹی شامل ہیں۔ ان تمام فریقوں کی شرائط اور مشکلات کے نتیجے میں ہماری واپسی یا عدم واپسی کا فیصلہ ہوگا۔ میں نے اس بات کا اضافہ کیا کہ ہمیں اندر انتشار بڑھانے کے لیے کسی خارجی سہارے کی ضرورت ہے، کیونکہ پاکستان میں قومی جمہوری انقلاب بغیر مسلح اور انقلابی جدوجہد کے ممکن نہیں۔ اس لیے اگر ہماری مرضی پر ہوا تو ہم ایسا ذریعہ باہر رکھنا ضروری خیال کرتے ہیں۔

بھٹو کے بارے میں کوئی پیش بینی نہیں کی جاسکتی، اس پر ہمیں پورا اعتماد نہیں۔ یہاں فیصلے کرنے کے باوجود کچھ عرصے بعد ہمیں وہاں قتل کراسکتا ہے۔ ہم ایسے فیصلے کے حق میں ہیں، جس سے تحریک کو فائدہ پہنچے۔

وہ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ افغانستان میں کونسا، کس کا اور کس نوعیت کا دباؤ، کس کے پاس ہے؟ کافی متوجہ محسوس ہوتے ہیں۔ اس کی ضرورت بھی محسوس کر رہے ہیں کہ حکومت میں سامراج دشمن، اہم اور بااعتبار افراد کو پہچانیں، تاکہ وقت بے وقت اور ایک طریقے سے یا دوسرے طریقے سے ان سے معلومات حاصل کرسکیں۔ افضل اور جمال کے داخلے کی بات کی، لیکن اس نے بتایا کہ تاخیر ہوچکی، اس نے کہا، کاش تم نے پہلے کہا ہوتا۔

16 جون:

بھٹو کے حالیہ دورے کے نتیجے میں بہت ساری افواہیں، مخالفت، حمایت، خوش خبریاں، بد خبریاں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ اس ملک کا اہم سیاسی واقعہ ہے۔ یہ اس بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ جو معلومات افغانستان والوں نے ہمیں بتائیں ہیں:

۱۔ مذاکرات بہت دوستانہ اور پرخلوص ماحول میں ہوئے ہیں۔

۲۔ بھٹو نے توقع سے زیادہ نرم رویے کا اظہار کیا اور تمام رعایتیں دینے کو تیار تھا۔

۳۔ آیندہ مذاکرات کے لیے راہ ہموار ہے اور دروازہ کھلا ہے۔

۴۔ کوئی ٹھوس اور واضح فیصلہ نہیں کیا گیا، محض راہ ہموار کی گئی ہے۔

بھٹو اس سب کے بعد کیا کرے گا اور اس کا نتیجہ کیا نکلے گا، اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔

[افغانستان والے بعض مفاہمتوں سے ہمیں بے خبر رکھتے تھے]

30 جون:

عام باتیں ہوئیں۔ وہ یہ سمجھنا چاہتے ہیں:

۱۔ بھٹو کے ساتھ مذاکرات کے بعد نئی معلومات، اثرات، اقدامات کیا ہیں اور ان کے نتیجے میں یہاں ہمارے ساتھ سلوک میں کوئی فرق؟

۲۔ ظفر خٹک، جو وزارت مالیات میں اکنامکس ڈیپارٹمنٹ میں ڈپٹی سیکرٹری ہے، یہ کون ہے؟

۳۔ یہاں افغانستان کی مختلف وزارتوں میں اچھے، شریف اور ترقی پسند دوستوں اور بُرے رجعت پسندوں کی فہرست درکار ہے۔

۴۔ بلوچوں اور پشتونوں کے ساتھ حکومت کے عمومی رویہ میں کوئی فرق آیا ہے یا نہیں؟

۵۔ یوں محسوس ہو رہا ہے کہ افغانستان مغرب کی جانب بڑھ رہا ہے۔

14 جولائی:

عمومی معلومات اور گفتگو۔ اطلاعات لکھ کردی گئیں۔ میں نے انہیں ظفر خٹک کی تاریخ اور جغرافیے سے آگاہ کیا، کہ یہ حکیم خان کا فرزند ہے اور 'شیدو' گاؤں سے تعلق ہے۔ اجمل خٹک کے عزیزوں میں سے ہے، ہم اچھی طرح پہچانتے ہیں کہ بہت مکار، چالاک اور بے اعتبار انسان ہے۔ اپنے آپ کو کچھ بھی بنا کر پیش کرسکتا ہے۔ امریکہ کے انفارمیشن یا یوایس آئی ایس میں بھی رہ چکا ہے، مکمل امریکی ہے۔

4 اگست:

بھٹو اور داؤد خان کی ملاقات کے بعد دونوں جانب پرامید تھے، تاہم یہاں افغانستان میں حد سے زیادہ خوش فہمی پائی جاتی ہے، کہ بھٹو مکمل طور پر اپنی مشکلات پر قابو پالے گا اور کچھ اقدام

کرے گا۔ اس لیے صدر مملکت داؤد خان اس ماہ اسلام آباد جا رہے ہیں۔ البتہ اب تک بھٹو نے کوئی عملی اور مثبت قدم نہیں اٹھایا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ وقت گزار رہا ہے اور اس وقت راہنماؤں کو آزاد کرے گا، جب انتخابات بالکل نزدیک آجائیں، تب وہ انتخابات میں حصہ نہ لے سکیں گے یا ہار جائیں گے۔

افغانستان ایران کے بہت قریب چلا گیا ہے۔ لیکن میرا خیال نہیں کہ افغانستان غیر جانبداری کا نقاب یکسر نوچ کر آر سی ڈی جیسے کسی معاہدے میں شامل ہو جائے گا۔

کسنجر ہو سکتا ہے، اس لیے آرہا ہو کہ انہیں اپنی مدد کا یقین دلائے۔

ہم ایک باعزت حل کے حق میں ہیں، جس سے عوام کو فائدہ پہنچے، یعنی بلوچستان سے فوجیں واپس جائیں، تاوان ادا کیا جائے، عام معافی کا اعلان ہو اور سیاسی سرگرمیوں کی مکمل آزادی ہو۔

یہاں، ہم اس فکر میں ہیں کہ بھٹو اگر واقعی خلوص دل سے ہندوستان، پاکستان اور اس کے نتیجے میں سوویت یونین سے دوستی چاہے، تو ہم اس قسم کی پالیسی کی حمایت میں ایک سیاسی قوت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شائد ہم بھٹو سے ایک باعزت مفاہمت کی بنیاد پر اسے اس مقصد کے لیے مدد دیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ بغض معاویہ میں ہم رجعت پسندی اور فوج کو فائدہ پہنچا دیں۔ یہاں یہ ہماری سوچ ہے۔

افغانستان میں افواہیں بہت پھیلتی ہیں جس کی ایک بڑی وجہ تو گھٹن کی فضا ہے، جو خود بخود افواہوں کے لیے راہ ہموار کرتی ہے۔ پھر اس فضا سے دشمن فائدہ اٹھاتے ہیں اور اپنے مفاد میں روس مخالف افواہیں پھیلاتے ہیں۔

18 اگست:

صدر محمد داؤد خان جب غیر جانبدار ممالک کی کانفرنس میں شرکت کے لیے کولمبو جا رہے تھے، تو واپسی پر پاکستان جانا تھا۔ وہ بہت سارے اندیشوں اور تشویش کے ساتھ یہ دورہ کر رہے تھے۔ موصوف یہ محسوس کر رہے تھے کہ بھٹو انہیں دھوکا دے رہا ہے اور اُن سے مصالحت بہت مشکل ہے۔ اور اگر مصالحت نہیں ہوتی تو پھر مخاصمت کی حالت میں آنا پڑے گا، اس لیے وہ ایسے نتائج سے تشویش میں مبتلا تھے۔

جاوید (حکیم لہڑی) کی بات میں نے بتائی، کہ صدر صاحب کو آکر رپورٹ دی، لیکن پتا نہیں کیا کہا تھا، کہ پھر حکومت نے اسے ملک بدر کر دیا۔

27 اکتوبر:

اطلاعات دیں۔ ہم مایوس ہیں۔ ہمارے بڑے کہہ رہے ہیں کہ ہم محض قید اور آزادی پر سودا بازی نہیں کر سکتے۔ پختون اور بلوچ الگ الگ مذاکرات نہیں کریں گے۔ بھٹو نے اب تک ہمارے بڑوں سے بات چیت کی کوشش نہیں کی۔ البتہ بلوچوں کو جرگے بھیجے گئے ہیں، انہیں کہا جا رہا ہے کہ پختونوں سے الگ ہو جاؤ، سب کچھ دیں گے، لیکن بلوچ نہیں مانتے۔ اس مسئلہ پر ہمیں یقین ہے، کہ بھٹو ہم سے سیاسی گفتگو کے لیے تیار نہیں۔ ہمارے سروں پر سودا بازی کی جا رہی ہے۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ (افغان) بھٹو کی سیاست اور چالاکی میں پھنس گئے ہیں۔ بھٹو ہمیں پاکستان کے اندر ختم کرنا چاہتا ہے۔ قبائل پر قبضہ کرنا چاہتا ہے اور افغانستان میں اندرونی انتشار پھیلا کر اپنا ہاتھ بڑھانا چاہتا ہے۔ اس کے لیے افغانستان کے ساتھ بات چیت کا ایک پردہ پھیلایا ہوا ہے، اس کے پیچھے اپنے مقاصد کو آگے بڑھا رہا ہے۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ اگر یہی حالات رہے تو بھٹو اپنی پوزیشن مضبوط کرتا جائے گا اور یہ کمزور ہوتے جائیں گے اور انہیں اپنے فیصلے ماننے پر مجبور کر دے گا۔ یہاں اب بھی تخریب کاروں کے لیے اسلحہ پاکستان سے آرہا ہے۔

بلوچ پناہ گیر (89 ہلمند میں شوراوک کے قریب سرحد پر، 45 دیگان کے قریب ہیں) آئے ہیں، انہیں اجازت نہیں دی جا رہی۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہمیں صاف جواب نہیں دے سکتے، لیکن رفتہ رفتہ ہمیں تنگ کیا جا رہا ہے اور مجبور کیا جا رہا ہے۔

دیر میں جنگ شروع کی، بمباری کی، سینکڑوں مرد، عورت، بچے مار ڈالے اور گاؤں کے گاؤں تباہ کر دیے۔ اس میں دو ڈھائی سو ملیشیا سپاہی مارے گئے۔ ابھی جنگ ختم نہیں ہوئی، لوگ اسی طرح پہاڑوں میں پناہ لیے ہوئے ہیں، حکومت کے بڑوں کے ساتھ مذاکرات ناکام رہے ہیں۔

بلوچستان میں جنگ جاری ہے، مقابلے ہو رہے ہیں۔ اس رواں ماہ میں ایک مقابلے میں پانچ افسر اور پچاس فوجی مارے گئے۔ حکومت نے 60 ہزار مزید فوج بھیجی ہے۔ مری کے علاقے میں لوگوں کو بہت تنگ کر رکھا ہے، ان پر بمباری کی جا رہی ہے۔ اس لیے تو مزید اتنے بہت

مہاجرین ہجرت پر مجبور ہوئے ہیں۔ گذشتہ دنوں میں ہمارا ایک بہادر بلوچ کمانڈر میر سفر خان زرکزی بھی جنگ میں شہید ہوا۔ [پاکستان آکر مجھے معلوم ہوا کہ سفر خان کے ساتھیوں کا رات کے اندھیرے میں آرمی کے گشتی دستے سے آمنا سامنا ہوا، فائرنگ کا تبادلہ ہوا اور صبح معلوم ہوا کہ موصوف مارے جا چکے ہیں۔]

یہاں افغانستان حکومت دائیں طرف کو جھکتی جا رہی ہے۔ تعزیرات کا قانون بہت فاشٹ اور پولیس گردی پر مبنی ہے۔

افغانستان ہر قیمت پر مفاہمت چاہتا ہے، لیکن اس مفاہمت کے لیے پاکستان نے کوئی فضا تیار نہیں کی۔

جو سوالات اُنہوں نے کیے، وہ یہ تھے:

۱۔ تمہارا کمیونسٹ پارٹی سے کیا اور کیسا تعلق ہے؟

۲۔ کن غیر ملکیوں کے ساتھ تعلق رکھتے ہو؟

۳۔ ولی خان صدر داؤد کو مفاہمت پر اثر انداز ہونے کے لیے کوئی پیغام یا صلاح مشورہ بھیجتا ہے یا نہیں؟

۴۔ حکومت میں وہ لوگ، جو آپ کے تعلق میں ہیں، ان میں اچھے اور برے لوگوں کی فہرست فراہم کریں۔

۵۔ بلوچستان، پختونستان اور افغانستان میں مفاہمت کے حوالے سے جو غیر معمولی پیش رفت ہو، اس سے ہمیں آگاہ کیا کریں۔

۶۔ اجمل خٹک باہر کب جا رہے ہیں؟

۷۔ صدر داؤد سے اجمل خٹک کس طرح، کتنے عرصے بعد اور کس کی خواہش پر ملتے ہیں؟

۸۔ حکومت کا رویہ آپ کے ساتھ کیسا ہے؟

۹۔ اگر سی آئی اے میں کوئی ایسا بندہ ہو، تو اس کی اطلاع دیا کریں۔

6 نومبر:

ہنگامی اور غیر معمولی ملاقات: میر احمد شاہ کی سربراہی میں حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش

کرنے والے افراد کی جو فہرست میجر اسلم (اسلم وطن جار) نے منکشف کی تھی، جس میں وہ بھی بظاہر شامل رہا تھا، وہ فہرست انہیں دی۔ (یہ دستاویز بعد میں حکومت نے 30-29 نومبر کو ظاہر کی اور میر احمد شاہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ گرفتار ہوا۔ پھر اس دستاویز کی خبر ریڈیو افغانستان کے ذریعے 3 دسمبر 1976 کو نشر کی گئی)۔

17 نومبر:

رپورٹ: یہاں سکتہ اور جمود ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہم آرمی، پولیس اور جاسوسی محکمے میں قابل اعتماد افراد کو ڈھونڈیں۔ وہ حالات کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ ارگ یعنی صدارتی محل کے جمہوری گارڈ میں کسی قابل اعتبار رابطے کے متلاشی ہیں۔ میں نے انہیں آمر کشف (انٹیلی جنس افسر) عبدالحق علومی کا نام دیا، کہ یہ قابل اعتماد ہے۔

وہ یہ بھی سمجھنا چاہتے ہیں کہ ہمارے مسئلے کا کیا بنے گا؟ ان کی رائے ہے کہ اجمل خٹک کے لیے اچھا یہ ہوگا کہ وہ لندن کی بجائے چیکوسلواکیہ چلے جائیں۔

8 دسمبر:

میر احمد شاہ کی سازش کے بارے میں بات چیت ہوئی۔ نسیم بی بی نے داؤد خان کو گلہ کا خط لکھا ہے۔ یہ لوگ اجمل خٹک کے باہر جانے سے ڈرتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ لندن چلے جائیں اور پھر افغان حکومت زیادہ دیر تک انہیں وہیں روکے رکھے، علاج یا کسی اور بہانے سے۔ اس لیے وہ لندن کے حق میں نہیں۔ کہتے ہیں کہ اگر جانا ہے تو چیکوسلواکیہ جائیں۔

علومی صاحب کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ وہ حاکم محمد زئی کے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے، اس لیے اُس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ (یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ علومی صاحب کو ایک مرتبہ گارڈ سے تبدیل کر دیا گیا تھا، تاہم بعض مصلحتوں کی بنا پر واپس اپنی جگہ بحال کیا گیا۔)

15 دسمبر:

ہنگامی ٹیلیفون پر مکالمہ: اسلم خان (وطن جار) کی اطلاعات پر بہت مسرور ہیں۔ کہہ رہے ہیں کہ اگر اجمل خٹک باہر جائیں اور میرا ساتھ جانا طے پائے، تو میں ہرگز ان کے ساتھ نہ جاؤں، بلکہ انکار کر دوں۔ میں نے انہیں بتایا کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میرا یہاں کوئی ذکر ہی نہیں آ سکتا۔

22 دسمبر:

معلومات: معلوم ہوا ہے کہ نچلے نیپ کے راہنماؤں نے ایک قابل اعتماد حکومتی ذریعہ کو بتایا کہ داؤد خان کے خلاف حالیہ سازش اس لیے بنائی گئی تھی کہ وہ ماسکو جا رہے ہیں۔ انہیں ماسکو جانے سے پہلے ختم کر دیا جائے یا ان پر دباؤ ڈالا جائے کہ وہاں سوویت راہنماؤں کے ساتھ معاہدہ نہ کریں۔ یا دورے کے بعد بھی یہی حرکات جاری رکھی جائیں جب تک وہ ختم نہ ہو جائے یا اسے بالکل دوسری طرف موڑ نہ دیں اور ایسی ہی اور باتیں۔

12 جنوری 1977:

پوچھے گئے سوالات:

ا۔ لویہ جرگہ بلایا گیا ہے، اس میں کیا ہوگا؟
۲۔ جرگے میں نمائندگان کا انتخاب کیسے کیا جائے گا؟
۳۔ کون اور کن شرائط کے تحت جرگے کا رکن نامزد کیا جائے گا؟
۴۔ جرگے میں کیا فیصلے ہونگے؟
۵۔ اس سے کیا امیدیں اور توقعات رکھی جا رہی ہیں؟
۶۔ تختہ الٹنے کی سازش کے خلاف تحقیقات کیسی جا رہی ہیں؟

"میری ذاتی رائے یہ ہے کہ افغانستان کچھ نہیں کر رہا۔ پاکستان میں بھی ہماری کوئی اہمیت باقی نہیں رہی۔ وہ بس ہم سے ہتھیار رکھوانا چاہتے ہیں۔ اس پوری تحریک کی ابتداء ہی غلط تھی، غلط اندازوں اور کمزور تجزیہ پر مبنی تھی۔ اندھیرے میں تیر چلانا تھا۔ اگر یہی حال رہا تو دن بہ دن مایوسی بڑھتی جائے گی۔ غالب امکان یہ ہے کہ ہم جو باہر نکلے ہیں، رفتہ رفتہ بکھر جائیں گے۔ ہماری کامیابی یہ ہوگی کہ تمام لوگ ایک رائے پر متفق ہو کر اور زندگی کے عام دھارے میں شامل ہو جائیں۔ اگر سیاست کا موقع ملے تو سیاست کریں۔"

26 جنوری:

معلومات کا تبادلہ اور بحث مباحثہ ہوا۔

اس کے بعد کی ملاقاتوں کا حال درج نہیں، بعض ڈائریاں مجھ سے گم ہو گئیں۔ اب میں باقی

تفاصیل اپنے حافظہ کی مدد سے لکھ رہا ہوں۔ یہ وہ دن تھے جب حالات بہت پیچیدہ تھے۔ افغانستان کے سیاسی سٹیج پر سوویت اور امریکی طرفداروں میں کانٹے کا مقابلہ جاری تھا۔ ہماری ملاقاتیں اور زیادہ خفیہ ہوتی چلی گئیں۔ ایک بات کا میں یہاں اقرار کرلوں کہ ہم نے سوویت یونین کی دل کی گہرائیوں سے مدد کی تھی۔ لوئیس ڈوپرے، جو امریکی ماہر تاریخ اور بشریات تھا اور یہاں بیس پچیس سال سے رہتا تھا۔ اس کا آزادانہ پاکستان آنا جانا تھا اور دونوں حکومتوں کے ساتھ رابطہ میں تھا، روسیوں کو شک تھا کہ یہ سی آئی اے کے لیے کام کر رہا ہے۔ وہ ہمارے پاس بہت آیا کرتا تھا، اجمل خٹک اور حتیٰ کہ مجھ سے تبادلہ خیالات کرتا تھا۔ اس کے لیے سوویت والوں کے کہنے پر ٹیپ ریکارڈر رکھا، اس کا حالات پر تجزیہ لیا، اور اس کے سوال و جواب محفوظ کیے (بعض سوالات بھی روسیوں کے فراہم کردہ تھے)۔ پھر یہ سارا مواد سوویت دوستوں کو دیا۔

دوسری مرتبہ یہ ہوا کہ امریکیوں نے بہت چال بازی سے کام لے کر کسی طرح دو روسی سفارتکاروں کو افغان حکومت کے ذریعے ناپسندیدہ قرار دلوا کر نکال دیا۔ اس کے جواب میں روسیوں نے بھی کوشش کی، کہ امریکا کے دو سفارتکاروں کو نکالا جائے۔ ایک مرتبہ میرے ذمہ یہ کام لگایا کہ سر راہ موجود فون بوتھ سے میں ان سفارتکاروں کو فون کروں۔ ایک کا نام آرمز سٹونٹز اور دوسرے کا نام میں بھول گیا۔ مجھے یہ کہنا تھا کہ افغان حکومت ان کی خفیہ سرگرمیوں سے آگاہ ہے۔ اس دوران روسیوں کی کوشش سے، جس میں ہم نے بھی بالواسطہ کردار ادا کیا، 'پرچمی' اور 'خلقی' دونوں دھڑوں میں اتحاد ہوگیا۔ اس اتحاد نے بہت ارتعاش پیدا کیا۔ سردار محمد داؤد کی حکومت کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس کی حکومت میں دائیں بازو کے عناصر بھڑک اٹھے اور داؤد خان نے بھی اس اتحاد کے پس پردہ مقاصد کی نشاندہی کر دی۔

جولائی 1977 میں ضیاء الحق نے تختہ الٹ دیا تھا۔ عام معافی کا اعلان کر دیا گیا اور پختون زلمے بھاگم بھاگ رخصت ہونے لگے۔ میں نے 16 اکتوبر کی ملاقات کا احوال درج کیا ہے، جس میں سوویت دوست نے مجھ سے پوچھا کہ آیا:

- پاکستان میں دوبارہ تختہ الٹائے جانے کا امکان ہے؟
- اگر عدالت بھٹو کو رہا کر دے تو کیا فرق پڑے گا؟
- دس اکتوبر کو ضیاء الحق نے کابل کا دورہ کس مقصد کے لیے کیا تھا؟

- داؤد خان اور ضیاء الحق کے درمیان کیا باتیں ہوئیں؟
- ضیاء الحق عرب، ایران، امارات کے دورے کے بعد افغانستان کیوں آئے؟
- آرمی متحد ہے اور ضیا کے پیچھے کھڑی ہے یا آرمی میں اندرونی اختلافات پائے جاتے ہیں؟
- آرمی کے نچلے رینکس میں کیا سوچ پائی جاتی ہے؟
- کیا ولی خان وغیرہ کے رہا ہونے کا امکان موجود ہے؟
- کل افغانستان کے بعد ایران کے دورے کا مقصد کیا ہے؟
- افغانستان میں کیا ہو رہا ہے؟
- کیا حکومت مخالف کچھ کوشش ہوئی ہے یا نہیں؟

انہوں نے یہ سوالات میرے سامنے رکھے اور میں نے اپنی سوچ سمجھ کے مطابق ان کا جواب دیا۔

ہم نے اپنے پختون زلمے کے نوجوانوں کو عام معافی کے اعلان اور نیپ لیڈران سے ایک مفاہمت کے بعد رخصت کردیا۔ آخری کیمپ بسم اللہ کاکڑ اور عزیز اللہ کا تھا، جو آسومرغہ کیمپ تھا۔ وہ بھی جنوری فروری 1978 میں واپس لوٹ گئے۔ مری کے علاوہ دیگر بلوچ نمائندے بھی واپس لوٹ گئے۔ میں نے بھی اپنا سامان یعنی کتب اور چند دیگر ذاتی استعمال کی چیزیں واپس بھجوادی تھیں اور ولی خان کو اپنی واپسی کے ارادے سے باخبر کردیا تھا۔ اجمل خٹک بہت ترغیب وترکیب کو کام میں لاکر مجھے واپسی سے منع کررہے تھے، لیکن میں اُن کی بات نہیں مان رہا تھا۔ سوویت دوست بھی اس بات کو پسند نہیں کررہے تھے۔ آخر سوویت یونین کی ایک اہم شخصیت، جس کا نام 'ویلیوورگا بریلویچ اوساچی' تھا نے مجھ سے رابطہ کیا، یہ شخص بعد میں صدر ببرک کارمل کا مشیر اعلیٰ بھی بنا تھا، اُس نے مجھے کہا کہ سوویت کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کی خواہش ہے کہ میں واپس نہ جاؤں۔ تمہیں پاکستان میں کئی خطرات کا سامنا ہوگا اور ہم تمہاری یہاں موجودگی زیادہ ضروری اور اہم سمجھتے ہیں۔ جب مرکزی کمیٹی کا واسطہ آیا تو میں مجبور ہوگیا اور وہیں ٹھہر گیا۔ اب سوچتا ہوں کہ اس خواہش کے پیچھے ضرور اجمل خٹک نے بھی اپنا کردار ادا کیا ہوگا۔

اس دوران انقلاب آگیا، حالات بدل گئے اور نئی امیدیں پیدا ہوئیں۔ انقلاب کے بعد میرا زیادہ تر تعلق اوساچی سے رہا۔ وہ مجھ سے افغانستان، انقلاب، انقلاب کی مشکلات، پرچم،

اور 'خلق' کی باہمی چپقلش پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ پہلے پہلے ان کا خیال تھا کہ حفیظ اللہ امین پختون ہے، اس لیے اتنی شدت پسندی اور انتہا پسندی کا مظاہرہ کررہا ہے، یعنی اُسے شک کا فائدہ دیتے رہے۔ لیکن رفتہ رفتہ اُن کا رویہ بدلتا رہا۔ وہ بعض باتیں مجھ سے ایسی بھی کرتا تھا جو اجمل خٹک سے بھی نہیں کرتا تھا، جس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ اجمل خٹک سے ملنا مشکل تھا، اور دوسرے اجمل تقریباً 'خلقی' ہوچکے تھے۔ وہ مجھے سخت تاکید کرتے تھے کہ میں گھر سے ادھر اُدھر نہ جاؤں، اپنے روابط میں احتیاط کروں، کیونکہ سخت پکڑ دھکڑ کا زمانہ تھا۔ مجھے یہ بھی کہتے تھے کہ ان پارٹیوں کو دوبارہ کیسے متحد کیا جاسکتا ہے؟ جب یہ دباؤ ڈالنے میں ناکام رہے تو انہوں نے چیکوسلواکیہ کے کمیونسٹ پارٹی کے نظریہ دان اور پولٹ بیورو کے رکن 'واسیلی بیلاک' کا انتخاب کیا، کہ وہ کابل آکر ترہ کی اور امین پر دباؤ ڈالے۔ مجھ سے رائے طلب کی تو میں نے کہا کہ اب 'بیلاک' بھی کچھ نہیں کرسکتا۔ میری رائے درست ثابت ہوئی اور بیلاک خالی ہاتھ لوٹا۔ انقلاب کے دوسرے مرحلے تک میری ملاقاتیں خفیہ تھیں، لیکن جب روسی خود آگئے تو میری ملاقات کھلے عام ہونے لگیں۔

دوسرے مرحلے کے بعد 'اوساچی' ببرک کارمل کا مشیر اعلیٰ مقرر ہوا اور اُس نے اجمل خٹک سے ناراض اور اس کے لیے غصہ رکھنے والے ببرک کارمل کے ساتھ تعلقات دوبارہ بحال کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس وقت میرا تعلق 'بورس واسیلیویچ' سے بنا، جو پاکستان میں رہ چکا تھا اور تمام راہنماؤں کو ذاتی طور پر جانتا تھا۔ وہ روابط رکھنے میں بہت آزاد تھا۔

ڈاکٹر نجیب حکومت کے آخر تک میرا تعلق متعلقہ سوویت مربوط افراد کے ساتھ رہا، لیکن ببرک کارمل کی حکومت اور سوویت کی شخصی موجودگی نے میرے روابط کو عمومی رنگ دے دیا۔ اب سوویت مشیر افغانستان کے ہر ادارے میں موجود تھے، جبکہ پاکستان کی سیاست، پالیسی اور اطلاعات کی جمع آوری اب خاد اور کے جی بی کے حوالہ تھی۔ اس لیے میری اہمیت اور ضرورت کوئی خاص باقی نہ رہی تھی۔

1974 سے 1989 تک میرا رابطہ سات روسی نمائندوں سے رہا جن میں سے ایک آذربائیجانی تھا۔

البتہ میں یہاں ایک قصہ یاد کرنا چاہتا ہوں، جس کا تعلق روسیوں کی ان کوششوں سے ہے جو انھوں نے افغان انقلاب کو محفوظ کرنے کے لیے کیں۔ ایک تو ان کی کوشش تھی کہ موجودہ وسائل میں

ردِ انقلاب عناصر کے خلاف کامیابی حاصل کرلیں، دوسری طرف یہ بھی نظر میں تھا کہ پاکستان کے بارے میں ایک جارحانہ پالیسی اختیار کریں، تیسرے راستے کی تلاش میں بھی تھے کہ پاکستان کے امن وسلامتی کی ضمانت دیں اوراس کے بدلے اُسے افغانستان میں مداخلت سے منع کریں۔ اس حوالے سے 1982 میں بیس اکتوبر کو میرے ساتھ رابطہ کیا گیا اور یہ سوال جواب ہوئے:

س: بفرضِ محال اگر افغانستان ڈیورنڈ لائن کو تسلیم کرلے تو کیا ہوگا؟

ج: اگر ایسا کرنے سے انقلاب مستحکم ہوتا ہے تو یہ بہت اچھا قدم ہوگا۔ ہم وطن پرست اور انٹرنیشنلسٹ ہیں، اور انقلاب کی کامیابی اپنی کامیابی سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر ایسا کرنے سے افغانستان کے ہاتھ کچھ نہیں آنا تو یہ گھاٹے کا سودا ہے۔ یہ اصل میں اتنا سادہ مسئلہ نہیں۔ اس کے نتیجے میں اور بہت سارے مسئلے پیدا ہونگے، جیسے قبائل کا مسئلہ۔

س: ولی خان کا موقف کیا ہوگا؟

ج: میرے خیال میں وہ بہت ناراض ہونگے۔ وہ نہیں چاہتے کہ افغانستان ڈیورنڈ لائن کو تسلیم کرے۔ پختون عوام بھی اس پر ناراض ہوگی۔ [میرا جواب صحیح نہیں تھا۔]

س: تم کہہ رہے ہو کہ عام پختون اس سے ناراض ہونگے تو پھر انقلاب کیسے مستحکم ہوگا؟

ج: سب سے اہم چیز انقلاب کا استحکام ہے۔ توازن دیکھنا چاہیے کہ توازن کہاں زیادہ ہے۔ اگر جلد از جلد انقلاب کا مسئلہ حل ہوتا ہے تو باقی مسائل کے حل بعد میں تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن اس کا زیادہ انحصار پاکستان کے حالات پر ہے۔ اگر پاکستان میں مختلف قومیتوں کو جبر وستم کا سامنا رہا تو ہوسکتا ہے کل بلوچ اٹھ کھڑے ہوں اور جنگ کے نتیجے میں پاکستان کو توڑ دیں۔ پھر پشتون کیا کریں گے؟ اور اگر پاکستان کی قومیتیں خوشحال ہوں اور ہندوستان اور افغانستان کے ساتھ تعلقات اچھے اور ٹھیک ہوں تو اچھی بات ہے۔ لیکن امریکا ایسے امکان کو کیسے قبول کرسکتا ہے؟

(روسی اس بات پر تیار تھے کہ افغانستان ڈیورنڈ لائن کو مان لے بشرطیکہ پاکستان مداخلت بند کرے۔ مگر افغانستان کا ڈیورنڈ لائن معاہدے کو نہ ماننا۔ یہاں مداخلت کاروں کے حق میں آجاتا ہے۔ اس لیے پاکستان تیار نہیں ہوا)۔

ہندوستان اور ہم

نیپ کا ہندوستان سے تعلق فطری تھا۔ ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے اور نیپ ایک سیکولر جمہوری پارٹی۔ نیپ ایک غیر جانبدار اور غیر منسلک خارجی سیاست کی حامی تھی اور ہندوستان تسلیم شدہ غیر جانبدار ملک تھا اور ہے۔ نیپ امریکا اور مغرب کے ساتھ تمام معاہدوں کے خلاف تھی اور ہندوستان بھی آزاد اور خودمختار سیاست پر کاربند تھا۔ نیپ تمام ترقی پسند اور سامراج دشمن ملکوں کے ساتھ دوستی کی قائل تھی اور ہندوستان اسی اصول پر عمل کررہا تھا۔ نیپ تمام پڑوسی ممالک بالخصوص ہندوستان سے دوستانہ تعلقات رکھنے پر زور دیتی تھی۔

ان سب کے علاوہ نیشنل عوامی پارٹی باچا خان یعنی سرحدی گاندھی کے بیٹے عبدالولی خان کی قیادت میں سرگرم تھی۔ پختونوں میں یہ پارٹی ایک لحاظ سے انڈین نیشنل کانگریس کا تسلسل تھی۔ باچا خان اور ولی خان کا ہندوستان کی تمام حکومتوں سے اور بالخصوص کانگریسی حکومتوں سے ذاتی اور گھریلو تعلقات تھے اور ہیں۔ ان کے درمیان ہمیشہ سے لین دین کی روایت نہ پہلے کوئی پوشیدہ بات تھی اور نہ اب ہے۔

تو ہم جو ہندوستان کے دوست تھے، اپنے مشترکہ دشمن پاکستان کے خلاف جنگ لڑ رہے تھے اور مشترکہ دوست افغانستان میں بیٹھے سرگرم تھے۔ اس لیے افغانستان کے بعد سب سے پہلے مدد کے لیے اپنا ہاتھ بغیر چھپائے ہندوستان کی طرف بڑھایا تھا اور ہندوستان نے بھی ہمیشہ کی طرح اپنے بازو ہمیں سمیٹنے کے لیے پھیلائے تھے۔

بڑے پیمانے کا لین دین اور مالی آمد ورفت اجمل خٹک کے ذریعے ہوتی تھی اور میں نے اس کی ٹوہ لینے کی کبھی کوشش نہیں کی کیونکہ: 'چیزے را کہ عیاں است چہ حاجت بہ بیان است' (جو چیز صاف ظاہر ہے اُسے بیان کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے)۔ البتہ ہمارے گھر کے خرچ کے لیے تیرہ ہزار افغانی کی ماہانہ مدد کی جاتی۔ ٹائپ، سائیکلوسٹائل، طباعت اور ڈاک کی مد میں بھی مدد کی جاتی تھی۔ ہمارے ساتھ سیاسی تبادلہ خیال کیا جاتا اور سوال جواب کے سلسلے میں مدد کرتے۔ اُس وقت بھارتی جاسوسی تنظیم 'را' (Research and Analysis Wing- RAW) کے نام سے تو کوئی واقف نہ تھا، لیکن اُن مخصوص نمائندوں سے جو ہندوستان کے سفارتخانے میں بطور سفارتی اہلکار

کام کیا کرتے تھے، ہمارا رابطہ رہتا۔

پہلے سفارت کار کا نام ایس ایل بھگا، تھا جب اُس کا تبادلہ ٹرینیڈاڈ ہوگیا تو اس کی جگہ ملہوترا آیا جو مشہور صحافی اندر ملہوترا کا بھائی تھا۔ اس کے بعد ایک اور آیا تھا جس کا نام میں بھول رہا ہوں۔ پھر ثور انقلاب اور روسیوں کی آمد کے بعد یہ سلسلہ بکھر گیا۔ اگرچہ میرے ساتھ ہندوستانیوں کے تعلقات آخر دم تک رہے، لیکن ہمیشہ سفیر کی حد تک۔ البتہ اجمل خٹک سے پرانا لین دین کا رابطہ بحال رہا۔ جو کچھ اس حوالے سے میری کاپیوں میں درج ہے اُسے یہاں نقل کرتا ہوں۔

26 جنوری 1975:

اجمل خٹک ہندوستان کے سفیر سے ملاقات کے لیے اُس کے گھر گئے۔

15 فروری:

میں بھگا سے ملنے سفارت خانے گیا۔ میں وہ خطوط ساتھ لے گیا جو اجمل خٹک نے اقوام متحدہ کے جنرل سیکرٹری کے نام لکھا تھا اور دوسرا خط آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر گامبریچ کے نام تھا، جس نے بھٹو پر انسانی حقوق کی پامالی اور بلوچستان میں لشکر کشی کو تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ اس کے ساتھ انقلابی جمہوری محاذ کے کمانڈر کی جانب سے لکھا گیا اعلان نامہ بھی لے گیا کہ اُسے سائیکلوسٹائل کر دیں۔ موصوف نے شام ساڑھے سات بجے آنے کا وعدہ کیا ہے۔

19 فروری:

بھگا کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ افغان حکومت اپنے ارادوں اور وعدوں میں سچی نہیں۔ ہوسکتا ہے کچھ اور شک ہو، کیونکہ اس نے بتایا:

- افغانستان میں مظاہرے نہیں روکنے چاہیے تھے۔ لوگوں کو موقع دینا چاہیے تھا کہ پاکستان کے خلاف اپنی نفرت ظاہر کریں۔
- یہ افغانی اپنی جنگ لڑنے کی سکت نہیں رکھتے، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ جو تھوڑی بہت مدد کر رہے ہیں یہ بھی بند کر دیں۔
- یہ جو کچھ پاکستان میں کرتے ہیں، اُس کی تردید کرتے ہیں۔
- ایران انہیں غیر جانبدار بنانے کی کوشش کر رہا ہے، وہاں ان کی آمد و رفت مشکوک حد تک

بڑھ گئی ہے۔
- تحریک ایسے نہیں چلتی، جیسے یہ چلا رہے ہیں۔
- ہوسکتا ہے، بھٹو کو امریکا نے کوئی اشارہ کیا ہو، جس نے ایسا قدم اٹھایا ہے۔
- روسی نہیں چاہتے، کہ یہاں کوئی گڑبڑ ہو، انہیں مشورہ دیا گیا ہے کہ تحمل سے کام لیں۔
- خطرہ ہے کہ جنگ کی صورت میں افغانستان کے قبائل بھی پاکستان کا ساتھ دیں گے۔
- تم لوگوں کا کوئی سیاسی فورم نہیں ہے، کہ افغانستان پر دباؤ ڈال سکے۔ کل افغانستان اپنے اقدامات سے پھر سکتا ہے اور تمہاری امداد بند کرسکتا ہے۔ پھر دنیا کو کہہ سکتا ہے، کہ بلوچ اور پختون یہ سب کارروائیاں کر رہے تھے اور اب نہیں کر رہے، پہلے ہمارا ہاتھ تھا اور نہ اب ہے۔
- افغانستان کا موقف تبدیل ہوگیا ہے، پہلے کہا کرتا تھا کہ پختونستان ہماری زمین ہے اور ڈیورنڈ لائن بے انصافی پر مبنی سرحد ہے، جمہوریہ کے اولین دنوں میں یہی موقف تھا، اب کہتے ہیں یہ بلوچ اور پختون لیڈرز کا اپنا عمل ہے۔ اگر ان سے مذاکرات کیے جائیں اور انہیں منا لیا جائے تو افغانستان کو قبول ہوگا۔ دوسرا، افغانستان اب پختونستان کے بارے میں یہ موقف رکھتا ہے کہ وہاں حق خودارادیت کی بنیاد پر ریفرنڈم کرا دیا جائے۔
- بھگا صاحب کا کہنا ہے کہ اب وہاں نیپ کے لوگوں کی نمائندگی نہیں اور تازہ انتخابات میں ہوسکتا ہے کہ بھٹو اپنے لوگوں کو منتخب کرالے اور ان کی مرضی اور رضا سے یہ اعلان کرے کہ ہم نے بلوچ اور پختون نمائندوں سے مفاہمت کرلی ہے اور وہ افغانستان کا موقف رد کرتے ہیں۔
- دوسری بات یہ کہ ریفرنڈم کے موقع پر پختون افغانستان کے ساتھ شامل نہیں ہونگے۔ ہوسکتا ہے وہ آزاد پختونستان کا مطالبہ کریں یا پاکستان کے ساتھ ہی رہنے کا فیصلہ کرلیں۔ اس بارے میں افغانستان کا موقف بہت کمزور معلوم ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ یہ نیچے کے علاقوں کے پختونوں سے ڈرتے ہیں، کیونکہ وہ ترقی یافتہ ہیں اور ان کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔
- افغانستان پختونوں کی حمایت افغانستان کی قیمت پر نہیں کرسکتا۔ اگر افغانستان کے وجود کو خطرہ پیش ہوا تو وہ بہ آسانی اپنے موقف سے پیچھے ہٹ سکتا ہے۔

ہندوستانی دوست کی باتوں سے بہت سارے اندیشے ظاہر ہوتے ہیں، جیسے:

- ہندوستان کو تشویش ہے اور وہ چاہتا ہے کہ افغانستان تیزی دکھائے اور انقلابی اقدامات کرے، کیونکہ یہی وقت ہے۔
- ہمارے ذہنوں میں شکوک بونا چاہتے ہیں، کیونکہ ہندوستان کبھی برداشت نہیں کرے گا کہ بلوچستان اور پختونستان ہندوستان سے الگ آزاد حیثیت رکھیں۔ تو چاہتے ہیں کہ ہمیں مایوس کر کے ہمیں ہندوستانی موقف پر سوچنے پر مجبور کریں۔
- یا پھر یوں ہے کہ ہندوستان کو واقعی ہمارا غم ہے اور محسوس کرتا ہے کہ افغانستان غلط راستے پر روانہ ہے۔ افغانستان کا موقف اور عمل درست نہیں، بلکہ دھوکا دے رہا ہے اور معروضی طور پر وہ سب کچھ نہیں کر سکتا، جس چیز کا وہ دعویٰ کر رہے ہیں، اُن کا عمل بالکل برعکس ہے۔ اور ان کا پختونستان محض وزارت خارجہ کے بیانات تک محدود ہے۔

12 مارچ:

بھگا صاحب گھر آئے۔ طے شدہ وظیفہ دیا۔ وہ خط جو امریکا کے سفارتخانے کے سیاسی قونصلر کی جانب سے اجمل خٹک کے لیے آیا تھا اور ملاقات کے لیے آمادگی ظاہر کی گئی ہے، انہیں دکھایا گیا۔ موصوف کی رائے یہ ہے کہ جب اجمل خٹک نے امریکا کے سفارتخانے کے ناظم الامور سے ملاقات کی تو انہوں نے اس ملاقات کو سرسری اور غیر سنجیدہ لیا۔ لیکن جب اس ملاقات کی اطلاع سی آئی اے کو پہنچی ہوگی، تو ان کے لیے یہ اہم ہے کہ تحریک سے رابطہ رکھیں، اس لیے یہ خط لکھا گیا کہ وہ ہر وقت ملاقات کے لیے تیار ہیں۔

18 مارچ:

شیرپاؤ کے قتل کے حوالے سے ہم نے ایک پمفلٹ پختون سٹوڈنٹس فیڈریشن کی جانب سے تیار کیا ہے جس کا عنوان ہے، 'سیاسی قاتل کون؟' یہ سائیکلوسٹائل کے لیے ہندوستان کے سفارتخانے لے گیا اور 23 مارچ کو دو ہزار کے قریب سائیکلوسٹائل کیا ہوا واپس لایا۔ میکروریان کو لے گیا، تاکہ پشاور کو بھجوا سکیں۔ اس پمفلٹ کے ذریعے ہم نے حیات شیرپاؤ کے قتل کا ذمہ دار بھٹو کو ٹھہرایا۔

4 اپریل:

آج امریکی کانگریس کے زعماء کے نام اجمل خٹک کا لکھا ہوا خط ٹائپ کیا۔ پورے سات

گھنٹے لگے ٹائپ کرنے میں۔

7 اپریل:

غٹ (ہندوستانی رابطہ کار) سے ملاقات ہوئی۔ گپ شپ ہوئی اور اپنا وظیفہ اس سے وصول کیا۔

13 اپریل:

جو کتاب (کتابچہ) ہم نے ڈاکٹر خورشید عالم کے ذریعے انگلستان میں شائع کی ہے، وہ آج ہندوستانی دوستوں کے ذریعے بھجوائی گئی۔ کتاب انگریزی زبان میں ہے اور عنوان 'گولی کا جواب گولی' ہے، اس کے اسّی نسخے بھگا صاحب سے وصول کیے۔ ہندوستانی سفارتخانے کے پریس اتاشی 'بدھ راج' کو اجمل خٹک کا وہ خط یو این آئی کو بھیجنے کے لیے دے دیا، جو اقوام متحدہ کے نام لکھا گیا ہے۔ اُسی وقت سفارتی ڈاک میں بند کر دیا گیا۔ اس خط کی 290 سائیکلوسٹائل نقول افغان وزارت خارجہ نے تیار کیں تھیں اور پھر اجمل خٹک نے ان پر دستخط کیے تھے۔

[غٹ کے ساتھ میری ملاقات مہینے میں دو، تین یا چار مرتبہ ہوتی۔ کبھی کبھی وہ خود گھر آجایا کرتا تھا اور اجمل خٹک سے براہ راست ملاقات کرتا تھا۔ سب میں درج نہیں کر سکا اور جو کچھ درج تھا، اُس میں سے بھی کچھ حصہ گم ہو چکا ہے۔]

28 جون:

ہندوستان میں ہنگامے ہیں اور وزیراعظم اندرا گاندھی نے ایمرجنسی نافذ کر دی ہے۔ میں سفارت خانے گیا تاکہ ہمدردی کا اظہار اور اپنی طرف سے اظہار افسوس کر سکوں۔

30 جون:

سید مختار باچا نے ولی خان کا حلفیہ بیان اور اپنا پمفلٹ 'مزدور کسان کا چہرہ' (مزدور کسان پارٹی) بھجوایا ہے۔ حلفیہ بیان کی چند نقول جلد ٹائپ کرنے کے لیے ہندوستانی دوست کے پاس لے گیا، کہ یہ کام جلد ہو سکے۔

21 جولائی:

آج مجھے فون کیا۔ وہاں پہنچا تو اپنے سفیر کے گھر میں منعقد ہونے والی ہندوستانی فنکاروں، سازندوں اور گلوکاروں کی محفل میں شرکت کے لیے دعوت نامہ دیا۔ میں نے انہیں غوث بخش بزنجو

اور جام ساقی کی طرف سے عدالت کے لیے لکھے گئے حلفیہ بیانات کی نقول دے دیں۔

یکم اگست:

بھگا صاحب کا تبادلہ ہوگیا ہے، وہ ٹرینیڈاڈ جا رہے ہیں۔ اُن کی جگہ ملہوترہ آیا ہے، دونوں ہمارے گھر آئے۔ کھانا ہمارے ساتھ کھایا اور گپ شپ کی۔

7 اگست:

بھگا اور ملہوترہ دونوں گھر آئے، کھانا کھایا اور گپ شپ کی۔ یہ جب بھی ہمارے گھر آتے تو دار جیلنگ کی پیک چائے اور اشیائے خورد ونوش بھی ساتھ لاتے۔

15 اگست:

فوج اور پولیس کی مدد سے شیخ مجیب کے خلاف ایک رجعت پرستانہ کودتا کامیاب ہوگئی۔ اس سے ہمیں بہت افسوس ہوا۔ شیخ مجیب الرحمٰن اور وزیر اعظم منصور علی خان دونوں بمعہ خاندان کے مارے گئے۔ خوندکر مشتاق احمد صدر نامزد کیے گئے ہیں اور اُنہوں نے دس رکنی کابینہ تشکیل دی ہے۔

16 اگست:

غٹ کے پاس گیا اور شاہ محمد شاہ کی آمد کی اطلاع دی۔ اس کے علاوہ شیخ مجیب کی موت پر گفتگو ہوئی اور اظہار افسوس کیا۔ شیخ مجیب کو ضلع فرید کوٹ میں مٹی کے سپرد کر دیا گیا۔ رات ہندوستان نے مرحوم کی موت پر گہرے افسوس کا اظہار کیا اور مرحوم کو اس دور کی بڑی شخصیات میں سے شمار کیا۔ ہندوستان موجوہ حالات کو بنگلہ دیش کا اندرونی معاملہ قرار دیتا ہے اور کہا ہے کہ ہندوستان ایک پڑوسی ملک کی سیاسی تبدیلیوں سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ ہندوستان کی وزارت خارجہ کے ترجمان نے اضافہ کیا کہ ہم برصغیر کے تمام عوام کے ساتھ قریبی تعلق رکھتے ہیں۔

18 اگست:

غٹ گھر آیا اور اجمل خٹک سے اکیلے میں بات کی۔

26 اگست:

غٹ سے انگریزی کتابچے Bangladesh in Sindh (سندھ میں بنگلہ دیش) کی

سائکلو سٹائل وصول کیں، یہ کتابچہ جیسے سندھ والوں نے لکھا ہے۔

7 ستمبر:

غٹ کے پاس گیا، کل آنے کا وعدہ کیا ہے۔

9 ستمبر:

غٹ گھر آیا، اجمل خٹک سے پختونستان کے دن کا اعلامیہ اور پرچم اور خلق کے ابلاغیے مانگے۔

8 نومبر:

باچا خان کی رہائی اور کسی اور ملک میں علاج کی اجازت کے لیے اجمل خٹک کی طرف سے ایک اپیل تیار کی گئی اور اس کا ترجمہ کرنے کے بعد ٹائپ کیا۔ ارادہ یہ ہے کہ اسے بڑی تعداد میں اردو، پشتو اور انگریزی میں شائع کیا جائے۔ اپنے صوبے، بلوچستان اور پوری دنیا میں پھیلائیں۔ اس بنیاد پر ایک عالمی تحرک پیدا کریں گے، چندہ جمع کریں گے، عوام کی توجہ مبذول کرائیں گے اور پاکستان پر دباؤ ڈالیں گے۔

9 نومبر:

وہی اپیل افغان وزارت خارجہ کے سیاسی امور کے نائب وزیر، وحید عبداللہ کے پاس لے گیا۔ ہندوستانی دوست نے فون کیا۔ ایک نقل انہیں بھی دی۔ اس نے بتایا کہ اندرا گاندھی کا خصوصی نمائندہ محمد یونس آیا ہوا ہے۔ وہ چاہتا ہے اجمل خٹک سے ملاقات ہو۔ [اس کے بعد یونس جان خفیہ طور پر جلال آباد پہنچا اور وہاں کمانڈر ہدایت اللہ سے ملاقات کی اور پیش کش کی کہ ہندوستان اس کے لیے تیار ہے، کہ وہ اسلحہ جو بنگلہ دیش کی لڑائی میں پاکستانی فوج سے پکڑا تھا، وہ پختون زلمے کو دے دیا جائے۔ لیکن افغانستان کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ اجازت نہیں دے رہا، جبکہ افغانستان کی اجازت اور مدد کے بغیر کسی اور راستے پختون زلمے یہ اسلحہ پاکستان میں محفوظ نہیں رکھ سکتے تھے۔]

18 نومبر:

انسانی ضمیر کے نام لکھی گئی اپیل افغان وزارت خارجہ نے سائکلو سٹائل کر دی۔ بڑی تعداد

میں ہندوستان کو بھجوادی۔

10 فروری 1977:

باز (ولی خان) کے خط کا ترجمہ غث کو اطلاع کی غرض سے دیا۔ (یہ بہت اہم خط تھا لیکن اس کا متن میں درج نہ کر سکا۔ اس وقت فوٹو کاپی مشین نہیں ہوا کرتی تھی۔)

یہاں تک میں نے اپنی معلومات درج کیں۔ تاہم اس میں کئی اہم چیزیں مجھ سے چھوٹ گئیں۔ اس تاریخ کے بعد کے اندراجات مجھ سے گم ہو گئے ہیں۔ البتہ اپنے ملنے ملانے اور لینے دینے کا سلسلہ جاری رہا۔ میرا گمان ہے کہ ہمارے چینل کے علاوہ بھی یہ بلوچوں سے الگ سے ملتے تھے اور ان سے ملنے جلنے اور دینے دلانے کا الگ ذریعے بھی رکھتے تھے۔ پھر بلوچ بھی اتنے سادہ نہ تھے کہ سارے انڈے ایک ہی ٹوکری میں رکھتے، البتہ انہوں نے ہم پر تکیہ کیا ہوا تھا۔

یہ بات بھی یاد رکھے جانے کے قابل ہے کہ ہمارے ہیڈ کوارٹر کی تمام خفیہ خط و کتابت نسیم بی بی اور ولی خان سے اُن خفیہ قلموں کے ذریعے ممکن تھی جو ہندوستانی دوست ہمیں مہیا کرتے تھے۔ یعنی پہلے ہم خط اس مخصوص قلم سے لکھتے اور اس کا متن خفیہ رہتا، اور پھر اس کاغذ پر ہم عام سی تحریر درج کرتے جیسے تمہارا بھیجا ہوا گڑ مل گیا ہے، اور گڑ تب بھیجنا جب ہم تقاضا کریں وغیرہ۔ ایسے خطوط پر نہ خط لکھنے والے کا نام ہوتا نہ وصول کرنے والے کا۔ جبکہ دوسری طرف مخصوص قلم سے لکھا گیا خط ہوتا جو نظر نہ آتا۔ یوں اگر یہ خط پکڑے بھی جاتے تو لے جانے والے اور پکڑنے والے دونوں کو اصل حقیقت کا ادراک نہ ہوتا۔

پختون زلمے کی تربیت اور ہم

صدر داؤد کی فوج میں دو پرچمی افسر، جو اُس وقت میجر تھے، پختون زلمے کی عسکری تربیت کے لیے مخصوص کیے گئے تھے۔ یہ کمانڈر رضا مجید کے ماتحت تھے اور اس لحاظ سے ارگ (صدارتی محل) میں جمہوری گارڈ سے مربوط تھے۔ ایک کا نام گل آقا تھا، جو ثور کے انقلاب اور خاص کر سوویت فوجوں کی آمد کے بعد ببرک کارمل کا معاون تھا، یعنی انقلابی شوریٰ کا نائب صدر رہا۔ جبکہ دوسرا ہدایت اللہ تھا، جو ثور کے انقلاب کے وقت جلال آباد کے کورپ (Corp) میں تھا اور حفیظ اللہ امین کے خلاف شورش میں 'خلقیوں' نے اسے مار ڈالا۔

میں، افراسیاب، سید مختار باچہ، میاں شاہین شاہ اور شیر محمد، سب کے سب گل آقا سے نظری اور عملی تربیت حاصل کرنے کے لیے چنے گئے تھے۔ 6 مئی 1975 کو ہماری تربیت کا آغاز ہوا۔ اس دن صرف گوریلا اور پاٹیزن جنگ کے نظریاتی اور نظری پہلوؤں پر درس دیا گیا۔ 7 مئی کو کابل سے باہر چہار آسیاب کے پہاڑوں کے درمیان بیچ میدان کو گئے۔ میں کافی دن بعد پہاڑ پر چڑھا تھا اس لیے دل خراب ہوا اور میں نے الٹیاں کیں۔ باقی دوستوں کی حالت بھی پتلی تھی۔ اُس دن صرف دھماکہ خیز مواد سے دھماکے کرنا سیکھے۔ پھر جلد سلگنے والے تار کے ذریعے الگ الگ دھماکے کیے۔ تین بجے عملی تربیت ختم ہوئی اور اس کے بعد افغانستان کی تاریخ کے ساتھ ساتھ نظریاتی تعلیم دی گئی۔ 9 مئی کو جمعہ کا دن تھا، اس لیے چھٹی تھی۔ دس مئی کو بجلی کے ذریعے دھماکہ کرنے کی تربیت مکمل ہوئی۔ تھری ناٹ تھری رائفل اور نئی آئی ہوئی کلاشنکوف سے نشانہ لگانے کی مشق کرائی گئی۔

11 اور 12 مئی کو ہینڈ گرنیڈ پھینکنے، راکٹ چلانے، میزائل چلانے اور مارٹر گولہ چلانے کا طریقہ سکھایا گیا۔ ٹائمر اور پٹرول کے ذریعے دھماکے کرنے اور آگ لگانے کے طریقے سیکھ لیے۔

13 مئی کو عملی تربیت ختم ہوئی اور آخر تک نظریاتی تربیت بھی چلتی رہی۔

پختونوں اور بلوچوں کے ریڈیو پروگرام

بشیر مٹہ، نثار مظلوم، اور سیف الرحمٰن سلیم

ریڈیو افغانستان کابل سے ہر روز مغرب اور عشا کے درمیان ایک گھنٹے کا پختونستان کا پروگرام نشر ہوتا تھا۔ پختونستان پروگرام نے اگست 1949ء میں کابل کی طرف سے شروع کی گئی پختونستان تحریک سے جنم لیا تھا۔ پختونستان تحریک نے 22 جون 1947ء کو کانگریس۔ خدائی خدمتگار کی طرف سے پیش کی گئی 'بنوں قرارداد' اور اس کے بعد جولائی 1947ء میں ریفرنڈم کے بائیکاٹ سے اثر لیا تھا۔ جب جولائی 1973ء میں محمد داؤد خان نے بادشاہت ختم کر کے اقتدار پر قبضہ کیا تو اس نے نیپ کی پختون بلوچ مشترکہ سیاست کی پیروی میں یوم پختونستان کو یوم پختون بلوچ اور پختونستان کے ریڈیو پروگرام کو پختون اور بلوچ پروگرام میں تبدیل کر دیا۔ پروگرام چلانے کے لیے تجربہ کار اور لائق لوگ مقرر کیے گئے۔ امور قبائل کی مستقل ریاست (ڈائریکٹریٹ) کو 'وزارت سرحدات' کا درجہ دیا۔

بشیر مٹہ

بشیر مٹہ ملیشیا میں پاکستانی سفارتخانے میں سیکنڈ سیکرٹری کے طور پر خدمات انجام دے رہے تھے۔ جب بلوچستان اور پختونخوا میں نیپ کی جنگی سرگرمیاں شروع ہوئیں تو افغانستان پاکستان کے تعلقات بگڑ گئے تھے۔ اگرچہ بشیر مٹہ کا خاندان مسلم لیگی تھا، لیکن اس کے پختون مزاج میں تلخی آئی اور بھٹو کے پختون مخالف اقدامات کو برداشت نہ کر سکے۔ استعفیٰ دیا اور افغانستان سے سیاسی پناہ مانگ لی۔ ایک سفارت کار ہونے کی وجہ سے افغانستان نے اس کی پذیرائی کی، عزت واحترام سے پیش آئے اور میکروریان میں اسے ایک بڑا گھر دیا اور ہماری تحریک کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ اس کے حوالے پختونوں اور بلوچوں کے پروگراموں میں پاکستان کے خلاف لکھنے کا کام سپرد ہوا۔

بشیر کے دو بیٹے تھے، عمران اور بختیار، جنہیں میں پیار سے روسی زبان میں 'تواریش' (ساتھی) اور 'گاسپادین' (مسٹر) کہا کرتا تھا۔ بشیر تعلیم یافتہ تھا، پروگرام چلانے اور لکھنے میں ماہر تھا۔ لیکن افغانستان کے ماحول سے ناآشنا تھا۔ اسے یہ علم نہ تھا کہ افغانستان نہ پختون ریاست

ہے اور نہ کبھی بن سکے گی۔ اگرچہ وہی اس کے بانی اور نام بھی انہی سے منسوب ہے۔ دوسرے افغانستان اور خاص طور پر کابل کا ماحول وسیع النظر نہ تھا۔ اس لیے زود رنج بشیر بہت جلد روٹھ جاتا تھا اور اس کی پریشانیاں دور کرنے کے لیے ہمیشہ میں اور اجمل خٹک اُس کے گھر کی طرف جا رہے ہوتے۔ اس کی ناراضی کی وجوہات کئی ہوتیں تھیں، کچھ ذاتی اور اکثر سیاسی۔ نمونے کے طور پر چند یادداشتیں درج کرتا ہوں:

30 جولائی 1975:

شام بشیر صاحب کے ساتھ نشست۔ بے چارہ مایوس ہے۔ نچلے علاقے کے عوام سے بھی اور یہاں کے حالات سے بھی۔ کہہ رہا تھا کہ:

- اسلم خٹک لاہور میں اردو بولتا ہے اور فیض محمد خان محسود کابل میں فارسی، تو فرق کیا ہوا؟ ہمارے لیے تو ہندوستان اور ایران دونوں ایک بات ہیں۔
- آئین بن رہا ہے، اس کا کہنا ہے کہ اجمل خٹک افغانوں کو کہیں کہ آئین ایسا بنے کہ اُس میں پختونوں کا تسلط یقینی بنایا جائے۔ بجائے ایک کابل کے کابلی کے، قبائل سے کسی کو وزیر بنایا جائے
- گولیوں اور دھماکوں سے کچھ نہیں ہوتا۔ شیر پاؤ ہو یا کوئی اور، مرتا پختون ہے اور پنجابی خوش ہوتے ہیں۔ ایک بنیادی سکیم بنانے کی ضرورت ہے۔
- ہر ایک کے ساتھ اثبات میں سر ہلانے کی ضرورت نہیں۔ اچھا یہ ہے کہ آپس میں بیٹھ کر صاف صاف باتیں اور بحث کریں۔
- اجمل بجائے اس کے کہ وزراء کے ساتھ اپنا وقت ضائع کرے، پختون جرگوں سے ملاقاتوں میں اپنا وقت صرف کرے۔
- یہاں ہم مہمان نہیں ہیں۔ یہ ایرانیوں کا وطن نہیں اور نہ اس کے امور میں شریک ہونا بے جا مداخلت میں آتا ہے۔ ہمیں ساری توجہ پختونوں کو دینی چاہیے۔
- اگر ہم یہاں بیٹھے ہیں تو یہ فارسی بولنے والوں کا احسان نہیں، ہم یہاں پختونوں کی برکت سے بیٹھے ہیں۔

- پختونوں میں کوئی ترقی پسند اور رجعت پسند نہیں۔ پہلے تمام پختونوں کو اکٹھا کرنا ضروری ہے، چاہے فاشسٹ ہوں یا کمیونسٹ۔ جرمن قوم کا بندہ چاہے فاشسٹ ہو، کمیونسٹ ہو، یا جمہوریت پسند لیکن اپنے وطن، مٹی اور قوم کی شناخت رکھتا ہے۔ اس طرح چینی اور سوویت یونین اگرچہ کمیونسٹ ہے، لیکن اپنے مفادات کے لیے ریاست کو ختم کرنے کے بجائے مضبوط کرلیا ہے۔
- یہاں سب لوگ جاہل ہیں۔ روسی زبان میں دو کتابیں پڑھ کر ترقی پسندی اور رجعت پرستی کے کلمے دھراتے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں تاجکستان اور تاشقند میں اتنی ترقی ہوئی۔ ہمیں کیا؟ ہمیں اپنے پختونوں کو اکٹھا کرنا اور انہیں ترقی دینی ہے، چاہے یہ جیسے بھی ممکن ہو۔ ہمیں باقی دنیا سے کیا غرض؟

موصوف یہ سب باتیں اتنی سنجیدگی اور تازہ کاری کے ساتھ کرتے ہیں کہ کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ یا تو پاگل ہو جائے گا ورنہ مایوس ہو کر بھاگ جائے گا۔ جشن کے بعد تو بہت مایوس تھا۔ کہہ رہا تھا، فیض محمد خان کے ساتھ جشن کو گیا، وہ سب سے فارسی میں باتیں کر رہا تھا۔ سارے فارسی بولنے والے کیمپوں میں تھے، لیکن ایک خالص پشتو بولنے والے کی جگہ نہ تھی۔ ان سب باتوں کا اس کے دل پر اتنا اثر ہوا ہے کہ آگے خدا خیر ہی کرے۔

نثار مظلوم:

یہ بھی ان شخصیات میں سے ہیں، جنہوں نے شوق کی آواز پر زندہ باد کہا۔ یعنی میاں افسر شاہ اور اشرف مفتون کے ساتھ ریڈیو پاکستان میں اچھی نوکری پر ملازم تھا، لیکن نوکری چھوڑ چھاڑ کر انقلاب کے ساتھ مل گیا، کابل آیا اور پیچھے بال بچے بھی یہیں آگئے۔ وہ بھی بشیر کی طرح زود رنج تھا، لیکن اُس کے مقابلے میں قافیہ فراخ تھا اور بہت سے لوگوں سے آزادانہ دوستی کی وجہ سے تعلق پیدا کرلیا تھا۔ اچھی طرح افغان معاشرے میں گھل مل گیا تھا۔ چونکہ اصل میں ریڈیو کا بندہ تھا، اس لیے لکھنے اور تبصرہ کرنے میں ماہر تھا، لیکن حکومت کی جانب سے جتنی عزت بشیر صاحب کو دی جاتی تھی، یہ بے چارہ اس درجے پر نہ تھا۔ ایک عام سے دو کمروں کے اپارٹمنٹ میں زندگی گزار رہا تھا۔ تعلق بھی خان اور امیر گھرانے سے نہ تھا۔ افغانستان روایتی طور پر خانوں اور ملکوں کا ملک رہا

ہے اس لیے یہاں امیر گھرانوں کی عزت زیادہ کی جاتی ہے۔ ہماری تحریک پر بھی خانوں اور ملکوں کا اثر تھا۔

مظلوم صاحب بہت جلد روٹھ گئے اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، بشیر صاحب سے بھی پہلے پاکستان واپس چلے گئے۔ پارٹی نے قبول نہ کیا، اس لیے آزاد راستہ چنا۔ تاہم افضل خان لالہ سے آخری وقت تک تعلق برقرار رہا۔

سیف الرحمٰن سلیم:

یہ حضرت اولسی ادبی جرگہ کے وقت سے ترقی پسند ادب سے جڑے ہوئے تھے۔ اجمل خٹک سے دوستی تھی۔ قوم داؤدزئی سے تعلق رکھتا تھا اور ادیبوں شاعروں کی محفل میں اچھی شہرت کا حامل تھا۔ نازک مزاج عشقیہ اور رزمیہ شاعری کیا کرتا تھا۔ یہ بھی آخر آخر میں کچھ عرصے کے لیے کابل آیا، لیکن یہ اچھا ہوا کہ زیادہ عرصہ یہاں نہ رہا۔ اُس نے عقل سے کام لیا، ورنہ اس کا حال بھی برا ہوتا۔

چند اور متفرق باتیں:

تورلالی

تورلالی کا تعلق باجوڑ سے تھا۔ باجوڑ میں غلجی قبیلے سے تھا۔ بہت غریب تھا، اس لیے چارسدہ کے سرڈھیری میں محنت مزدوری کیا کرتا تھا۔ کبھی گڑ بیچتا، کبھی چائے کی دوکان کرتا۔ نیپ سے تعلق تھا اور ایک عام کارکن تھا۔ جب اجمل خٹک کابل آرہے تھے تو باجوڑ کے راستے میں اسے بدرگہ کے طور پر ہمراہ کیا۔ جب دوسری طرف پہنچا تو جو عزت اجمل خٹک کی ہوئی، وہ اس کی بھی ہوئی۔ اس لیے وہیں رہ گیا۔ افغانستان میں اجمل خٹک کی بہت عزت تھی اور جب 17 جولائی 1973ء میں صدر داؤد برسراقتدار آیا تو یہ عزت کئی گنا بڑھ گئی۔ بنگلہ نما ایک بڑا جدید گھر، باورچی، نوکر اور گھر کی حفاظت کے لیے پولیس گارڈ۔ پھر اس گھر میں وزراء آتے رہتے، حکومت کے بلند رتبہ شخصیات اور افسران آتے۔ سیاسی لیڈر، خان، ملک آتے جاتے۔ وہ سب تورلالی سے بہت محبت اور احترام کا برتاؤ کرتے۔

یہ سب کچھ تورلالی کے لیے بالکل نئی چیزیں تھیں۔ نیا تو شائد اجمل خٹک کے لیے بھی تھا، لیکن وہ لیڈر تھے اور ان کا ظرف بڑا تھا۔ لیکن تورلالی جیسے غیر تعلیم یافتہ اور سادہ انسان کے لیے یہ سب شان و شوکت ہضم کرنا بہت مشکل ہوگیا تھا۔ بس وہ اسی کا ہوکر رہ گیا۔ پھر رہی سہی کسر اس نے پوری کردی کہ آنے والے بلند رتبہ لوگ اس کی بات توجہ سے سنتے اور اگرچہ یہ باتیں منطق اور سمجھ سے آزاد تھیں، لیکن ان سب کا تورلالی کی نفسیات پر بہت منفی اثر ہوا۔ اس کے علاوہ وہ اجمل خٹک کے گھر میں سیاہ وسفید کا مالک تسلیم کرلیا گیا۔ حتیٰ کہ اجمل خٹک اسے روسی دوستوں اور صدر داؤد سے خفیہ ملاقاتوں تک میں ساتھ رکھتے اور یوں وہ ایک طرف سے اجمل خٹک کا 'آلٹر ایگو' ہوگیا۔ وہ اس کا ذکر اور اس کی باتیں بڑے لوگوں کے سامنے تعریف آمیز کلمات سے دہراتے۔ اگرچہ تورلالی بنیادی طور پر شریف، ایماندار، محبت والا اور خدمت گزار تھا لیکن اس میں چند منفی عادتیں بھی جڑ پکڑتی گئیں جو بعد میں خود اجمل خٹک کے لیے بھی تکلیف کا باعث تھیں۔ اس سے آگے میں اپنا تبصرہ روکتا ہوں اور جو کچھ اُس کے بارے میں یادداشتوں میں درج ہے وہ

پیش کرتا ہوں:

15 جولائی 1975:

آج تورلالی ناراض تھا۔ یوں تو اس کی ناراضگی کے کئی اسباب ہیں، جس میں نفسیاتی، تربیتی، فکری اور اجتماعی عوامل شامل ہیں، لیکن یہ تو علمی تجزیہ ہوا۔ جس پر طویل بحث اور تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ناراضی کی فوری وجہ یہ ہے کہ جشنِ جمہوریہ کے لیے تین طرح کے کارڈ تقسیم کیے گئے ہیں۔ وی آئی پی کے لیے A کارڈ، متوسط درجے کے لیے B اور باقی عام افراد کے لیے C کارڈ آئے ہیں، تو یہ اپنے آپ کو A کارڈ کا حقدار سمجھتا ہے۔ ہمارے گھر میں A کارڈ صرف اجمل خٹک کے لیے آیا ہے۔ بلوچوں میں مہر اللہ مینگل، گوہر خان زرکزئی، خیر جان، مراد بزنجو، مراد بخش مری اور میر اکرم خان کو یہ کارڈ دیا گیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ لوگ مجھ سے کس لحاظ سے بہتر ہیں؟ قربانی کی بنیاد پر؟ تو وہ تو میں نے ہر ایک سے زیادہ دی ہے۔

دوسری ناراضی اس کے لاشعور میں جاگزیں ہے اور کبھی کبھی اس کا اظہار بھی کرتا ہے، وہ یہ ہے کہ مہمند قبیلہ کے امور منشی سحر گل کے حوالہ کیے گئے ہیں، آفریدی قبیلہ کے امور حاجی نادر خان زخہ خیل کے حوالہ ہیں، اسی طرح جانے کس قانون کے تحت ہدایت اور اعظم کو سیکٹر انچارج بنایا گیا ہے۔ میرا تعلق باجوڑ سے ہے، گھر میرا تباہ کیا گیا تو باجوڑ میرے حوالے کیوں نہیں کیا جاتا، اور باجوڑ سے متعلق امور میں مجھ سے مشورہ کیوں نہیں لیا جاتا؟

یہ تو وہ سب باتیں ہیں جو یہ سادہ لوح کیا کرتا ہے۔ لیکن ہمارے پاس اسے خوش رکھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اچھا ہوا کہ رئیس بودجہ (بجٹ ڈائریکٹر) ڈاکٹر محراب الدین پکتیاوال نے اس کی منت سماجت کی اور یہ خوش ہوگیا۔ سب اس کے ناز اٹھاتے ہیں۔ یہ بے چارہ اپنی عزت بڑھانا چاہتا ہے۔ یہ خواہش رکھتا ہے کہ اس کی منت سماجت کی جائے، اس کی قدر و قیمت پیدا ہو۔ میرے خیال میں دل میں قطعاً تیار نہیں کہ استعفیٰ دے، یوں ہی ناز نخرے اٹھوانا چاہتا ہے۔

7 ستمبر 1975

آج تورلالی نے اپنی مونچھیں صاف کردیں۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ چند دن پہلے افواہ پھیلی کہ اس کے بھانجے رشید کو حکومت نے گرفتار کیا، لیکن پھر سودا بازی کے تحت رہا کردیا۔ اسے یہ

اطلاع ہدایت باچا کے ذریعے موصول ہوئی تھی۔ ننگرہار کے گورنر اور سارے کیمپ میں بھی یہ اطلاع پھیلی، جو تورلالی کے لیے ندامت اور شرمندگی کا باعث بنی۔ لیکن کل یا آج کوئی یہ اطلاع لے کر آیا کہ رشید بے چارہ ابھی قید ہے اور دن رات تشدد سہہ رہا ہے۔ اس بات نے تورلالی کو رنجیدہ اور مغلوب الغضب بنا دیا۔ اسے غصہ تھا کہ جان بوجھ کر ہدایت مجھے بدنام کر رہا ہے اور اجمل خٹک حقیقت معلوم ہونے کے بعد بھی اُس کی سرزنش نہیں کر رہے، کہ ایسے جھوٹے اور گھٹیا پروپیگنڈا کیوں کر رہے ہو؟ اور کسی پر تو بس نہیں چلتا تھا، اس لیے اپنے غصے، احتجاج اور ناراضی کے اظہار کے لیے اپنی مونچھیں صاف کر لیں۔ [رشید اکثر اپنے ماموں کے پاس کابل آتا اور مہینوں پڑا رہتا، ایک مرتبہ تو پورا سال بھی مقیم رہا تھا]

26 جولائی 1975:

آج رات تورلالی اوپر میرے کمرے آیا، کہنے لگا مجھے اس حساب کتاب کے جھنجھٹ سے چھڑاؤ۔ یہ میرے حساب کتاب کی کاپیاں تم سنبھال لو، بے چارہ غلط بھی نہیں کہہ رہا۔ یہ ایک جذبے کے تحت یہاں اجمل خٹک کے ساتھ آیا تھا، حالات نے مجبور کیا تو ٹھہر گیا۔ بال بچے وہاں رہ گئے اور یہ یہاں ہے۔ اتنے عرصے میں اس نے کوئی بے ایمانی نہیں کی، بس یہ خرابی ہے کہ لوگوں کے سامنے غیر ضروری حد تک اپنی عزت چاہتا ہے۔ گلے میں پستول کا قاش ڈالے، پستول لٹکائے پھرتا ہے اور لوگوں پر رعب داب گانٹھتا ہے۔ لیکن اگر اس کے کام، محنت اور مشکلات کو دیکھا جائے تو اس سے کئی گنا زیادہ گناہ اور خرابیاں معاف کی جاسکتی ہیں۔

سارا دن ایک گدھے کی طرح محنت کرتا ہے، نہ نیند ہے نہ آرام۔ کسی کو ڈاکٹر کے پاس لے جا رہا ہے، کسی کے لیے بستر کا انتظام کرتا ہے، کسی کے بچے بہلاتا ہے، اُن کے لیے میکروریان دودھ لاتا لے جاتا ہے، سارا دن اوپر نیچے اترتا چڑھتا ہے۔ کبھی کوئی بلاتا ہے، کبھی کوئی۔ کبھی ایک پوچھتا ہے، کبھی دوسرا۔ دس آدمیوں کی روٹی پکتی ہے تو چالیس آ ٹپکتے ہیں۔ بے وقت کے مہمان ہر وقت موجود۔ بے وقت کھانے چائے کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ کسی کو کپڑے، کسی کو نقد، کسی کو دوائی پہنچانی ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ گھر کے خرچ کے پیسوں میں کرنا پڑتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فقیروں کی طرح کھانا کھاتے ہیں۔ اگر خرچ کے پیسے کم پڑ جائیں تو پھر چغل قرض سودا لاتا ہے

(چغل ہمارے مزدور کا نام تھا)۔ اب یہ بھی ہوتا ہے کہ مہمانوں میں بڑے بڑے خان آ رہے ہوتے ہیں، اس بیچارے پر رعب بھی ڈالتے ہیں۔ ان کے بچوں اور عورتوں کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ دن میں ہزاروں روپے لگاتے ہیں، لیکن خواہش ہوتی ہے کہ پھر بھی تورلالی کے پیسوں سے کچھ نکال سکیں۔ اس کو لاحق ان سب چیزوں کا احساس ہے، پھر بھی اس سے حساب کتاب لیا جاتا ہے۔ پیسے مہینے کے شروع میں ملتے ہیں اور دس دن میں ختم ہو جاتے ہیں۔

اس جذبے سے مغلوب بیچارہ آج آیا تھا اور فریاد کر رہا تھا کہ اجمل خٹک سے کہو مجھے اس مصیبت سے نکالیں۔ آج اتنے مہمان آئے ہیں کہ بے چارے کو اپنے سونے کی جگہ نہیں مل رہی۔ بستر تو دور کی بات، کسی کو کمبل بھی نہیں ملتا اور سب رعب داب اس بے چارے پر ڈالتے ہیں۔ تو بیچارہ کیا کرے؟ زیادہ سے زیادہ مجھ سے شکایت؟ وہی بات کہ 'اگرچہ قبر بہت مشکل جگہ ہے، لیکن مردے کی تو مجبوری ہے'۔ میں اس کی فریاد ہمدردی کے ساتھ سن لیتا ہوں، اسے تسلی مل جاتی ہے۔

یہ ہماری زندگی ہے اور یہ مصروفیات۔ انقلاب کا سارا بنیادی کام ہم سے رہ گیا ہے اور بس لوگوں کو خوش کرنے اور بہلانے کے لیے بیٹھے ہیں۔ باقی سب تو چھوڑیں، خود زندگی سے بیزار ہو چکے ہیں، کہیں سے موت آئے اور ہمیں اس مصیبت سے آزادی ملے۔

☆☆☆

داؤد خان کے بعد اور پھر ہماری تحریک کے خاتمے کے بعد ہماری پرانی اہمیت باقی نہ رہی۔ اگرچہ ببرک کارمل کے بعد پرانے پرچمی اور ان کے طرف دار خلقی، جو بڑے بڑے عہدوں پر تھے ان کی آمد و رفت زیادہ ہوگئی لیکن اب وہ کام اپنی مرضی اور ارادے سے کرتے تھے۔

سب سے اہم تبدیلی یہ ہوئی کہ اجمل خٹک کے گھر والے بھی آ گئے اور گھر کا انتظام لازمی طور پر وہاں منتقل ہو گیا۔ اس سے تورلالی کی اہمیت کم ہوگئی، جس سے وہ بہت پریشان تھا۔ اس کے بعد وہ طرح طرح کے بہانے ڈھونڈتا اور یوں ایک مصیبت بن گیا۔ اختصار کے ساتھ اُن دنوں کے اندراجات بھی نقل کرتا ہوں:

13 مارچ 1983:

تورلالی کا معاملہ ٹیڑھا ہو گیا ہے، اس نے اجمل خٹک سے بات چیت بند کر دی ہے۔

سرونٹ کوارٹر میں منتقل ہوگیا ہے۔ مجھے پہلے سے معلوم تھا اور اب یقین ہوگیا ہے کہ جلا بیٹھا ہے۔ کسی بھی وقت اس سے فساد بن سکتا ہے۔ آج کمانڈر عبدالغفار صاحب (سابق کمانڈر پولیس) نے اسے بلایا تھا کہ اس کا کوئی فیصلہ کریں، لیکن وہاں نہیں گیا۔ تین باتیں اس سے کرنی ہیں:

۱۔ اگر یہاں رہنا ہے تو تمہارے لیے حکومت سے الگ گھر لے دیتے ہیں۔

۲۔ اگر باہر ملک جانا چاہتے ہو تو پاسپورٹ اور ٹکٹ کا ذمہ ہم لیتے ہیں۔

۳۔ اگر واپس اپنے گاؤں جانا چاہو، تب بھی تمہاری مدد کو تیار ہیں۔

یہ مزید اجمل خٹک کے گھر نہیں رہ سکتا اور اجمل خٹک کو بھی اس کے لیے راضی کرلیا ہے۔
لائق صاحب، پکتیاوال اور افراسیاب سب کی رائے یہی ہے، کہ اس سے جان چھڑانی چاہیے۔

یکم اپریل 1983:

آج میں اور کمانڈر عبدالغفار سارا دن گھر رہے اور تورلالی سے گفتگو کی۔ اس نے پھر بلیک میل کرنے کی کوشش کی اور کہا اس شرط پر رہنے کو تیار ہوں کہ اجمل خٹک کے گھر میں کوئی مداخلت نہ کرے۔ ہم نے واضح کردیا کہ تمہارا اجمل خٹک کے گھر میں رہنا اب کسی طرح ممکن نہیں۔ جتنی شرمندگی ہوچکی، وہ کافی ہے۔ تمہارے پاس تین راستے ہیں: دوسرے گھر جانا چاہو، تو حکومت سے لے دیں گے، ماہوار وظیفے کا بھی انتظام کردیں گے، باہر ملک جانا چاہو تو پاسپورٹ اور ٹکٹ کا انتظام کریں گے اور واپس جانا چاہو تو بھی مدد کریں گے۔ تورلالی نے باہر جانے کا راستہ پسند کیا۔

2اپریل:

تورلالی کا پاسپورٹ وزارت خارجہ سے حاصل کیا۔ یہ مشرق وسطیٰ اور ہندوستان کے لیے ہے۔ شام پھر اجمل خٹک کے پاس گیا، تورلالی سے گفتگو کی۔ اُس نے اسے کہا بے وقوفی نہ کرو یہیں رہ جاؤ۔ وہ نہ مانا اور کہا سعودی عرب جانا چاہتا ہوں۔

3اپریل:

پاسپورٹ ہندوستان کے سفارتخانے کو ویزے کے لیے بھیج دیا، ابھی واپس نہیں آیا۔

[الغرض تورلالی ہندوستان چل دیا۔ بے چارہ دہلی میں دربدر پھرتا رہا، کبھی ایک جگہ کبھی دوسری جگہ۔ اکثر ہندو گوالوں کے ساتھ رہتا اور ان کی بھینسوں کی خدمت کرتا۔ غریب اور بے تعلیم

انسان اور کیا کرسکتا ہے؟ وہ ٹھاٹھ باٹھ جو اُسے کابل میں نصیب تھے، وہ کہاں۔ وہاں اس نے دوسال کے قریب وقت گزارا۔ پھر واپس آیا اور اجمل خٹک کے ساتھ رہنے لگا۔ اجمل خٹک مقبرے کا درخت تھے، نہ کوئی اس کے سائے میں بیٹھ سکتا تھا اور نہ اُس کا پھل کھا سکتا تھا!

اگر میری بات مانتا تو کابل میں اپنا گھر ہوتا اور اگر ذرا سلیقے سے رہتا تو بچوں کو بھی پال سکتا تھا۔ جب اجمل خٹک پر دوسرا دور آیا اور جنرل پرویز مشرف سے ملاقات ہوئی اور اُس کے مطابق اُس کے ماتھے میں نور دیکھا، تو اے این پی نے پارٹی سے نکال دیا اور انہوں نے پھر نیپ بنائی۔ اس سارے وقت میں تورلالی ان کا ساتھی رہا۔ لیکن بہت جلد انہیں اے این پی کے ولی باغ نے اپنے ساتھ وابستہ کرلیا۔

[موصوف کی موت کے وقت میں پاکستان میں نہ تھا، اس لیے جنازہ اور فاتحہ میرے پر قرض رہا۔ خدا اُسے جنت میں جگہ دے۔]

کابل میں ہمارے گھر

کابل میں ہم نے کئی گھر بدلے۔ سب سے پہلے 'جمال مینہ' کی ایک گلی میں ہمارا گھر تھا۔ 1974 کو دہمزنگ میں 'کوٹہ سنگی' کی شاہراہ پر منتقل ہو گئے۔ جب آمد و رفت اور مہمانوں کی تعداد زیادہ ہوئی تو 'کارتہ سہ' کے اندر ایک بڑے گھر چلے گئے، جو حبیبیہ کالج کے سامنے والی سڑک پر تھا۔ پھر پارلیمنٹ ہاؤس کے پیچھے، صدر داؤد خان کے وزیر دفاع غلام حیدر رسولی کے گھر منتقل ہو گئے، البتہ بہت کم مدت وہاں رہے۔ اس کے بعد 'کارتہ سہ' میں 'چہچہ مست' کے کنارے سڑک پر ایک گھر لیا اور ترہ کی، امین کے دور تک وہیں رہے۔ اس کے بعد اجمل خٹک یہاں سے وزیر اکبر خان مینہ کے گھر میں رہے اور وہاں سے ایک اور گھر بھی گئے، جبکہ میں نے شادی کر لی اور میکروریان سوم کے اُس وقت کے آخری بلاک 122 نمبر چلا آیا۔ اس کے دوسری طرف کھیتیاں تھیں اور ہر وقت گولیاں چلتی رہتیں۔ میرے آس پڑوس میں ایک آصف نواز طبلہ نواز تھے، جبکہ دوسری طرف میرے دیوار شریک اور دوسرے زینے پر مقبول گلوکار استاد سرآہنگ رہ رہے تھے۔ استاد سرآہنگ کے گھر کے اوپر میرے حاجی دوست میاں گل اپنی روسی بیوی کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ بعد میں ڈاکٹر نجیب نے میرا یہ گھر تبدیل کرایا اور اپنے زینہ میں ایک خلقی 'جیلانی'، جو وزارت ٹرانسپورٹ میں نائب وزیر تھا، کے گھر کے ساتھ تبدیل کر دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اسے انگریزی سکھاؤں۔ میرے لیے یہ سہولت کا باعث بنا کہ میں اپنے سسرال کے قریب آ گیا اور کیونکہ اس بلاک میں سب حزبی اور حکومتی بڑے بڑے افراد رہتے تھے اس لیے سیکورٹی کے لحاظ سے بھی بہتر تھا۔

کابل میں اجمل خٹک، تورلالی اور میرے علاوہ اجمل خٹک کا بڑا بیٹا جمال اور بعد میں تورلالی کا بڑا بیٹا غلام حبیب مستقل رہائشی تھے۔ سمجھدار لوگ اپنی اولاد تعلیم کے لیے شہر یا انگریزی درسگاہوں کو بھیجتے ہیں، اجمل خٹک نے اپنے بیٹے کی تعلیم کے لیے شانگلہ پار میں لیلونئی کے علاقے میں 'سرزیب خان' کے ساتھ میں بھیجا تھا۔ جب کابل آیا تو اسے ہم نے خوشحال خان لیسہ میں داخل کیا۔ بعد میں غلام حبیب کو بھی اسی درسگاہ میں داخل کیا گیا۔ جمال کو ہندوستانی فلموں اور گانوں کا بہت شوق تھا۔ وہ گانے ٹیپ ریکارڈ کیا کرتا تھا اور ایک بہت بڑا بکس ان کیسٹس سے بھرا ہوا تھا۔ وہ سکول کے بہانے نکلتا اور سینماؤں میں پایا جاتا۔ فلمیں دیکھتا اور فنکاروں، ایکٹروں کی

تاریخ جغرافیہ اسے بہت اچھی طرح حفظ تھی۔ اکثر میں اسے ڈھونڈتا اور بزور اسے سکول بھیجتا۔ خوشحال خان سکول سے فارغ ہونے کے بعد میں نے اسے روس بھیجا اور اس کے بعد غلام حبیب بھی گیا۔ پاترلیس لوممبا یونیورسٹی میں داخل کیے گئے۔ دونوں نے ڈاکٹریٹ کی، البتہ تھے دونوں نالائق۔

سنگین ولی خان

نومبر 1977: سنگین ولی کابل آیا تھا۔ کبھی 'جالوان' کے بیٹے ایمل کے ساتھ اُس کے گھر رہتا اور کبھی ہمارے ساتھ۔ دن کو عموماً ہمارے ساتھ ہوتا اور میرے ساتھ میرے دفتر میں بیٹھا رہتا۔ اس وقت سنگین بہت خوبصورت اور پیارا جوان تھا۔ ابھی داڑھی بھی نہیں آئی تھی اور اپنے لمبے قد اور پتلے جسم کے ساتھ بہت باوقار نظر آتا، ساتھ ساتھ ذہین بھی تھا۔ بے جا نازونعم نے اسے خراب بھی کیا تھا۔ میں نے بہانے بہانے سے بہت کوشش کی کہ کسی طرح اُسے روس میں پڑھنے کے لیے جانے کے لیے آمادہ کر سکوں، تاکہ وہاں سوویت زندگی کا تجربہ ہو۔ لیکن اس کی نامکمل تربیت میرے اس ارادے میں بہت بڑی رکاوٹ تھی۔ اس نے روس کے خلاف بہت بری بری باتیں کیں، اس پر امریکا کے زرق برق کلچر اور گلیمر کا اثر تھا اور ذہن میں یہی تھا کہ پی آئی اے میں نوکری کروں گا۔ بعد میں پی آئی اے میں نوکری ملی بھی، لیکن جلد ہی چھوڑ دی۔ میرا خیال تھا کہ ولی خان کا بیٹا ہے، اس کا جانشین ہو گا، اس لیے اگر روس میں پڑھے گا تو سرخ نہ سہی سرخی مائل تو بن جائے گا۔ بائیں بازو اور انقلابی سیاست کا اثاثہ ہو گا۔ لیکن تقدیر کو یہ منظور نہ تھا۔ مرحوم کی زندگی عیش عشرت نے تباہ کی۔ صحت ختم ہوئی اور بالآخر عین جوانی میں مرا۔ میں سوچتا ہوں اگر میری بات مانی ہوتی تو شائد آج اپنے باپ کا جانشین ہوتا اور سربراہی کی عزت ملتی۔ ذہانت کے اعتبار سے سنگین پورے خاندان میں سب سے آگے تھا۔

علی خان محسود

جنوبی وزیرستان میں محسود قبیلے سے تعلق رکھنے والا علی خان پختون سٹوڈنٹس فیڈریشن کا فعال راہنما اور نیپ کے قوم پرست حلقے سے، بالخصوص باچا خان کے خاندان سے قریبی تعلق رکھتا تھا۔ پشاور یونیورسٹی کی اکھاڑ پچھاڑ میں بہت سرگرم تھا، لیکن جب نیپ کے پٹاخوں اور دھماکوں کے نتیجے میں حیات محمد خان شیر پاؤ (صوبائی وزیر داخلہ اور مقتدر صوبائی راہنما) مارے گئے تو پشاور یونیورسٹی اور بالخصوص پختون سٹوڈنٹس فیڈریشن پر نزلہ گرا اور بہت سے راہنما ادھر ادھر ہو گئے۔ علی خان مایوس ہو کر کابل آ گیا۔

2 ستمبر 1975:

آج علی خان محسود پہنچ گیا، کہہ رہا ہے کہ نچلے پختونخواہ میں کام بہت دشوار ہو گیا ہے۔ اجمل خٹک کوئی کام بتائیں، کہ میں کروں۔ اس کا کہنا ہے: لوگوں میں مایوسی بڑھ گئی ہے، کوئی سیاسی سرگرمی نہیں ہے، نیپ بالکل خاموش ہے۔ اس کے کارکن دل شکستہ ہیں۔ پیپلز پارٹی کی حکومت نے بہت دباؤ ڈالا ہوا ہے اور یہ دن بہ دن بڑھ بھی رہا ہے۔ لوگ داؤد خان کی حکومت سے بھی ناراض ہیں، کہتے ہیں کہ بڑی بڑی باتیں کرتا ہے، عملی طور پر کچھ نہیں کرتا۔ پنجشیر وغیرہ میں تخریب کاری اور شیخ مجیب کے قتل سے مایوسی اور بھی بڑھ گئی ہے۔

یونیورسٹی میں آنے والے انتخابات کے لیے کالجوں میں پی ایس ایف کے لیے امیدوار تک ملنا مشکل ہو گئے تھے۔ اب کچھ تھوڑے بہت کام کے بعد لڑکوں میں کچھ جان آئی ہے۔ لیکن ان کا جوش و ولولہ گذشتہ سال کے مقابلے میں کچھ نہیں، شیر پاؤ کی موت نے پی ایس ایف کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔

افواہ ہے کہ جن جرنیلوں نے بھٹو کو ہٹانے کے لیے اتحاد کیا تھا انہیں بھٹو اور ٹکا خان نے بے عزت اور معزول کرنے کے بعد گرفتار کر لیا ہے۔ اس سلسلے میں پیرزادہ اور جتوئی نے بھی ان سے میٹنگ کی تھی۔ جتوئی کو ممتاز بھٹو نے بے عزت کیا اور پی پی پی کی میٹنگ میں اسے مارا پیٹا۔ پی ایس ایف کا وہ دوسرا لیڈر (افراسیاب) بھی لاہور میں ہے، کچھ لڑکے اس کے ساتھ مل گئے ہیں۔ وہ اجمل سے ناراض ہے۔ کہتا ہے یونہی بغیر کسی مقصد کے گولیوں اور دھماکوں سے ہمیں نقصان

پہنچایا، خود کچھ کر نہیں سکتا۔

قبائل افغانستان حکومت اور صدر داؤد خان کے خلاف باتیں کرتے ہیں، کہ جو پیسے اگلی حکومتیں ہمیں دیا کرتی تھیں، وہ روک دیے ہیں۔ پہلے باچا خان کابل آئے تو یہ پیسے روک لیے گئے تھے، اب اجمل خٹک آیا ہے تو اس نے حکومت سے کہا ہے کہ ہمیں پیسے نہ دے۔ بلکہ پیسے انہیں دے، جو نچلے علاقوں میں بموں کے دھماکے کر رہے ہیں۔ یہ پروپیگنڈا قبائل میں بہت عام ہو چکا ہے۔

3 ستمبر:

اجمل خٹک کل جلال آباد گئے۔ میں اور علی خان سارا دن گھر میں اکیلے تھے۔ رات کو 'رئیس گمرکات' (کسٹم ڈائریکٹر) ڈاکٹر کیمور آ گئے اور ہمیں اپنے گھر لے گئے۔ امازئی کے علاقے کا وہ لڑکا جس کا نام 'پشتون' ہے اور لندن میں انجنیئر ہے، ان کے ساتھ تھا۔ شام کا کھانا وہاں کھایا اور گپ شپ لگائی۔

5 ستمبر:

علی خان کا کہنا ہے کہ سید مختار باچا اور ڈاکٹر شیر افضل کی آپس میں ٹھنی ہوئی ہے۔ کیوں؟ کیونکہ باچا ولی خان اور نسیم بی بی کا مخالف ہے، ان کے پیچھے بری بری باتیں کرتا ہے اور کہتا ہے کہ انہوں نے امریکا سے ہاتھ ملایا ہوا ہے۔ شیر پاؤ کو اسی لیے قتل کیا گیا کہ پی ایس ایف کی قوت ختم کی جا سکے اور اس کا ترقی پسند رول ختم کیا جا سکے۔ کیونکہ پی ایس ایف سے نیپ کا دائیں بازو خوفزدہ تھا، اس لیے شیر پاؤ کو ختم کرنے کی سازش محض پی ایس ایف کو ختم کرنے کی سازش تھی۔

ڈاکٹر شیر افضل کا کہنا ہے کہ یہ محض نام کے کمیونسٹ، ولی خان کو کیوں برا بھلا کہتے ہیں۔ ولی خان جیل میں پڑا ہے، اپنے آپ کو پھانسی کے پھندے کے سامنے کر رکھا ہے اور یہ کمیونسٹ باہر آزاد پھر رہے ہیں۔ محض باتیں بگھار رہے ہیں۔ تو سی آئی اے کے اصل ایجنٹ کون ہوئے؟ بتایا کہ باچا اجمل کے خلاف بھی باتیں کرتا ہے کہ اجمل ترقی پسند نیشنلسٹ ہے، کمیونسٹ نہیں اور ولی خان کا ایجنٹ ہے، ہمارا نمائندہ نہیں۔

23 ستمبر:

علی خان ناراض اور غصے میں ہے۔ اس نیت سے آیا تھا کہ حالات اچھے ہوں گے۔ ہر معاملہ

اجمل اور فیض محمد کے ہاتھ میں ہوگا۔ عزت اور لیڈری بھی ہوگی، پیسہ اور شان بھی ہوگی۔ لیکن ایسا نہیں۔ حالت دن بہ دن خراب ہو رہی ہے، ہر کام ہمارے ہاتھ میں نہیں۔ پھر اس کے مستقبل اور ہر عمل کی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے اجمل تیار نہیں، تو اب کہہ رہا ہے کہ واپس چلا جاتا ہوں۔ پختون غیرت صرف نیپ، اجمل، ولی خان اور باچا خان تک محدود نہیں۔ تعلیم یافتہ ہوں، اپنے لیے راستہ بنا سکتا ہوں۔ اور اگر میں فساد پر آمادہ ہوگیا تو قبائل میں میرے ہاتھوں کوئی کام نہیں کر پائے گا۔ یہ کہتا ہے، مجھے مختار باچا اور افراسیاب نے کہا کہ کابل جاؤ، اجمل نے بلایا ہے۔ (حالانکہ یہ بات غلط ہے، یا تو اپنی جان چھڑائی ہے یا جھوٹ بول رہا ہے۔) میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں۔ کبھی کہتا ہے، ولی خان نے مجھے اس کا کہا تھا اور کل واپس جاتا ہوں کہ ولی خان کو ساری رپورٹ دوں۔ کبھی یہ بھی کہتا ہے کہ شمس الدین کے چچا اور ہمیش خلیل نے مجھے بھیجا تھا۔

یہ بھی کہتا ہے کہ میں کام کو تیار ہوں، لیکن پیسہ میرے پاس نہیں۔ میرے سامنے چار راستے ہیں:

۱۔ قبائل میں کام کروں، لیکن قبائل میں کام اور سیاست بغیر پیسوں کے نہیں ہوتی۔ ہر وقت دس بیس لوگ آپ کے مہمان ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ دس مسلح افراد بھی ہر وقت ساتھ ہونا لازم ہے۔ پھر مسلح افراد کے لیے اسلحے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ (کہہ رہا ہے کہ میرے باپ نے یہ پیغام بھجوایا ہے کہ میں مزید تمہارا خرچ برداشت نہیں کرسکتا۔) یہ بھی ممکن نہیں، کیونکہ افغان حکومت اس کے لیے تیار نہیں۔ اور اگر یہ لوازمات نہ ہوں تو قبائل میں کام ناممکن ہے۔

۲۔ زیریں ڈیرہ اسماعیل خان میں پارٹی اور پی ایس ایف کا کام: اس کا کہنا ہے کہ اگر اجمل کی طرح شہباز اخبار کے دفتر میں بھی رہ لوں، تب بھی 15000 روپے ماہوار خرچ ہوگا۔

۳۔ اگر یہ دونوں کام نہیں ہوتے تو شاید خلیجی ممالک چلا جاؤں۔ پیسہ کماؤں، پروپیگنڈا کروں اور چندہ اکٹھا کروں۔ لیکن اس پر اجمل خٹک کا موقف ہے کہ میں پی ایس ایف کے راہنماؤں سے پوچھتا ہوں، اگر وہ ذمہ داری لیتے ہیں تو میں بالکل تیار ہوں۔ لیکن علی خان یہ تسلیم نہیں کرتا، اس کا کہنا ہے کہ میرے لیے نیپ بھی آپ ہیں اور پی ایس ایف بھی آپ۔ جب تعلیم مکمل کرلی تو اب میں اور افراسیاب طلبہ تنظیم کے راہنما ہیں ہی نہیں۔

۴۔ انہوں نے مجھے خود جرمنی جانے کی تجویز دی ہے۔ فیض محمد خان پاسپورٹ دے رہا ہے اور

ڈیکموز، تین ماہ کا خرچ۔ یہ تجویز انہوں نے خود بنائی تھی، لیکن اب کہہ رہے ہیں، وہاں جاکر کیا کروں گا؟ وہاں ہمارے دیگر ساتھی ویسے بھی موجود ہیں۔

اس لیے علی خان کا موقف ہے کہ اگر ان سب تجاویز پر عمل نہیں ہونا، تو صاف صاف بتا دیں، تاکہ واپس جا کر اپنا راستہ خود تراشوں۔

19 اپریل 1976:

آج علی خان محسود، شاہجہان اور اس کا بھائی لیاقت ماسکو کے راستے جرمنی روانہ ہوگئے۔

علی خان اپنی ذات میں ایک معمہ تھا، مجھے موقع پرست سا لگا۔ اپنا کردار اچھی طرح ادا کیا ہے۔ سٹوڈنٹس مومنٹ میں فعال حصہ لیا، لیکن ساری سیاست لیڈروں والی کی ہے۔ لیڈروں سے قربت اور ان سے تعلقات بنانے کا شوق رہا ہے، عوامی سیاست کا مزاج نہیں۔ اس کی سیاست کی جہت معلوم نہ تھی۔ گذشتہ دنوں ہماری سیاست کے خلاف کئی جگہ مختلف باتیں کی تھیں۔ پی ایس ایف میں بھی دوسرے لیڈروں کے ساتھ رقابت تھی۔ جرمنی گیا ہے پتا نہیں اس کا کیا بنے گا؟ یا تو بہت اچھا ہو جائے گا یا پھر ہمیشہ کے لیے یہ کہانی ختم ہوئی۔ اگر اچھا ہوا تو اس قابل ہوگا کہ اپنے آپ کو سنبھال سکے اور اپنی عزت کو۔ سیاست کا میدان بہرحال ہمیشہ کے لیے اس سے چھوٹ گیا۔ اور اگر خراب ہوا تو بس یونہی ہوگا، جیسے وہ کبھی تھا ہی نہیں۔

[علی خان کی طبعیت میں مزاح بھی بہت تھا۔ اس کی ایک مزاحیہ بات اب بھی مجھے یاد ہے۔ نسیم بی بی کی بڑی بہن کا شوہر مردان کے قریب 'ھلکے' گاؤں کا خان تھا۔ بے چارہ بے وقوفی کی حد تک سادہ تھا۔ اس کے باوجود مردان ضلع میں پختون زلمے کا کمانڈر بھی رہا تھا۔ شاہی باغ (جس کا بعد میں نام ولی باغ رکھ دیا گیا) تخریبی اور جنگی جدوجہد کے میدان کو اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتے تھے، اس لیے ہر جگہ اپنے ہی لوگوں کو رکھا ہوا تھا۔ اس چکر میں انور خان بھی کمانڈر بنا۔ لیکن جوں ہی جیل سے چھوٹا، سیدھا افغانستان کا رخ کیا۔ افغانستان میں پہلے سے ہی اس کا بیٹا ایاز اپنے باپ کی گدی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہماری تخریب کاری کی تحریک جب ناکام ہوچکی اور انور خان کمرے میں بیٹھا اپنی عقل وفراست کے پھول بکھیر رہا تھا، تو علی خان نے میرے کان میں کہا، 'اچھا ہوا اس ٹھائیں ٹھائیں کے دوران واقعی پختونستان نہیں بن گیا'۔ میں نے حیرت سے

پوچھا: ’کیوں؟‘ اس نے کان میں کہا، ’آج انور خان ہمارا کمانڈر انچیف ہوتا!!‘]

فیض محمد خان محسود چونکہ وزیر داخلہ اور ہمارے بہت قریب تھا، تو اس کے کہنے پر علی خان کے لیے افغانی پاسپورٹ بنایا گیا، شائد ٹکٹ بھی اسی نے لے کر دیا۔ اس وقت یورپ آمد ورفت بہت آسان تھی، افغانی پاسپورٹ بہت معتبر سمجھا جاتا تھا، کیونکہ دنیا ابھی افغانیوں سے واقف نہیں ہوئی تھی۔

عارف محمود قریشی

4 ستمبر 1975:

ملتان میں نیپ کے جنرل سیکرٹری، عارف محمود قریشی آج صبح پہنچا۔ یہ دو دن پہلے کابل آیا ہے۔ ایل ایل بی کا امتحان دیا ہے، چاہتا ہے کہ لندن سے بار ایٹ لاء کرے۔ لیکن اس سے پہلے جرمنی جانا چاہتا ہے، کہ اتنے پیسے کما لے جو لندن میں زندگی گزارنے کی ابتداء کے لیے کافی ہوں۔ اس حوالے سے اجمل خٹک کی مدد کا خواہاں ہے۔ اس کے لیے تعارف شاہ صاحب یعنی قسور گردیزی صاحب کا دے رہا ہے۔ اسے ٹکٹ اور وہاں رہنے کے لیے مدد کی ضرورت ہے۔

اس کا کہنا ہے کہ بھٹو کی حکومت محض پولیس، فوج اور فیڈرل سیکیورٹی فورس پر قائم ہے۔ عوام کی نفرت بڑھ گئی ہے۔ ولی خان کی پنجاب میں مقبولیت اتنی بڑھ گئی ہے کہ وہاں اس کا سپریم کورٹ کا حلفیہ بیان بلیک میں فروخت ہو رہا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ بھٹو انتخابات سے پہلے چاہتا ہے کہ ایٹمی دھاکہ کرے تاکہ پنجاب کے ووٹ لے لے۔ پنجاب میں اب کام دو طرح سے ممکن ہے۔ کیونکہ پارٹی پر پابندی ہے، اس لیے پنجاب کو تقسیم کرنے کے لیے ایک راستہ تو یہ ہے کہ سرائیکی زبان بولنے والوں کے لیے الگ صوبے کا مطالبہ کیا جائے۔ اس کے لیے تحریک چلائی جائے۔ ایک تو زبان میں فرق ہے، دوسرا سرائیکی بولنے والے اکثریت میں ہیں، جبکہ کارخانے بالائی پنجاب کے پاس ہیں۔ یہ گلہ بہت عرصے سے موجود ہے۔ بہاولپور صوبے کی آواز بھی کبھی کبھی اٹھتی ہے اور اس کی بنیاد بھی سرائیکی زبان ہوتی ہے۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ عظیم پنجاب کا نعرہ بلند کیا جائے، جس کے حمایتی لاہور کے ترقی پسند عناصر جیسے مشتاق راج وغیرہ موجود ہیں۔

5 ستمبر 1975:

عارف محمود کے ساتھ فیصلہ اور اجمل خٹک کا جان چھڑانا: ”آپ شاہ صاحب کے پاس جائیں، اسے کہیں کہ آپ کے لیے دس ہزار روپے کا انتظام کریں۔ ہم یہاں باہر بیٹھے ہیں، یہ حکومت ہمیں انقلابی سمجھتی ہے، اس لیے ہمیں اپنے سات کیمپوں اور چار مراکز کے لیے بہت کم خرچ ملتا ہے۔ اسے بھی ہم نیچے پختونخوا سے آنے والے چندے سے پورا کرتے ہیں۔ آٹھ دس

حصہ چہارم

پس منظر: انقلابِ ثور اور ہم

عوامی جمہوری پارٹی افغانستان (پشتو: دافغانستان خلق دموکراتیک گوند) یکم جنوری 1965 میں بنائی گئی۔ اس کے سیکرٹری جنرل نور محمد ترہ کی اور نائب ببرک کارمل تھے۔ لیکن یہ اتحاد زیادہ دیر تک نہ چلا۔ 1967ء میں یہ دو دھڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ اس پارٹی کے اولین اخبار کا نام 'خلق' (عوام) تھا، اس لیے نور محمد ترہ کی کی سربراہی میں الگ ہونے والے دھڑے کو 'خلقی' کہا جانے لگا۔ دوسرا دھڑا 'پرچمی' کہلایا، اس کی وجہ یہ تھی کہ الگ ہونے کے بعد انہوں نے اپنا الگ اخبار شروع کیا اور اس کا نام 'پرچم' تھا۔ چونکہ یہ ایک ہی پارٹی کے دو دھڑے تھے، تو بالکل جیسے ایک دادا کی اولاد میں جائداد کے تنازعے ہوا کرتے ہیں، اسی طرح دونوں دھڑوں میں باہم عناد پایا جاتا تھا۔ 'خلقیوں' میں اکثریت دیہاتی لوگ تھے، جبکہ 'پرچمی' شہروں میں رہنے والے، تعلیم یافتہ پشتون اور فارسی بولنے والوں کی جماعت تھی۔ خلق دیہاتیوں کی سی تندی اور تیزی رکھتے تھے، جبکہ پرچمیوں کا مزاج شہری تھا اور وہ نرم فطرت تھے۔ دونوں ہی اشتراکی نظام کے حامی تھے اور اپنے آپ کو سوشلسٹ نظام اور ترقی پسند سوچ کا نمائندہ سمجھتے تھے۔ تاہم دونوں کے طریقہ کار اور رجحانات میں فرق تھا۔ خلق کا رویہ تیز اور لچک سے عاری تھا۔ پرچمی نرم اور لچکدار رویہ رکھتے تھے۔ پرچم میں استاد میر اکبر خیبر جیسے لوگ بھی تھے، جن کا خیال تھا کہ داؤد خان کی حکومت کے خلاف اٹھنا افغانستان اور افغانستان کے عوام سے خیانت کے برابر ہوگا۔ اس لیے جب ایک وقت داؤد خان چاہتا تھا، کہ قومی پارٹی بنائے تو وہ اس کا حامی تھا کہ اس میں 'پرچم' بھی ضم ہو جائے اور داؤد خان کی حمایت کرے۔ جبکہ 'خلق' پہلے دن سے داؤد خان کی حکومت کے خلاف تھے۔

مختصر یہ کہ اپنی تیرہ سالہ زندگی میں یہ پارٹی دو سال متحد رہی اور باقی گیارہ سال اس کے دو دھڑے ایک دوسرے کے خلاف رہے۔ لیکن جب داؤد خان دائیں بازو کے لوگوں سے جڑ گیا، عرب دنیا، ایران، پاکستان اور مغرب کے قریب گیا اور اُس نے اپنے آپ کو سوویت سے دور کرنا شروع کیا، تو اس پارٹی کو اپنے وجود کا خطرہ لاحق ہو گیا۔ اس طرح روس کو بھی ان حالات پر تشویش تھی۔ افغان حکومت کے اندر کشمکش چل رہی تھی اور امریکا و روس کی خفیہ لڑائی جاری تھی اور دونوں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے مصروفِ عمل تھے۔

ان حالات میں جولائی 1977ء میں پرچم اور خلق نے اتحاد کرلیا۔ یہ اتحاد دونوں دھڑوں کے سول کارکنوں کی طرف ہو چکا تھا، لیکن شک اور بے یقینی کی اس فضا میں دونوں کے فوجی حلقے ابھی الگ الگ تھے۔ خلق کے فوجی حلقے کی سربراہی حفیظ اللہ کے پاس تھی، جبکہ پرچم میں یہ عہدہ ایک محتاط فلسفی، استاد میر اکبر خیبر کے پاس تھا۔ تاہم بعد میں یہ ذمہ داری پرچم میں نور احمد نور اور عبدالوکیل کے حوالہ کردی گئی۔ خیبر پر خلقی یہ الزام لگاتے کہ وہ پولیس کا بندہ ہے، جبکہ پرچمی امین پر یہ الزام لگاتے، کہ وہ سی آئی اے کا بندہ ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ استاد خیبر سیاست میں پولیس کے پس منظر سے داخل ہوئے تھے اور امین نے اپنی تعلیم امریکا میں حاصل کی تھی۔ خیبر ہمیشہ سے وحدت کا حامی تھا، جبکہ حفیظ اللہ امین اور کارمل دونوں اتحاد کے خلاف تھے۔ نئی پارٹی میں خیبر، کارمل کی کوششوں سے پولٹ بیورو سے باہر رہ گیا، تاہم پھر بھی وہ اتحاد کا حامی رہا۔ داؤد خان کی حکومت میں عزیز اللہ واصفی، عبدالقدیر نورستانی، وحید عبداللہ اور غلام حیدر رسولی وغیرہ دائیں جانب تھے۔ عبدال اللہ، قیوم خان وردگ وغیرہ داؤد خان کے قومی تحریک (پارٹی) کے حامی تھے۔ لیکن بیچ میں شکوک اور سازشوں کے جالے تنے ہوئے تھے۔

ان حالات میں بعض سیاسی قتل ایسے ہوئے، جنہوں نے سیاسی حالات بہت گندے کردیے۔ وزارت منصوبہ بندی کے وزیر، علی احمد خرم دفتر کے دروازے پر قتل کیے گئے۔ اس وقت وہ ایک جاپانی وفد کے ساتھ ملاقات میں مصروف تھے، کہ مرجان پستول کے ساتھ آیا اور چاہتا تھا کہ اُسے بزور داؤد خان کے پاس لے جائے۔ وزیر اس کے ساتھ دروازے تک آیا، لیکن مزید آگے جانے میں ہچکچایا، تو مرجان نے وہیں گولی ماردی۔ مرجان قندوز کے علاقے کا ایک پختون تھا اور امین نے اسے خلق میں شامل کیا ہوا تھا۔ افواہ یہ تھی کہ موصوف اصل میں گلبدین کی حزب اسلامی سے جڑا ہوا تھا۔ ایسا ہی دوسرا قتل پائلٹ انعام گران کا تھا۔ انعام گران وہاں میکروریان کے اس بلاک کے سامنے مارا گیا، جہاں ببرک کارمل رہتا تھا۔ انعام گران کے چہرے میں ببرک کارمل کی بہت شباہت پائی جاتی تھی، فرق صرف یہ تھا کہ گران قدرے موٹا تھا اور کارمل پتلا۔ پارٹی نے یہ افواہ پھیلائی کہ اصل میں انعام نے، باختر ہوا باز کمپنی کے صدر، نجیب کے ساتھ جو وزیر دفاع حیدر رسولی کا داماد بھی تھا، جنگ کی تھی، اس لیے اُس نے سازش کرا کے اُسے ماردیا۔ لیکن ہم جانتے تھے کہ اصل ہدف ببرک کارمل تھا اور قاتل کی غلط فہمی سے انعام مارا گیا۔ اس اندیشہ کا اظہار میں

نے اجمل خٹک اور اپنی طرف سے ببرک کارمل سے کیا اور اس نے شکریہ ادا کیا۔

انہی دنوں داؤد خان کی حکومت گرانے کے لیے گردیز شہر کے شیعوں نے جرنیل میر احمد شاہ اور اس کے ساتھیوں کے مدد سے ایک سازش تیار کی۔ اس سازش میں بظاہر 'اسلم وطن جار' بھی شامل رہا۔ اس نے سازش کی یہ مکمل دستاویز اور شرکاء کے نام اجمل خٹک کو دیے، جنہوں نے میرے حوالے کی کہ روسی رابطہ کار کو دوں۔

ایک ملاقات میں روسی رابطہ کار نے پوچھا کہ تم لوگ صدارتی محل میں کسی قابل اعتماد فوجی افسر کو جانتے ہو؟ میں نے کہا ہاں ایک انتہائی قابل اعتبار اور اچھے انسان کو جانتے ہیں، جو وہاں آمر کشف ہے اور اس کا نام عبدالحق ہے، جو اس وقت شائد میجر تھا۔ لیکن اگلی ملاقات میں اُسی روسی سفارت کار نے کہا عبدالحق پر بھروسا مت کرنا، کیونکہ وہ حکمران خاندان 'محمد زئی' سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر جب انقلاب آیا اور خلقی اقتدار میں آئے تو مجھے شک ہوا کہ روسی، پرچمی فوجی افسروں پر اس لیے بھی اعتماد نہیں کرتے کہ ان کی کافی تعداد کا تعلق محمد زئی کے حاکم قبیلے سے تھا۔ جبکہ دوسری طرف خلقی سب دیہاتی فوجی افسران تھے۔ شائد خلق اور پرچم کے فوجی دھڑوں کو اکٹھا کرنے میں یہی سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔

یہ 1977ء کے اوائل کے حالات تھے۔ میں جنوری 1978 میں زابل میں تھا، 'توبہ کاکڑی' کے بالکل سامنے 'نخاس' پہاڑ کے پیچھے واقع 'آسو مرغہ' میں بسم اللہ کاکڑ اور اس کے دوستوں کا دیگان کیمپ تھا۔ میں مرکز کی طرف سے یہاں بھیجا گیا تھا کہ دیگر کیمپوں کی طرح انہیں بھی خیر خیریت سے رخصت کردوں۔ وہاں ایک خلقی دوست اور فوجی افسر نیاز محمد مہمند کے قتل کی خبر سنی۔ وہ پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھا اور گردیز، پکتیا میں مقرر کیا گیا تھا۔ وہاں اس نے ذاتی کلینک بھی کھولا ہوا تھا۔ کوئی اسے 'جدران' کے علاقے میں مریض کے معائنے کے بہانے ساتھ لے گیا اور ذبح کردیا، یہ شائد فروری 1978ء کی بات ہے۔

اسی طرح معاشرے میں قتل وقتال جاری تھا، داؤد خان کی کابینہ میں بھی اکھاڑ پچھاڑ جاری تھی۔ درحقیقت یہ امریکا اور روس کی خفیہ جنگ تھی، جو یہاں کھیلی جارہی تھی۔ داؤد خان کی حکومت نے دو روسی سفارت کاروں کو ناپسندیدہ شخصیت قرار دے کر نکالا تھا۔ روسی بھی سوئے ہوئے نہیں تھے، جواب میں دو امریکی سفارت کاروں کو نکلوا کر دم لیا اور یوں سکور برابر کردیا۔ دوسری جانب حزب متحد ہوگئی

تھی، ان کی کارروائیوں میں بھی شدت آ گئی تھی اور اخوانی عناصر بھی متحرک تھے۔ اس بدبودار فضا میں پارٹی کے ایک اہم اور مدبر رہنما میر اکبر خیبر شام کی چہل قدمی کی نیت سے اپنے دوست عبدالقدوس غوربندی کے گھر سے نکلے اور اپنے میکروریان والے گھر کی جانب واپس جا رہے تھے کہ کسی نے سرکاری پرنٹنگ پریس کے پاس انہیں قتل کر دیا، یہ 7 اپریل 1978 کا واقعہ ہے۔

استاد میر اکبر خیبر کے قتل نے ایک بہت بڑے سیاسی ارتعاش کو جنم دیا۔ ہزاروں حزب والے اور آزاد دانشور مرحوم کے گھر کے آس پاس جمع ہو گئے، جب میت کو پوسٹ مارٹم کے لیے علی آباد ہسپتال لے گئے تو وہاں بھی بہت زیادہ لوگ جمع ہو گئے۔ میں خود مرحوم کے گھر اور پھر علی آباد ہسپتال گیا۔ ڈاکٹر نجیب اور دیگر کے ساتھ تعزیت کی۔ دوسرے دن مرحوم کا جنازہ تھا، جس میں بیسوں ہزاروں افراد اور سینکڑوں موٹروں نے جسد خاکی کو جلوس کی صورت میں قبرستان تک پہنچایا۔ وہاں قبرستان میں پارٹی راہنماؤں نے تند و تیز بیانات دیے اور سارا الزام صدر داؤد اور اس کی حکومت پر ڈالا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے پہلے سے لکھے گئے منظرنامے میں ہر کوئی اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔ خیبر وہ آدمی تھا، جس نے 1974 میں مجھے کہا تھا کہ داؤد خان کو ہٹانا ہمارے لیے چند گھنٹوں کا کام ہے، لیکن اس کا اثر افغانستان پر بہت برا پڑے گا۔ خون بہے گا اور یہ افغانستان کے عوام کے ساتھ خیانت ہوگی۔

ہم یعنی کابل میں مقیم پختونوں اور بلوچوں (اجمل، تورلالی، میں، میر اکرم بلوچ اور مری بلوچوں کے دیگر نمائندے) نے جنازے اور پھر 'شاہ دو شمشیرہ' مسجد میں فاتحہ کی مجلس میں شرکت نہیں کی۔ اجمل خٹک نے منع کیا تھا کہ صدر داؤد خان کی طرف سے وزیر دفاع حیدر رسولی کا فون آیا ہے کہ کوئی بھی شرکت نہ کرے، (اس ٹیلی فون کی آمد کی حقیقت معلوم کرنا بہت مشکل کام تھا جبکہ دوسری طرف ایسا فون کرنا خود داؤد خان کی فطرت کے خلاف تھا)۔ باچا خان جلال آباد میں تھے اور انہیں جنازے میں پہنچنا بھی مشکل تھا۔ شائد انہیں بھی شرکت سے منع کرنے کی کوشش کی گئی ہو، لیکن وہ فاتحہ میں شرکت کے لیے آئے اور سب پارٹی والوں کو ممنون احسان کر دیا۔ اجمل خٹک کے خلاف ایک بہت بڑی مہم اور لعنت و ملامت کا آغاز ہوا، ساری پارٹی نے انہیں برا کہنا شروع کیا۔ خاص طور پر پرچمی حلقے ان سے بہت ناراض ہوئے۔ سب کے احساسات مجروح ہوئے تھے۔ سلیمان لائق کے گھر میں اجمل خٹک کی ایک بہت بڑی فوٹو کو فریم میں لٹکایا گیا تھا، موصوف

نے وہ تصویر بمعہ فریم اجمل خٹک کو بھجوا دی کہ اس تصویر کی ہمارے گھر میں جگہ نہیں ہے۔ اجمل خٹک بھی اعصابی دباؤ کا شکار ہو گئے، فکرمند اور مشوش رہنے لگے۔

انہی دنوں اسفندیار نے نئی نئی شادی کی تھی اور ہنی مون کے لیے اپنی نوبیاہتا بیوی کے ساتھ کابل آیا تھا۔ ایک دن میں نے انہیں خیبر ریسٹورنٹ میں دعوت دی۔ لیکن یہ بھی اس ہنگامے میں پھنس گئے۔ جس دن واپس پشاور جا رہے تھے، ہر طرف ٹینک تھے اور کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ انہیں بھی روک لیا گیا، لیکن پھر بہت مشکل سے جانے دیا گیا۔ شائد اسلم وطن جار نے انہیں پہچانا اور ان کے نکلنے میں مدد کی۔

یہاں یہ ذکر کرتا چلوں کہ خیبر کے جنازے نے داؤد خان کی حکومت کے اوسان خطا کر دیے تھے، جبکہ دوسری طرف وزیر داخلہ قدیر نورستانی اور وزیر دفاع حیدر رسولی جیسے کٹر مخالفین داؤد پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ پرچم اور خلق کی متحدہ پارٹی کے خلاف اقدامات کرے اور پارٹی کو کچل دے۔ پارٹی کے تمام راہنماؤں جیسے نور محمد ترہ کی، ببرک کارمل، سلطان علی کشت مند، سلیمان لائق، صالح محمد زیرے وغیرہ کو گرفتار کر لیا گیا اور ان کی گرفتاری کا اعلان ریڈیو پر بہت بے عزتی کے ساتھ کیا گیا۔ صرف حفیظ اللہ امین اور چند دیگر افراد گرفتار نہیں کیے گئے۔ تاہم جب امین نے اپنے فوجیوں کو تختہ الٹنے کا حکم دیا، تو اسے بھی جیل بھیج دیا گیا، یہ سارا واقعہ ہمیں بعد میں معلوم ہوا۔ ہم نے صرف ریڈیو پر ان گرفتاریوں کا اعلان سنا اور یہ افواہ بھی سنی کہ حکومت چاہتی ہے کہ فوج سے خلقی اور پرچمی عناصر کو نکال باہر کرے۔ تاہم واقعات کی نبض بہت تیز تھی اور واقعات ایک دوسرے کے بعد جلد جلد رونما ہوتے چلے جا رہے تھے۔

27 اپریل 1978 کو کابل میں توپوں کی گھن گرج سنائی دی۔ اُس وقت ہم سڑک دارالامان پر واقع حبیبیہ لیسہ کے سامنے 'کارتہ ءِ سہ' جانے والی سڑک، جس کے مغربی کنارے پر پرانے خوشحال خان لیسہ کی عمارت اور جگہ تھی، جبکہ دوسرے کنارے پر ہمارا گھر تھا، میں رہتے تھے۔ [اب وہاں کرزئی صاحب کی مہربانی سے محسنی صاحب نے اہل تشیع کے لیے ایک بہت بڑی دانشگاہ بنائی ہے۔] دوستوں اور طالب علموں سے جو ہمارے گھر آتے تھے اطلاع ملی، کہ بازار میں ٹینک گھوم رہے ہیں اور صدارتی محل پر گولہ باری کی جا رہی ہے۔ اجمل خٹک نے وزیر سرحدات پروفیسر عبدالقیوم وردگ کو فون کیا، وہ صدارتی محل میں تھے اور وہاں کابینہ کا اجلاس جاری

تھا۔ اس نے کہا کہ گھبرانے کی بات نہیں، کچھ لڑکے ہیں، انہیں ہم سیدھا کرلیں گے۔ ہم نے بھی سکون کا سانس لیا۔ اتنے میں جیٹ طیارے بلند ہوئے اور بمباری شروع کردی۔ رات گئے تک ہمارے پاس دارالامان سڑک پر بھی لڑائی شروع ہوگئی۔ دوپہر کو ہم نے فیصلہ کیا کہ بے خبری میں کوئی ہمیں نہ مار جائے اس لیے ہم 'کارتہ پروان' میں حاجی نادر خان ذخہ خیل آفریدی کے گھر منتقل ہو جاتے ہیں۔ حاجی صاحب کے بیوی بچے سردی میں جلال آباد والے گھر چلے جاتے تھے اور وہ ابھی تک واپس نہیں لوٹے تھے۔ گھر خالی پڑا تھا اور شائد نادر خان کابل میں ہی تھا۔ ہم عصر کے وقت حاجی نادر خان کے گھر منتقل ہو گئے۔ سارا دن گولیوں اور گولوں کی آوازیں سنتے گزرا۔ اس دوران عشاء کے وقت کابل ریڈیو جو مسلسل خاموش تھا، اچانک بولنے لگا۔ کچھ دیر بعد اعلان ہونے لگا، کہ افغانستان کے عوام نے اقتدار حاصل کرلیا ہے اور یحیٰ خیل کے گھرانے کی حکومت ختم ہوگئی۔'' (سردار داؤد کا تعلق محمد زئی قبیلے کی یحیٰ خیل شاخ سے تھا) یہ اعلان اسلم نے، جو بعد میں تخلص کے باعث 'وطن جار' کہلایا، نے کیا، اس کے بعد فارسی میں میجر عبدالقادر نے دھرایا۔ اناؤنسر کا فرض حفیظ اللہ امین نے ادا کیا، ہم سمجھ گئے کہ کیا ہوا ہے۔ ہم بھی فطری طور پر انقلاب کے طرف دار تھے اور باجود اس کے کہ داؤد خان اور اس کے گھر والوں کے قتل پر غمزدہ تھے، لیکن اس نئی تبدیلی سے خوش اور پرامید تھے۔ اس اعلان کے بعد حالات معمول پر آگئے اور ہم واپس اپنے گھر آگئے۔ انقلاب نے تمام سیاست تبدیل کردی اور نئے حالات کو جنم دیا۔

انقلاب کے دوسرے دن بشیر غازی عالم ہمارے گھر آیا۔ یہ لوگر کے علاقے کا ایک پرانا مہم جو لیفٹننٹ تھا جو اس سے پہلے ترکی کی شہری جنگ میں لڑا تھا، جنہیں وزیر داخلہ فیض محمد خان وزارت داخلہ لائے تھے۔ موصوف میجر عبدالقادر کے قریبی دوست تھے۔ ہم ابھی انقلاب کی خوشیوں میں مگن تھے۔ ابھی حکومت کا اعلان نہیں ہوا تھا اور انقلابی شوریٰ کا اعلان بھی نہیں ہوا تھا۔ غازی عالم متحدہ پارٹی میں کارمل اور امین، کارمل اور ترہ کی اور اسی طرح خلق اور پرچم کے اختلافات کے علاوہ عہدوں کی تقسیم پر جھگڑوں کی خبر لایا۔ اجمل خٹک کو یہ سب بہت برا لگا بلکہ ان میں تو سننے کا حوصلہ بھی نہیں تھا، کیونکہ یہ باتیں 'نئے دربار' کے خلاف تھیں۔ البتہ مجھے سوچنے کے لیے بہت سا مواد دے گیا اور میں نے راوی کی روایت پر شک نہ کیا۔ احتیاط لازم تھی اور وہ میں کررہا تھا۔

اجمل خٹک کا ہیڈ کوارٹر بھی ایک اہم مرکز تھا۔ وہ تمام لوگ جو اقتدار کی بندر بانٹ میں

شریک نہ تھے، بڑی تعداد میں یہاں آتے جاتے اور اکثر بہت اچھی امیدیں لیے ہوئے تھے۔ انقلابی حکومت اور انقلابی شوریٰ کا اعلان ہوگیا تو صاف ظاہر تھا کہ خلقیوں کا پلڑا بھاری ہے۔ نور محمد ترہ کی پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے جنرل سیکرٹری، انقلابی شوریٰ کے سربراہ (صدر) اور مجلسِ وزرا کے سربراہ (وزیر اعظم) نامزد کیے گئے۔ ببرک کارمل انقلابی شوریٰ اور وزار کی مجلس کے معاون، حفیظ اللہ امین کو پولٹ بیورو کے رکن ہونے پر مزید ترقی دی گئی اور اسے مجلس وزراء کا معاون (نائب وزیر اعظم) اور وزارت خارجہ کا قلم دان دیا گیا۔ انقلابی شوریٰ میں اکثریت خلقی فوجی افسران کی تھی اور کابینہ میں بھی اہم عہدے انہیں کے پاس تھے۔ بہت جلد معلوم ہوگیا کہ اختیار کس کے پاس ہے۔ انقلاب کی سحر نو کے کمانڈر، امین کے پاس!

انقلاب کے ساتھ ہی قبائل میں ارتعاش اور بغاوت کا اعلان ہوگیا۔ میں پارٹی کے شہر کے دفتر گیا اور کیونکہ پرچمی حکومت کے ایوانوں سے محروم رہ گئے تھے، اس لیے اُن کی کوشش تھی کہ پارٹی پر قبضہ کرلیں۔ وہاں ڈاکٹر نجیب نے پوچھا کہ تم لوگ کیا کر سکتے ہو، کہ قبائل بالخصوص وزیرستان میں بغاوت اور مداخلت کو روکا جا سکے؟ انقلاب کا عام طور پر استقبال ہوا تھا۔ یہ انقلاب کے پہلے پہلے دن تھے اور ابھی اقتدار کے مالکوں نے مارکس اور لینن کو کابل کے گلی کوچوں میں ننگا نہیں پھرایا تھا، وہ بڑے مغالطے میں تھے۔ پرچمی نوجوان اپنی قیادت سے شاکی تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ خلقی حقیقی انقلابی تھے، جبکہ ہماری لیڈرشپ معاملہ گرد۔ کیونکہ فوجی کودتا کا آغاز کرنے والے اور اسے پھیلانے والے خلقی تھے، سوائے محمد رفیع کے جو وطن جار کا افسر تھا اور اسے سارا راز معلوم تھا، اس لیے تختہ الٹنے میں شرکت کی تھی۔ جبکہ اکثر پرچمی فوجی بے خبری میں ابتداء میں داؤد خان کی طرفداری میں اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور تختہ الٹنے کے دوران انہیں حقیقی صورتحال کا اندازہ ہوا کہ یہ اپنوں کی طرف سے ہے، تو انہوں نے رخ بدلا۔ کامیابی کے نشے میں مست خلقی اور بالخصوص لیڈرشپ میں ان کے بڑے، پرچمیوں کو طعنہ دیا کرتے تھے اور ان کے مساوی نمائندگی کے تقاضے کو رد کرتے تھے۔ یہ انقلاب شروع سے آخر تک خالص پختونوں کا انقلاب تھا۔ دیکھتے ہیں پختون اس کے ساتھ کیا کرتے ہیں؟

کیونکہ انقلاب کی سربراہی پشتونوں کے پاس تھی، اس لیے پشتو زبان کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ وہ اہل کابل، جنہوں نے زندگی بھر کبھی پشتو میں بات نہیں کی تھی، وہ بھی اس میں

گفتگو کی مشق کرنے لگے اور اپنے قدیم پشتون رشتے پھر سے یاد کرنے لگے۔ بعض سخت کوش پشتون نوجوان، جو انقلاب کی برکت سے کابل میں نرم و نازک کرسیوں تک پہنچ گئے، تو انہوں نے کابل کی مٹھاس اور گدراہٹ کی تلاش میں دوسری شادی کا فریضہ انجام دیا۔ سب انقلاب کے نشے میں تھے اور دھت تھے۔ ملک میں کلچرل انقلاب کی نقل کرتے ہوئے تمام گلوکاروں کو گلی کوچوں میں لایا گیا اور چوراہوں پر الگ الگ کنسرٹ ہوئے۔ سب چیزوں کو سرخ رنگ دے دیا گیا: دیواریں، جھنڈے، غرض سب کچھ سرخ رنگ میں رنگ دیا گیا۔ ہر وزارت، شعبے، چوک، گاڑی اور کوچے میں ترہ کی کی بڑی بڑی تصاویر آویزاں کی گئیں تھیں۔ ترہ کی کا نام سنتے ہی تالیاں پیٹنا اور 'ہررا' کے نعرے لگانا معمول ہو گیا۔ یہ شخصیت پرستی کی بے ڈھنگی اور بدصورت پشتون صورت تھی۔ افغانستان کی معاصر تاریخ ترہ کی سے شروع ہو کر اسی کی ذات پر ختم کی جاتی تھی۔ انقلاب کے کمانڈر امین نے بہت ہوشیاری سے یہ بت بنانا شروع کیا اور سادہ لوح ترہ کی اس پر بہت خوش تھا، تمام خلقی اسی راستے پر گامزن تھے۔

ہمارا تمام تعلق وزارت سرحدات سے تھا۔ اس وزارت کے لیے پرچمی وزیر، نظام الدین تہذیب کو مقرر کیا گیا۔ اس سے ملنے کے لیے اگر کوئی غیر ملکی آجاتا تو اکثر وہ مجھے مدد کے لیے بلاتا۔ جب وہ امریکی سفیر ڈابز (Dobbs) سے ملتا تو ترجمانی میرے ذمہ ہوتی، اگر ہندوستان کے سفیر سے ملاقات ہوتی تو یہ فریضہ میں ہی انجام دیتا اور پاکستان کے سفیر سے ملاقات میں بھی یہ کام میرے ہی ذمے ہوتا۔ اس زمانے میں ہر وزارت میں انقلاب کے استقبال کے لیے اجلاس منعقد کیے جاتے تھے، اس لیے ایسا ہی ایک جلسہ وزارت سرحدات میں بھی برپا کیا گیا۔ خلق کی طرف سے پولٹ بیورو کے رکن اور وزیر خزانہ عبدالکریم میثاق نے شرکت کی۔ اس جلسے میں اجمل خٹک اور مجھے بھی بلایا گیا تھا۔ میثاق جب آیا تو اس نے 'ہررا' (Hurrah) کا نعرہ بلند کیا اور ترہ کی کی تعریفیں شروع کیں۔ اجمل خٹک بھی اپنی تقریر سے پہلے اٹھے اور ترہ کی کی تصویر کو تعظیم دی اور اسے سیلوٹ کیا، مجھے یہ سب بہت برا لگ رہا تھا۔ ایک وجہ تو یہی رہی ہوگی کہ ہم پر 'پرچمی' رنگ زیادہ تھا اور دوسرے مزاجاً یہ افراط اور انتہا پسندی میری طبیعت کے خلاف تھی۔ لیکن اجمل خٹک ہر بات سے بہت جلد متاثر ہونے والوں میں سے تھے، وہ یوں ظاہر کر رہے تھے گویا وہ بہت پہلے سے خلقی تھے، کچھ اس میں مجبوری بھی شامل رہی ہوگی، لیکن اس میں اجمل خٹک کی

طبیعت کا رنگ بھی شامل تھا۔

☆☆☆

انھیں ایام میں جنرل جیلانی بھی آنازل ہوا اور غالباً امریکا سے آیا تھا، شائد کابل ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ چونکہ اجمل خٹک ان موصوف کے تاریخ جغرافیہ سے اچھی طرح آگاہ تھے اس لیے وزیر داخلہ جو پرچمی تھا، نور احمد نور کو اطلاع دی گئی اور اس نے یہ اہتمام کیا کہ یہ جہاں بھی جاتا، اس پر نظر رکھی جاتی۔ اس کے بارے میں یہ شبہ تھا کہ اسے امریکیوں نے بھیجا ہے۔ وہ ہمارے گھر بھی آیا اور اجمل خٹک سے اپنی نگرانی کی شکایت بھی کی۔ چونکہ موصوف نیپ کا راہنما بھی رہ چکا تھا، اس لیے اسے وزارت ثقافت کے ریسٹ ہاؤس میں بھی چند دن ٹھہرایا گیا۔ پشاور سے عسکر علی شاہ بھی آیا۔ شاہ صاحب صحافی تھے اور خیبر میل کے ایڈیٹر تھے۔ ہمارے گھر آتے تھے اور بہت کرید کرید کر سوالات کیا کرتے تھے۔ محترم کی ایک بات مجھے آج تک یاد ہے کہ: ''افغانستان میں کابل پر قابض ہو جانے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ پورے افغانستان پر قبضہ مکمل ہو گیا''، یہ اس کی درایت کا ثبوت تھا۔

ان دنوں آریانا سینما میں ایک سوویت تاجکی فلم 'داستان سیاہ غوش' لگی ہوئی تھی۔ میں فلم دیکھنے گیا، میرے ساتھ والی کرسی پر وزارت سرحدات کے سابق ڈائریکٹر خدمات پکتیانے صاحب بیٹھے تھے۔ چونکہ ابھی ٹیلی ویژن کا افتتاح نہیں ہوا تھا اس لیے فلم کے آغاز میں ٹریلرز چلا کرتے تھے۔ فلم سے پہلے انقلاب کے بڑوں کو دکھایا جاتا کہ انہوں نے 'جیلوں کے دروازے باندھ دینے' کا جو اعلان کیا تھا اس پر کیسے عمل کیا گیا۔ مجرمین اور قاتل رہا ہوتے گئے۔ اس میں امین کو دکھایا گیا کہ وہ دھمزنگ جیل جاتا ہے اور جیل کی بری حالت دیکھتا ہے پھر تمام قیدیوں کے فائل اور ریکارڈ پھاڑ کر انہیں رہا کرتا ہے۔ یحیٰ کے خاندان کے مظالم یاد کرتا ہے۔ یہ دیکھتے ہوئے پکتیانے میرے قریب ہوا اور کہنے لگا 'یاد رکھو، یہ خود اتنے ظلم کریں گے اور اتنی جیلیں بھریں گے، کہ لوگ یہ سب مظالم بھول جائیں گے۔'' کتنا پیش بین شخص تھا، اس کی کہی ہوئی بات بعد میں حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی۔

☆☆☆

انقلابی کونسل اور وزراء کی کابینہ کی تشکیل کے بعد میں اور اجمل خٹک انقلاب کے بڑوں کو

مبارک باد دینے گئے۔ وزیر سرحدات تہذیب صاحب تو ہماری وزارت کا سربراہ تھا، اس لیے فطری طور پر سب سے پہلے اسے مبارک باد دینے گئے۔ اُن سے ہم نے ترہ کی اور امین سے ملاقات کی خواہش کا بھی اظہار کیا۔ پھر وزارت خارجہ میں امین کو مبارکباد دینے اور ملنے گئے۔ میں نے اُن سے مذاق کیا کہ وزارت تو نفیس لوگوں کی جگہ ہوتی ہے اور تمہارے ارد گرد تو سارے 'بکھرے بالوں والے' جمع ہیں۔ اس نے کہا، جب تک اس وزارت کے ٹائلز پر لوگوں کے قدموں کی نشان نہ بن جائیں، چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ مبارکباد اور چند باتوں کے تبادلے کے بعد ہم واپس لوٹ آئے۔ میرا خیال ہے کہ ترہ کی سے ملنے اجمل خٹک اکیلے گئے تھے یا شائد اس کی نوبت نہیں آسکی تھی، ٹھیک سے یاد نہیں۔ دیگر لوگوں سے ملاقات کا احوال بھی صحیح سے یاد نہیں۔

☆☆☆

جس وقت ریڈیو پر ترہ کی انقلاب کے بنیادی نکات بیان کر رہا تھا، اس کے بعد اس کا 'دری' زبان میں ترجمہ اناؤنسر نے پیش کرنا تھا، لیکن ببرک کارمل خود سٹوڈیو میں داخل ہوا اور 'دری' ترجمہ خود پڑھنے لگا۔ یہ ایک غیر شائستہ عمل تھا اور اس سے رقابت کی بو آتی تھی۔ اس کے علاوہ تمام اہم عہدوں پر امین بہت عجلت میں اپنے خلقی لوگوں کی تعیناتی میں مصروف تھا اور اگر وہ میسر نہ ہوتے تو اپنے قریبی لوگوں کو جگہ دیتا۔ جس قدر عجلت، انتہا پسندی اور لیفٹزم بڑھ رہی تھی، سوشلزم، کمیونزم، مارکسزم اور لینینزم کے مفاہیم زیادہ استعمال ہونے لگے اور معاشرے کے ہاضمے کو نہیں دیکھا جارہا تھا۔ پرچمی نمائندے نسبتاً آہستہ روی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔

پارٹی کے اندر اختلافات دن بہ دن بڑھ رہے ہیں۔ ببرک کارمل کو پراگ، ڈاکٹر نجیب کو تہران، محمود بریالے کو اسلام آباد، نور احمد نور کو واشنگٹن، عبدالوکیل کو لندن، اور ڈاکٹر اناہیتا راتبز اد کو بلغراد میں سفیر کی حیثیت سے بھیج دیا گیا۔ ابھی نظام الدین تہذیب وزارت سرحدات کا وزیر ہے، جب میں اس کے پاس جاتا ہوں اور اس کا حال احوال پوچھتا ہوں تو وہ مجھ سے قلم کی زبان سے گفتگو کرتا ہے۔ میں لکھ کر سوال کرتا ہوں، وہ لکھ کر جواب دیتا ہے، یا وہ سوال لکھتا اور میں اس کاغذ پر اپنا جواب لکھتا ہوں۔ سرفراز مہمند اس وزارت کا نائب وزیر ہے، لیکن وہ بہت محتاط اور خوف زدہ ہے، اور نہیں چاہتا کہ مجھ سے گفتگو کرے۔ اجمل خٹک بھی دن بہ دن خلقی ہوتے جا رہے ہیں۔

☆☆☆

اُن ایام میں لکھی گئیں یادداشتیں

مارچ 1978ء میں میں خفیہ طور پر ایران شاہ کی مدد سے 'ناوہ' اور 'چمرکنڈ' کے راستے پاکستان آیا۔ کچھ دن اپنے بھائی زیارت خان کے ساتھ سیدوشریف، سوات میں گزارے، اپنے عزیزوں رشتے داروں سے ملاقات کی، دیگر اہم مسائل حل کیے اور پھر 6 اپریل 1978ء کو چمرکنڈ سے جلال آباد کے راستے گھر پہنچ گیا۔ سوات میں اطلاع ملی کہ 12 اپریل 1978ء کو باچا خان اپنے جلال آباد والے گھر پہنچ گئے۔

17 اپریل 1978:

استاد میر اکبر خیبر، ڈیموکریٹک خلق پارٹی کے ایک بزرگ، سمجھدار، تجربہ کار، باحوصلہ اور ہمدرد سیاسی کارکن ایک مکروہ عمل کے نتیجے میں رات سات اور آٹھ بجے کے درمیان ایک خائن کی گولیوں کی نشانہ بن گئے۔

18 اپریل:

خیبر شہید کی لاش جب پوسٹ مارٹم کے لیے 'فورنزک طب' لائی گئی، تو پولیس نے مظاہرے کے ڈر سے خفیہ طور پر ان کی رہائش گاہ (میکروریان اول، بلاک 25) واپس پہنچائی۔ کل جنازہ ہے، لیکن وزیر دفاع کی جانب سے فون آیا ہے کہ ہم (بہ شمول باچا خان) کوئی بھی جنازے میں شرکت نہ کرے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہمارے جذبات اور سیاست، دونوں اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ اس جنازے میں شرکت کی جائے۔ ہم جب ہر ایرے غیرے کے جنازے اور فاتحہ کے لیے جاتے ہیں، تو ایسی عظیم شخصیت کے جنازے میں کیسے شریک نہ ہوں؟

22 اپریل:

آج استاد خیبر کی شہادت کے بعد پہلی مرتبہ نجیب کے گھر گیا۔ معلوم ہوا کہ ہماری عدم شرکت کی وجہ سے بہت سے شکوک نے جنم لیا ہے اور لائق صاحب آئے تو انہوں نے تو یکسر نظر انداز کر دیا۔ عام طور پر وہ خیر خیریت اور اجمل خٹک کے بارے میں پوچھا کرتے تھے، لیکن جب نجیب کے باپ نے جنازے میں باچا خان کی شرکت کی بات چھیڑی تو اس نے کہا اب یہ معلوم ہو گیا کہ

باچا خان واقعی پشتون ہے اور پشتونوں کا دردمند ہے۔ بہت سے لوگ (اجمل خٹک کی طرف اشارہ تھا) بڑائی اور بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں، لیکن وہ صرف گندے انڈے ہیں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے، کہ یہ ماحول ہمارے لیے اب کانٹوں کی سیج بنتا جارہا ہے، یہاں سے نکل جانا چاہیے۔

26 اپریل:

کل ڈیموکریٹک خلق پارٹی کے تمام چوٹی کے راہنما خیبر کی شہادت کے بعد گرفتار کر لیے گئے۔ وہ حادثہ، جس سے ہمیشہ پارٹی بچنے کی کوشش کرتی تھی یعنی داؤد کی حکومت سے ٹکر نہ لی جائے، اب ان کی گردن پر آپڑا ہے، اب دیکھتے ہیں کیا بنتا ہے۔

27 اپریل:

(صبح) یہ ملک کس طرف جارہا ہے؟ رجعت پسند بھی دشمن اور ترقی پسند بھی دشمن، دوست صرف موقع پرست، اخوان اور رجعت پسندوں کے ایجنٹ۔ نہ ان پر عربوں کو اعتبار ہے، نہ ایران، نہ امریکا اور نہ روس کو اعتبار ہے۔ حکومت کا سربراہ تنہا، بیوروکریسی بے کار اور بے اعتبار، حکومت کی پارٹی چوروں اور نااہلوں کا گروہ ہے۔ بادشاہی ختم ہوگئی، لیکن جمہوریت سامنے نہیں آئی۔ اسی لیے لوگوں میں بے چینی بڑھ رہی ہے، ذہن منتشر ہورہے ہیں، کنفیوژن بڑھ رہی ہے۔ کوئی راستہ نظر نہیں آرہا اور اس کے پیچھے دشمن کا کوئی طے شدہ منصوبہ محسوس ہوتا ہے، کہ اس موقع سے فائدہ اٹھائے، لیکن وہ کیا ہے، ابھی سمجھ نہیں آرہا۔ داؤد کو دائیں جانب جھکایا جارہا ہے یا پھر اس کا تختہ الٹنے والے ہیں۔ جو بھی ہے، حالات درست نہیں، بلکہ افغانستان کی سلامتی کو بھی خطرہ ہے۔

استاد خیبر کی یاد میں

'خون پھر خون ہے، بہتا ہے تو جم جاتا ہے'

یہ سطور میں نے صبح یہیں تک لکھیں تھیں کہ بعد میں مکمل کروں گا، تاہم گیارہ بجے گولہ باری شروع ہوگئی۔ معلوم ہوا کہ 'ارگ' اور ریڈیو کا محاصرہ کرلیا گیا ہے۔ پھر ٹینکوں، اینٹی ایئر کرافٹ گنوں، جہازوں اور توپوں کی گرج شروع ہوئی۔ رات سات بج کر دس منٹ پر ریڈیو پر اسلم خان نے پشتو اور عبدالقادر خان نے دری میں انقلاب کی کامیابی کی خبر نشر کی۔ پہلے تو مجھے تشویش ہوئی، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ اپنے لوگ ہیں۔

28 اپریل:

کل دن اور رات جلال آباد کا راستہ بند ہونے کی وجہ سے میں حاجی صاحب (نادر خان) کے گھر رہا، دوپہر کے بعد اپنے گھر منتقل ہوگیا۔ گھر کے حفاظتی گارڈ سب سادہ کپڑوں میں تھے اور گھر میں بند تھے۔ معلوم ہوا کہ ہمارے گھر کے پچھواڑے دارالامان والی سڑک پر انقلابیوں اور داؤد کی فوج میں سخت مقابلہ جاری تھا اور کچھ گھروں کو بھی نقصان پہنچا ہے۔

29 اپریل:

نور محمد ترہ کی ڈیموکریٹک ریپبلک پارٹی کی شوریٰ کے سربراہ اور ڈیموکریٹک ریپبلک آف افغانستان کے صدر اعظم مقرر کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر حبیب منگل کے دو بھائی، ایک 'جدران' میں علاقہ دار تھا اور دوسرا وہاں سکول کا طالب علم تھا، جنھیں اخوانیوں نے قتل کر دیا ہے۔

11 مئی:

باچا خان کے لیے میں جلال آباد گیا اور انھیں ان کے بنک اکاؤنٹ کی معلومات پیش کیں۔[۴۰]

18 مئی:

ابھی تک 'جدران' میں گڑبڑ ہوئی ہے۔ دو انقلابیوں کو مار دیا گیا (علاقہ دار بہت زیادہ انتہا پسندی سے کام لیا کرتا تھا)، بعض اخوانی فرار ہوگئے ہیں، کچھ پہاڑوں میں روپوش ہوگئے ہیں، کسی پر بمباری ہوئی ہے اور کچھ گرفتار ہوئے ہیں۔ کونڑ کے علاقے مروره میں بھی گڑبڑ ہوئی ہے۔ پانچ افراد جن میں کہا جاتا ہے کہ دو پاکستانی فوجی بھی تھے اور تین پنجشیر کے تخریب کار گرفتار کیے گئے ہیں۔ شولتن درہ میں اخوانیوں، جماعت اسلامی اور پاکستانی حکومت کی مدد سے بہت سے تخریب کار آئے ہیں۔ 'سرکانڑو' میں تین فوجی اور دو عہدیداروں کو قتل کیا گیا ہے، ان پر بھی بمباری کی گئی۔

28 مئی:

فوج میں خلق اور پرچم کی چپقلش جاری ہے، خاص طور پر خلقی دوست اس بات کو خوب اچھال رہے ہیں۔ یعنی تمام کارنامہ خلقیوں نے کیا اور پرچمی تو داؤد کی طرفداری میں بدنام تھے،

ہم نے ان کی عزت رکھ لی۔

پارٹی اور حکومت کی تفریق مٹا دی گئی ہے، بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ عہدوں کے لیے مقابلہ جاری ہے، ہر کوئی دہائی دے رہا ہے، کہ مجھے عہدہ نہیں دیا گیا، فلاں کو فلاں عہدہ کیوں دیا گیا وغیرہ۔ عملی طور پر یوں محسوس ہوتا ہے گویا جماعت حکومت میں مدغم ہو چکی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جماعت حکومت کی راہنمائی کرے گی یا حکومت جماعت کی۔ محسوس تو یہی ہو رہا ہے کہ حکومت جماعت پر حاوی ہے اور اگر یہی صورت رہی تو جماعت محض حکومتی بیوروکریسی کی ضروریات اور چوکھٹ کی تابع ہو جائے گی۔

انقلابی شوریٰ میں وسعت لائی گئی ہے، لیکن کم تر اور ادنیٰ سمجھ بوجھ کے لوگ اس میں شامل کیے گئے ہیں۔ دوسری خبر یہ ہے کہ مرکزی کمیٹی میں بھی توسیع کی جا رہی ہے، لیکن یہ کن اصولوں کے تحت ہوتی ہے؟ اصولی لوگوں کو ہٹایا جا رہا ہے اور چین کی طرح اصلی اور با اصول کارکن تنہا ہوتے جائیں گے اور انہیں مرکزی کمیٹی سے نکال دیا جائے گا۔ کمزور اور ایک شخص یا خاص لائن کے تابع عناصر کو فوقیت مل جائے گی۔

☆☆☆

(۱)

ثور انقلاب کے بعد ایک اجلاس پولیٹینک میں ہوا تھا اور جس میں ترہ کی کے سوا سب آئے تھے، ابھی پرچم کے ساتھ دوریاں نہیں تھیں۔ اس اجلاس میں محمد اسلم وطن جار نے امین کو جو ایڈریس پیش کیا اور انقلاب کا حکم دینے کے حوالے سے جو تعریفی اور توصیفی کلمات کہے اور اس کے بعد امین نے جو نپی تلی باتیں کیں، تو میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ ہوا کا رخ کس طرف ہے۔

پشتونوں کا انقلاب اختلافات کے ساتھ شروع ہوا اور دونوں گروہ یعنی پرچمی اور خلقی کے راہنما باہم مسابقت میں مصروف تھے۔ کارمل کو اپنے لیے دوسری اور کم پوزیشن پسند نہ تھی، جبکہ خلقی لیڈر، پرچمیوں کے لیے اپنی نفرت چھپانے کا تکلف نہیں کر رہے تھے۔ اس کش مکش میں جس کے پاس بندوق تھی، وہی کامیاب تھا۔ بندوقیں خلقیوں کے پاس تھیں۔ اجمل خٹک نے بھی اپنی حمایت اسی پلڑے میں ڈال دی، اس لیے جو بھی آتا اُس سے ترہ کی کی رہبری اور تدبر کا تذکرہ

کرتے۔ کوشش کرتے تھے کہ اپنے آپ کو خواہ مخواہ خلقیوں کا حمایتی ثابت کریں۔

(۲)

یہ انقلاب کا آغاز تھا۔ میرے دوست ڈاکٹر حسن شیر زئی، داؤد خان کے زمانے سے 'نور شفاخانہ' کے سربراہ تھے۔ وہ ہرات میں اس ہسپتال کی شاخ کھولنا چاہتے ہیں اور میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ میں بھی جاؤں گا۔ طیارے میں ہرات گئے، ہسپتال کی شاخ کا افتتاح کیا۔ ہرات کے ایک اچھے ہوٹل 'موافق ہوٹل' میں قیام کیا۔ ابھی غیر ملکی موجود ہیں، اسی ہسپتال کے ساتھ کرسچین ایڈ کے امریکی نمائندے ٹام لٹل (Tom Little) کے گھر بھی گئے۔ [۲۱] ہرات شہر کے ساتھ ترکمانستان کی سرحد 'تورغنڈی' بھی گئے اور پکنک کی۔ اس وقت نظیف اللہ نھضت (امین کا دوست اور ہمارے پروفیسر مختار احمد کے چچا کا بیٹا) وہاں گورنر تھا، اس سے بھی ملاقات کی۔ اس کے کچھ عرصے بعد ہی ہرات میں شورش برپا ہوگی، طیارے یہاں بمباری کریں گے، ہزاروں ہراتی اور فساد کرنے والے مارے جائیں گے۔ اسی طرح کچھ روسی مشیر اور ماہرین بھی اس دنیا سے رخصت کیے جائیں گے۔

(۳)

ابھی پارٹی کی بدصورتی پوری طرح سامنے نہیں آئی تھی۔ عوام نے عام طور پر انقلاب کا استقبال کیا تھا، اس کا ثبوت اس وقت بہم پہنچا جب انقلابی کونسل نے فیصلہ کیا کہ ملک کا جھنڈا تبدیل کر کے سرخ عوامی انقلابی جھنڈا مقرر کیا جائے۔ نئے جھنڈے کی پرچم کشائی کی تقریب صدارتی محل میں انجام پائی۔ پرچم کشائی کے دن عام تعطیل کا اعلان کیا گیا، پارٹی اور حکومت نے نئے جھنڈے کے سامنے عوام کی سلامی کا انتظام کیا تھا۔

صدارتی محل میں، جس کا نام اب 'دخلکو کور' (عوام کا گھر) رکھ دیا گیا تھا، سٹیج بنایا گیا۔ سٹیج پر پارٹی کا تمام پولٹ بیورو، غالباً چند غیر ملکی مہمان اور راہنماؤں کی بیگمات، میں اور اجمل خٹک کھڑے تھے۔ ہم سب کے ہاتھوں میں نیا پرچم تھا، جسے ہم لہرا رہے تھے۔ ترہ کی نے نئے جھنڈے کی پرچم کشائی کی اور ریڈیو پر قومی نغمے، ترانے اور رواں تبصرے نشر ہو رہے تھے۔ بہت

شور شرابا تھا۔ خوشحالی، مبارکباد اور نئی زندگی کے آغاز کی نوید سنائی کا سلسلہ جاری تھا۔ لائق صاحب ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے وزیر ہونے کے ناطے اسی وقت تحاریر لکھ لکھ کر اناؤنسرز کو دے رہے تھے، جو اسی وقت نشر کی جا رہی تھیں۔

پرچم کشائی کے بعد عوام کا ایک سیلاب تھا جو 'عوام کے گھر' کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ تقریباً مسلسل چھ گھنٹے عوام اس پرچم کو سلامی دینے کے لیے گزرتے رہے۔ جوش اور ولولہ واضح نظر آرہا تھا۔ لیکن بہت جلد ان لوگوں کی خوشی مایوسی میں بدل جائے گی۔ عصر کے وقت جب پرچم کشائی کی تقریب اختتام کو پہنچی، تو راہنما ترہ کی کے دفتر میں جمع ہوئے۔ اجمل خٹک اور میں نے بھی ترہ کی کو مبارکباد پیش کی۔ اس وقت میں نے ترہ کی کو یہ بھی کہا، کہ ہم بھی تمہارے سپاہی ہیں، جس کے جواب میں اس نے کہا، ہم سب ایک دوسرے کے سپاہی ہیں۔

(۴)

انقلاب کے پہلے یا دوسرے مہینے ترہ کی کا بھائی اپنی طبعی موت مرتا ہے۔ اس کی فاتحہ شہرنو کی مسجد علی یعقوب میں ادا کی گئی، میں اور اجمل خٹک وہاں گئے۔ لوگوں کے استقبال کے لیے بہت سے خدائی خدمتگار جمع تھے۔ ان میں حفیظ اللہ امین کا بھائی عبداللہ امین بھی تھا، موصوف شمال میں تمام امور کا مسئول تھا اور کئی ہلاکتوں کا ذمہ دار تھا۔ اتنے میں قلعہ جواد کے حضرات بھی آگئے۔ عبداللہ امین نے دور سے اُن کا تمسخر اڑایا، جو مجھے بہت برا لگا۔ پھر یوں ہوا کہ کچھ ہی دن بعد ان کا پورا گھرانہ ترہ کی۔ امین کی ڈیتھ اسکواڈ کا نشانہ بنا اور ان کی لاشیں تک معلوم نہ ہو سکیں۔

(۵)

شائد یہ اگست 1978ء کا مہینہ تھا جب ہم کارتہ سہ میں پیدل میں گھوم رہے تھے۔ بارش ہوئی تھی اور چہچہ مست میں سیلاب آیا تھا۔ ہمارے ساتھ غلام حسن خان صافی، جن کا گھر چہچہ مست کے دوسری جانب کارتہ چار میں تھا، محو گفتگو تھا۔ اجمل خٹک کے پاس اپنا ٹرانسسٹر تھا، جس پر وہ خبریں سن رہے تھے۔ اتنے میں ریڈیو کابل نے اعلان کیا کہ رجعت پسند، سامراج اور ارسٹو کریسی (مراد 'پرچم' والے تھے) مل کر کوشش کر رہے تھے کہ انقلاب کا تختہ الٹ دیا جائے۔ اس سازش میں

شریک لوگ گرفتار کر لیے گئے ہیں۔ اس کے بعد گرفتار شدگان کے نام لیے گئے: سلطان کشتمند (پرچم)، جنرل رفیع (پرچم)، میر علی اکبر (علی آباد ہسپتال کے سربراہ)، ڈاکٹر یورش (جمہوریت ہسپتال کے معاون سربراہ) اور جنرل شاہ پور احمد زئی (قوم پرست)۔ ڈاکٹر یورش نے ایک وقت میں ہمارے مریضوں کی بہت خدمت کی تھی، کہا جاتا ہے کہ وہ ماؤسٹ تھا۔ اس کے بعد ان گرفتار شدگان میں کشتمند اور رفیع کے سوا باقی سب کو ہلاک کر دیا گیا۔ صافی صاحب کا کہنا تھا کہ یہ قوم پرستوں کا کام تھا اور ان کی گرفتاریوں پر رنجیدہ تھا۔

اس طرح پرچم سے تعلق رکھنے والے تمام سفیر برطرف کر دیے جاتے ہیں اور مقدمہ چلانے کے لیے کابل بلائے جاتے ہیں۔ اُن میں سے کوئی بھی واپس نہیں آتا اور اپنے اپنے سفارتخانے میں جتنے پیسے اور بجٹ ہیں، لے کر رفو چکر ہو جاتا ہے۔ اس میں سب سے بڑی رقم ڈاکٹر نجیب اڑاتا ہے، یعنی پانچ لاکھ ڈالر۔ کیونکہ سفارتخانے کے اکاؤنٹ میں سفارت کی سابقہ عمارت کی فروخت کے پیسے بھی موجود تھے، جو موصوف کے ہاتھ لگتے ہیں۔ پرچم کے خلاف پروپیگنڈا شروع ہوتا ہے اور 'خلق' اور زیادہ اپنے آپ کو انقلابی اور بائیں بازو کی انتہا پسندی کے راستے پر آگے بڑھ جاتی ہے۔ انتہا پسندی کا رجحان بڑھتا ہے اور پرچمیوں کو عہدوں سے برخواست کر دیا جاتا ہے، کئی کو جیلوں میں ڈال دیا جاتا ہے اور بعض کو بالکل غائب ہی کر دیا جاتا ہے۔

(۶)

اس دفعہ پشتونوں اور بلوچوں کا دن (یوم پشتونستان) ایسے حالات میں منایا جا رہا ہے، کہ انقلاب برپا ہو چکا ہے۔ حکومت کی جانب سے اس تقریب میں ہمیشہ کابل کا میئر نمائندگی کیا کرتا تھا۔ کونڑ کے سید گھرانے کے فرزند اور امین کے طرفدار خلقی، شیر آقا حرکت اس فرض کو نبھانے آئے۔ اجمل خٹک اپنی روایتی تقریر کا آغاز انقلاب کی تعریف اور اس کے راہنماؤں، بالخصوص نور محمد ترہ کی کی توصیف سے کرتے ہیں اور اس کے بعد کی تمام تقریر خانوں اور جاگیرداروں اور بہ باطن باچا خان اور اس کی سیاست کے خلاف کی گئی۔ آخر میں محض اتنا اضافہ کیا اور یہ نعرہ بلند کیا کہ: ''اللہ ہمیشہ پشتونوں کے بوڑھے جرنیل کو زندہ رکھے۔'' اس کی ضرورت یوں پیش آئی کہ میئر صاحب نے اپنی تقریر میں باچا خان کی تعریف کی تھی، اس لیے اجمل خٹک مجبور تھے کہ اپنی تقریر

میں باچا خان کے نام کا اضافہ کریں۔ حقیقت میں تقریباً بائیں بازو والی انقلابی اور جاگیرداری کی سیاست کے تضاد پر مبنی تھی۔ یہاں اس بات کا ذکر بے جا نہ ہوگا، کہ 'خلق' ہمیشہ سے نیپ کی سیاست کے مخالف رہے تھے اور ان کا زیادہ جھکاؤ افضل بنگش اور مزدور کسان پارٹی کے ساتھ تھا۔ باچا خان اور ولی خان کو ان کے مکمل ناموں کے حوالے سے 'خلقی' طنزاً 'دگنے خان' (دوسروں والے) کہتے تھے، یعنی جن کے نام کے شروع اور آخر میں لفظ خان ہے: خان عبدالغفار خان اور خان عبدالولی خان!

(۷)

میں نے ذاتی حیثیت میں پرچمیوں سے اپنے تعلقات ختم نہیں کیے۔ بلکہ میں انہیں تسلیاں دیتا تھا اور ان کا حوصلہ بڑھایا کرتا تھا۔ شاید یہ میرے مزاج کا حصہ ہے، کہ میں اپنے تعلقات بہ آسانی کسی اور سے متاثر ہوکر جوڑتا ہوں اور نہ توڑتا ہوں۔ اجمل خٹک نے اپنا گیئر تبدیل کیا ہوا تھا اور اسی رفتار سے رواں دواں تھے۔ مجھے روسی دوستوں کی خاص ہدایت ہے، کہ میں اپنے گھر سے زیادہ دور نہ جاؤں، کسی غیر محفوظ جگہ نہ جاؤں اور احتیاط سے کام لوں۔ وجہ یہ ہے کہ پکڑ دھکڑ، مار پیٹ اور خفیہ ہلاکتیں بہت زیادہ بڑھ گئی ہیں۔

انقلابی شوریٰ ایک کے بعد ایک ریڈیکل اور تیز دھار والے فرمان جاری کر رہی ہے۔ آرڈیننس سننے میں بہت اچھے محسوس ہوتے ہیں، لیکن عوام کے مزاج اور حالت سے مطابقت نہیں رکھتے۔ سب کے سب انتہائی بائیں بازو کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ایک دن میں اور محراب الدین پکتیاوال بیٹھے تھے۔ زرعی اصلاحات کے بارے میں حکم جاری ہوا ہے۔ پکتیاوال اگرچہ خود انتہائی بائیں بازو والا اور روایتی کمیونسٹ ہے، جس نے بلغاریہ میں تعلیم حاصل کی ہے، وہ بھی ان احکامات بالخصوص اراضی سے متعلق آرڈیننس پر اعتراض کر رہا تھا۔ میں اور پکتیاوال ایک طرف تھے، جبکہ اجمل خٹک دوسری طرف۔ ہم نے اس بحث میں دیگر آرڈیننسوں کو بھی غلط قرار دیا۔

(۸)

باچا خان نظریاتی لحاظ سے خان تھے۔ فطری طور پر وہ جاگیردارانہ نظام کی تباہی پر افسردہ

ہوتے تھے، کہ کہیں اسے کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان میں سیاسی بصیرت اور درایت کی بھی کمی نہ تھی۔ اس پر بہت خوش تھے، کہ افغانستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ حکمران پشتون ہیں اور پشتو زبان رائج کی ہے اور اسے اولین درجہ دیا ہے، لیکن پرچمیوں کے بھگائے جانے پر ناراض تھے۔ دو ماہ بعد جب 'تہذیب' ابھی تک وزیر سرحدات تھا، کابل آئے۔ ان کا استقبال کیا گیا اور انہیں سیدھا ترہ کی تک لے جایا گیا۔ ترہ کی اور امین بہت مغرور ہو چکے تھے اور باچا خان کی باتیں انہیں اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔ اس کے باوجود باچا خان نے انہیں اپنی باتیں سنائیں اور انہیں آپس میں اتفاق پیدا کرنے کو کہا۔ انہیں کہا، کہ لوگ کیسے تمہارے پیچھے چلیں گے، جب تمہارا آپس میں اختلاف ہے۔ ترہ کی نے انہیں کہا، باچا خان! تمہارا زمانہ گزر گیا، تم صرف دیکھو، کہ انقلابی نوجوان کیا کیا معجزات دکھائیں گے۔ باچا خان صورت حال کو سمجھ گئے۔ واپس جلال آباد گئے، چند موٹے موٹے شلجم کابل بھیجے کہ یہ ترہ کی کو دیے جائیں اور اسے بتایا جائے کہ یہ میں نے اپنے ہاتھوں سے کاشت کیے ہیں۔ ہم آبادی والے لوگ ہیں بربادی والے نہیں۔ لیکن ترہ کی اور امین بربادی کے راستے پر گامزن تھے۔

(۹)

عجیب بات یہ بھی تھی، کہ ابھی انقلاب پوری طرح افغانستان میں اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہوا تھا، کہ انہیں یہ فکر بھی لاحق ہوگئی تھی کہ یہ انقلاب پاکستان کیسے بھیجا جائے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی تھی کہ وہ افغانستان اور زیریں پشتون علاقوں میں اپنے سوا کسی لیڈر یا پارٹی کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ابھی اپنی پارٹی کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا کہ انہوں نے کوئٹہ اور پشاور میں 'خلق' پارٹی منظم کرنے کی ٹھان لی۔ یہ منصوبہ انہوں نے خلقی کونسلرز کے کاندھوں پر لاد دیا اور پشاور کی ذمہ داری کونڑ کے ماما صفدر کے بیٹے عبدالرحیم سالارزئی کے گلے ڈال دی۔ گویا عظیم تر افغانستان، افغانستان پر 'خلق' کی حکمرانی اور خلق کی سربراہی ترہ کی اور امین کے پاس! انہوں نے پشاور میں سابقہ سوشلسٹ پارٹی کے حسین خان، شمس بونیری وغیرہ کو ساتھ ملایا اور انہیں 'خلق' کی شاخ بنانے کی ذمہ داری تفویض کی۔ کوئٹہ میں بسم اللہ کاکڑ اور اس کے ساتھیوں کو یہ فرض سونپا گیا۔ چونکہ ہم ان کے اچھے لوگوں کی فہرست میں شامل نہ تھے، اس لیے اس سارے منصوبے کو ہم سے خفیہ رکھا

گیا۔صرف ان نئے خلقیوں کی آمدورفت کا ہمیں علم رہتا۔اگرچہ بھرپور کوشش کی جاتی کہ ہمارے ان پرانے ساتھیوں کو ہم سے دور رکھا جائے اور تمام لین دین الگ سے ہو،لیکن اتنے مختصر سے کابل میں کسی بات کو چھپائے رکھنا بھی امر محال تھا۔اس سب کے باوجود، ہم انقلاب کی حمایت میں کھڑے تھے۔

مار پیٹ، گرفتاریوں اور اندھی ہلاکتوں کی خبریں ہم تک پہنچتی رہتیں۔لوگ ڈرے ہوئے تھے، لوگوں نے نقل مکانی بھی شروع کر دی تھی۔لیکن خلقی ابھی دُھت تھے۔وہ ابھی ٹینک سے نیچے نہیں اترے تھے۔کونڑ، کٹہ واز، ہزارہ جات، غزنی، پکتیا اور بہت سی جگہوں میں شورش جاری تھی۔امین کا کہنا تھا کہ مکھی کو بھی ٹینک سے ماریں گے۔

(۱۰)

خلقیوں کے بے جا غرور کا اندازہ اُس واقعے سے بھی لگایا جا سکتا ہے، جس کا ہمیں بہت بعد میں علم ہوا۔ستمبر 1978ء میں جنرل ضیاء الحق نے کابل کا دورہ کیا۔ضیاء الحق لومڑی کی طرح خاکسار اور ہوشیار تھا۔ضیاء الحق نے کابل کا یک طرفہ سفر کیا۔پغمان میں انہیں مہمان بنایا گیا۔اس مہمانداری میں انہوں نے میزبانوں (ترہ کی اور امین) سے کہا کہ آپ لوگ دو کام نہ کریں: اول: شمشاد کی چوٹی پر ٹی وی بوسٹر نہ لگائیں (انقلاب سے اتنے خائف تھے کہ کہیں ٹی وی نشریات پاکستان پر اثر نہ کریں)، دوم: پاکستان میں اپنی پارٹی 'خلق' نہ بنائیں۔آپ کے پاس جو ہمارے لوگ ہیں (اجمل خٹک، صوفی امیر ہزار وغیرہ)، انہیں ہم عزت کے ساتھ واپس لے جائیں گے اور آپ کے لوگ (گلبدین حکمت یار، ربانی صاحب، احمد شاہ مسعود اور دیگر نئے مہاجرین) آپ کو واپس کر دیے جائیں گے۔مہاجرین کیمپ بند کر دیں گے اور اگر آپ چاہیں، تو انہیں بھی واپس بھیج دیا جائے گا۔

لیکن انقلاب کے راہنما تو نشے میں دھت تھے، انہوں نے ضیاء الحق کا مذاق اڑایا۔ترہ کی نے ضیاء الحق کے کاندھے پر آرمرڈ کور کے نشان پر ہاتھ مارتے ہوئے پشتو میں اپنے ساتھیوں سے کہا 'ملکہ وکٹوریا کا کمربند ابھی تک باندھا ہوا ہے'۔ضیاء الحق تھوڑی پشتو جانتے تھے۔دوسرا یہ کہ وہ نیچے سے ترقی کر کے اوپر پہنچنے والا افسر تھا اور ایک منظم فوج کا سربراہ بھی، جس میں سمجھ بوجھ

معمول سے زیادہ تھی۔اس نے یہ ساری باتیں دل پر لکھ لیں اور اس کا نتیجہ چند ماہ بعد سامنے آ گیا۔

(۱۱)

نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی (این ڈی پی) نے بہت پہلے، یعنی نیپ پر پابندی کے بعد اپنے آپ کو جرنیلوں کے قریب کر لیا تھا اور بائیں بازو کے عناصر اور بلوچوں سے دور کر لیا ہوا تھا۔ولی خان بھی بی بی کی سیاست کے مکمل تابع ہو چکے تھے اور یہ پارٹی اب مکمل طور پر حاکموں کی آلہ کار بن چکی تھی۔ ولی خان اور این ڈی پی نے راستہ تبدیل کر لیا تھا اور جرنیلوں کے قریب آ چکے تھے، (بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے جنرل فضل حق اور دیگر جرنیلوں، حتیٰ کہ ضیاء الحق تک کو افغانستان امور پر بریفنگ دینے کا فرض بھی سنبھالا ہوا تھا)۔جب کہ دوسری طرف تمام ترقی پسند ساتھی، جو این ڈی پی سے باہر تھے اور نیشنل پروگریسو پارٹی ترتیب دے چکے تھے، یا وہ ساتھی جو این پی پی سے تعلق رکھتے تھے اور این پی پی کے پیچھے موجود کمیونسٹ پارٹی سے تعلق میں تھے، وہ سب پاکستان نیشنل پارٹی میں اکٹھے ہو گئے تھے۔این ڈی پی کے ترقی پسند عناصر بھی بزنجو کی جانب جا رہے تھے، انہوں نے کابل میں ہم سے بھی رابطہ کیا۔ڈاکٹر شیر افضل اور مصطفیٰ اس سلسلے میں کابل بھیجے گئے اور اجمل خٹک نے ان کی معروضات پہ آمنا وصدقنا کہا۔میں اجمل خٹک کے ساتھ تھا اور اسی کی طرح کمیونسٹ پارٹی سے بھی الگ ہو چکا تھا۔

انقلاب کی برکت سے تمام ترقی پسند عناصر کابل آیا کرتے تھے۔مرتضیٰ بھٹو، شاہنواز بھٹو اور ان کے دیگر ساتھی آئے، کیوں کہ بھٹو صاحب کو ہٹا دیا گیا تھا اور پاکستان کی جانب سے انقلاب کے خلاف اقدامات میں تیزی آ گئی تھی۔انقلاب کے راہنماؤں نے داخلی سیاست کی غلطیوں کی ذمہ داری بھی پاکستان پر ڈالنی شروع کر دی تھی اور اسے علاقائی رجعت پرستی کے سرغنہ کے طور پر پیش کر رہے تھے۔عالمی قوتیں بھی انقلاب کے خلاف کھڑی دکھائی دیتی تھیں۔دوسری طرف ترہ کی اور امین کے انتہا پسندانہ بائیں بازو کے اقدامات اور بے جا پروپیگنڈے نے عوام کو پریشان کر رکھا تھا۔ ناتجربہ کار، نیم تعلیم یافتہ اور جذباتی خلقیوں نے آگ پر تیل ڈالنے کا کام سنبھالا ہوا تھا اور 'کمیونزم' بنانے کی دھن میں ہر الٹا کام کرنے کے درپے تھے۔افضل بنگش، جو انقلاب کے طرفدار اور حمایتی کے طور پر پاکستان میں زیر نگرانی تھا، وہ بھی کابل آیا۔وہ مرتضیٰ اور شاہنواز کے

قریب ہو گیا تھا اور چاہتا تھا کہ ان کے وسائل کو کام میں لائے۔ لیبیا، شام اور متحدہ عرب امارات کی دولت اور حمایت کے باعث حکومت افغانستان بھی اس بات کی متمنی تھی کہ بھٹو کے نام اور اس کی حمایت سے فائدہ اٹھائے اور مرتضیٰ کے منصوبوں میں اُن کا ساتھ دے۔ مرتضیٰ کے ساتھ راجہ انور اور کچھ دیگر نوجوان بھی تھے۔ ان میں سے کوثر علی شاہ اور نیلم بی بی بعد میں ہمارے ہیڈکوارٹر کے غیر رسمی مستقل ارکان کی حیثیت اختیار کر گئے۔

ان ترقی پسندوں میں بعض ہمارے گھر بھی آئے، جیسے شیر علی باچہ، امتیاز عالم، شوکت اور باچا جی کا ساتھ دینے والے کسان لیڈر، جن کی اکثریت مہمند تھی۔ یہ کافی دن ہمارے گھر رہے۔ ہم ہر وقت بحث مباحثے کرتے رہتے۔ میں نے امریکا کی کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری جنرل، جناب گس ہال (Gus Hall) کے ایک پمفلٹ کا پشتو میں ترجمہ کیا تھا۔ شیر علی باچہ چونکہ ماؤازم کا راہی تھا، اس لیے اس نے اس پمفلٹ پہ بہت زیادہ اعتراضات کیے۔ یہ کتابچہ بعد میں کوئٹہ کے ساتھیوں نے شائع کیا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے ایک اور کتاب 'سوشلزم: خیال سے حقیقت تک' کا بھی ترجمہ کیا تھا، جو بعد میں سلیم راز کی مدد سے پشاور میں طبع ہوئی۔ باچہ جی نے زمین پر کام کرنے والے مزدور کے نام سے تنظیم بنائی تھی اور افضل بنگش کو خوشحال کسان کا نمائندہ کہتا تھا۔ امتیاز عالم اور اس کے ساتھیوں نے اپنی تنظیم کا نام 'پنجاب لوک پارٹی' رکھا تھا، جبکہ سندھ میں اکرم دھریجہ نے بھی ایک تنظیم بنائی تھی۔ یہ سب لوگ آپس میں چند نکات پر متفق بھی ہوئے تھے۔

(۱۲)

ہمارے گھر کے ساتھ چمچہ مست ندی کے دوسرے کنارے پر کارتہ 4 میں غلام حسن صافی کا گھر تھا، جس میں وہ اپنے دو بیٹوں 'پتنگ' اور 'ایمل' کے ساتھ رہتا تھا، جبکہ ساتھ والے گھر میں اس کا بڑا بیٹا 'ودیر صافی' رہا کرتا تھا۔ ودیر نے اس وقت چیکوسلواکیہ سے پی ایچ ڈی کی تھی، جس وقت اس کا باپ وہاں سفیر تھا، اب ودیر صافی کابل یونیورسٹی میں پروفیسر تھا۔ موصوف کا روسیوں سے قریبی تعلق تھا، گو کہ وہ کسی تنظیمی کام میں حصہ نہیں لیتا تھا۔ میں اکثر ان کے گھر جایا کرتا تھا اور زیادہ تر وقت ان کا مہمان رہتا۔ میں ان کے ساتھ اپنی اطلاعات کا تبادلہ بھی کرتا۔ وہ بھی 'خلق' کی بائیں بازو کی انتہا پسندی سے ناخوش تھے۔ وہ انقلاب کے حمایتی تھے، لیکن انقلاب کے

راہنماؤں کی حرکتوں سے نالاں تھے۔ پرچمیوں کو الگ کرنے کو وہ ایک غلطی قرار دیتے تھے۔ وہ بھی اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ موجودہ حالت تبدیل ہوگی، پرچمی دوبارہ اقتدار میں آئیں گے اور پارٹی میں تبدیلیاں آئیں گی، اور اگر ایسا نہ ہوا تو سب کچھ تباہ ہوگا۔

(۱۳)

بعض سرکاری تقریبات میں مجھے اور اجمل خٹک کو بھی بلایا جاتا ہے۔ انقلاب کے بعد روس کے انقلاب اکتوبر کی سالگرہ آ پہنچی۔ یہ جشن کابل ننداری نام کے سینما ہال میں منایا گیا، اس جشن میں بعض غیر ملکی وفود نے بھی شرکت کی۔ شاید ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کے ایک رکن نے بھی اس میں شرکت کی تھی۔ امین صاحب اپنے انقلاب کی توصیف اور اہداف کے بیان میں بہت دور نکل گئے۔ اس نے بغیر کسی مدد کے افغان فوج، جو بقول اُن کے پرولتاریہ کی صحیح نمائندہ تھی، کے انقلاب برپا کرنے پر روشنی ڈالی، انقلاب ثور کا انقلاب روس سے تقابل پیش کیا، اور نور محمد ترہ کی کا تقابل لینن سے کیا۔ انقلاب کا ہدف قومی جمہوری انقلاب کی بجائے سوشلزم کو ٹھہرایا۔ یہ ایک ایسا انتہائی بائیں بازو کا بیان تھا، جس کا افغانستان کے حالات سے کوئی مطابقت نہ تھی۔ امین کی سوشلسٹ نظریے کی تفسیر معروضی اور موضوعی اغلاط سے پر تھا۔ ایسی تفاسیر انقلاب کے خاتمے کی پیش گوئی کے مترادف تھیں۔ پاکستان میں تو سوشلسٹ پارٹی نے اپنے اخبار میں یہاں تک لکھ دیا کہ 1982 تک پاکستان میں انقلاب آ چکا ہوگا۔ امین صاحب کی تقریر بھی ایسی ہی بے تکی پیش گوئیوں سے بھری پڑی تھی۔

(۱۴)

پرچمیوں کو ایک طرف کرنے اور زک پہنچانے کے بعد ان کے باقی ماندہ طرف داروں کا ہمارے گھر آنا جانا تقریباً ختم ہو گیا۔ اگر کبھی میرے سامنے ہوتے تو دل کے پھپھولے پھوڑتے، میں ان کا حوصلہ بڑھایا کرتا۔ خلقیوں کی طرف سے ہمارے گھر رسمی آمد و رفت فقط اقبال وزیری کیا کرتا تھا، وہ جنوبی وزیرستان کا احمد زئی وزیر تھا۔ رشید وزیری جو جیل میں تھا، اس کا قریبی عزیز بلکہ بھانجوں میں سے تھا۔ تاہم وہ امین کا قریبی ساتھی اور انتہائی متعصب تھا۔ اقبال وزیری کے ساتھ اجمل خٹک کا قرب بہت بڑھ گیا، کچھ ضرورت کے تحت اور کچھ طبیعت کی مجبوری کے

باعث۔اس کے برعکس اجمل پرچمیوں کی طرف بالکل متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ترہ کی ابھی زندہ تھا اور افغانستان کا سربراہ تھا۔مجھے امین صاحب نے پارٹی کی تاریخ ارسال کی، جوانہی کے نکتہ نظر کے مطابق پشتو میں لکھی گئی تھی۔انہوں نے پیغام بھیجا، کہ میں اُس کا انگریزی میں ترجمہ کردوں۔ میں نے ترجمہ کرکے ٹائپ کیا اور بھجوا دیا۔اس کے بعد میں نے نہیں دیکھا کہ طبع کیا گیا یا نہیں، تاہم کسی کی زبانی علم ہوا تھا کہ وہ شائع کیا گیا تھا۔

(۱۵)

سوویت یونین پر اکثر یہ الزام لگایا جاتا ہے اور خصوصاً خلقی ایسا کہتے ہیں کہ اختلافات پیدا کرنا، پارٹی کو بائیں بازو کی انتہا کی جانب دھکیلنا اور ترہ کی اور امین کے درمیان اختلافات پیدا کرنا (اگرچہ یہ بعد میں ضرورت بن گیا تھا)، وہ قصداً کیا کرتے تھے، تاکہ اپنی آمد کے لیے راستہ ہموار کریں، تاہم میرا تجربہ اور مطالعہ اس کے بالکل برعکس ہے۔یہ معذرت خواہانہ اور بہانے تراشنے والا رویہ ہمارے لوگوں کی عادت ہے، کہ ہر اچھائی کا تاج اپنے سر رکھتے ہیں اور برائی دوسروں سے منسوب کردیتے ہیں۔روسی کوشش کرتے تھے کہ پارٹی میں اختلافات پیدا نہ ہوں، اس مقصد کے لیے انہوں نے مرکزی کمیٹی میں عالمی امور کے سربراہ اور پولٹ بیورو کے نامور آلٹرنیٹ رکن بورس پانا ماریوف تک کو بھجوایا، لیکن وہ بھی ناکام رہا۔اس کے بعد انہوں نے صرف خلقی راہنماؤں کی امداد کا فیصلہ کیا، لیکن ان کے فیصلے غلطیوں اور انتہا پسندی کا مجموعہ تھے۔ انہیں کبھی بائیں بازو کی انتہا پسندی درکار نہ تھی، بلکہ کہا کرتے تھے کہ یہ پشتون ہیں، اس لیے یہ کچھ غلطیاں تو کریں گے۔لیکن جب سب کچھ قابو سے باہر ہوگیا، گاؤں اور دیہاتی علاقے اٹھ کھڑے ہوئے، انقلاب محصور ہوگیا اور مار پیٹ شروع ہوگئی تو وہ جان گئے کہ از سر نو پارٹی کی وحدت کے بغیر اب کوئی چارہ نہیں۔[۲۲] اس کے لیے انہوں نے بہت زور ڈالا۔مجھے میرے روسی رابطہ کار، اوساچی نے کہا کہ اس مقصد کے لیے چیکوسلواکیہ کی کمیونسٹ پارٹی کے پولٹ بیورو کے نامور رکن اور نظریہ دان، واسیلی بیلاک آرہے ہیں اور اس حوالے سے چند تجاویز پیش کریں گے۔اوساچی نے مجھ سے پوچھا، اس کا کچھ اثر ہوگا؟ میں نے اسے کہا، کہ پانی سر سے گزر چکا ہے، مشکل ہے کہ وہ کچھ کرسکے۔میری بات درست ثابت ہوئی اور اس بے چارے کو ناکام لوٹنا پڑا۔

(۱۶)

نظیف اللہ نہضت ہرات کے بعد غزنی کا گورنر مقرر ہوا اور امین کی حکومت کے مستحکم ہونے کے بعد کیوبا میں سفیر مقرر ہوگیا۔یہ ابھی غزنی میں ہی تھا کہ پروفیسر مختار گاؤں سے کابل آگیا۔ انقلاب آچکا تھا اور اس کے چچا کا بیٹا اقتدار تک پہنچ گیا تھا، وہ چاہتا تھا کہ اس سے ملاقات کرے۔ہم اکٹھے غزنی گئے اور ایک یا دو رات اس کی میزبانی کا لطف اٹھایا۔اس کی تفاصیل مجھ سے بھول گئیں ہیں۔

(۱۷)

پرچم اور خلق کے اختلافات کو تو میں خوب سمجھ چکا تھا، وہ اب پروپیگنڈے کا مستقل حصہ تھا۔پرچم پر دربار کے ایجنٹ، جنرل زادوں (کارمل کا باپ جنرل تھا) ارسٹوکریسی اور رجعت پسندی کے الزامات تقاریر، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی نشریات اور اخبارات کی تحاریر کا لازمی حصہ تھا۔ لیکن خلق کے اندر استاد اور شاگرد یا خود امین کے الفاظ میں ناخن اور گوشت (ترہ کی اور امین) کے درمیان اختلافات کتنے گہرے ہیں، اس کا مجھے پوری طرح علم نہ تھا، محض سرسری افواہیں میرے کانوں تک پہنچتی تھیں۔پھر مجھے میرے روسی رابطہ کار تک سے یہ ہدایت تھی، کہ میں زیادہ نہ پھروں اور احتیاط کروں۔اس بات کا علم مجھے نہیں تھا کہ امین اور ترہ کی میں اختلافات کی دراڑ بہت گہری ہوچکی ہے اور پارٹی عملاً دونوں کے حمایتیوں میں تقسیم ہوچکی ہے۔یہ سارا معاملہ اس وقت میرے علم میں آیا، جب (غالباً ستمبر 1979 میں) نور محمد ترہ کی ہوانا میں غیر وابستہ ممالک کی کانفرنس میں شرکت کے لیے گیا اور واپسی پہ ماسکو قیام کیا۔وہاں انہوں نے روسی راہنماؤں، بالخصوص برزنیف سے ملاقات کی اور پھر وہاں افغان طلبہ کے ایک وفد کی میٹنگ سے جو خطاب کیا، وہ کابل ٹیلی ویژن کے ذریعے نشر کیا گیا۔اس گفتگو میں انہوں نے اشارتاً امین کا نام لیے بغیر کہا کہ ہماری پارٹی میں سی آئی اے کا سرطان پھیل رہا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس سرطان کو پارٹی سے کاٹ کر الگ کردوں۔یہ انتہائی نامعقول بیان تھا، لیکن ترہ کی بنیادی طور پر بہت سادہ لوح تھا، اس کے اردگرد سب کچھ امین کے کنٹرول میں تھا۔اسکے محل کے ملازمین، حتیٰ کہ اس کے ذاتی محافظ بھی امین

کے اپنے لوگ تھے۔ اُن کے ساتھ بیرون ملک باڈی گارڈ کی حیثیت سے سفر کرنے والا داؤد تڑون اور وزیر خارجہ شاہ ولی بھی امین کے قریبی لوگ تھے۔ ترہ کی نے کس سے ملاقات کی (جیسے ماسکو میں کارمل سے ملا تھا)، کیا کہا، ان سب باتوں کی رپورٹ فوری طور پر امین تک پہنچ جاتی تھی۔

بہت سی باتیں، جیسے یہ کہ امین چاہتا تھا کہ ترہ کی کے طیارے کو ہوا میں ہی مار گرائے، یہ کہ ترہ کی کے طرف دار وزراء اسلم وطن جار، سید محمد گلاب زوی، شیر جان مزدوریار، اور اسد اللہ سروری کو برطرف کر دیا گیا تھا یا اس کی کوشش کی گئی تھی، یہ کہ امین کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا، لیکن وہ دوسرے راستے سے ترہ کی کے استقبال کے لیے ہوائی اڈے پہنچ گیا، اور یہ کہ ترہ کی نے اترتے ہی اُس سے پوچھا تھا کہ میرے وزیر کہاں ہیں؟ اور یہ کہ امین صاحب نے اُن سے کہا کہ یہ سب تمہارے سامنے موجود ہیں، ان تمام باتوں کی اطلاع ہمیں بعد میں پہنچی۔

(۱۸)

شاید چیکوسلواکیہ میں مزدوروں یا کسانوں کی تنظیموں کا اجلاس تھا، انہوں نے سوشلسٹ پارٹی سے ایک وفد بلایا تھا، اس وفد میں چودھری فتح محمد، رحمان (سہراب سائیکل بنانے والے) اور ایک اور فرد (نام بھول رہا ہوں) واپسی پہ ہماری طرف آئے اور ہمارے ہی گھر ٹھہرے تھے۔ انقلاب، پیش رفت اور سوشلزم کے بارے میں بحث مباحثے ہوتے رہے۔ انہوں نے کس سے ملاقات کی اب مجھے یاد نہیں۔ لیکن انہیں ویزے یا ایگزٹ ویزے کا مسئلہ پیش آگیا تھا۔ میں نے ان کے پاسپورٹ لیے، وزارت خارجہ گیا، وہاں انتظامی امور کے نائب وزیر خارجہ عبدالحمد درد مانگر تھا۔ وہ عطاء محمد شیرزئی کا داماد تھا، جبکہ شیرزئی کے تمام بھائی ہمارے دوست تھے۔ عبدالحمد امین کے خاص الخاص لوگوں میں سے تھا، اُن کو میں نے پاسپورٹ دیے۔ اُن سے پتا چلا کہ معاملہ پیچیدہ ہے۔ انہوں نے ترہ کی کی مخالفت میں کچھ باتیں کیں اور کہا کہ وہ چاہتا تھا کہ امین کو بیچ میں سے ہٹا دے۔ میں نے ڈر کے مارے زیادہ سوالات تو نہیں کیے، لیکن واپسی میں اجمل خٹک اور مہمانوں کو صورتحال سے آگاہ کیا۔ ایک یا دو دن بعد میڈیا کے ذریعے ترہ کی کے استعفے کی خبر نشر کی گئی۔ ان سب باتوں کا ہمیں بہت بعد میں پتا چلا کہ محل میں گولیاں چلیں، تڑون مارا گیا، امین بھاگ گیا اور ترہ کی کا محاصرہ کر کے اسے ہتھکڑی لگا کر قید کر دیا گیا۔

البتہ امین صاحب نے حکومت، پارٹی اور ریاست کی باگیں اپنے ہاتھوں میں کر لیں۔ پشتونوں کا انقلاب خون سے شروع ہوا، خون میں ڈوبا رہا اور خون پر ہی ختم ہوگا۔ یہ الگ اور بہت طویل کہانی ہے۔

(۱۹)

افغانستان میں یا تو بالکل کچھ نہیں ہوتا اور جب واقعات پیش آنا شروع ہوتے ہیں تو ان کی تیز رفتاری دیدنی ہوتی ہے۔ صرف ایک ستمبر (1979) میں سب کچھ ہو گیا۔ ایک دن خبر نشر ہوئی کہ اسلم وطن جار، سید محمد گلاب زوی، شیر جان مزدوریار اور انٹلی جنس کے محکمے یعنی آگسیا (د افغانستان دگٹو ساتونکی ادارہ: افغانستان کے مفادات کے تحفظ کا ادارہ) کے سربراہ اسد اللہ سروری کو اپنے عہدوں سے برطرف کر دیا گیا۔ حالانکہ یہ سب لوگ ترہ کی کے امین کو بیچ میں سے ہٹانے کے منصوبے کی ناکامی کے بعد روپوش تھے۔ (بعد میں معلوم ہوا کہ وہ سوویت یونین کے سفارت خانے میں چھپے ہوئے تھے، جنہیں روسیوں نے خفیہ طور پر روس منتقل کیا۔)

پھر بہت جلد اعلان ہوا کہ نور محمد ترہ کی اس بیماری کے باعث جو انہیں لاحق تھی، انتقال فرما گئے۔ (اس کا علم بھی ہمیں بعد میں ہوا کہ امین نے اپنے بندوں کے ذریعے اس کے چہرے پر تکیہ رکھ کر دم گھونٹ کر مارا تھا اور لاش کو خفیہ طور پر کسی نامعلوم مقام میں دفن کر دیا تھا۔) سید داد تڑون اور نواب 'عوام کے گھر' (محل) میں امین کی طرف داری کے باعث مارے گئے تھے اس لیے صدر حفیظ اللہ امین نے جلال آباد شہر کا نام 'تڑون شہر' اور لشکر گاہ کا نام 'نواب شہر' رکھا۔ اجمل خٹک نے امین کو مبارکباد کا خط لکھا، جو میڈیا کے ذریعے نشر کر دیا گیا۔ یہ یقیناً ایک نامعقول قدم تھا۔

امین صاحب نے قانون، عدل اور سلامتی کا نیا نعرہ بلند کیا اور قتل عام کی ساری ذمہ داری ترہ کی پر ڈالتے ہوئے، وزارت داخلہ میں ان بارہ ہزار افغانوں کی فہرست آویزاں کر دی، جنہیں قتل کیا گیا تھا۔ تاکہ لواحقین آ کر اس فہرست سے اپنے پیاروں کے نام جان لیں۔ لوگ کہتے تھے کہ ترہ کی اور امین نے پینتس ہزار افغانوں کو الگ الگ وحشیانہ طریقوں سے موت کے گھاٹ اتارا تھا، ان مظلومین میں وہ بھی تھے، جنہیں ہوائی جہازوں سے زندہ نیچے پھینک کر قتل کیا گیا تھا۔

(۲۰)

ترہ کی صاحب کے قتل کے بعد میں سمجھ گیا کہ یہ انقلابی اقتدار نہیں چل سکتا۔ ایک ہی راستہ بچتا ہے کہ امین، امریکا، پاکستان اور اخوانی آپس میں اتحاد کرلیں۔ کیونکہ فوج میں ترہ کی کے حمایتی زیادہ تھے، جو ایک کے بعد ایک 'ریشخور' اور 'بالا حصار' میں اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ ان کی بغاوت کچل دی گئی، لیکن اس نے امین کو کمزور کردیا۔ انقلابی بغاوت کو جس طرح کاسترو اور چی گویرا نے سنبھالا، وہ مثالی ہے۔ وہ چند لوگ تھے، لیکن اپنے ساتھ اوروں کو ملاتے چلے گئے اور ایک دن سارا کیوبا ان کے ساتھ ہوگیا، پشتونوں کا انقلاب اس کے بالکل الٹ راستے پر گامزن تھا۔ پہلے اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری اور ان کے بیچ رہنے والے طرف داروں سے اگر پوچھا جائے تو وہ سارا الزام روس پر دھر دیں گے۔ میرا اکبر خیبر کی پیش گوئی درست ثابت ہو رہی تھی۔

سوویت سفیر الیکزندر یوزانوف ترہ کی اور امین کے درمیان بیچ بچاؤ کرانے یا اس بہانے امین کو ختم کرنے کئے الزام میں حفیظ اللہ امین سے تند و تیز جملات کے نتیجہ میں بعد میں امین کی درخوست پر تبدیل کردیے گئے، اگرچہ سفارتی سطح پر دونوں کا ایک دوسرے پر تکیہ تھا۔ امین صاحب نے پاکستان کی طرف ہاتھ بڑھا دیا تھا۔ ان کے پاس بچاؤ کا اور کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ سوویت یونین کبھی بھی اپنے پڑوس میں ایسی حکومت برداشت نہیں کریں گے، جس سے اُس کی سرحدیں غیر محفوظ ہو جائیں۔ یوں سوویت یونین اب کوئی قدم اٹھانے پر مجبور تھا۔ یہ کہنا کہ روس گرم پانیوں تک آنا چاہتا تھا، یا اس نے جان بوجھ کر افغانستان میں کمیونسٹ پارٹی میں نفاق کے بیج بوئے تھے اور سب فسادات اور قتل مقاتلے اس کی پشت پناہی کے باعث تھے، سب بے کار کی باتیں ہیں۔ اصل میں پارٹی اس میں ناکام ہوگئی تھی کہ اپنی وحدت کو قائم رکھ پاتی، عوام سے درست برتاؤ کرتی اور اپنے ملک اور علاقے کی مفادات کا خیال رکھتی۔ روسی بعد میں امین کو سی آئی اے کا گماشتہ کہتے تھے۔

(۲۱)

حفیظ اللہ امین کا دورِ حکومت بھی عجیب تھا، حادثات، تشویش اور کچھ ہونے کے خوف سے

بھرا ہوا دور۔ کسی کو یقین نہ تھا کہ یہ حالت اسی طرح قائم رہ سکتی ہے۔ کیونکہ انجام تقریباً طے تھا۔ وددیر صافی اور میں اکثر اس پر بحث کیا کرتے تھے۔ دونوں اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ روسی مداخلت کریں گے۔ دسمبر 1979 کے تیسرے عشرے میں روس کے بڑے طیاروں کی گڑگڑاہٹ میں اضافہ ہوگیا جو ہمیں سونے نہیں دیتے تھے۔ ایک رات ہم ٹی وی پر خبریں دیکھ رہے تھے کہ اچانک خبریں پڑھنے والا گھبرا گیا اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ کیا ہو رہا ہے۔ اتنے میں وددیر صافی نے مجھے فون کیا اور کہا کہ ریڈیو کھولو، کارمل کی تقریر آرہی ہے۔ ریڈیو کھولا تو وسطی ایشیاء کے کئی سٹیشنوں سے کارمل کی تقریر بار بار نشر کی جارہی تھی جس میں وہ کہہ رہا تھا کہ امین بے امین اور میر غضب کی ظلم اور وحشت کی حکومت ختم ہوچکی اور متحدہ پارٹی نے حکومت سنبھال لی ہے۔

کابل میں گولیاں چل رہی تھیں، تپہ تاج بیگ، جہاں حفیظ اللہ امین نے 'عوام کے گھر' سے اپنا ہیڈ کوارٹر منتقل کیا تھا، لڑائی کی زد میں تھا۔ لیکن یہ مزاحمت زیادہ دیر جاری نہ رہ سکی اور 26-27 دسمبر 1979 کی رات ختم ہوگئی۔ صبح جب ہم جاگے تو کابل کے چوراہوں پر روسی فوجی اور ٹینک کھڑے تھے۔ 27 دسمبر کو ببرک کارمل متحدہ پارٹی کا سربراہ، انقلابی شوریٰ اور کابینہ کا سربراہ (صدر اور وزیرِاعظم) کے طور پر اعلان کیا جارہا تھا اور امین کو انقلابی عدالت کی جانب سے پھانسی پر لٹکانے کا بھی اعلان کیا جارہا تھا، حالانکہ وہ جنگ کے دوران مارا جاچکا تھا۔

(۲۲)

حاجی نادر خان ذخہ خیل کا ہونے والا داماد، شفیع جو ابھی کابل پولی ٹیکنیک کالج کا طالب علم تھا، پرچمی تھا، اسے خلقیوں نے دیگر پرچمی طلبہ کے ساتھ ہلاک کردیا۔ نادر خان کے روابط امین کے ساتھ معمول کے مطابق تھے، مگر موصوف کے لیے گھیرا تنگ ہو چکا تھا۔ اس نے بھاگنے کے لیے یہ بہانہ بنایا کہ تیراہ کے علاقے میں پاکستانی حکومت کی شرارت اور فساد بہت بڑھ گیا ہے، جس کی روک تھام کے لیے اسلحے کی ضرورت ہے۔ موصوف کو اسلحہ فراہم کردیا گیا۔ حاجی صاحب کی بہت کوشش تھی کہ مجھے بھی ساتھ لے جائیں، کئی بار میری منت کی کہ تم کابل میں کیا کر رہے ہو، چلو میرے ساتھ تیراہ چلو، سیر بھی ہو جائے گی، وقت بھی اچھا کٹے گا۔ مجھے یوں ہی شک ہوا کہ حاجی صاحب تو کبھی مجھ پر اتنے مہربان نہیں رہے، اب انہیں کیوں مجھ پر اتنا پیار آرہا ہے۔ میں

نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد یوں ہوا کہ حاجی صاحب گئے تو ہمیشہ کے لیے گئے، ضیاء الحق کے سامنے ہتھیار رکھ دیے اور اس کا بہت عزت و احترام کیا گیا۔ حاجی صاحب کا قد اور بھی بڑھ جاتا، اگر مجھے بھی ساتھ لے جاتے۔ سارا فائدہ موصوف کو ہوتا اور میں یونہی رہ جاتا یا جیل بھیج دیا جاتا۔

ورکنگ گروپ

ورکنگ گروپ بنانے کی اصل علت کچھ یوں تھی کہ ذوالفقار علی بھٹو کے عہد حکومت میں حیات محمد خان شیر پاؤ کے قتل کے بعد نیشنل عوامی پارٹی پر پابندی لگا دی گئی اور پھر اس پابندی کی توثیق سپریم کورٹ آف پاکستان نے اپنے ایک واضح فیصلے میں کر دی، اسی وجہ سے نیپ کے راہنماؤں، اسمبلی کے ارکان اور دیگر بلند مرتبہ کارکنان کو پانچ سال تک سیاسی سرگرمیوں کی اجازت نہ تھی۔ یہ راہنما ایک سازش کیس میں حیدر آباد جیل میں قید تھے۔ اس لیے سیاسی خلا پر کرنے کے لیے شیر باز مزاری اور بیگم نسیم ولی خان کی قیادت میں نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی (این ڈی پی) بنائی گئی۔ لیکن یہ نئی پارٹی ترقی پسند نظریات کی علمبردار نہ تھی، بلکہ بڑی حد تک دائیں بازو کی قوتوں کے زیر اثر تھی۔ اس کے برعکس کمیونسٹوں نے ڈاکٹر اعزاز نذیر کی قیادت میں نیشنل پروگریسو پارٹی (این پی پی) تشکیل دی۔ اس لیے ہم نے این پی پی کے بجائے این ڈی پی کی حمایت کی اور اپنے موقف کی وضاحت کے لیے ایک مقالہ بھی لکھا۔ یہ مقالہ پھر 'زوان ژغ (صدائے جوان)' میں اردو، پشتو اور انگریزی زبان میں شائع کیا۔ یہ جریدہ ہمارے جنوبی پختونخوا کے پختون زلمے کے کیمپ میں سائیکلوسٹائل کی صورت میں نکلا کرتا تھا۔ ہم اسے خفیہ طور پر شائع کرتے تھے۔

دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ پاکستان میں بھٹو کے خلاف پاکستان نیشنل الائنس (پی این اے) کی تحریک جاری تھی اور ایئر مارشل اصغر خان نے فوج کو خط لکھا تھا اور ایسا بیان دیا تھا جس سے ظاہر ہو رہا تھا گویا اصغر خان نے فوج کو اقتدار سنبھالنے کی دعوت دی ہے۔ اجمل خٹک نے بی بی سی سے ایک انٹرویو میں اصغر خان کے موقف کی تائید کی، جس کے نتیجے میں کمیونسٹ پارٹی نے انہیں پارٹی سے نکال دیا۔ این ڈی پی بھی بغض معاویہ کے تحت جماعت اسلامی اور دیگر دائیں بازو کی جماعتوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑی تھی۔ ہمیں بھی این ڈی پی سے بہت سے اختلافات تھے لیکن صدر داؤد کے ڈر سے ہم اس کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ مختصر یہ کہ ضیاء الحق نے بھٹو کا تختہ الٹ دیا اور یوں افغانستان کے ساتھ مفاہمت ہو گئی۔ حیدر آباد ٹریبونل ختم کر دیا گیا، سابقہ نیپ کے بلوچ اور پشتون راہنماؤں اور کارکنوں کو آزاد کر دیا گیا، افغانستان میں قیام پذیر

پشتون اور بلوچ (سوائے مری قبیلے کے) واپس پاکستان چلے گئے۔ نیپ کے بلوچ راہنما ایک طرف رہ گئے اور وہ این ڈی پی کے ساتھ نہ چل سکے۔ ولی خان نے نہ صرف ضیاء الحق کی حکومت کی حمایت کی بلکہ یہاں تک کہا کہ: ''قبر ایک ہے، اس میں ضیاء کو لیٹنا ہوگا یا بھٹو کو'' یعنی فوجی حکومت کو اس بات پر اکسایا کہ بھٹو کو جسمانی طور پر بھی ختم کر دیا جائے۔ یوں ہم بیچ میں رہ گئے، نہ این پی پی کے ساتھ تھے اور نہ اعلانیہ این ڈی پی کی سیاست کی تائید کر سکتے تھے۔

انقلاب ثور (27 اپریل 1979) برپا ہوا تو ولی خان اس وقت لندن میں تھے۔ چونکہ خلق اور پرچم ابھی افغان حکومت میں شریک تھے، اس لیے ولی خان نے اپنے سامان کے بھرے صندوق آریانا جہاز کے ذریعے کابل بھجوائے۔ مگر مجموعی طور پر این ڈی پی اور ولی خان سیاسی طور پر انقلاب کی بجائے ضیاء الحق کے ساتھ تھے۔ ان حالات میں ہم مجبور تھے کہ ورکنگ گروپ کے نام سے ایک عارضی کمیونسٹ گروپ تشکیل دیں۔ اس گروپ کے ساتھ پاکستان میں میاں شاہین شاہ اور سلیم راز اپنے دیگر دوستوں کے ساتھ شامل تھے۔ بعد میں جب غوث بخش بزنجو نے پاکستان نیشنل پارٹی (پی این پی) کے نام سے پارٹی تشکیل دی اور ان کا ایک وفد ڈاکٹر شیر افضل کی قیادت میں ہمارے پاس کابل آیا تو ورکنگ گروپ نے پی این پی کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا۔

ورکنگ گروپ بنانے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ ہم کمیونسٹ پارٹی کے تنگ قافیے سے آزاد ہو گئے اور تمام جمہوری اور بائیں بازو کی قوتوں سے آزادانہ طور پر مذاکرات، بحث مباحثے اور فیصلوں کی آزادی ملی۔ ثور انقلاب کے بعد بہت سے بائیں بازو کے گروہوں نے کابل میں ہمارے گھر کا رخ کر لیا۔ ان میں اکثریت کل تک کے ماؤنواز تربیت یافتہ افراد کی تھی، جنہوں نے اب قبلہ تبدیل کر لیا تھا کیونکہ چین ثور انقلاب اور 'دوسرے مرحلے' کی مخالفت میں مغربی محاذ کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس سلسلے میں ہمارے گھر شیر علی باچا اور اس کے ساتھی آئے، ان سے بات چیت اور فیصلے ہوئے۔ ان کے ساتھ امتیاز عالم اور شوکت بھی تھے جو واپسی کے سفر میں مہمند ایجنسی میں گرفتار ہو کر جیل پہنچ گئے تھے۔

افضل بنگش بھی بھاگ کر آیا تھا، اسے پہلے کابل ہوٹل میں رہائش دی گئی اور پھر پل سرخ کے ساتھ کارتہ سہ میں ایک گھر دے دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہماری ملاقاتیں کابل ہوٹل میں ہوتی تھیں۔ یہ ابھی انقلاب کا پہلا مرحلہ تھا، وہ چاہتا تھا کہ سب مل کر ایک فرنٹ تشکیل دیں، لیکن ہم

ابھی اکیلے تھے۔ بنگش صاحب پاکستان پیپلز پارٹی اور بالخصوص 'الذوالفقار' کے بہت قریب تھے، اور ان کے خیال میں ہم افغان حکومت کے قریب تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ اگر کوئی ہمیں (ہم سے مراد مرتضیٰ بھٹو کو شامل کر کے) اسلحہ دے تو افغان حکومت اسے اپنی سرزمین سے پاکستان کی طرف لے جانے کی اجازت دے۔ ہم نے کہا کہ ہمارا سابقہ تجربہ ہمیں اس طرح کی کسی بھی مہم جوئی کی اجازت نہیں دیتا۔ ہم نے فرنٹ کے معاملے میں اس سے اتفاق کیا اور اُنہوں نے وعدہ کیا کہ پیپلز پارٹی سے ہمارے رابطے قائم کروائے گا۔ اجمل خٹک نے کہا کہ آج کل ہم کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ سابقہ اعتماد بحال کرنے کی کوشش میں ہیں، اگر اس میں کامیابی ہوئی تو تمہاری (بنگش کی) فائل بھی ان کے سامنے رکھیں گے۔ ہم نے انہیں کہا کہ ہم پاکستان میں فرنٹ کے حوالے سے اپنے دوستوں سے مشورہ کریں گے۔ بنگش نے بتایا کہ حفیظ اللہ امین نے اس سے راستہ دینے کا وعدہ کیا ہے (اس وقت ترہ کی اور امین کے درمیان شدید کشمکش جاری تھی اور ان کے حامی باہم دست و گریبان تھے)۔ ہم نے ان سے کہا کہ اس وقت یہ اپنے داخلی مسائل کا شکار ہیں اور دوسرے انہیں داخلی طور پر امن کی شدید ضرورت ہے۔ ان حالات میں ہم کیسے ان سے تمہارے لیے مطالبات کریں۔

انقلاب کے پہلے مرحلے میں اجمل خٹک خلقیوں کے ساتھ شیر و شکر ہو چکے تھے، لیکن میں نے اپنے رابطے پرچمیوں سے توڑے نہیں تھے۔ ہمارے گروپ میں دو لائنیں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ میں پرچم کے نرم موقف کا حامی تھا، لیکن یہ اختلاف کبھی ہم کسی کے سامنے نہیں لائے تھے۔

چیکوسلواکیہ میں کسانوں یا مزدوروں کی کانفرنس میں پاکستان سوشلسٹ پارٹی کا ایک تین رکنی وفد چودھری فتح محمد کی سربراہی میں شرکت کے بعد واپسی پہ ہمارے گھر ٹھہرا۔ یہ بھی بہت حد تک بدل چکے تھے اور ایک مشترک سیاسی پلیٹ فارم کے حق میں تھے۔ لیکن وہ ایک ایسے وقت میں کابل آئے تھے جب ترہ کی اور امین نے آپس میں سینگ پھنسائے ہوئے تھے، جس میں ترہ کی کو جلد پچھاڑ دیا گیا، اس لیے یہ وفد جلد ہی واپس لوٹ گیا۔

انقلاب کا دوسرا مرحلہ اجمل خٹک صاحب کی 'شاہ سے زیادہ شاہ کی وفادار' طبیعت کو بہت گراں گزر رہا تھا۔ کیونکہ پرچمی ان کے مخالف تھے اور ببرک کارمل کہتا تھا کہ ولی خان اجمل خٹک سے بہتر ہے، کم از کم اس کا اپنا ایک موقف تو ہے۔ اگرچہ اجمل خٹک تھے ہی ناشکرے، لیکن

میں نے توڑنے کے بجائے جوڑنے کا وطیرہ اختیار کیا اور اسے اکیلا نہ چھوڑا۔ روسی دوستوں نے بھی کوشش کی اور ببرک کارمل سے خوشگوار ماحول میں ملاقات ہوگئی۔ خیر ذکر ہو رہا ہے ورکنگ گروپ کا، تو پھر یوں ہوا کہ میاں شاہین شاہ کا آنا جانا بڑھ گیا۔

26 فروری 1980 کو میاں شاہین شاہ کی رپورٹ:

- ستار خان، شمس بونیری، سید نظیف کاکا کے فرزند امیر محمد، باجوڑ کے فیض محمد، ابراہیم اتمان خیل اور دیگر نے عبدالرحیم سالار زئی (افغان کونسل کے ساتھ) 'خلق' جماعت تشکیل دینے کی کوشش کی ہے۔
- افضل بنگش یہاں ہمارے ساتھ مذاکرات کرتا ہے اور زیریں علاقوں میں اس کے ساتھی ہمارے خلاف پروپیگنڈا کرتے ہیں۔
- شمیم اشرف ملک، میرزا ابراہیم، امین مغل، سی آر اسلم سے میاں صاحب کی ملاقات ہوئی۔ یہ سب انقلاب کے دوسرے مرحلے کی حمایت کرتے ہیں اور ان کے ساتھ امتیاز عالم بھی حمایت میں کھڑا ہے۔
- سوشلسٹ پارٹی قومیت کے مسئلے کے علاوہ بائیں بازو کے جمہوری اتحاد کی تائید کرتی ہے۔ روسی موقف کی حامی ہے اور انقلاب کے دوسرے مرحلے کی پوری پوری حمایت کرتی ہے۔ پیپلز پارٹی کے ساتھ رویہ درست نہیں۔ این ڈی پی پر ان کے اعتراضات ہیں، لیکن مارشل لاء کے خلاف جمہوری اتحاد کی حمایت کرتے ہیں، لیکن اس کام کے مدعی نہیں۔ یہ لوگ میجر اسحاق کے سخت مخالف ہیں۔
- شمیم اشرف ملک جمہوری عمل پر یقین رکھتے ہیں، جمہوری اتحاد کی تائید کرتے ہیں اور اعتدال پسند پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔ وہ باقی سب پر مطمئن ہیں، لیکن مرزا ابراہیم کے نام پر تذبذب کا شکار تھے کہ کہیں سردار شوکت کے زیر اثر چینی موقف کا حامی نہ ہو جائے۔ شمیم کی کوشش ہے کہ تمام بائیں بازو کی قوتیں سوویت یونین کی آمد کی حمایت کریں اور اسے خوش آمدید کہیں۔ بزنجو کو بے عملی پر تشویش تھی۔
- مرزا چین پر بہت تنقید کرتا ہے۔ پیپلز پارٹی کی قوت کا معترف اور وہ تعاون کے لیے تیار ہے۔

- امین مغل جنگ کے خلاف ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ پاکستان جنگ چاہتا ہے اور وہ جمہوری پاکستان کے حق میں ہے۔ ملٹری پاکستان کو تباہ کر رہی ہے، وہ اگر اپنی بارکوں میں واپس چلی جائے، تو اچھا ہوگا۔ البتہ اس خدشے کا بھی اظہار کر رہا ہے کہ پاکستان ٹوٹنے کی طرف جا رہا ہے۔ سرمایہ دار ہچکچاہٹ کا شکار ہیں اور پاکستان ٹوٹنے کے ڈر سے سرمایہ کاری نہیں کر رہے۔
- لوگوں میں بے اطمینانی ہے، لیکن بغاوت کے آثار نہیں۔ حکومت نے کوشش کی کہ افغانستان کے مسئلے پر لوگوں کو متحرک کرے، لیکن ناکام رہی۔
- پاکستان پیپلز پارٹی تیل اور تیل کی دھار دیکھنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ اس کے کارکن مایوس اور غصے میں ہیں۔ پارٹی میں دائیں بازو کے جھکاؤ والے لوگ فوج سے ساز باز کے حق میں ہیں، لیکن بے نظیر اور نصرت بھٹو ابھی اس کے لیے تیار نہیں۔ پارٹی میں غالب رجحان بائیں بازو والوں کا ہے۔
- ولی خان مفتی محمود وغیرہ کو ماننے سے انکاری ہے اور سیاسی عمل کی بحالی چاہتا ہے۔ ایک طرف مذہبی دائیں بازو کی جماعتیں ہیں اور دوسری طرف پیپلز پارٹی۔ ولی خان کے بارے میں پیش گوئی مشکل ہے۔
- صوبہ سرحد میں اتحاد کے بارے میں عام فضا پائی جاتی ہے۔ لطیف، باچا اور این پی پی کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ بھی پی این پی اور این پی پی کے ساتھ وسیع تر اتحاد چاہتے ہیں۔ یعنی دونوں کو ایک عوامی اتحاد بنانا چاہیے۔ لطیف، ورکنگ گروپ کے موقف کے بہت قریب ہے۔
- شیر افضل اور مصطفیٰ محض بیٹھ کر باتیں بنانے والے لوگ ہیں، کسی کام کے نہیں۔
- شیر امان اور سجاد سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ افراسیاب وغیرہ کے ایک ساتھی کو جمعیت کے لڑکوں نے (پشاور یونیورسٹی) ہاسٹل 9 میں پمفلٹ تقسیم کرتے ہوئے مارا پیٹا۔ جس کے جواب میں شیر امان نے جمعیت کے چھ لڑکوں کو مارا، جس پر انہوں نے احتجاجی جلوس نکالا۔
- این پی پی کے گروپ نے ہمارے شیر امان کے ساتھ اتحاد کی بات کی ہے، لیکن ابھی اس کا

کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔

- شیر علی باچہ اور ان کے دوست ہمارے بہت قریب ہیں، ان کے ساتھ ہم مذاکرات کے لیے بیٹھ سکتے ہیں۔

28 اگست 1980:

انقلاب کے نئے مرحلے کی روشنی میں ورکنگ گروپ دیگر گروپوں اور پارٹیوں کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرے اور کیا موقف اپنائے، اس بارے میں درج ذیل فیصلے ہوئے:

ولی خان کے ساتھ ایسا رویہ اختیار کیا جائے کہ وہ انقلاب کی حمایت کی جانب مائل ہو۔ ہمارا اولین کام انقلاب ثور کے استحکام کے لیے کوشش کرنا ہے۔ اس کے لیے زیریں علاقوں [پاکستان] میں قومی جمہوری تحریک کو متحد کرنا، مضبوط کرنا اور فعال رکھنا ضروری ہے۔ کیونکہ ہمارے نزدیک انقلاب کا استحکام افغانستان، خطے اور پوری دنیا کے لیے خوشحالی، آبادی اور امن کا پیغام ہے۔ اس کے بطن میں ہماری اقوام کی آزادی، آبادی اور خوشحالی کی روشن صبح موجود ہے۔ اس کام کو اچھی طرح سے سرانجام دینے کے لیے ہمیں چاہیے کہ ہم انقلاب کے نئے مرحلے کے تناظر میں اپنے معاشرے کا درست تجزیہ کریں۔ پہلے دوست اور دشمن کے بیچ امتیاز کرنا ہے۔ اس کے بعد دوستوں کو متحد کرنا اور دشمنوں کو ہر میدان میں نیچا دکھانے کی کوشش ہونی چاہیے۔ ہماری سوچ یہ ہے کہ جیسے آج ہمارے دوست مختلف الخیال ہیں، اسی طرح مستقبل میں ان کے لیے ہمارا رویہ ایک جیسا نہ ہوگا۔ ہم تمام دوستوں سے متفقہ مسائل اور پروگرام پر مذاکرات اور اس کے مطابق عمل کریں گے اور کوشش کریں گے کہ اختلافات کم ہوتے جائیں اور اتفاق بڑھتا جائے۔ تمام دوستوں کے سامنے چند بنیادی اصول رکھیں گے جو فکر و عمل کے لیے بنیادی شرط ہونگے۔ ان اصولوں سے جس کا اتفاق ہوگا، وہ دوست اور جسے اختلاف ہوگا وہ دشمن ہوگا:

۱۔ انقلاب ثور کے نئے مرحلے کی حمایت

۲۔ امریکہ، چین، دیگر مغربی اور رجعت پسند عرب ممالک کی جانب سے پاکستان کو فوجی اڈے میں تبدیل کرنے، اور پاکستان کی سرزمین سے پڑوسی ممالک میں مداخلت کی کوشش یا اس کی تیاری کی ہر کوشش کی مخالفت۔

۳۔ پاکستان میں عام انتخابات اور بالغ رائے دہی کی بنیاد پر جمہوریت کا قیام۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستان میں درج بالا تین اصولوں سے متفق دوست بہت سی تاریخی، سیاسی اور سماجی وجوہات سے آپس میں منتشر ہیں۔ ان میں سے اکثر ایسے ہیں، جو ان تینوں اصولوں پر الگ الگ اپنی استطاعت کے مطابق کوشش بھی کرنا چاہتے ہیں، لیکن متفقہ کوشش کے لیے یا تو تیار نہیں یا ایسا کرنے کا طریقہ انہیں معلوم نہیں۔ اس لیے اس بات کی ضرورت ہے، کہ وہ تمام ملی جمہوری گروہ یا جماعتیں، جن کے فکر و عمل کی راہیں ایک جیسی ہیں، اتحاد یا اشتراک کی ضرورت بھی محسوس کر رہی ہیں، اس کے لیے کوشاں بھی رہی ہیں، تجربہ کار بھی ہیں اور آمادہ بھی، تو ان سب میں ایک حد تک مفاہمت کو فروغ دینا ہے۔ اس مفاہمت کی بنیاد پر اس کام کو آگے بڑھایا جائے۔

ہمارا اندازہ ہے کہ درج ذیل پارٹیاں اور گروہ ہمارے دوستوں کی فہرست میں آسکتی ہیں، البتہ ان کے درمیان طبقاتی فرق کے باعث جو فکر و موقف کا فرق پہلے پایا جاتا تھا، وہ آج بھی موجود ہوگا:

۱۔ نیشنل پروگریسو پارٹی (این پی پی)

۲۔ پاکستان سوشلسٹ پارٹی (پی ایس پی)

۳۔ مزدور کسان پارٹی (ایم کے پی) کے تمام گروپ

۴۔ پاکستان نیشنل پارٹی (پی این پی)

۵۔ نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی (این ڈی پی)

۶۔ پاکستان پیپلز پارٹی (پی پی پی)

۷۔ پختونخوا نیشنل عوامی پارٹی (پی این اے پی)

۸۔ ان کے علاوہ دیگر تمام جمہوری سیاسی تنظیمیں، گروپ اور جمہوری سماجی تنظیمیں۔

این پی پی:

یہ پارٹی، پاکستان کمیونسٹ پارٹی جس کا سربراہ امام علی نازش ہے، کا عوامی سیاسی پلیٹ فارم ہے۔ ہم خود اس سیاسی جماعت میں کافی عرصے کام کر چکے ہیں۔ اس بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ پارٹی پاکستان میں کسی بھی پارٹی یا گروپ سے بڑھ کر انقلاب کے استحکام کے لیے عملی اور اصولی تعاون کے لیے تیار ہوگی۔ اس لیے ہم ان کے ساتھ مفاہمت کو کسی بھی سیاسی جماعت سے زیادہ

اہمیت دیتے ہیں۔ اس کے لیے ہم کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ دوستی ضروری سمجھتے ہیں، اس لیے ہم اپنے تمام دوستوں اور ہمدردوں کو ہدایت کرتے ہیں کہ ان دوستوں کے ساتھ تعاون کے لیے خلوص نیت سے ہمہ جہت کوششوں کا آغاز کریں اور اسی طرح امید رکھتے ہیں کہ ہمارے دوست بھی اس تعلق کو مضبوط بنانے کے لیے ہر طرح سے ہماری مدد کریں گے۔

پی ایس پی:

یہ جماعت اپنے آپ کو مارکسسٹ لیننسٹ بنیادوں پر چلانے کی دعویدار ہے۔ اس پارٹی نے دو مختلف حیثیتوں میں کام کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک لیننسٹ تنظیم کے طور پر اپنے آپ کو منوانے کی کوشش کی ہے اور دوسرا عوامی پلیٹ فارم کے طور پر کام منظم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس پارٹی کی لیڈر شپ متحدہ ہندوستان کے وقت ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کے ارکان تھے اور تقسیم ہند کے بعد یہ لوگ پاکستان کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ تھے۔ جب سی پی پی میں ماؤازم کی بنیاد پر اختلافات پیدا ہوئے، تو انہوں نے علیحدہ ہو کر کے یہ پارٹی تشکیل دی۔ تاہم بہت جلد یہ سنٹرسٹ ہو گئے۔ جب بنگلہ دیش کی قومی آزادی کے وقت آزادی کی جنگ میں بیجنگ رژیم اور پارٹی کا انحرافی اور شاؤنسٹ کردار واضح ہو گیا، تب ان کی آنکھیں کھلیں۔ تب انھوں نے واضح طور پر چینی پارٹی اور ماؤازم کے خلاف موقف اپنایا اور عالمی کمیونسٹ تحریک، جس کی سربراہی سوویت یونین کرتا ہے، کے طرف دار ہو گئے۔

پاکستان کے اندر یہ پارٹی ہمارے طے کردہ تین اصولوں کی حمایت کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، تاہم پاکستان کی دیگر بائیں بازو کی اور جمہوری جماعتوں سے اس کے دیگر کئی امور پر اختلافات ہیں۔ پی ایس پی نے بہت سرگرمی سے انقلاب ثور کی حمایت کی ہے۔ ہمارے دوست میاں صاحب کی رپورٹ کے مطابق انھوں نے انقلاب کے دوسرے مرحلے کی بھی خوش دلی سے حمایت کی ہے۔ ہم نے ان کے ساتھ مذاکرات اور بات چیت کا راستہ کھلا رکھا ہوا ہے اور کسی حد تک ان سے رابطے میں ہیں۔

- ## ایم کے پی:

اس پارٹی کے بعض راہنماؤں کا بھی ہماری طرح پی ایس پی اور سی پی پی سے تعلق رہا اور

سب نے نیشنل عوامی پارٹی میں کام کیا۔ یہ بھی سوشلسٹ پارٹی کی طرح اس وقت کمیونسٹ پارٹی سے الگ ہو گئے تھے، جب ماؤسٹ رجحان کے باعث اختلافات پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنے لیے مزدور کسان پارٹی تشکیل دی، جس نے پاکستان اور بالخصوص پشتونوں میں اپنے انحرافی ماؤسٹ اور شاؤنسٹ رجحان کے لیے بہت کام کیا۔ افغانستان میں بھی ماؤسٹ افکار کو پھیلانے اور ان کی ترویج کے لیے اس پارٹی نے اہم کردار ادا کیا۔ پاکستان کے اندر بھی اس نے قومی تحریک کو بہت نقصان پہنچایا۔ بعد میں یہ پارٹی تین حصوں میں بٹ گئی: میجر اسحاق، بنگش اور شیر علی باچا تین گروہوں کے سربراہ بنے، جن میں آخری گروہ میں امتیاز عالم اور اکرم دھریجہ شامل تھے۔

میجر اسحاق ہمیں ماضی کی طرح اب بھی ناقابل اعتبار محسوس ہوتا ہے۔ گذشتہ سال ہم نے بنگش سے مذاکرات کیے، لیکن وہ بھی ہمیں مشکوک لگا۔ ان کے بارے میں علمی بنیادوں پر مطالعے کی ضرورت ہے۔ شیر علی باچا کو ہم جس قدر جان پائے ہیں، اسی بنیاد پر ان سے بات چیت کی ہے، اور ان سے اب تک ہونے والی گفتگو کی بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہمارے اصولوں سے متفق ہیں۔ یہ بھی کہ قومی اور بین الاقوامی مسائل پر بڑی حد تک ان کا ذہن واضح ہے۔ ہم نے ان سے پشتونوں کی حد تک بات کی ہے اور اس بنیاد پر مشترکہ فیصلوں تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس وقت بھی وہ ہمارے پاس اسی غرض سے آئے ہیں کہ اکٹھے بیٹھ کر فکر وعمل کی مشترک راہیں تلاش کریں۔

پی این پی:

جب نیشنل عوامی پارٹی کے بڑے جیل میں بند تھے تو جیل سے باہر اس پارٹی کے قوم پرست دوستوں نے این ڈی پی کے نام سے پارٹی بنائی، جس کے پروگرام اور پالیسی پر نیشنل عوامی پارٹی کے تمام ترقی پسند اور قوم پرست پشتون اور بلوچ کی ایک رائے نہ تھی۔ پھر جب نیپ لیڈران سے پابندی اٹھانے، حیدرآباد ٹریبونل ختم کرنے اور افغانستان سے بلوچ اور پشتون جنگجوؤں کی واپسی کا عمل شروع ہوا تو ان امور کی شرائط پر نیپ راہنماؤں میں اختلاف پیدا ہوا۔ تمام راہنماؤں نے جب این ڈی پی کے تحت اشتراک عمل پیدا کرنے کی کوشش کی، تو وہاں بھی اختلافات نے جنم لیا۔ اس اختلاف کے نتیجے میں نیپ سے تعلق رکھنے والے جمہوری ترقی پسند عناصر نے پاکستان نیشنل پارٹی کے نام سے الگ پارٹی تشکیل دی، جس کے سربراہ غوث بخش بزنجو ہیں۔ وہ ترقی پسند

پشتون، جوان معاملات میں بزنجو صاحب کے ہم خیال تھے، اس پارٹی میں شامل ہو گئے۔ ہم بھی اس پارٹی کی سیاسی جدوجہد کے ساتھ ہیں اور ہمارے وہ ساتھی، جو کھلے عام سیاسی عمل میں حصہ لیتے ہیں، اسی پارٹی میں شامل ہیں۔ پارٹی افغانستان کے ثور انقلاب، بالخصوص اس کے دوسرے پڑاؤ سے مکمل طور پر متفق ہے۔ لیکن ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ اختلافات، جنہوں نے نیپ کی وحدت کو تہس نہس کر دیا، انہیں بھی دور کیا جائے اور وقت کے تقاضے پورا کرتے ہوئے درج بالا تین اصولوں کے تحت ایک وسیع تر اتحاد ترتیب دیا جائے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ سب سے پہلے پی این پی، این ڈی پی، اور این پی پی میں مفاہمت پیدا کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ یہ پاکستان کی قومی جمہوری تحریک کا محور بن سکے اور افغانستان میں انقلاب کے نئے پڑاؤ کے راہنماؤں کے لیے دوستوں کی قوت پھر میسر آسکے۔

این ڈی پی:

یہ پارٹی خدائی خدمت گار، باچا خان اور آج ولی خان کی تاریخی، روایتی سیاسی جدوجہد، خدمت اور شہرت، ماضی کے باقی رہ جانے والے اثرات کے تحت قائم ہے۔ اس میں شک نہیں کہ زیریں پختونخوا میں اس جماعت کا تھوڑا بہت سیاسی روایتی نظم وضبط موجود ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس پارٹی کی سیاسی حکمت عملی میں شکست خوردگی اور انحراف در آیا ہے اور رفتہ رفتہ یہ اپنے روایتی سیاسی موقف سے دور ہوتی جارہی ہے۔ بالخصوص فوجی حکمرانوں سے قربت اور نیپ کی سیاست کے ترقی پسند رجحانات سے انحراف نے اس پارٹی کو عوام سے دور کر دیا ہے۔ اس کی قوت اور شہرت کو نقصان پہنچایا ہے۔ ہر ایک کو معلوم ہے کہ اب تک ہم نے باچا خان اور ولی خان کی قیادت میں کام کیا ہے اور کسی جدوجہد یا قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ بلکہ سب سے زیادہ ہم ہی ان کے قریب ہیں۔ اس طرح اس پارٹی کے چھوٹے بڑے کارکنان سے ہمارا سیاسی تعلق، سب سے بڑھ کر ہے۔ لیکن حیدرآباد جیل سے نیپ راہنماؤں کے نکلنے اور ثور انقلاب سے ان کی سوچ اور عمل میں فرق در آیا ہے۔ ہمیں محسوس ہو رہا ہے کہ ان کے بڑوں نے رفتہ رفتہ یک طرفہ طور پر ہم سے منہ موڑ رکھا ہے۔ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اس پارٹی سے ہمارا ان نکات پر اختلاف ہے:

۱۔ پاکستانی حکمران ٹولے سے ان کی قربت۔

۲۔ انقلاب ثور کے خلاف شرپسندوں کو مضبوط کرنا

۳۔ بلوچ اور پشتونوں میں تاریخی وحدت توڑنا۔

۴۔ پاکستان کے اندر ان کا شدید اینٹی کمیونزم رویہ۔

تاہم ان تمام نکات کے باوجود ہم سمجھتے ہیں کہ مندرجہ ذیل، یعنی:

۱۔ اس تحریک کا بنیادی مقصد انقلاب ثور کو مستحکم کرنا ہے

۲۔ انقلاب ثور کے دوسرے مرحلے کے راہنماؤں سے ان کے قدیم روابط

۳۔ ہمارے موجودہ مرحلے، سیاسی سوچ اور موقف

۴۔ ملی اور بین الاقوامی حقائق

کے پیش نظر ولی خان اور اس کے ناطے این ڈی پی کے فعال ہونے کی شدید ضرورت ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ولی خان اور دیگر راہنما بھی یہ ضرورت محسوس کر رہے ہوں گے۔ اس لیے ہماری کوشش ہوگی کہ انھیں اس طرف متوجہ اور راغب کریں۔ اور پہلے کی طرح اس تحریک کی بنیاد پر انہیں بنیادی اصولوں پر اشتراک عمل کے لیے راضی کریں۔ ہمارے خیال میں موجودہ حالات میں یہ اشتراک عمل بہت مفید ثابت ہوگا۔

پی پی پی:

اس وسیع البنیاد پارٹی کے بارے میں تفصیلی گفتگو ہوئی اور اس کے بائیں بازو کے ساتھ اشتراک عمل پیدا کرنے کی ہدایت کی گئی۔ جس طرح شاہین نے تحلیل و تجزیہ میں وضاحت کی تھی، ان خطوط پر عمل کرنے کی سفارش کی گئی۔

پی این اے پی:

یہ تجزیہ میں لکھنے سے رہ گیا۔ تاہم اس جماعت کے ساتھ بھی ہمارے اشتراک عمل کے لیے کوشش کرنے کی ضرورت ہے اور پشتونوں کی سطح پر ان سے رابطہ بحال کیا جائے، تاکہ اتفاق اور وحدت کے لیے راستہ ہموار کیا جاسکے۔

29 فروری 1980:

شرکا: اجمل، شیر علی باچا، میاں شاہین اور میں۔

ایجنڈا:

ا۔ پاکستان کے عمومی سیاسی حالات کا تجزیہ اور خطے کے موجودہ حالات کی روشنی میں ہمارا موقف۔
۲۔ ہمارے اور شیر علی باچا کے درمیان تنظیمی امور۔
۳۔ دیگر دوست تنظیموں سے رویہ۔
۴۔ پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی آف افغانستان سے ہمارا تعلق۔
۵۔ ان تمام امور کی روشنی میں عملی اقدامات کی فہرست سازی۔

شیر علی باچا: پہلے پاکستان اکیلا تھا، کوئی اسے امداد نہیں دے رہا تھا۔ ثور انقلاب اور بالخصوص اس کے دوسرے مرحلے کے بعد چین، امریکا، مغرب اور عرب ممالک پاکستان کی جانب متوجہ ہوئے اور ضیاء الحق کی پشت پر کھڑے ہوگئے۔ اس میں ہندوستان کا کردار بہت اہم ہے۔ وہ چین سے مخالفت رکھتا ہے، مغرب اور امریکا سے اس کے اختلافات ہیں اور پاکستان کے ساتھ تو اس کے اختلافات کی ایک تاریخ ہے۔ اس کے علاوہ وہ اس خطے میں اپنے سے برتر کسی کو تسلیم کرنے کو تیار بھی نہیں۔ ملک ٹوٹنے کا خطرہ لوگوں کے ذہن میں بہت زیادہ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جس قدر امریکا و مغرب ضیاء الحق اور فوج کے قریب آئیں گے، اتنا یہ خطرہ بڑھے گا۔ اس لیے پنجاب کے لوگوں میں ملک بچانے کے لیے فوج اور امریکا کے خلاف جذبات پیدا ہو رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ تمام اقوام کو ان کا حق دیا جائے، جمہوریت قائم ہو اور ملک کو نقصان نہ پہنچے۔ ملک میں اس وقت دو لہریں ہیں: ایک فوجی سامراجی، جو اقوام کے استحصال سے عبارت اور جمہوریت کے خلاف ہے۔ دوسری لہر جمہوری ہے، جو اقوام اور نچلے طبقات کے حقوق کو ملک کی سالمیت کے لیے لازمی سمجھتی ہے۔ ضیاء الحق اپنے حق میں عوام کو متحرک کرنے میں ناکام رہا ہے۔ خانہ کعبہ پر حالیہ قبضے کے واقعے نے عوام کو امریکی سفارت خانہ جلانے پر تیار کر دیا، لیکن افغانستان پر روسی قبضے نے عوام کو کسی ردعمل پر مجبور نہیں کیا۔ مفتی محمود کی جہاد کانفرنس ناکام رہی۔ گفتگو کی حد تک واضح صف بندی ہو چکی اور واضح قطب بندی سامنے آ چکی ہے۔ جمہوریت کے حوالے سے ملٹری کے خلاف، طبقات اور سوشلسٹ کیمپ کے حوالے سے امریکا کے خلاف، فوج اور چین کی ضد میں روس کے حق میں۔ کیمونزم کا کلمہ اب مسلمان ہو گیا ہے۔ بائیں بازو کے لوگوں کی فہرستیں تیار کی

جا رہی ہیں، جن پر کسی بھی وقت حملہ کیا جا سکتا ہے۔ ابھی حکومت اپنے آپ کو کمزور محسوس کر رہی ہے، اس لیے عام کسانوں کی بے دخلی سے گریز کر رہی ہے۔ مزدوروں کے لیے رویہ نرم رکھا ہوا ہے اور ابھی بائیں بازو پر حملہ آور نہیں ہوئی۔ ایک طرف ڈر کے مارے حملہ نہیں کر رہے، دوسری طرف حملے کی تیاری بھی جاری رکھی ہوئی ہے۔ ایک طرف لسٹیں بنائی جا رہی ہیں تو دوسری طرف کسانوں، مزدوروں او رطالب علموں کے صفوں میں امن کے خواہاں ہیں، کہ گڑ بڑ نہ ہو۔ چنگاریاں موجود ہیں اور ان سے آگ لگائی جا سکتی ہے، لیکن ابھی ان کو منظم نہیں کیا جا سکا۔ کارکنان آپس میں تقسیم ہیں اور مزید ٹوٹ پھوٹ کا عمل بھی جاری ہے۔ اس کے برعکس وحدت کے لیے بھی کوشش جاری ہے، لیکن یہ محض خبروں کی حد تک محدود ہے۔ آخر میں وحدت کا عمل ہی غالب آئے گا۔ کارکن اپنی مایوسی کا اظہار یوں کر رہے ہیں کہ راہنماؤں سے بغاوت کرنی چاہیے، جبکہ نیچے اتحاد کی ضرورت ہے۔ کارکنان حکومت کی گرفتاریوں کے منصوبے سے آگاہ ہیں اور پریشان ہیں کہ گرفتار ہو گئے تو اس کے بعد کیا ہوگا؟ متبادل انتظام کیا ہوگا؟ کارکنوں میں اشتعال بڑھ گیا ہے اور کہہ رہے ہیں کہ فیصلہ اب تلوار سے ہوگا۔ اس کے لیے ساز و سامان اپنی لیڈر شپ سے طلب کر رہے ہیں۔

شاہین شاہ: قانونی جدوجہد کے راستے فی الحال بند ہیں، جبکہ مسلح جدوجہد کے لیے اسلحہ اور لشکر نہیں ہے۔

صوفی: فی الحال سیاسی جدوجہد کے لیے راستے ڈھونڈنے چاہییں۔ ہم نے ایک تجربہ کیا ہے اور وہ ناکام رہا۔ البتہ آئندہ کے لیے مسلح جدوجہد کے امکانات کو رد نہیں کرنا چاہیے۔ اس موضوع پر اجمل خٹک نے بھی بہت باتیں کیں اور اپنا تجزیہ پیش کیا۔

فیصلہ:

پاکستان کے موجودہ حالات میں مسلح، غیر مسلح اور قانونی تینوں طرح کی جدوجہد کے امکانات موجود ہیں، لیکن شائد ہم ایک ایسا عوامی فرنٹ تشکیل دے سکیں جو وسیع جمہوری محاذ ہو اور فوجی تیاریوں اور پاکستان کی طرف سے افغانستان کے خلاف کارروائی کے خلاف ہو۔ یہ محاذ جمہوریت، قومی حقوق اور معاشی انصاف کے لیے کام کرے، لیکن ہم مسلح جدوجہد کے لیے تیاری

کو بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ ہمارے خیال میں پاکستان میں ان تمام جماعتوں اور گروہوں کو یکجا کرنے کی ضرورت ہے، جنھیں ہم خطے میں نئی تبدیلیوں کے پیشِ نظر دوست سمجھتے ہیں، تاکہ ان میں مفاہمت ہو اور اپنے کارکنان کو مسلح جدوجہد کے لیے صف بندی پر آمادہ کیا جائے۔ ان دونوں امور کے لیے ہمیں دوستوں کی مدد اور مشورے کی ضرورت ہے۔ ہم اپنے دوستوں سے برادرانہ پارٹیوں جیسے اصولی سلوک کی توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ مکمل تعاون کریں گے۔ [ایسی مجالس میں اکثر مجھ سے اپنی کہی ہوئی باتیں اور تجزیے لکھنے سے رہ جاتے، کیونکہ ایک ہی وقت میں بولنا اور لکھنا محال تھا۔]

یکم مارچ 1980:

شرکاء: شیر علی باچا، شاہین شاہ، صوفی۔

شیر علی باچا: جو پارٹیاں پہلے ہی ایک دوسرے سے قریب ہیں، انھیں اور قریب آجانا چاہیے اور یہی ہمارا نکتہ آغاز ہوگا۔ آپ کی اور ہماری قربت میں مزید اضافہ ہونا چاہیے۔ اس طرح باقی گروپ اور پارٹیاں جو ہمارے قریب ہوں، ان سے بات چیت کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ اگر ہمارے درمیان بنیادی اختلاف نہ ہو تو زیادہ سے زیادہ پروگرام پر ہمارا اتحاد ہونا چاہیے۔ یوں ہمارے عمل میں زیادہ سے زیادہ یکسانیت ہوگی۔ ہم سب عمومی لائن پر تو متفق ہیں۔ ہمیں اس عمل کا آغاز اپنے آپ اور اپنی دو تنظیموں سے کرنا چاہیے:

۱ مزدور کسان پارٹی: شیر علی باچا، امتیاز عالم، اکرم دھریجہ (ایک لہر)
افضل بنگش، میجر اسحاق، ڈاکٹر فیروز (دوسری لہر)

میجر اسحاق بھی اپنے آپ کو کمیونسٹ پارٹی کی حیثیت سے پورے پاکستان میں متعارف کراتا ہے۔ افضل بنگش بھی پاکستان میں اپنی کمیونسٹ پارٹی رکھتا ہے۔

شیر علی باچا، امتیاز اور اکرم دھریجہ، پاکستان کی حد تک نہ کمیونسٹ پارٹی سے تعلق کا دعویٰ کرتے ہیں اور نہ اس پر یقین رکھتے ہیں۔ بلکہ ان کا کہنا ہے کہ پاکستان میں ملک گیر پارٹی بنانا قبل از وقت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر علاقے میں قومیتوں کے مفادات اور حالات میں فرق موجود ہے اور ان حالات میں پارٹی کی صورت نہیں بن سکتی۔ اکرم سندھ کی سطح پر اپنے آپ کو عوامی سطح پر

مضبوط کرے اور اپنی کمیونسٹ پارٹی بنائے، پنجاب میں یہی کام امتیاز عالم کرے اور سرحد میں یہ کام شیر علی باچا کرے گا۔

سندھ لیبر آرگنائزنگ کمیٹی اکرم دھریجہ کا ظاہری عوامی فرنٹ ہے، جس کے پیچھے کمیونسٹ گروپ موجود ہے۔ پنجاب میں امتیاز عالم نے 'پنجاب لوک پارٹی' اور اس کے تحت کمیونسٹ گروپ بنایا ہے۔ تینوں کے درمیان مشاورتی کمیٹی بنائی گئی ہے۔ تمام ملک سے خبروں اور اطلاعات کا تبادلہ ہوگا، مشترک فیصلے ہوں گے، مشترک پالیسی ہوگی، مشترک سوچ ہوگی۔ البتہ ہر تنظیم آزاد ہوگی اور فیصلے اتفاق سے کریں گی، البتہ ان کی سمت ایک ہوگی۔

ہم اپنی تنظیم میں آزاد ہیں، لیکن امتیاز اور دھریجہ کے ساتھ بین الاقوامی لائن کی حد تک ہماری ایک ہی پالیسی ہے۔ افغانستان کی پارٹی کے ساتھ تعلقات رکھنے پر وہ دونوں متفق ہیں۔ وہ اجمل خٹک اور ورکنگ گروپ کے ساتھ ہمارے روابط کی تصدیق کرتے ہیں، اس لیے صوبہ سرحد میں ہم کسی بھی حد تک جاسکتے ہیں۔ اب ہم جس نتیجے پر پہنچیں گے تو میرے دیگر ساتھیوں کو اس کی اطلاع کی جائے گی اور وہ اس سے اتفاق کریں گے۔

پاکستان عوامی تحریک میں یہ افراد اور جماعتیں شامل ہیں:

۱۔ پروفیسر عزیز الدین کی پاکستان جمہوری فرنٹ
۲۔ رسول بخش پلیجو کی سندھ عوامی تحریک
۳۔ علی یاور کا پاکستان نوجوان محاذ
۴۔ ملتان کے رشید کا محنت کش محاذ
۵۔ شیر علی باچا
۶۔ امتیاز عالم
۷۔ اکرم دھریجہ

عوامی تحریک کی سطح پر ایک اور مشاورتی کمیٹی بنائی گئی ہے، جس میں پانچ تنظیمیں شامل ہیں: پلیجو، شیر علی، امتیاز عالم، پنجاب جمہوری فرنٹ اور پاکستان نوجوان محاذ۔

یہ جماعتیں رفتہ رفتہ ترقی کر کے پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی کی صورت اختیار کرلیں گی۔

اب تک یہ دو رابطے اور مشاورتی کمیٹیاں وجود رکھتی ہیں۔ ان میں پلیجو، پروفیسر اور علی یاور

غیر جانبدار ہیں، یعنی ماؤازم کے حق میں غیر جانبدار رہے، روس اور چین دونوں کی مخالفت کرتے تھے اور ہر طرف سے امداد کے حصول کے لیے کوشش کر رہے تھے، چاہے وہ روس ہو یا چین، البانیا ہو یا کیوبا۔ یہ پاکستانی کمیونسٹ پارٹی بنائیں گے۔ انہوں نے تیزی سے پارٹی کی جانب بڑھنے کی کوشش جاری رکھی، لیکن اس پالیسی سے شیر علی باچا، امتیاز اور اکرم کو اتفاق نہ تھا۔ پروفیسر کے ساتھ باچا نے ملاقات کی۔ انہوں نے کہا کہ بین الاقوامی لائن ایک طرف کر کے پاکستان کے مسائل پر اتفاق رائے پیدا کیا جائے، جو پہلے سے وجود رکھتا ہے۔ یعنی امریکا مخالفت، جمہوریت، افغان انقلاب کے حق میں، قومیتوں کے حقوق کے لیے اور فوج کی مخالفت کے لیے مشترکہ جدوجہد کے لیے لوگ تیار ہیں۔ پروفیسر وغیرہ افغانستان کے انقلاب کی عوامی سطح پر مخالفت نہیں کرتے، لیکن اندرونی طور پر سوویت افواج کی مداخلت کے مخالف نظر آتے ہیں۔ وہ پھر ایک رابطہ بحال کرنا چاہتے ہیں، لیکن اشتراک عمل کے خلاف ہیں۔ وہ پارٹی بھی بنانا چاہتے ہیں، لیکن باچا نے انھیں کہا کہ پارٹیاں تو زیادہ سے زیادہ مشترک نکات پر تشکیل پاتی ہیں۔ امتیاز وغیرہ ثور انقلاب کے حوالے سے پروفیسر سے رابطہ ختم کرنا چاہتے ہیں۔ باچا کا کہنا ہے کہ پروفیسروں کے گروپ میں بعض ارکان مستعفی ہو گئے ہیں اور افواہ ہے کہ چین نے انھیں کچھ نہ کچھ امداد دی ہے۔

2 مارچ 1980:

شرکا: شیر علی باچا، شاہین شاہ، اجمل، صوفی۔

ایجنڈا: پارٹی کے بارے میں تنظیمی امور۔

اجمل: ہمیں یہاں افغانستان کے ساتھیوں کی بین الاقوامی پالیسی کا علم نہیں۔ اس لیے ہم یہ رائے نہیں دے سکتے کہ ایک پارٹی بنائی جائے، پاکستان کی سطح پر بنائی جائے یا سرحد کی سطح پر الگ پارٹی بنائی جائے۔

شیر علی باچا: ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ ایک ہی پارٹی ہو، جو پی ڈی پی اے (افغانستان خلق ڈیموکراتیک گوند) کے ساتھ مل کر بنائی جائے، ایک ملک میں ایک پارٹی ہونی چاہیے۔ البتہ طریقہ کار میں پی ڈی پی اے سے فرق آسکتا ہے۔ ہمارا موقف تھا کہ پشتونوں میں "ایک پارٹی ایک ملک" کے ہم خیال متحد ہو جائیں، ایک پارٹی بنے اور پھر وہ مناسب شرائط پر پی ڈی پی اے سے مفاہمت

کرے، یہ ہمارا آئیڈیل تھا۔ ہماری آخری سوچ اب بھی یہی ہے، لیکن اس کا انحصار اس جگہ (افغانستان) پر ہے۔ البتہ سرحد میں ہم اکثر ساتھیوں اور گروپس کو اس اصول پر اکٹھا کر سکتے ہیں۔ اس لیے پہلے وہاں یہ شرائط پوری کر دی جائیں، یعنی ایک تنظیم اور پارٹی زیریں علاقوں (پختونخوا) میں تشکیل دی جائے۔ لیکن اس کا انحصار افغانستان پر بھی ہے کہ یہ کیا کہتے ہیں، کیا کرتے ہیں اور ان کی پارٹی کس حد تک مستحکم ہے۔ ان کی سوچ معلوم کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ ہم اپنی پالیسی اور سٹریٹجی اس کے مطابق ترتیب دیں۔ فی الحال ہماری تنظیمیں آزاد حیثیت میں کام کرتی رہیں اور یہی اہداف پیش نظر رکھیں۔ ہمیں سرحد کی سطح پر ہم خیال لوگوں کو اکٹھا کر لینا چاہیے، پاکستان کی سطح پر رابطے ہوں۔ یہ روابط مشاورتی شکل میں ہوں اور اتحاد نہ ہو۔ ورکنگ گروپ اور ایم کے پی سرحد کی سطح پر متحد ہوں، اگر پاکستان میں ایک کمیونسٹ پارٹی نہیں بن سکتی تو ہم سرحد کی سطح پر مستحکم گروپ تشکیل دیں۔ ہمارا اساسی ہدف ایک ملک ایک پارٹی ہے۔ اس پر ہم دونوں تنظیمیں متفق ہیں۔ اس کے لیے ہم سرحد میں دیگر افراد سے رابطے کر رہے ہیں اور موجودہ حالات میں پاکستان کی سطح پر ہم ہر اس پارٹی کے ساتھ ہر حد تک رابطے یا اشتراک کو تیار ہیں، جو ہمارے ساتھ یہ بات تسلیم کر لے کہ اس خطے میں اگر سوشلسٹ حل آتا ہے تو پشتون متحد ہو جائیں اور ڈیورنڈ لائن ختم کر دی جائے۔ جو ہمارے ساتھ پاکستان کی سرزمین میں ہمارے اہداف تسلیم کرے ہم اس کے ساتھ اتحاد کے لیے تیار ہیں۔ این پی پی پاکستان میں قومیت کے مسئلے کی اولیت اور اہمیت سے انکاری تھی اور ایک پاکستان کی سطح پر سوچتی تھی، تاہم ثور انقلاب کے بعد قومی مسئلے نے پھر اولیت اختیار کر لی ہے۔ اس لیے این پی پی کا کہنا ہے کہ بنگال کے بارے میں کمیونسٹ پارٹی کی قرارداد بحال ہو گئی۔

ایک قرارداد کیسے پہلے منسوخ ہوئی اور پھر بحال کر دی گئی؟ دوسری قرارداد کو پاس ہونا چاہیے۔ اصل میں ایسی ایک قرارداد پیش کرنے کی ابتدا کر دی گئی ہے، لیکن وہ ابھی بحث کے مرحلے میں ہے۔ اس بات کا اندازہ میں نے کمیونسٹ پارٹی کے ایک شخص کی بات سے لگایا۔ کمیونسٹ پارٹی کہتی ہے، کہ قوموں کے حق خودارادیت کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن عملاً وہ کہتے ہیں کہ بڑی قوم کے کمیونسٹ حق خودارادیت کی بات کریں اور چھوٹی قوم کے کمیونسٹوں کا فرض یہ ہے کہ وہ وحدت کی بات پر زور دیں۔ قومی حق خودارادی کو مہاجر، سی آر اسلم اور ماؤسٹ سب تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ وہ سالمیت کو تسلیم

کرتے ہیں، اس لیے اب یہ سالمیت لانے کے لیے وہ اقوام کا یہ حق اپنے سائنسی فکر کے تابع کرنا چاہتے ہیں۔ ایک ہاتھ سے حق دے کر دوسرے ہاتھ سے واپس لے رہے ہیں۔

2 مارچ 1980:

شرکاء (دوسری نشست): شیر علی، میاں صاحب، اجمل اور صوفی۔

شیر علی باچا نے تین باتیں پیش کی ہیں:

۱۔ پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی کے علاوہ وفاقی بنیادوں پر ایک پاکستان گیر پارٹی تشکیل دی جائے، یا

۲۔ صوبہ سرحد میں الگ پارٹی بنائی جائے، یا

۳۔ پی ڈی پی اے کے ساتھ مل کر ایک پارٹی بنائی جائے، جس میں سرحد میں قائم پارٹی ایک شاخ کی حیثیت سے کام کرے۔

میاں شاہین: اگر پورے پاکستان کی سطح پر پارٹی بنانی ہے تو پہلے کمیونسٹ پارٹی سے بات کی جائے۔ ابھی ہم ان سے پوری طرح مایوس نہیں۔ کمیونسٹ پارٹی کے بغیر ہم پاکستان کی سطح پر دوسری پارٹی نہیں بنائیں گے۔ مصطفیٰ کے گھر بابو فضل خالق، سلیم راز، سرفراز، سید مختار باچا اور شاہین شاہ آپس میں باتیں کر رہے تھے اور یہ کوئی باقاعدہ میٹنگ نہیں تھی۔ باچا اور روز گل، ورید اور لطیف الگ الگ باتیں کر رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ہم عوامی سطح پر ایک فرنٹ بنا لیتے ہیں۔ اس کے بعد سرفراز، شاہین، باچا نے ایک ہوٹل میں گپ شپ کی۔ سید مختار باچا چاہتا تھا کہ ایک وسیع تر فرنٹ میں سب آملیں، اگر پورے پاکستان کی سطح پر یہ اتحاد ہونا ہے تو سرحد سے ہم اس کی ابتدا کر لیتے ہیں اور ایک عوامی محاذ بنائیں۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد پر بات کریں۔ ہم نے اپنے آپ کو ابھی ان سے الگ نہیں کیا۔ سرفراز ان باتوں میں شاہین کا طرف دار تھا۔ مختار باچا کہہ رہا تھا کہ ہم اپنے گاؤں جا کر وہاں بات کریں گے، کمیونسٹ پارٹی کی سطح پر باچا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شاہین کمیونسٹ پارٹی سے کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد پر مذاکرات کرے گا۔

3 مارچ 1980:

شرکا: باچا، میاں، اجمل، صوفی۔

چھوٹی اقوام کے حق خود ارادیت کی بنیاد پر فیصلہ، جبکہ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان ان اقوام کے حق خود ارادیت کے لوازمات سے مخصوص حالات کی بنیاد پر انکاری ہے۔

ہمارا موقف: ہر اس اصول اور بات کی مخالفت، جو عملاً حق خود ارادیت کے اصولوں سے متصادم ہو۔ اگر مذکورہ نکات بنیادِ عمل ہوں اور ثور انقلاب کی تائید اس میں شامل ہو۔ تو عام جمہوری محاذ میں یہ پارٹیاں شامل ہو سکتی ہیں، گویا یہی ہمارے دوست ہوں گے:

۱۔ این پی پی

۲۔ این ڈی پی

۳۔ پی این پی

۴۔ پی پی پی (صرف بائیں بازو)

۵۔ ایم کے پی (میجر اسحاق کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا)

۶۔ پنجاب لوک پارٹی

۷۔ سندھ لیبر آرگنائزنگ کمیٹی

۸۔ پختونخوا نیپ

۹۔ سندھی عوامی تحریک (یا سندھ ہاری کمیٹی، پلیجو کی)

۱۰۔ سوشلسٹ پارٹی

۱۱۔ بلوچ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن (بی ایس او، دونوں گروپ)

۱۲۔ خیر بخش مری

اس مقصد کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی جا سکتی ہے، جو ان نکات پر لوگوں سے مذاکرات کرے۔ یہ کام شیر علی باچا، میاں شاہین شاہ اور لطیف آفریدی سر انجام دے سکتے ہیں۔ الگ الگ اور اکٹھے یہ ملاقاتیں کی جائیں اور پھر معلومات کا تبادلہ کر کے، اتفاق رائے سے پروگرام ترتیب دیا جائے۔

4 مارچ 1980:

شرکا: باچا، شاہین، اجمل، صوفی

ایجنڈا: شیر علی باچا کے ساتھ تنظیمی امور

باچا: آپس میں تبادلہ خیالات، باقاعدہ میٹنگ، وقتاً فوقتاً باہم فیصلے۔ گذشتہ ایک ڈیڑھ برس میں ہمارے باہمی تعلقات کی بنیاد پر ہم اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ ہم پارٹی اور فرنٹ، دونوں سطح پر مل کر کام کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے ہمارا طریقہ کار کیا ہونا چاہیے؟

شاہین: دیگر فرنٹ کے گزشتہ تجربات کی طرح دائیں بازو کی سیاست کا شکار نہ ہو جائیں۔

باچا: ایسے فرنٹوں میں لیڈرشپ کا سوال بہت اہم ہے، کہ وہ کس کے پاس ہے۔ ہم وسیع جمہوری محاذ کی بنیاد دو نکات پر رکھیں گے، یعنی جمہوریت کے حق میں اور ملٹری بلڈاپ کی مخالفت میں۔

5 مارچ 1980:

شرکا: باچا، میاں، اجمل، صوفی۔

باچا: ہم دو تنظیمیں آپس میں کیا کریں گے؟ پی این پی کے محاذ کے لیے ہمارا رویہ کیا ہوگا؟ کیونکہ ہم دونوں ان کے ساتھ ہیں۔

اجمل: پی این پی سے لطیف، باچا اور شاہین اکٹھے مذاکرات کریں گے اور نئے حالات کی روشنی میں ہماری حکمت عملی کے بارے میں ان کی رائے معلوم کرلیں گے۔ البتہ یہاں پی ڈی پی اے سے مذاکرات کرتے ہیں، ان کے ارادوں کا اندازہ لگائیں گے، اور اس کے مطابق اپنا پروگرام بنائیں گے۔ زیریں علاقوں یعنی پاکستان میں کام، آپ لوگوں کا اپنا اختیار ہے۔

ببرک کارمل سے ملاقات

ان بحث مباحثوں کے نتیجے میں ہم نے افغانستان کی پارٹی سے رجوع کیا اور آخر کار پی ڈی پی اے کے جنرل سیکرٹری اور انقلابی شوریٰ کے سربراہ ببرک کارمل سے 13 مارچ 1980 کو سہ پہر تین بجے ملاقات ہوئی۔ یہ ملاقات دو گھنٹے یعنی پانچ بجے تک جاری رہی۔ اس ملاقات میں میاں شاہین، شیر علی باچا، اجمل خٹک اور صوفی موجود تھے۔ اُنھوں نے بہت گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ اس موقع پر ببرک کارمل کی گفتگو کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

ہم آپ کی اصولی مدد کرنے کو تیار ہیں، لیکن ہمارا اولین فرض افغانستان میں امن لانا ہے۔ ہم سب کو پہلے اس پر توجہ دینی چاہیے۔ مارکسسٹ لیننسٹ پارٹی کے بغیر مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ پارٹی اصولوں کی بنیاد پر بنانی چاہیے۔ البتہ لیڈرشپ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہو، جن کا رجحان

ہمیشہ اصولی رہا ہو۔ پہلے بھی ایسی پارٹی تشکیل دینے کے لیے سی پی پی اور پی ایس پی کو ضم کرنے کے لیے کوشش کی گئی، لیکن ناکام رہی۔ آپ سی پی پی، پی ایس پی اور دیگر بائیں بازو کے اصولی سوچ رکھنے والے گروہوں کو متحد کرنے کی کوشش کریں اور اس کے لیے ہمارا اور ہمارے دیگر دوستوں کا تعاون آپ کو حاصل رہے گا۔

ہم نے کہا، کہ پہلے مرحلے میں ہم اور سی پی پی اکٹھے ہو جائیں تو بہتر ہوگا۔ لیکن اس کے لیے ہم صرف آپ کی کوششوں پر تکیہ کیے ہوئے ہیں۔ کارمل نے یہ قبول کیا اور ذمہ داری اپنے سر لے لی۔

کارمل صاحب نے اضافہ کیا کہ اگر فوری طور پر مارکسسٹ لیننسٹ بنیاد پر پارٹی بنانا ممکن نہ ہو، تو یہ کیا جاسکتا ہے کہ پہلے بائیں بازو کی سوچ رکھنے والوں کو متحد کیا جائے اور پھر اس اتحاد میں ہم خیال گروہ قریب آکر پارٹی تشکیل دیں۔ اس بنیاد پر جمہوریت پسندوں یعنی ولی خان اور پی پی پی سے بات کی جاسکتی ہے۔ اس سلسلے میں ہم اس حد تک تعاون کو تیار ہیں کہ ان پارٹیوں کے سربراہوں کو خفیہ طور پر کابل بلائیں اور سب کے سامنے اتحاد کی بات رکھیں، یوں ایک واحد پارٹی بنانے کا کام مکمل ہوسکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے اولین فریضہ آپ لوگوں کا ہے۔ ہم آپ کے ساتھ اصولی، مادی اور مالی تعاون کو تیار ہیں، لیکن اس وقت اولین ترجیح یہی ہے کہ افغانستان میں امن کو استحکام ملے۔ اس کے لیے مل کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ پاکستان اور بالخصوص پشتون علاقوں سے ہم پر حملے جاری ہیں، آپ کو اپنی کوششوں سے اس کو روکنے کی تدبیر کرنی چاہیے۔

کارمل کی باتیں پتھر پر لکیر تھیں، اس لیے پھر ہم سب نے انھی خطوط پر سوچنا شروع کیا۔ خصوصاً شیر علی باچا کو اپنے موقف سے ہٹنا پڑا۔

20 مارچ 1980:

شرکا: شیر علی، شاہین شاہ، صوفی، اجمل۔

ہمیں اب ان خطوط پر کام کرنے کی ضرورت ہے:

ا۔ پاکستان میں ایک نئی طرز کی لیننسٹ پارٹی کی تشکیل۔

۲۔ اگر ایسی پارٹی فی الحال نہیں بن سکتی تو تمام بائیں بازو کی قوتوں کو کسی نہ کسی طرح اشتراک عمل تک لانا۔

٣۔ ایک وسیع عمومی جمہوری محاذ کی تشکیل۔

یعنی پارٹی، بائیں بازو کا اتحاد، اور وسیع تر محاذ کی تشکیل۔ پارٹی کی لیڈر شپ ان لوگوں کے ہاتھ میں رہے، جو ہمیشہ اصولی موقف کے حامل رہے ہوں۔

ہم نے اپنی سرگرمیاں ورکنگ گروپ کے فورم سے جاری رکھیں اور اس کے ذریعے اپنے رابطے بحال رکھے۔ اگرچہ انقلاب کے دوسرے مرحلے اور روسی افواج کی آمد نے ہمارا کام آسان کر دیا تھا اور ہماری ساری توانائی اور توجہ ان نوجوانوں پر مرکوز تھی، جو افغانستان اور پھر سوویت یونین میں تعلیمی اداروں میں داخلوں کے لیے آتے تھے۔ ہم قبائل میں اپنے پرانے تعلقات پر بھی کام جاری رکھے ہوئے تھے۔ یہ سرگرمیاں اس وقت تک جاری رہیں، جب تک ہم واپس کمیونسٹ پارٹی میں شامل نہ ہو گئے، یہ واقعہ 1981 میں ہوا۔ غالباً نازش اور افراسیاب شاید 1980ء میں آئے تھے، لیکن ہم سے چھپے ہوئے تھے۔ ہوسکتا ہے، کہ میں غلطی پر ہوں۔ 15 جولائی 1980ء کو جب ابھی میں بیرون ملک نہیں گیا تھا، میرے دوست محمود بریالے نے مجھے بتایا کہ: کمیونسٹ پارٹی کا کہنا ہے کہ ہم نے اجمل کو خارجی امور اور کمیونسٹ روابط کو مضبوط بنانے کے لیے بھیجا تھا، وہ یہ کام انجام نہ دے سکا۔ [روابط کو مضبوط بنانے کا مفہوم بعد میں میری سمجھ میں آیا۔] یہ ایک نیا اعتراض تھا جو میں نے سنا ورنہ عموماً وہ یہ کہتے تھے کہ بی بی سی پر اجمل نے اصغر خان کے بیان کی مذمت نہیں کی، بلکہ الٹا حمایت کی۔ ایک اعتراض یہ کیا جاتا تھا کہ اجمل خٹک جماعت کا نمائندہ تھا، ولی خان اور سردار داؤد کا نمائندہ نہ تھا، پھر وہ کیوں داؤد خان کے اتنے قریب ہوا۔ یہ نیا اعتراض انقلاب کے بعد کا اعتراض تھا، ورنہ اس سے قبل وہ اس قربت پر خوش تھے۔

29 اگست 1980:

شرکا: شیر علی باچا، اجمل، میاں شاہین شاہ، صوفی

شیر علی باچا نے اپنی تفصیلی رپورٹ پڑھی۔ حفیظ جمال، جاوید اختر، شفیع قریشی، وکیل اور ٹریڈ یونینسٹ، دوسری طرف ڈاکٹر محبوب، ڈاکٹر حسان، بی ایم کٹی اور بزنجو، دونوں سی پی پی کے مخالف ہیں۔ البتہ ایک دوسرے پر بھی الزامات لگاتے ہیں۔ اول الذکر کو ٹریڈ یونینسٹ کہتے ہیں، جبکہ حسان انہیں کتابی کمیونسٹ کی عرفیت دیتا ہے۔ حسان وغیرہ متحدہ محاذ کو زیادہ اہمیت دے رہے

تھے اور Liquidationist پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ تمام بائیں بازو والے پی این پی میں شامل ہو جائیں، تو اس کے اندر سے کمیونسٹ پارٹی بنائیں گے، کیونکہ پی این پی کی پالیسی قومی جمہوریت ہے۔ ان کا کہنا ہے، کہ مشترک مرکزی رابطہ بن جائے تو بعد میں صوبوں کو جائیں گے۔ عوامی جمہوریت اور قومی جمہوریت میں سے وہ قومی جمہوریت کو ترجیح دیتا ہے۔ وہ نیپ کی مسلح جدوجہد کو عوامی جمہوریت کی لائن قرار دیتے ہیں۔ چونکہ وہ قومیتوں کے مسئلے کو اہمیت نہیں دیتے، اس لیے این پی پی کو عملی لحاظ سے عوامی جمہوریت کا شکار قرار دیتے ہیں۔ اس طرح سوشلسٹ پارٹی کا بھی یہی حال ہے۔ حسان کا گروہ قوموں کے حق خود ارادی کو تسلیم کرتا ہے، لیکن پارٹی کو پاکستان کی سطح پر تسلیم کرتے ہیں۔ گویا ہماری سوچ کے مطابق اور ہمارے ساتھ مل کر ایک پاکستان گیر کمیونسٹ پارٹی کی تشکیل کے حق میں ہیں۔ شمیم اشرف ملک اور حسان کی سوچ ایک ہے، البتہ شمیم پی پی پی کو زیادہ اہمیت دیتا ہے اور حسان پی این پی کو۔ لطیف آفریدی اپنے آپ کو سید مختار باچا اور ہم سے دور کرنا چاہتا ہے اور یہ بھی کہ ہمارے دوستوں کو اپنے ساتھ ملا کر پی این پی کے پلیٹ فارم سے فائدہ اٹھائے۔

سی پی پی کے بارے میں: سید مختار باچا سے میاں شاہین نے ملاقات کی، کہ ہم سی پی پی کو اصولی پارٹی تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن باچا کا کہنا تھا کہ اگر گروپ سی پی پی میں شامل ہوتا ہے تو سی پی پی ایک غیر معمولی فیصلہ کرے گی۔ میاں صاحب کو کہا گیا تھا، کہ آپ سے جون میں بات کریں گے، لیکن پھر یہ ملاقات نہیں کی گئی۔ اعزاز نذیر، عزیز اللہ سائیں اور ڈاکٹر منظور کا کہنا ہے کہ ہماری پارٹی سی پی آئی کا ایک جائز تسلسل ہے اور جو آنا چاہے فرد کی بنیاد پر آئے اور ہماری پارٹی اور لیڈر شپ کو تسلیم کرے۔ ڈاکٹر منظور کا کہنا تھا کہ جو پارٹی چھوڑ کر گیا ہے وہ مرتد ہیں اور اب تھک گئے ہیں۔ یہ لوگ پارٹی کے معاملات میں مرکزیت کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ سائیں نے واضح طور پر کہا کہ اگر پارٹی کو طبقاتی جدوجہد کرنی ہے تو ایک مضبوط مرکز لازمی ہے۔ مختار باچا کا کہنا ہے کہ جمہوری فرنٹ اور اتحاد بنانے کو تیار ہیں اور این پی پی کا نام ختم کرنے کو بھی تیار ہیں۔ سائیں وغیرہ کہہ رہے تھے کہ جس طرح کا بھی اتحاد آئے، ثابت ہو جائے گا کہ کون کتنے پانی میں ہے۔

بائیں بازو کے اتحاد کی میٹنگ کے بارے میں:

ڈاکٹر حسان، اعزاز نذیر، انیس ہاشمی، معراج محمد خان اور شیر علی باچا: جمہوری جدوجہد کے لیے

بائیں بازو کی قوتوں کے اتحاد کے لیے ابتدائی گفتگو کی گئی اور ایک اصولی پروگرام طے پایا: ملٹری مخالف، سامراج دشمن اور محبّ افغانستان۔ سید مختار کا کہنا ہے کہ ورکنگ الائنس اب اپنا وجود نہیں رکھتا، وہ تو ہم نے پی پی پی پر کام کرنے کے لیے بنایا تھا۔ معراج محمد خان نے کہا، کہ اگر جمہوری فرنٹ میں پی پی پی شامل ہوئی اور صرف تحریک استقلال آئی تو ہم پھر ایسے فرنٹ کو تسلیم نہیں کریں گے۔

بی ایس او، رازق بگٹی کے بارے میں:

میرا این پی پی سے کوئی تعلق نہیں اور فیڈرل سٹوڈنٹس یونین سے وہ کنارہ کش ہو چکے ہیں۔ وہ صرف پاکستان کے بلوچوں کی آزادی کی بات کرتے ہیں۔ رازق ایران گیا تھا، وہاں اس نے 'تو دہ' پارٹی اور بلوچوں سے ملاقات کی تھی۔ وہ بزنجو کا سخت مخالف ہے، اسے قومی تحریک کا غدار اور کراچی کے سرمایہ داروں کا ایجنٹ کہتا ہے۔ مینگل کو بھی بزنجو کا ساتھی بتاتا ہے۔ خیر بخش اور شیر محمد کو پسند کرتا ہے۔ یہ بھی کہتا ہے کہ وہ جو آزادی کی تحریک چلا رہے ہیں، اس کی بنیاد قبائلی ہے۔ ان کا کہنا ہے، کہ کوئی خاص فرق نہیں صرف تنظیمیں الگ الگ ہیں۔ دونوں پرو سوویت ہیں اور خیر بخش بھی اسی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ بی ایس او کے اندر ایک پارٹی تشکیل دینا چاہتا ہے اور دیگر قومیتوں سے رابطے کی حد تک پارٹی کو محدود رکھنا چاہتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر صحیح فرنٹ سامنے آیا تو اس کی حمایت کریں گے، لیکن اس میں شامل نہیں ہوں گے۔ وہ آزاد بلوچستان کے حق میں ہیں۔

دوست تنظیموں کے بارے میں:

نوجوان محاذ (علی یاور)، سندھ لیبر آرگنائزنگ کمیٹی اور پنجاب لوک پارٹی۔ یہ بھی تیسری سوچ سے اتفاق کرتے ہیں، یعنی سی پی پی اور پی این پی کی سوچ سے اختلاف رکھتے ہیں۔ البتہ فورم (ورکنگ گروپ اور مزدور کسان پارٹی شیر علی باچا) سے عمومی لحاظ سے اتفاق کرتے ہیں۔ پارٹی بنانے کے بارے میں ان کا نکتہ نظر یہ ہے کہ پہلے بنیادی مسائل پر اتفاق، رابطہ اور پھر اس کے بعد رفتہ رفتہ پارٹی کی تشکیل۔ رازق بگٹی، اکرم اور ڈاکٹر ارباب ہم خیال لگتے ہیں۔ نوجوان محاذ کنفیوز ہے اور اپنا کوئی واضح موقف نہیں رکھتے۔

شیر علی باچا کا آخری سفر اور آخری بحث تھی۔ اُن کی بھی مجبوریاں تھیں، لیکن سی پی پی اصلاً ایک فرقے کی صورت اختیار کر چکی تھی اور وہ اس کے ساتھ نہیں چل سکتا تھا، اس لیے آخر کار وہ محمود خان اچکزئی سے جاملا۔

ببرک کارمل کی آمد اور ہم

ببرک کارمل متحدہ پارٹی کے سربراہ کی حیثیت سے اقتدار میں آیا، لیکن اس کا دل 'خلق' کے لیے اور 'خلق' کا دل اُس کے لیے صاف نہ تھا۔ آتے ہی موصوف نے اولین پریس کانفرنس بہت بے ڈھنگے پن سے کی۔ صحافیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: دوست صحافیو اور دشمن صحافیو! دوست وہ تھے، جن کا تعلق سوشلسٹ ممالک سے تھا اور دشمن وہ، جن کا تعلق مغربی اور دیگر ممالک سے تھا۔ ببرک کارمل کے آتے ہی ہم نے سُکھ کا سانس لیا اور وہ ہر وقت کا دھڑکا جاتا رہا کہ جانے کب کیا ہو جائے۔ البتہ اجمل خٹک کا بلڈ پریشر ہائی رہتا، کیونکہ ببرک کارمل اور پرچمیوں کا رویہ اجمل خٹک کے لیے مثبت نہ تھا۔ اس بات کا احساس اجمل خٹک کو بھی تھا۔ لیکن میں اُن کے شانہ بشانہ کھڑا تھا اور اگر ایسے اعتراضات کبھی اجمل خٹک پر میرے سامنے ہوتے تو میں اُن کا بھرپور دفاع کرتا۔ میرے ذہن میں کبھی یہ خیال نہ آیا کہ میں اجمل خٹک کو چھوڑ کر اپنی راہ چلوں۔ میری طبیعت ایسی ہے کہ میں چغل خور اور ایک کی بات دوسرے کو کہنے والا نہیں اور نہ ہی دو افراد کے درمیان اختلافات کو بھڑکانا مجھے پسند ہے۔ یہ پتا نہیں خوبی ہے یا خامی، لیکن کبھی کبھی اس کی وجہ سے مجھے نقصان بھی ہو جاتا ہے۔

تمام ملک بدر کیے گئے پرچمی ماسکو میں جمع کیے گئے تھے، جن کے ساتھ خلقی وزیر اسلم وطن جار، سید محمد گلابزوے، شیر جان مزدوریار اور اسد اللہ سروری بھی جاملے تھے۔ یہ سب تقریباً ایک ساتھ سوویت فوجوں کے ساتھ کابل میں داخل ہوئے۔ ان میں سے اکثر نے اپنے خاندانوں کو پیچھے چھوڑا، مثلاً ڈاکٹر نجیب اور فیض محمد خان محسود نے۔

فیض محمد خان کا میکروریان میں گھر تھا، جس میں کوئی اور رہائش پذیر تھا۔ رہنے کی جگہ ان کے پاس نہ تھی، اگرچہ وہ چاہتا تو حکومتی ہوٹل اور مہمان خانے سب ان کے اختیار میں تھے، لیکن انھیں ہم سے خصوصی محبت تھی۔ ہمارے گھر رہنے لگا اور میرے ساتھ میرے ہی کمرے میں منتقل ہو گیا۔ فیض محمد خان نے روسی راہنماؤں برزنیف، گرومیکو، پانا ماریوف، اوستینوف اور دیگر کے ساتھ اپنی ملاقات اور بات چیت کا احوال سنایا۔ چند دن ہمارے ساتھ رہا اور خوب وقت گزرا۔ موصوف کی اولاد عراق میں تھی یا ماسکو میں۔ اسے داؤد کی حکومت نے انڈونیشیا کا سفیر بنایا تھا اور

پھر امین نے تبدیل کر کے عراق بھیج دیا تھا۔ وہاں سے معزول کر کے کابل واپس آنے کو کہا گیا، لیکن دوستوں نے سمجھایا کہ کابل میں حالات درست نہیں، یہاں نہ آنا۔ وہ سفارت سے معزول ہونے کے بعد دیگر پرچمیوں کے ساتھ ماسکو میں رہا۔

پورے کابل میں روسی فوج کے داخلے کے ساتھ ہی ان کا استقبال اللہ اکبر کے مخالفانہ نعروں سے ہوا۔ مظاہرے جاری تھے۔ اس دوران فیض محمد خان نے فیصلہ کیا کہ اسے میکروریان اپنے گھر جانا چاہیے۔ میں نے بہت منع کیا لیکن وہ بہت بہادر انسان تھا۔ انھی فسادات کی حالت میں جس میں جان کا خطرہ تھا، جادہ میوند کے راستے، مظاہروں کے بیچ سے گزر کر میکروریان پہنچ گیا۔

ببرک کارمل کے آتے ہی پل چرخی جیل کے دروازے کھول دیے گئے۔ تمام پرچمی قیدی جیسے سلطان علی کشت مند، سلیمان لائق، تہذیب، رفیع اور نور وغیرہ اور حتیٰ کہ اخوانیوں تک کو، جن میں عبدالرب رسول سیاف جیسا انتہا پسند شامل تھا، سب کو آزاد کر دیا گیا۔

اس کے ساتھ ساتھ کابینہ، انقلابی شوریٰ اور پارٹی کی مرکزی کمیٹی کی ازسرنو تشکیل کی گئی جس میں نصف نصف کے اصول کو مدنظر رکھا گیا۔ یعنی نصف ارکان خلق کے اور نصف پرچم کے۔ اگرچہ یہ ظاہر تھا کہ وزن کس کے پلڑے میں زیادہ تھا، پرچم کے!

فیض محمد خان کو مرکزی کمیٹی کا رکن چنا گیا، جبکہ سرحدی اور قبائلی امور کی وزارت بھی اُنھیں ہی دی گئی۔ اس طرح ڈاکٹر نجیب کو پولٹ بیورو کی سربراہی کے ساتھ سب سے اہم اور بااختیار عہدہ، یعنی 'خاد' (خدمات اطلاعات دولتی: ریاستی اطلاعات کی جمع آوری کا ادارہ) کی سربراہی دی گئی۔ یہ دونوں افراد ہمارے ہیڈ کوارٹر کے قریبی لوگ تھے۔ ہمارے دوست اور پرانے ساتھی تھے۔ اپنے عہدوں کے لحاظ سے ہمارے لیے نئی حکومت میں رابطہ کار کی حیثیت رکھتے تھے۔ دونوں ہماری طرف بہت آیا جایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ پرچمیوں میں سے عبدالرشید وزیری بھی آزاد ہوا تھا، جو ہمارا قریبی دوست تھا۔ اگرچہ وہ بہت جلد کوئٹہ میں قونصل جنرل مقرر کر دیا گیا اور ہمارا بالفعل رابطہ کٹ گیا، لیکن کوئٹہ کے باعث اس کا ہم سے رابطہ تھا ضرور، کیونکہ یہ ہمارا مشترکہ میدان تھا۔ خلق کی طرف سے اسلم وطن جار ہمیشہ سے ہمارے ساتھ رہا تھا، اسلم اپنی عادات اور فطرت کے لحاظ سے شریف النفس انسان تھا۔

ببرک کارمل کے آتے ہی افغانستان میں یوم سوگ کا اعلان کیا گیا اور تمام مرنے والوں کے

لیے افغانستان کی تمام مساجد میں فاتحہ خوانی کا اعلان کیا گیا۔ اس کے علاوہ انفرادی طور پر بھی بعض افراد کے لیے فاتحہ خوانی کی گئی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر نجیب کے بھانجے اور نیک محمد کے بیٹے 'بریالے' کے لیے بھی فاتحہ خوانی کی گئی، جو پرچمی تھا اور یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ اس کی فاتحہ قرہ باغ میں کی گئی، جس میں میں اور اجمل خٹک دعا کے لیے گئے۔ اس طرح کی ہلاکتیں بے شمار کی گئی تھیں۔

☆☆☆

سوویت دوست چاہتے تھے کہ پارٹی میں اختلافات نہ ہوں، تبھی انقلاب مستحکم اور انقلاب کے دشمن ناکام رہیں گے۔ یہ ان کی کوشش اور خواہش تھی، لیکن افغان تو الگ ہی قسم کے لوگ ہیں۔ یہ دریائے کابل اور دریائے سندھ کا ملنا نہ تھا، جو کچھ فاصلے کے بعد آپس میں مل کر ایک ہو جاتے ہیں، یہ افغان تھے، جو آخر تک آپس میں نہ ملے۔ نہ صرف خود آپس میں نہ ملے بلکہ روسیوں تک کو مجبور کر دیا کہ وہ خلق اور پرچم کی حمایت میں تقسیم ہو جائیں۔

ببرک کارمل متحدہ پارٹی کے سربراہ کی حیثیت سے سامنے آیا، لیکن وہ کبھی بھی دل سے پارٹی وحدت کے لیے وفادار نہ تھا۔ اس طرح خلقی بھی اس حقیقت کے ساتھ ساتھ کہ اُن میں آپس میں بھی اختلافات تھے، پرچمیوں کے ساتھ وحدت میں صادق نہ تھے۔ لیکن یہ وہ وقت تھا جب تمام ذمہ داری پرچمیوں پر تھی، کیونکہ حاکمیت ان کے پاس تھی اور تمام لیڈرشپ ان کے ہاتھوں میں مرتکز کر دی گئی تھی۔

اگرچہ ببرک کارمل کو اجمل خٹک سے گلے تھے اور اسے 'کمزور شخصیت' کا مالک قرار دیا کرتا تھا، تاہم میری اور ڈاکٹر نجیب کی خواہش اور اور ویلیور گابریلوبیچ اوساچی، جو کارمل کا مشیر اعلیٰ تھا، کی مدد سے ببرک کارمل کو اجمل خٹک کی جانب پھر راغب کرنے پہ کام ہوا۔ ان کوششوں کے نتیجے میں بہت جلد اجمل خٹک اور مجھے، ببرک کارمل نے ملاقات کے لیے بلا لیا۔

کارمل صاحب کا یہ عقیدہ تھا کہ ترہ کی امین سے بدتر انسان تھا اور اس سارے فساد کا باعث ترہ کی تھا، لیکن اب، ہم مجبور ہیں کہ سارا الزام امین پر ڈالیں اور ترہ کی کا نام عزت سے لیں۔

ان دنوں ترہ کی کے تمام طرفدار اور چاہنے والے مرحوم کی قبر دریافت کرنے کی مہم میں مصروف تھے۔ افضل بنگش نے بھی اس تلاش میں اپنا حصہ ڈالا تھا۔ اس ملاقات میں اجمل خٹک نے ببرک کارمل سے شکایت کی کہ افضل بنگش کی خواہش ہے کہ امین اور ترہ کی کے مرنے کے بعد وہ

خلق کا سربراہ بنے۔ کارمل نے اسی وقت ٹیلی فون اٹھایا اور خاد کے سربراہ ڈاکٹر نجیب اللہ کو کہا بنگش کو بلاؤ اور اپنے آپ کو اس سے چھڑاؤ۔ دوسرے ہی دن ڈاکٹر نجیب نے بنگش کو بلایا اور افغانستان سے جلاوطن کرنے کا حکم سنایا۔ بنگش مجبور تھا کہ افغانستان چھوڑ کر لندن چلا جائے، کہ اب انھیں افغانستان سے بھی جلاوطن کر دیا گیا تھا۔

حکمران پارٹی کے عالمی تعلقات کمیشن میں خدمات

ایک دن ڈاکٹر نجیب آئے اور مجھ سے کہا، کہ ہماری کچھ مدد کرو گے؟ میں نے کہا، بالکل! میں تیار ہوں، حکم کریں۔ یہ 1980ء کے جولائی کی بات ہے۔ نجیب نے کہا، ہم نے پارٹی کی مرکزی کمیٹی میں عالمی امور کی شاخ ترتیب دی ہے۔ تم سیاست اور نظریے سے واقف ہو اور انگریزی بھی جانتے ہو۔ میں بریالے [مراد محمود بریالے تھا جو ببرک کارمل کا بھائی، پولٹ بیورو کا متبادل رکن اور اس نئی قائم ہونے والی شاخ کا سربراہ تھا] کو بتادوں گا، کہ صوفی ہماری مدد کرنے کو تیار ہے۔ دوسرے دن مجھے فون کیا، کہ بریالے تمہارا منتظر ہے۔ میں گیا، بریالے سے ملا، جس نے مجھے دفتر میں کام کرنے والے دیگر افراد سے متعارف کرایا۔ یہ دفتر وزارت خارجہ کی عمارت قصرِ ستور میں واقع تھا۔ میں نے وہاں کام شروع کیا اور پہلی مرتبہ مجھے چھ ہزار افغانی ماہوار تنخواہ ملنی شروع ہوئی۔ اس سے قبل حالت یہ تھی کہ مشترکہ لنگر کا کھانا نصیب ہوتا تھا اور وہ بھی تورلالی کے رہین منت تھا۔ میں نے اس دفتر میں 15 جولائی کو کام کا آغاز کیا۔ جس وقت میں اس دفتر کے عملے میں شامل ہوا، اس کی صورت کچھ اس طرح تھی:

سربراہ: محمود بریالے

اول معاون: عبدالرحمان بسام

سیکرٹری: شفیع

معاونِ ثانی: اسداللہ کشت مند

علاقائی (کمیونسٹ) پارٹی کے امور: رحیم رفعت

یورپ، امریکا، جاپان، آسٹریلیا: فہیم ادا

سوشلسٹ ممالک: رزاق

افریقا، ایشیا اور لاطینی امریکا: عمر

عالمی ادارے: وحید

یہ ترتیب بہت تیزی سے تبدیل ہوتی رہی اور اس میں وسعت آتی رہی۔ نئے نئے افراد اس میں شامل ہوتے رہے۔ شعبہ کے مشیر سیلکنن تھے۔ میاں گل صاحب، جنھوں نے روس میں تعلیم

حاصل کی تھی اور ایک شریف روسی خاتون سے شادی کی تھی، یہ پہلے ہمارے ہمسائے تھے، بعد میں وہ اس شعبے کے فعال کارکن ثابت ہوئے۔ اسی طرح اسد روغ، پرکاش، سلطان، یوسفی، ریدی گل اور دیگر بہت سے لوگ اس میں شامل ہوتے رہے۔ ان میں سے میاں گل صاحب ایسے ہیں، جو آج تک میرے ساتھ تعلق نبھا رہے ہیں، روس میں مقیم ہیں اور جرمن شہریت بھی رکھتے ہیں۔ [۲۳]

☆☆☆

میرے خیال میں روسیوں کی طرف سے یہ طے پایا تھا، کہ اجمل خٹک علاج کے لیے چیکوسلواکیہ جائیں۔ غالباً جون 1980ء میں اجمل خٹک ماسکو کے راستے پراگ روانہ ہوگئے۔ اس زمانے میں افغانستان کے پاس DC-10 طیارہ تھا، جب وہ پراگ کے ہوائی میدان میں اترتا تو پورے پراگ میں اتنا بڑا اور خوبصورت جہاز نہیں تھا، لوگ اسے دیکھتے ہی رہ جاتے۔

پکتیا میں جدران قبیلہ باغی ہوگیا تھا۔ جدران قبیلے نے صدر داؤد کے زمانے میں بھی بغاوت کی تھی، جس کی وجہ یہ تھی کہ صدر داؤد نے اعلان کیا تھا کہ کوئی بھی لکڑی پاکستان اسمگل نہیں کرے گا بلکہ طے کردہ نرخ پر حکومت کو فروخت کی جائے گی۔ پہاڑوں میں کاشت ممکن نہ تھی، اس لیے جدران قبیلے کا سارا دارومدار لکڑی کی فروخت پر تھا، اس لیے انھوں نے بغاوت کردی۔ اس وقت فیض محمد خان وزیر داخلہ تھے، وہ گئے اور انہوں نے جدران قبیلے سے مذاکرات کرکے پرامن طریقے سے مسئلہ حل کرلیا۔ اس مرتبہ بھی اُن کا خیال تھا کہ وہ جدران کو رام کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے، لیکن وہ اس حقیقت سے ناواقف تھے کہ اب کہ جدران کی پشت پر عالمی اخوانی، پاکستان اور امریکا کھڑے ہیں اور بغاوت کی وجہ مقامی یا قبائلی مفادات نہیں۔ ان میں جلال الدین حقانی جیسے پکے، کٹر انتہا پسندوں اور اخوانی لوگوں نے اپنی جڑیں قائم کرلی ہیں۔

فیض محمد خان بہادر اور صاف نیت انسان تھا، اپنی سچائی پر جسے یقین تھا۔ اُنھوں نے اپنے ساتھ کچھ ترقی پسند قبائلیوں، جیسے بختہ جان وزیر عسکری ڈویژن کے اعزازی سربراہ سربراہ بجن خان کے بیٹے، پیر کوتی اور ایک دو دیگر افراد کو ساتھ لیا، ہیلی کاپٹر لیا اور ٹھیک جدران کے بیچ اتارا۔ ہیلی کاپٹر انھیں چھوڑ کر واپس آگیا۔ ایک دو راتیں گزرنے کے بعد جلال الدین کے لوگوں نے انھیں وضو کرتے ہوئے قتل کردیا اور لاشیں وہیں کہیں غائب کردیں۔ ہمیں اس موت کی اطلاع اس وقت ملی، جب بی بی سی نے اس کی خبر نشر کی۔ ایک دو دن تو کسی کو یقین نہ آیا، لیکن جب خادؔ نے اپنے

ذرائع سے اس کی تصدیق کردی تو حکومت حرکت میں آئی۔ تاہم موت کی خبر اس کے بھی چند دن بعد نشر کی گئی۔

ڈاکٹر نجیب نے وزارت سرحدات میں ایک میٹنگ بلائی۔ اُن کی خواہش تھی کہ اس واقعے پر جدران قبیلے سے پشتون اخلاقیات اور اسلام کی بنیاد پر اپیل کی جائے، کہ یہ قتل پشتون اخلاقیات، جرگے، شورا اور اسلام کے اصولوں کے خلاف ہے، اس لیے جدران قبیلہ خود قاتلوں کی نشاندہی کرے اور انھیں سزا دے۔ ہمیں کہا گیا کہ اس مضمون کا ایک اعلان نامہ لکھیں، تاکہ اسے شائع کرکے ہیلی کاپٹر کے ذریعے جدران میں پھینکا جائے۔ محراب الدین پکتیاوال اور کچھ دیگر دوستوں نے اس طرح کا اعلان نامہ لکھا۔ میں چونکہ پہلے بھی قبائل کے ساتھ کام کرچکا تھا اور ان کے مزاج سے واقف تھا، اس لیے میرا لکھا ہوا اعلان نامہ ڈاکٹر نجیب کو پسند آیا اور اسے شائع کرکے پھیلایا گیا۔ آخر دم تک حکومت یہ جرات نہ کرسکی کہ فیض محمد خان کی فاتحہ کا اعلان کرے۔ اگر وہ زندہ رہتے تو زیادہ امکان یہی تھا کہ وہ افغانستان کے سربراہ بنتے اور نجیب کو موقع نہ مل پاتا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ببرک کارمل بھی فیض محمد خان کے قتل پر خوش تھا، جس کی وجہ یہ رہی کہ کارمل کے لانے پر بعض روسی فوجی حلقے اس کے انتخاب پر خوش نہ تھے اور اس کی کارکردگی سے مایوس تھے۔

☆☆☆

عالمی امور کے دفتر میں میرے ذمہ بھی وہی کام تھا جو باقی رفقائے کار کیا کرتے تھے۔ فرق محض اتنا تھا، کہ میں اُن کی پارٹی میٹنگز میں شریک نہ ہوتا تھا، کیونکہ میں ان کی پارٹی کا حصہ نہ تھا، البتہ باقی تمام امور میں میرا حصہ برابر تھا۔ میرے بنیادی فرائض میں حکومت اور پارٹی کی جانب سے دیگر ترقی پسند ریاستوں اور پارٹیوں کے نام لکھے گئے پیغامات اور خطوط کے علاوہ عالمی تنظیموں میں قیادت کے بیانات کا انگریزی زبان میں ترجمہ بھی شامل تھا۔ بیرون ملک پارٹیوں اور حکومتوں کو میرا کیا گیا ترجمہ، اصل فارسی متن کے ساتھ ارسال کیا جاتا۔ یہ خطوط، پیغامات اور بیانات اکثر افغانی اصطلاح سازی اور رنگین بیانیوں کا شاہکار ہوتے، جو انگریزی زبان و کلچر سے قطعاً میل نہ کھاتے تھے۔ لیکن یہ مشکل بیانی افغانیوں کی عادت تھی اور اب بھی ہے۔ اس کے علاوہ میں ادارے کی میٹنگز اور فیصلوں میں بھی شریک ہوتا اور ان کے درسی پروگراموں میں بھی ساتھ دیتا۔ پاکستان کے حوالے سے بھی اکثر مجھ سے مشورہ کیا جاتا۔ پاکستانی اخبارات میں شائع

ہونے والے اہم مضامین کا ترجمہ بھی میں کیا کرتا تھا۔ بریالے بعض اہم معاملات میں مجھ سے مشاورت کیا کرتا۔

اس تمام عرصے میں خارجہ امور کا وزیر شاہ محمد دوست تھے، جس سے میری اُس وقت سے جان پہچان تھی، جب موصوف پشاور میں افغان قونصل جنرل کی حیثیت سے تعینات تھے۔ وہ اکثر پاکستان کے حوالے سے مجھ سے مشورہ کرتے۔ آخر میں وہ مجھ سے اس قدر متاثر ہو گئے تھے کہ انھوں نے مجھے دعوت دی کہ "ہمارے ساتھ باقاعدہ کام شروع کرو اور میں تمہیں نیویارک میں اپنے نمائندے کی حیثیت سے تعینات کردوں گا"۔ (کاش میں نے یہ دعوت قبول کی ہوتی، یہ دعوت قبول نہ کرنا میری غلطی تھی!)

☆☆☆

8 جولائی 1980ء:

باچا خان علاج کی غرض سے دو ماہ قبل ہندوستان گئے تھے، آج واپس آ گئے۔ ہوائی میدان پر ان کے استقبال کے لیے نور احمد نور، ڈاکٹر صالح محمد زیرے، ڈاکٹر اناہیتا راتب زاد، فیض محمد خان محسود، اسلم وطن جار، ڈاکٹر نیاز محمد، پکتیاوال، فوائد عامہ کے وزیر اور دیگر احباب کے ساتھ میں بھی موجود تھا۔ 'وزیر اکبر خان مینہ' میں ظاہر شاہ کے وزیر دفاع جنرل عارف خان کے گھر میں قیام پذیر رہیں گے، یہ گھر اب حکومت کے قبضے میں ہے۔

☆☆☆

پاکستان کمیونسٹ پارٹی کی مثال بھی ویسی ہی تھی، جیسا کہ ابابیل الٹا لٹک کر کہتا ہے "آسمان میں نے اپنی دو ٹانگوں پر سہارا ہوا ہے"۔ کراچی کے 'نظریہ دانوں' نے اس پارٹی کو کچھ ایسی ہی چیز بنا دیا تھا۔ لیکن عملاً ان کی مثال ایک پدی سے زیادہ نہیں تھی، کہ جھاڑیوں اور درختوں کی جڑوں میں بیٹھ کر شور بہت کرتے ہیں اور چھلانگیں لگاتے رہتے ہیں۔ جس وقت ہم کمیونسٹ پارٹی سے جدا تھے تو افغانستان کی 'خلق ڈیموکریٹک پارٹی' سے نورت خان آفریدی کے ذریعے تعلق قائم رکھا گیا تھا، جو خود ایک نیم پاگل شخص تھا۔ میں اکثر دیکھتا کہ وہ اکڑتا ہوا 'بریالے' سے ملاقات کے لیے آیا کرتا تھا۔ اس کے بعد نورت خان قبائل ٹرانسپورٹروں کی تنظیم کا سربراہ بنے گا اور بہت سے وسائل اور اختیارات سمیٹ لے گا۔

سفر بلغاریہ اور سوشلسٹ ممالک کا دورہ

ستمبر 1980ء میں بلغاریہ کے دارالحکومت صوفیہ میں 'عالمی عوامی شوریٰ برائے امن' (World Parliment of the Peoples for Peace) کا اجلاس ہونا تھا۔ افغانستان سے ایک بہت بڑے وفد کو بلایا گیا ہے اور مدعوئین میں میرا نام بھی شامل ہے۔ اس وفد میں پولٹ بیورو کے دو ارکان ظہور رزم جو اور محمود بریالے، مرکزی کمیٹی کے چند افراد، چند وزارتوں کے نائب وزرا، ٹریڈ یونینوں کے سربراہان، افرو ایشیائی تنظیم اور عالمی امن کونسل کے سربراہوں کے علاوہ صحافی شامل ہیں۔ ہم سب ایک طیارے میں ماسکو گئے اور کریملن کے قریب 'مسکوا' نامی ہوٹل میں جا ٹھہرے۔ باقی سب ماسکو سے رومانیہ کے راستے ریل گاڑی سے صوفیہ کی جانب روانہ ہوئے۔ میں اور چند دیگر شرکا کو طیارے کا ٹکٹ دیا گیا تھا۔ میں ماسکو میں ٹھہرا رہا اور دو دن بعد ہوائی جہاز کے ذریعے صوفیہ پہنچا۔ ہمیں شہر کے بیچ 'یوروپا' نامی ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ اس پارلیمنٹ کا اہتمام 'عالمی امن کونسل' (World Peace Council) کی جانب سے کیا گیا تھا، جس کا افتتاح کونسل کے صدر رامیش چندرا نے کیا۔ اس پارلیمنٹ میں بلغاریہ کی سربراہ 'تودر ژیفکوف' کے علاوہ دیگر کئی اہم حکومتی اور تنظیمی شخصیات نے دنیا بھر سے شرکت کی، جن میں یاسر عرفات بھی شامل تھے۔ اس کونسل کی بلغاریہ میں شاخ کے سربراہوں میں تودر ژیفکوف کی بیٹی اور بلغاریہ کمیونسٹ پارٹی کے پولٹ بیورو کے رکن 'لودمیلا ژیفکووا' کے پاس تھی۔ اس اجلاس میں شرکت کے لیے پاکستان سے فیض احمد فیض آئے تھے، جو ماسکو ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھا اور ایک پری پیکر روسی ترجمان ہر وقت ان کے ساتھ رہتی۔

یہ پارلیمنٹ چند دن جاری رہی۔ ہم سب کو مختلف ورکشاپوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ میں نے بحر ہند سے متعلق ورکشاپ میں حصہ لیا اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کے علاوہ وفد کے سربراہ ظہور رزم جو، جو کابل کی شہری کمیٹی کے سربراہ تھے، کی تقریر کا ترجمہ بھی میں نے کیا۔ پانچ دن بعد پارلیمنٹ کا اجلاس اپنے اختتام کو پہنچا اور "تودر ژیفکوف' نے تمام شرکا کو اپنے محل میں مدعو کیا۔ اس کے بعد تمام وفود اپنے اپنے ملک واپس لوٹے۔ محراب الدین پکتیاوال اس وقت بیکار تھا، لیکن اس نے تعلیم بلغاریہ میں حاصل کی تھی اور فیض محمد خان کے ساتھ 'افغان بلغاریہ دوستی انجمن' کا نائب

تھا۔اس لیے ہمیں اسی انجمن کے بلغاری سربراہ، جو بلغاریہ کمیونسٹ پارٹی کے پولٹ بیورو کے رکن تھے اوراس کے ڈپٹی 'ایوان کراسانوف' (جو کابل میں سفیر کے طور پر خدمات انجام دے چکے تھے اور اسی زمانے سے ہمارا تعارف تھا) نے اپنا مہمان بنایا۔ اس انجمن نے ہماری مدد سے فیض محمد خان کی یاد میں ایک جلسہ بھی منعقد کیا۔ میں جب کابل سے نکل رہا تھا تو میں نے اپنے روسی رابطہ کار 'اوساچی' سے مشورہ کیا تھا کہ میں بہت تھک گیا ہوں اور سیر کرنا چاہتا ہوں۔اس نے مشورہ دیا کہ اچھی بات ہے، تمام سوشلسٹ ملکوں کی سیر کرو لیکن مغرب کی طرف مت جانا۔ بلغاریہ کی طرف سے ملنے والے دعوت نامے کے باعث یہ ممکن ہوگیا، کہ میں پکتیاوال کے ساتھ تمام ممالک کی سیر کرسکوں۔

دوستی انجمن نے ہمیں آگاہ کیا کہ ہم جس ہوٹل میں رہ رہے ہیں، اسی میں اپنا قیام بڑھا سکتے ہیں۔ہمیں فی یوم ذاتی خرچ کے لیے فی کس بیس 'لیوہ' (بلغاریہ کی کرنسی جو اُس وقت روبل سے مہنگی تھی اور ایک لیوہ دو ڈالر کی وقعت رکھتا تھا) دیے جاتے اور یہ آزادی تھی کہ جہاں چاہیں کھانا کھاسکتے ہیں۔ پکتیاوال اور میں کئی مرتبہ صوفیہ کے قریب سیرگاہ 'ویتوشا' اور ایک قریبی شہر 'پلاودیف' میں مہمان بنائے گئے۔اس کے علاوہ ایک مرتبہ سگریٹ کے کارخانے 'بلگارتباک' (BT) نے ہمیں اپنا مہمان بنایا۔سٹوڈنٹ سٹی 'درونیستا' (Darvanista) گئے اور خوب سیر کی۔ ابھی دس دن نہ گزرے تھے کہ پکتیاوال کو کابل سے پیغام ملا کہ فوراً پہنچو اور وزارت مالیات میں نائب وزیر کا عہدہ سنبھالو، وہ چلا گیا اور میں اکیلا رہ گیا۔ میں نے صوفیہ سے ماسکو کا ہوائی جہاز کا ٹکٹ کینسل کرادیا تھا اور اس کی جگہ پراگ میں اجمل خٹک کو پیغام بھجوادیا تھا کہ میں آہستہ آہستہ پراگ کی جانب قریب آتا جارہا ہوں۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ اجمل خٹک سے پراگ میں ملاقات ہوگی اور وہاں سے برلن اور وارسا جاؤں گا۔ وہاں کچھ دن گزار کر آخر میں ماسکو جاؤں گا۔ پراگ میں وزیرستان کے علاقے سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر غلام سے بات ہوچکی تھی، جو وہاں حصول تعلیم کے لیے ٹھہرے ہوئے تھے اور وہ اس امید میں تھے کہ میں آؤں تو مل کر سیر و تفریح کریں۔

میں ستمبر کے آخر یا اکتوبر کے آغاز میں ریل کے راستے بلغراد روانہ ہوا۔ میری بدقسمتی یہ رہی کہ ان دنوں بلغراد (یوگوسلاویہ، مرحوم) میں یونیسکو کانفرنس جاری تھی اور پوری دنیا سے چھوٹے بڑے مدعو اور غیر مدعو مندوبین اور لابی کرنے والے وفود موجود تھے۔ اس لیے تمام سستے ہوٹل ان

کے قبضے میں تھے۔ میں نے ایک عورت کے گھر میں ایک کمرہ کرایہ پر لیا، جہاں پہلے ہی سری لنکا کے دو سیاح ڈیرہ جمائے ہوئے تھے۔ بلغراد خوبصورت شہر ہے، لیکن آرام دہ جگہ نہ ملنے اور عارضی مہنگائی کے باعث میں وہاں محض تین چار دن ہی ٹھہر سکا۔

میری اگلی منزل ہنگری کا دارالحکومت بوڈاپسٹ تھا۔ وہاں کارمل کا پھوپی زاد اور میرا پرانا دوست 'جیلانی باختری' سفیر تھا۔ میں ریل کے ذریعے وہاں پہنچا اور کیرپشے اوتسا یعنی کیرپشے سڑک پر واقع ایک گھر میں ایک کمرہ کرائے پر لیا۔ ہوٹل مہنگے ہوں تو میرے جیسے سیاح اکثر لوگوں کے گھروں میں سستے ٹھکانے ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ بوڈاپسٹ بہت خوبصورت شہر ہے، اس کے عین وسط میں 'دانیوب' دریا بہتا ہے جس کے ایک کنارے کا علاقہ 'بودا' کہلاتا ہے اور دوسرے کنارے کا علاقہ 'پسٹ'!

میں جمعے کے دن وہاں پہنچا اور اگلے دو دن وہاں چھٹی تھی۔ میں سفارتخانے گیا تو وہ بند تھا اور سفیر کے گھر کا پتا معلوم نہ تھا۔ سفیر سے ملنے سے قبل میں نے پیدل ہی پورا شہر گھوم لیا۔ جہاں بھوک لگتی، مرغی کا گوشت کھاتا اور آگے بڑھ جاتا۔ بوڈاپسٹ میں زیر زمین ریل کا بہت خوبصورت جال بچھا ہوا ہے۔ اس کے 'ماسکو' نامی ایک اسٹیشن پر ہاٹ ڈاگ یعنی ساسیج بکتے تھے، مجھے یہ ساسیج بہت لذیذ لگے۔ میں اس شہر کی تمام سیرگاہوں میں گھوما، حتیٰ کہ 'مولن روژ' جیسی تفریح گاہ کا بھی ٹکٹ لیا۔ دو دن بعد سفیر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے مہمان بنایا اور بہت زور ڈالا کہ میں ان کی رہائشگاہ میں ٹھہر جاؤں اور سفارت خانے کے تمام وسائل سے استفادہ کروں۔ میں ہنسا اور کہا 'جیلانیوں' سے میں کابل میں بڑی مشکل سے جان چھڑا کر بھاگا ہوں، یہاں میں اُن سے دور رہنا چاہتا ہوں۔

انہی دنوں افغانستان سے افریقہ۔ ایشیا عوام دوستی کا وفد بھی بوڈاپسٹ آیا ہوا تھا۔ اس وفد کے سربراہ مجاور احمد زیار تھے۔ موصوف کو امین نے چند دن کے لیے جیل بھجوایا تھا، جب رہا ہوئے تو اپنے آپ کو پرچم زدہ کرلیا، حالانکہ ان کی گرفتاری کے اسباب کچھ اور تھے۔ زیار صاحب ہر جگہ زبردستی کے قائل تھے۔ ان کی بیگم صاحبہ جرمنی میں زیر تعلیم تھیں۔ انہوں نے ہنگری کے میزبانوں کو اس پر مجبور کیا کہ ان کی اہلیہ کا بوڈاپسٹ کے لیے دو طرفہ ٹکٹ بھی فراہم کیا جائے۔ اس حرکت نے انھیں نقصان پہنچایا، کیونکہ کابل میں ان کی یہ بے جا ضد، بڑوں کی نظر میں ان کا مقام گرانے کا باعث بنی۔

میں بوڈاپسٹ میں خوش تھا اور یہاں تقریباً بارہ دن گزارے۔ خواہش تھی کہ کچھ دن اور رہوں اور اس کے بعد پراگ جانے کا سوچوں۔ بوڈاپسٹ میں کئی افغانوں سے تعارف ہو چکا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ 'بالاتون' کا چکر لگاؤں اور پھر پراگ جایا جائے۔ یہ ہنگری کا مشہور سیاحتی مقام ہے، جہاں کھڑے پانی کا ایک بڑا ذخیرہ ہے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اچانک اجمل خٹک نازل ہوتے ہیں۔ اجمل خٹک کے علاج اور سیر کے دن پورے ہو چکے تھے۔ انھیں وہیں میرا انتظار کرنا چاہیے تھا یا ماسکو چلے جانا چاہیے تھا۔ میں نے جس مصیبت سے عارضی فرار اختیار کیا تھا وہ پھر میرے گلے آپڑی تھی۔ باختری نے یہ اطلاع ٹیلی فون پر دی کہ اجمل خٹک بوڈاپسٹ آرہے ہیں، انھیں یہ اطلاع خود اجمل خٹک نے دی تھی۔

اب میری مجبوری تھی کہ میں باختری کے گھر منتقل ہو جاؤں، کیونکہ اجمل خٹک انھیں کے معزز مہمان تھے۔ کچھ دن اور وہاں رکا رہا، سرکاری گاڑی میں بھی شہر گھوم کر دیکھا۔ باختری کے صاحبزادوں نے سیر کرائی۔ ایک دن مجھے سوکھا میٹھا گوشت کھلایا۔ وہ مجھے چھیڑتے رہے کہ یہ تو گدھے کا گوشت تھا۔ چاہے گدھے کا تھا یا خچر کا، لیکن تھا بہت لذیز! اسی قیام کے دوران ہنگری کی وزارت خارجہ کا ایک اہم رکن سفارت خانے آیا۔ اس کو دی گئی دعوت میں شرکت کی اور سیاسی بات چیت رہی۔ اس کی سنی اور اپنی سنائی۔

اجمل خٹک کو میرے پروگرام کا علم تھا اس لیے انھوں نے کہا میں تو تمہارے ساتھ ہی جاؤں گا۔ میں انھی حضرت سے بھاگ کر نکلا تھا اور بلا کہہ رہی ہے کیوں حضرت ہمارے بغیر کہاں چل دیے!؟ میں آزادی چاہتا تھا، جہاں رات آئی سو لیے، جب بھوک لگی، کھا لیا۔ اجمل خٹک کے ساتھ پھرنا تو بچے کو ساتھ پھرانے سے بھی مشکل تھا، کہ ان کی ہر دوپہر کو ضد ہوتی کہ اپنے بستر کے بغیر سکون نہیں ملتا۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا، مجبوری تھی، کہ انکار بھی ممکن نہ تھا۔ اجمل خٹک کی وجہ سے پراگ کی سیر میں نہ کر سکا۔

کچھ دن بعد ٹرین میں بیٹھے اور مشرقی جرمنی کے دارالحکومت مشرقی برلن پہنچ گئے۔ یہ عشاء کا وقت تھا اور سفارتخانے کی عمارت بند تھی۔ باختری نے ہمیں رخصت کرنے سے پہلے جس سفارتی نمائندے کو اطلاع دی تھی، وہ گھر نہ تھا۔ ہم نے اپنے رہنے کے لیے 'اونتر ڈین لینڈن' سڑک پر اسی نام کے ہوٹل میں ٹھکانہ بنایا۔ ہمارے پاس ڈالر تھے، اس کو تبدیل کرنے کی جگہ ڈھونڈنے کی

کوشش کی، لیکن ناکام رہے۔ ڈالر کا سرکاری تبادلہ ہمیں مہنگا پڑا، لیکن اجمل خٹک کو بھوک لگی تھی، یوں ہمیں وہ کھانا 35 ڈالر کا پڑا، ہوٹل کا ملازم بہت خوش تھا۔ یہ درحقیقت اتنی رقم تھی کہ اگر بلیک مارکیٹ میں بدلتے تو اس میں ہم کئی دن کھانا کھا سکتے تھے۔ یہ راز کی بات بھی ہمیں بعد میں معلوم ہوئی کہ مغربی برلن کے بینک ڈالر کے بدلے بلیک مارکیٹ جتنا ہی دام چکاتے تھے۔ میں نے پبلک ٹیلی فون سے باختری کو خیر خیریت سے برلن پہنچنے کی اطلاع دی۔ ٹیلی فون ملانے کے لیے دو مارک کے سکے ڈالے تھے، لیکن جب ٹیلی فون رکھا تو چار مارک اس نے باہر پھینک دیے۔ گویا دو مارک کا فائدہ ہوا! یہ نومبر 1980 کی رات تھی، سردی تھی، لیکن رات ہم نے سکون سے گزاری۔

صبح زمان آموجود ہوئے اور تمام تکلفات برلائے۔ مشرقی جرمنی کے اہم راہنماؤں سے بات کی اور انھیں ہماری اہمیت اور مقام سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جرمن حکومت اور پارٹی نے ہمیں سرکاری مہمان خانے 'ہاؤز یوہانوسوف' میں ٹھہرالیا۔ وہاں ہر چیز عالی شان اور مفت تھی۔ اجمل خٹک کا ساتھ بچے کا ساتھ تھا۔ ان کے قیلولے کی عادت نے مجھے قیدی بنایا ہوا تھا۔ اس کے باوجود ہم نے شہر کے اہم مقامات، میوزیم اور دوسری عالمگیر جنگ کی یادگاریں دیکھ ہی لیں۔ اس زمانے میں تمام اہم مقامات کی نگرانی کا فرض روسی افواج کے پاس تھا۔ انھوں نے ہمیں تمام جگہیں دکھائیں، وہ تمام خندقیں اور بنکر دکھائے، جہاں جنگ کے دوران مزاحمت اور حملے ہوئے۔ مستند جنگی فلمیں دکھائیں اور خوب عزت واحترام کا معاملہ کیا گیا۔

اب یہ بھول رہا ہوں، کہ اس وقت وہاں افغانستان کا سفیر تھا یا ابھی مقرر نہیں ہوا تھا۔ تاہم سفارتخانے کے عملے نے ہماری خوب خدمت کی۔ روسیوں کا یومِ انقلاب اکتوبر آپہنچا تھا۔ روسیوں نے ہمیں بھی مدعو کیا۔ دعوت میں تمام سفیروں اور جرمن حکومت اور پارٹی کے بلند رتبہ افراد نے شرکت کی۔ دعوت میں تمام لوازمات تھے اور روسی سفیر خاص طور پر اجمل خٹک سے بہت گھل مل گیا۔ انقلاب اور اس کی ترقی کے لیے بہت سے پیک بلند کیے۔ اجمل خٹک اس طرح کی دعوت کے آداب سے واقف نہ تھے۔ مجھے کہا بھئی اب مجھے میرے کمرے چھوڑ آؤ۔ یوں میں محفل کے بعد کی موسیقی سے محروم رہ گیا۔ اب صحیح سے یاد نہیں کہ کتنے دن وہاں رہے، لیکن کم از کم دس دن تو ضرور برلن میں گزارے۔

وہاں سے ٹرین کے ذریعے وارسا (پولینڈ) گئے۔ پولینڈ خوبصورت مگر ویران ملک تھا۔

وہاں ہم افغان سفیر کے مہمان تھے۔ وہاں اُس وقت کونڑ صوبے میں 'سرکانڑو' علاقے سے تعلق رکھنے والے ایک خلقی کو سفیر لگایا گیا تھا۔ شریف انسان تھا، لیکن دیہاتی تھا اور کئی نزاکتوں سے ناواقف تھا۔ وارسا کے بیچ ایک ہوٹل 'گرینڈ' میں ہم دونوں کے لیے ایک کمرہ کرایے پر لیا ہوا تھا۔ مجھے بہت برا لگا، یہ تو ایسا تھا جیسے دو مہمان کسی کے گھر جائیں اور اسی کے حجرے کے ایک ہی کمرے میں ٹھہرا لیے جائیں۔ یہ ایک بڑا ہوٹل تھا جس کی کئی منزلیں اور ہر منزل میں کئی کمرے تھے اور ہمارے لیے ایک ہی کمرہ کرائے پر لیا گیا تھا۔ سفیر صاحب سفارتی آداب سے ناآشنا تھے اور پولینڈ کی سرکاری شخصیات سے کوئی خاص مراسم بھی نہ رکھتے تھے، اس لیے وہاں ہماری سرکاری افراد سے ملاقات بھی نہ ہوسکی۔ سفیر صاحب کو میرے مزاج کا اندازہ ہوا، تو میرے لیے ایک الگ کمرہ لیا گیا اور میں وہاں منتقل ہو گیا۔

سردیوں کی آمد آمد تھی، بلکہ پولینڈ میں تو وہ اپنے جھنڈے گاڑ چکی تھی۔ اجمل خٹک کو سردی بہت لگتی تھی۔ سردی کے ہاتھوں وہ چلنے پھرنے سے عاجز تھے۔ تھوڑی دیر باہر رہتے تو پھر واپس آکر سر تھامے بیٹھے رہتے۔ جب بہت تنگ آگئے تو مجھے کہا میں چلا ماسکو۔ اجمل خٹک کو ائیر پورٹ پر رخصت کیا۔ میں کچھ دن اور وہاں رہا لیکن جیب کی حالت اچھی نہ تھی۔ آخر میں نے بھی ٹرین کا ٹکٹ لیا اور وارسا سے ماسکو کی جانب چل پڑا، دوسرے دن ماسکو پہنچا۔ صوفیا جاتے ہوئے میں ماسکو میں روسی سرکاری مہمان تھا، اس لیے امید تھی کہ شائد واپسی میں بھی وہ اس مہمان نوازی کا مظاہرہ کریں۔ لیکن وہاں پہنچا تو دیکھا کہ اجمل خٹک کو افغان سفارت خانے نے یوکرین ہوٹل میں ٹھہرایا تھا تو مجھے اچھا نہ لگا کہ میں روس سے سرکاری مہمانداری کا مطالبہ کروں۔ اس وقت ماسکو میں سفارت کی باگیں 'دانشجو' کے ہاتھ میں تھیں، جو بعد میں وزارت خارجہ کے نائب وزیر بھی مقرر ہوئے۔ موصوف پارٹی سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ میں ماسکو کے مضافات میں اپنے خرچ پر 'دوستک' ہوٹل میں ٹھہرا۔ برف باری کا سلسلہ خوب زور و شور سے جاری تھا۔ ماسکو برف سے ڈھکا ہوا تھا۔ میرا ہوٹل میٹرو سے دور تھا اور بسوں کا پیچیدہ نظام میری سمجھ سے باہر تھا۔ اس لیے جب اجمل خٹک سے ملنے جاتا تو بہت مشکلات سے گزرتا۔ اکثر ذاتی گاڑیوں یا سرکاری گاڑیوں کو کرایہ دے کر ماسکو تک پہنچتا۔ ایک دن کسی موٹر کے انتظار میں تھا، کہ ایک کالی 'والگا' میرے سامنے آرکی۔ میں خوش ہوا، کہ کوئی مہربان لفٹ دینے رکا ہے۔ لیکن اس میں سے ایک لڑکا نکلا اور مجھ سے

پوچھا 'تمہارے پاس بونیم ہے؟'۔ بونیم اس زمانے میں جرمنی کا مشہور میوزک گروپ تھا۔ روسی اس قدر مغرب کے دیوانے ہوئے پڑے تھے۔ ہر غیر ملکی کو مغربی کلچر کا درآمد کنندہ سمجھتے تھے۔ کچھ دن ماسکو میں ادھر اُدھر گزارے، فیض احمد فیض سے ملاقاتیں رہیں اور پھر واپس کابل آگئے۔

☆☆☆

یوں تو کابل اور خصوصاً ننگرہار میں میڈیکل اور پھر بعد میں انجینئرنگ کالج میں طلبہ کو داخلہ دلوانے کی ذمہ داری میری تھی۔ ان کے اسناد کی تصدیق، وزارت سرحدات سے اس کی منظوری اور کالجوں میں داخلہ ہمارے ہیڈ کوارٹر کے ذمہ تھا۔ تاہم انقلاب کے بعد اور پھر پرچمیوں کے آنے کے بعد یہ سلسلہ بہت بڑھ گیا۔ ویزہ دینا اور اس میں توسیع وزارت داخلہ کے ذمہ تھا، لیکن یہ معاملہ اتنے مراحل پر مشتمل تھا کہ طلبا کے کئی دن ضائع ہو جاتے۔ پہلے وہ اپنے ادارے سے وزارت سرحدات کے نام ایک مراسلہ لاتا، پھر وہ وزارت خارجہ کو لکھتے، وہ وزارت داخلہ کو بھیجتے اور پھر وزارت داخلہ کابل کے پاسپورٹ کے محکمے کو الگ سے لکھتی۔ میری خواہش تھی کہ یہ سلسلہ مراتب مختصر کر دیا جائے۔ وزیر داخلہ 'سید محمد گلاب زوے' کو میں اس وقت سے جانتا تھا جب وہ روس سے تازہ تازہ تربیت لے کر آیا تھا اور ایک نچلے درجے کا فوجی افسر تھا، 'فروشگاہ افغان' میں اس کے ساتھ کئی مرتبہ چائے کے پیالے پر طویل گپ شپ کی محفلیں جمی تھیں۔ اجمل خٹک کے پاس یہ خود، اس کا بھائی محمد اور والد صاحب بھی آیا کرتے تھے۔ محمد نے کئی مرتبہ اجمل خٹک کو اپنے گھر میں دعوت دی تھی۔ مجھے کیا خبر تھی کہ موصوف کو اقتدار، خلق سے تعلق یا ہمارے پرچمی ہونے نے اس قدر مغرور اور بدلحاظ کر دیا ہوگا۔ انھیں میں نے فون کیا اور طلبہ کی مشکلات سے آگاہ کیا۔ موصوف نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور غصے سے فرمانے لگے کہ یہ پاکستانی ایسا کرتے ہیں اور ویسا کرتے ہیں۔ میں نے بات بڑھانی مناسب نہ سمجھی اور فون بند کر دیا۔ یہی قصہ بریالے کو سنایا تو اس نے فون اٹھایا اور وزارت خارجہ کو ڈیوٹی سونپ دی کہ جس درخواست پر صوفی لکھ دیا کرے، یہیں اس طالب علم کو ویزا اور اجازت دے دی جائے۔ اس کے بعد یہ مسئلہ حل ہو گیا، جو پاکستانی طالب علم آتا، میں ایک دو سطروں کا مراسلہ اسے لکھ دیتا اور وزارت خارجہ سے اسے ویزا مل جاتا۔ درمیان کے تمام مراحل سے جان چھوٹی۔ طلبہ بھی خوش تھے اور میں بھی سکھی تھا کہ روز روز کی سفارشوں سے جان چھوٹی۔
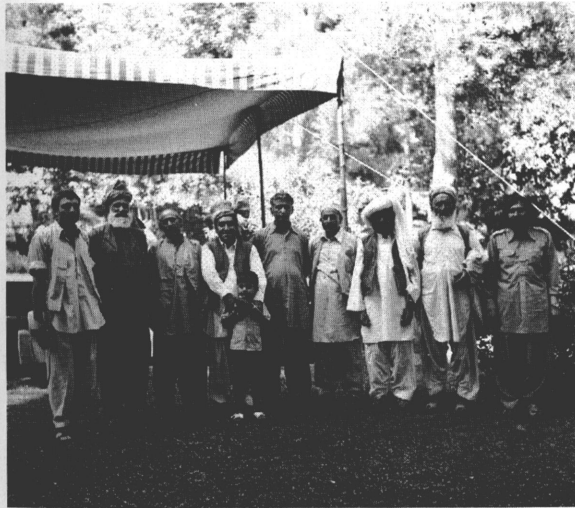
☆☆☆

ہمارے بعض ایسے لڑکے جنہیں پاکستان میں داخلہ نہیں ملتا تھا، انھیں بھی ہم نے کابل میں ڈاکٹر اور انجینئر بنا دیا۔ سب کی خواہش ہوتی تھی کہ ڈاکٹر بنیں اور اگر وہ نہیں تو انجینئر۔ ہم بھی اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی آزاد خیال تھے۔ بعض ایسے لڑکے جنھوں نے پاکستان میں آرٹس میں تعلیم حاصل کی، انھیں بھی ہم نے وہاں ڈاکٹر بنا کر چھوڑا۔ ایک دن ڈاکٹر نجیب نے فیصلہ کیا کہ پاکستانی طالب علم اگر ڈاکٹری میں داخلہ لینا چاہتے ہیں، تو سب کو داخل کر دیا جائے۔ یہ وہ طالب علم تھے، جو 'خوشحال خان لیسہ' کے فارغ التحصیل تھے۔ یہ ادارہ فاٹا کے قبائلی علاقوں کے طلبا کے لیے بنایا گیا تھا۔ افغان طلبہ پر پابندی تھی کہ وہ انٹری ٹیسٹ 'کانکور' دیں، اور اس میں حاصل کردہ نمبروں کی بنیاد پر مختلف شعبوں میں داخلہ ملتا۔ محض ہمارے گاؤں والے اور دو اور لڑکے باقی تھے۔ جسیم میرے پاس آیا اور میں نے ڈاکٹر نجیب اللہ سے اس سے متعلق کہا، یوں سب کو داخلہ مل گیا۔ اب وہی ڈاکٹر جسیم ہے جو اکڑ اکڑ کے چلتا ہے۔

اس وقت سوشلسٹ ممالک کو طالب علم بھیجنے کے لیے وزارت منصوبہ بندی کی جانب سے کوئی ضابطہ مقرر نہ تھا۔ یہ سارا فرض ہمارا ادارہ، یعنی بین الاقوامی تعلقات کمیشن انجام دیا کرتا تھا۔ گرمیوں کی چھٹیاں ہیں۔ افغانی طالب علم چیکوسلواکیہ جا رہے ہیں۔ بخت زمین اور فضل الرحمان دیر کے لڑکے 'خوشحال خان لیسہ' سے فارغ ہو چکے اور وزارت نے انھیں ٹھہرایا ہوا ہے، جبکہ باقی طالب علم اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے ہیں۔ میں نے انہیں کہا، آؤ تمہیں پڑھنے کے لیے چیکوسلواکیہ بھجواتا ہوں۔ وہ اڑ گئے کہ ہم تو نہیں جاتے۔ پھر کہا، اگر بھیجنا ہے تو ہمیں سوویت یونین بھجوا دو۔ میں نے انہیں بہت سمجھایا کہ چیکوسلواکیہ، روس کے مقابلے میں بہت بہتر ہے۔ لیکن وہ نہ مانے۔ بعد میں بخت زمین ہمارے علاقے گاؤں 'زیدہ' کے ساتھی عبدالنعیم کے ساتھ جیل چلا گیا اور فضل الرحمان بھی یہیں رہ گیا۔ اسی طرح کراچی کے رؤف وارثی کی بیٹی کو میں نے پراگ بھجوایا۔ ایک اور لڑکا نعیم 'شیوہ' گاؤں سے تعلق رکھتا تھا اور 'خوشحال خان لیسہ' میں پڑھ رہا تھا۔ جب کابل پر کفر کے فتوے لگے، تو اس کے باپ نے اسے وہاں سے واپس آنے کو کہا، وہ اجمل خٹک کے ساتھ ہمارے ہیڈ کوارٹر میں رہ رہا تھا۔ کچھ لڑکے پڑھنے کیوبا جا رہے تھے، میں نے نعیم کا نام شامل کیا اور اسے وہاں بھیج دیا۔ میری کوشش تھی کہ کیوبا میں بھی اس سے رابطہ قائم رہے۔ اسے میں نے زراعت کے شعبے میں داخلہ دلوایا تھا، وہ مسلسل وہاں سے درخواست کرتا تھا کہ اسے 'سائنسی

ریشخور، کور ہیڈ کوارٹر: (جشن افغانستان کے موقع پر)
جنرل غلام حیدر رسولی اور دیگر جرنیلوں کے ساتھ اجمل خٹک اور اعظم۔

(بائیں سے) اعظم ہوتی، مراد بزنجو، حاجی نادر خان (ساتھ) حیدر ہوتی
میر اکرم بلوچ، سحر گل مہمند، میر ہزار، سیال اور مسیت، اسلم گچکی۔

جشن پختونستان: اجمل دیگر افغان وزرا کے ساتھ دکھائی دے رہے ہیں۔

(بائیں سے) ڈاکٹر نوین، اجمل خٹک، قیوم وردگ، میر اکرم، میر ہزار، اسلم گچکی۔

(بائیں سے) عبدالقادر مل، صوفی، داؤد کاویان۔

1989ء، پشاور: صوفی اور بشیر بلور۔

1975ء، کابل: صوفی، تور لالی، عالمزیب۔

14 مارچ 1978ء: رشید اقبال، صوفی اور صفدر۔

اعزازی جنرل دلباز خان وزیر، فیروز شاہ باچا آف باجا، اور اجمل خٹک۔

صوفی اور عالمزیب۔

(بائیں سے دوسرا) مولوی محمد ہاشم خان وزیر، اپنے ساتھیوں کے ہمراہ۔
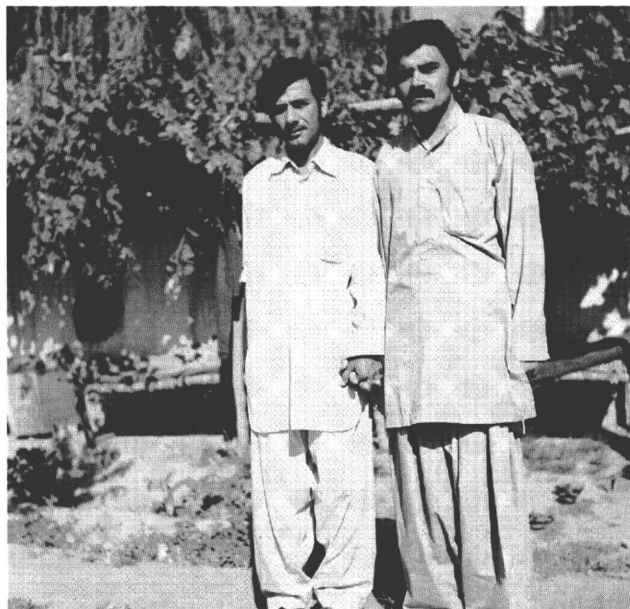
کمانڈر شہباز خان اپنے ساتھی کے ہمراہ۔

(بائیں سے) امجد، جنرل یحییٰ نوروز، جنرل روکے، تورلالی، جنرل عزیز
اجمل خٹک، غلام حیدر رسولی، میر اکرم، جنرل؟، میر ہزار، جنرل؟، مراد بزنجو۔

(بائیں سے) خیال جان، مسیت، تحصیلدار (آف دیر)، نادر خان
بخت باچا خان، منشی سحر گل، ملک عظیم خان اور ان کے دو ساتھی۔
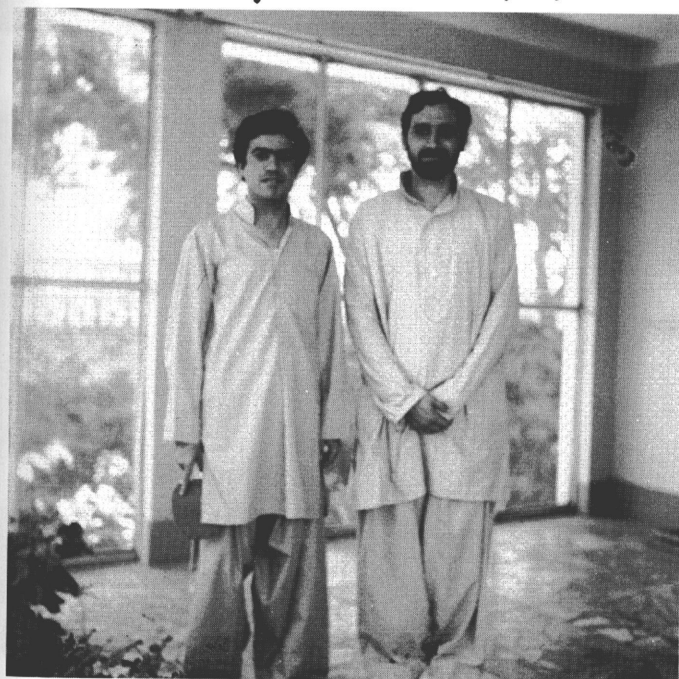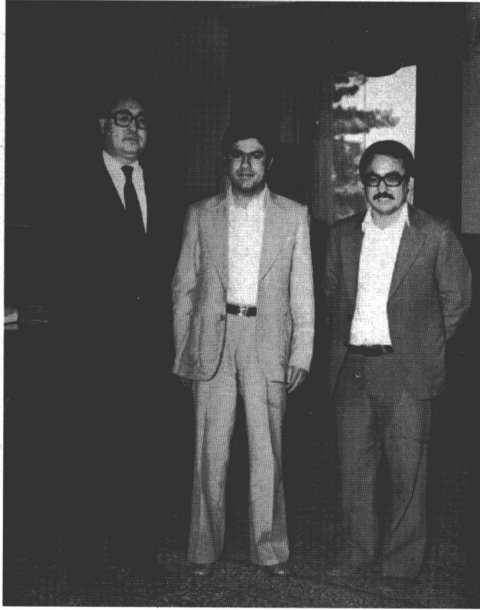
وزیر اعظم 'سلطان علی کشت مند' اور ان کے بھائی 'اسد اللہ کشت مند'
کے درمیان، وزیر اعظم ہاؤس میں، 17 مئی 1981ء

15 اکتوبر 1981ء میری منگنی کی تقریب: (بائیں سے) سید مختار، افراسیاب خٹک
اجمل خٹک، جمعہ خان صوفی، ہوسئ (منگیتر)، تورلالی اور نجیب اللہ۔

مئی 1983ء، بابر باغ، کابل: (پاکستانی شنواریوں کا جرگہ، بیٹھے ہوئے پہلی قطار میں) سرور ماموند، اسحاق توخے، جنرل داؤد شاہ، نجیب اللہ، رشید وزیری، مفتاح الدین، صوفی، منڑو کے منگل، سلیم مومند۔ (تقریر کرتے ہوئے) حاجی معروف شاہ۔
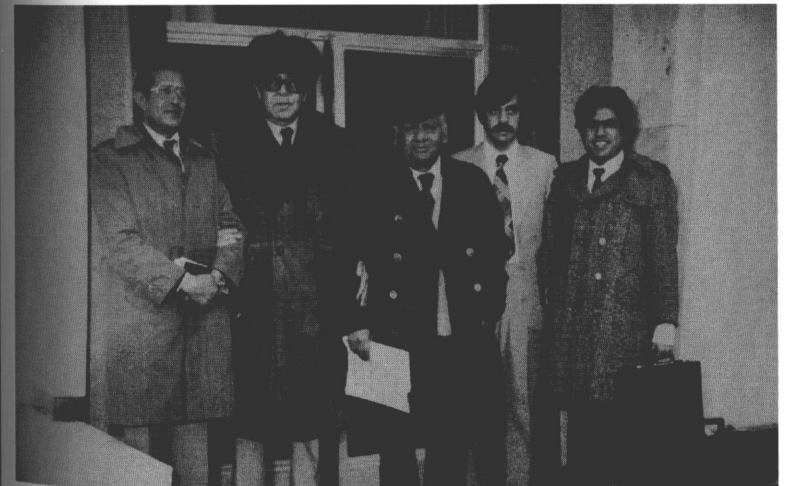
1981ء، کابل، افروشیائی لکھاریوں کی کانفرنس: (شرکت کے غرض سے آئے ہوئے کابل ائرپورٹ پر، بائیں سے) صوفی، عبداللہ نائبی، فیض احمد فیض، مصری شاعر الخمیسی، عنایت رشید۔

1975ء، کابل: صوفی، کمانڈر ہدایت اللہ اور اجمل

اپریل 1976ء: صوفی اور اجمل گھر میں۔

دسمبر 1973ء، سالنگ پاس: (دائیں سے) صوفی، جمال، کیمور، اجمل خٹک
وزیر سرحدات باچا گل وفادار، ولی خان (اس کے سامنے بیٹھے ہوئے اسلم وطن جار)
وزیر داخلہ فیض محمد خان محسود (ان کے سامنے بیٹھے ہوئے سید محمد گلاب زوے)، بیگم نسیم ولی، تور لالی اور ڈرائیور۔

1975ء، قرغہ، کابل: (بائیں سے) صوفی، میر اکرم بلوچ، مراد بزنجو۔
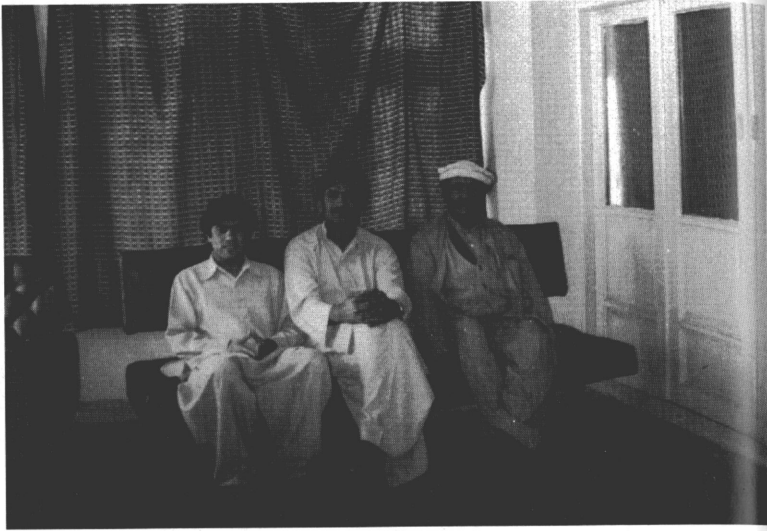
مارچ 1978ء، کابل: اسفندیار ولی خان کے ہنی مون ٹرپ کی تصویر (صوفی اور تور لالی کے درمیان)۔
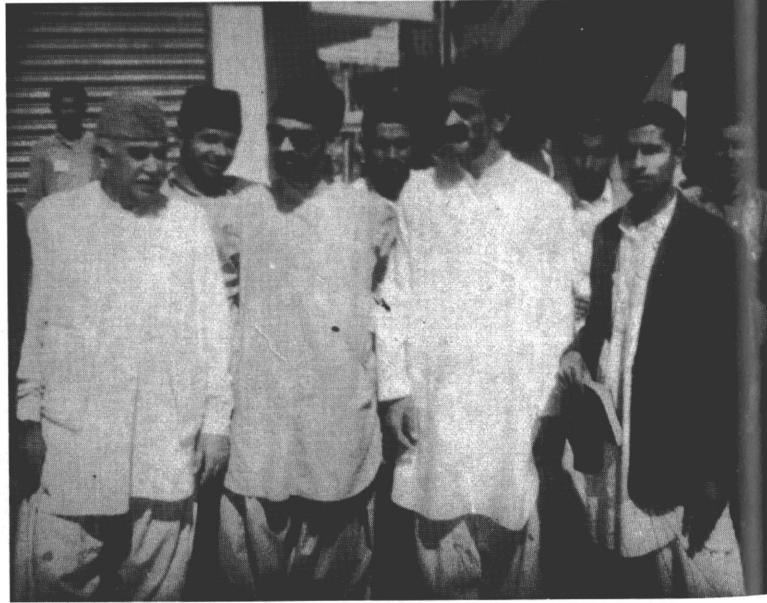
17 مارچ 1969ء، راولپنڈی: (گول میز کانفرنس کے موقع پر 'سلور گرل ریسٹورنٹ' کے ساتھ، دائیں سے)
قریش گل، اکبر بگٹی، عطاء اللہ مینگل، غوث بخش بزنجو، (دوسری قطار میں)
صاحبزادہ، شفیق، مہتاب ضمر، ابراہیم پراچہ اور آخر میں صوفی۔

منگنی کی تقریب: سلیمان لائق، صوفی، ہوسئی، اجمل خٹک
اور کھڑے ہوئے افراسیاب، سید مختار، تورلالی۔

منگنی: ماہرہ (ساس)، محبوبہ کارمل، صوفی اور ہوسئی۔

1987ء، دہلی: (بائیں سے) صوفی، بھارتی سیاست دان
سلیمان لائق اور دو بھارتی دوست۔

17 مارچ 1985ء، ماسکو: (بائیں سے)
پراوالوف، نازش، صوفی اور ترجمان خاتون۔

اجمل خٹک دو چھوٹے بھائیوں غزن اور امیر حیدر ہوتی کے بیچ۔

(بائیں سے) نور محمد اچکزے، میر ہزار، صوفی، اسلم گچکی اور امجد۔

(بائیں سے) صوفی، میر اکرم اور مراد بلوچ۔

رشید وزیری کے ساتھ۔

6 ستمبر 1970ء، شاہی باغ، پشاور: 'پختون زلمے' کی تشکیل کے سلسلے میں ہونے والے اجلاس سے اجمل خٹک کا خطاب۔

1963ء ہری پور جیل: (نیشنل عوامی پارٹی کے قیدی، بیٹھے ہوئے دائیں سے) میاں شاکر اللہ مولانا ترخوی، شہزاد عبدالکریم، فردوس خان عرف کوکو آف مانیری (کھڑے دائیں سے) مجاہد خان سلار منیر خان آف مانیری، ہمیش خلیل، جانس خان آف مانیری، فدا محمد درانی، زرین خان عرف نانا۔

نومبر 1977ء کابل: صوفی اور سنگین ولی۔

جون 1974ء ولی خان کو تورخم بارڈر پر الوداع: (بائیں سے) تورلالی، اجمل خٹک، کور کمانڈر یونس خان، گورنر عزیز اللہ واصفی۔

اگست 1976ء، جمال مینہ، کابل: افغان مصنف اور مورخ، عبدالحئی حبیبی کے ساتھ۔

1973ء، یونیورسٹی ٹاؤن، پشاور: ولی خان 'پختون زلمے'
کے دفتر کا افتتاح کرتے ہوئے۔ ساتھ کمانڈر ہدایت اللہ ہیں۔
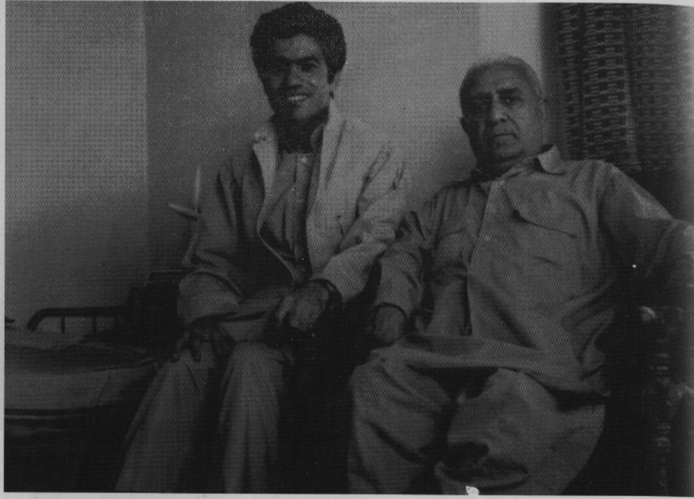
کابل: (داؤد خان کے عہد میں) صوفی اور میاں شاہین شاہ۔
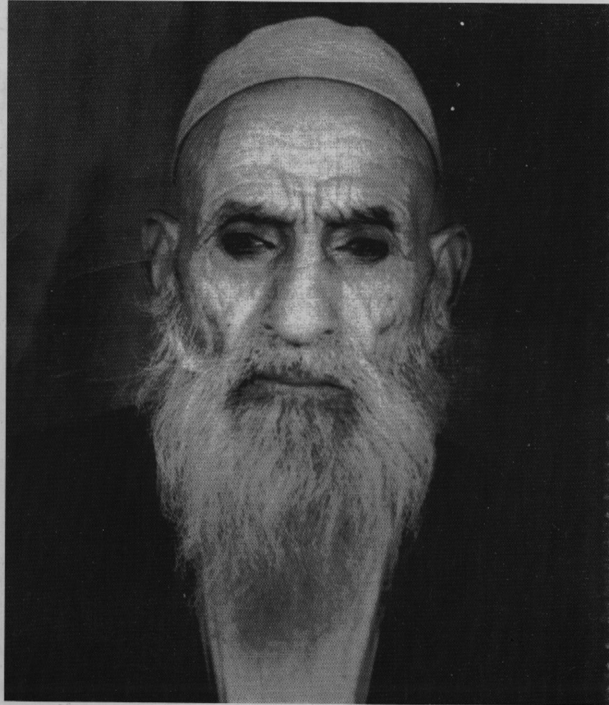
والد صاحب اُمبارس خان۔

صدر ببرک کارمل کے ساتھ امریکی جریدے 'ٹائمز' کے سفارتی نامہ نگار 'سٹروب ٹالبوٹ' کے انٹرویو کی ترجمانی کرتے ہوئے۔ یہ بعد میں صدر کلنٹن کی انتظامیہ میں خارجہ امور کے اسسٹنٹ سیکرٹری اور اب 'بروکنگز انسٹی ٹیوٹ' کے سربراہ ہیں۔ اکتوبر 1981ء
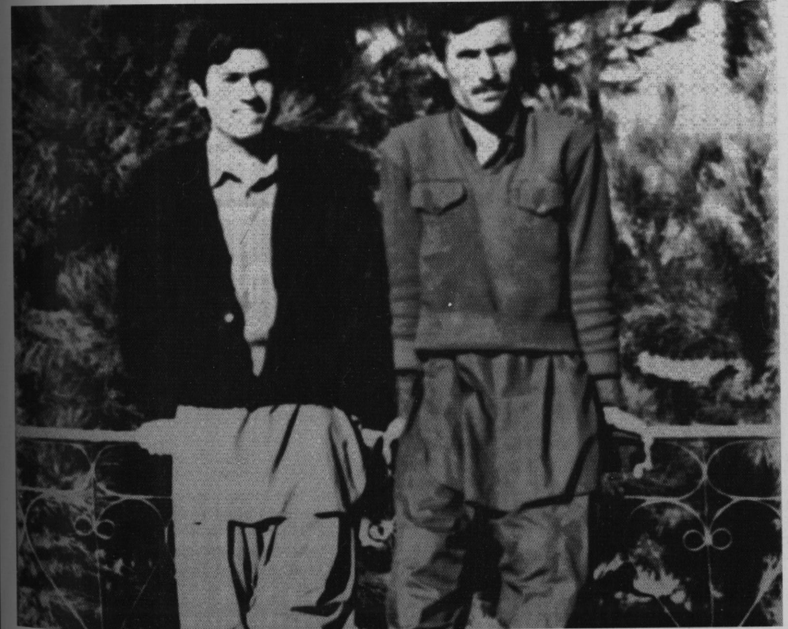
1976ء کارتہ ءسہ، کابل: صوفی اور بسم اللہ کاکڑ

نومبر 1976ء، کابل: (بائیں سے) صوفی، بسم اللہ کاکڑ اور استاد قاسم

ستمبر 1976، کابل: وزیر سرحدات فیض محمد خان میرے کمرے میں۔

12اپریل 1982ء: کابل میں باچاخان کے ساتھ باچاخان کے گھر

16اپریل 1982ء: ولی خان کے ساتھ گورنمنٹ گیسٹ ہاؤس میں

جون 1974ء: ولی خان اور اجمل خٹک ننگرہار کے گورنر عزیز اللہ واصفی کے ہمراہ۔
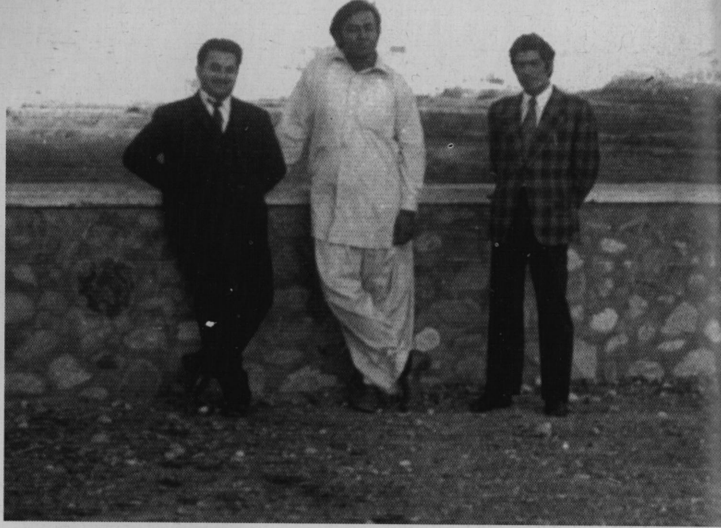
(بائیں سے) ڈاکٹر نیاز محمد مہمند، اسماعیل وسیم، صوفی
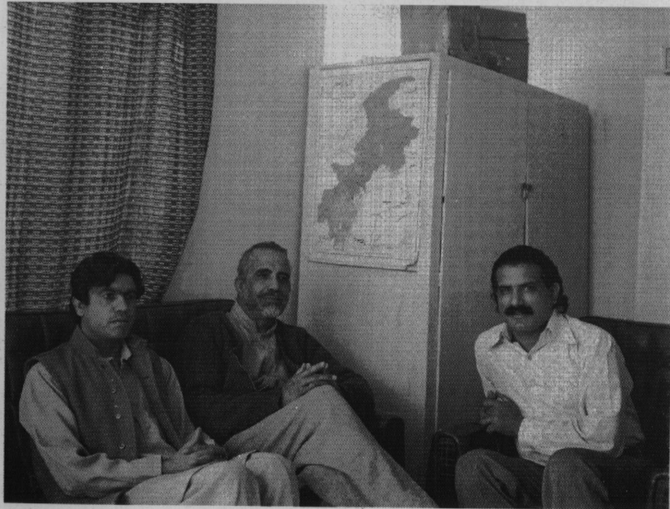
کابل: صوفی، اجمل خٹک اور مطیع اللہ ناشاد۔

21 جنوری 1988ء جلال آباد: باچا خان کا جنازہ

1978ء، کابل: (دائیں سے) صفدر، صوفی اور فاروق۔
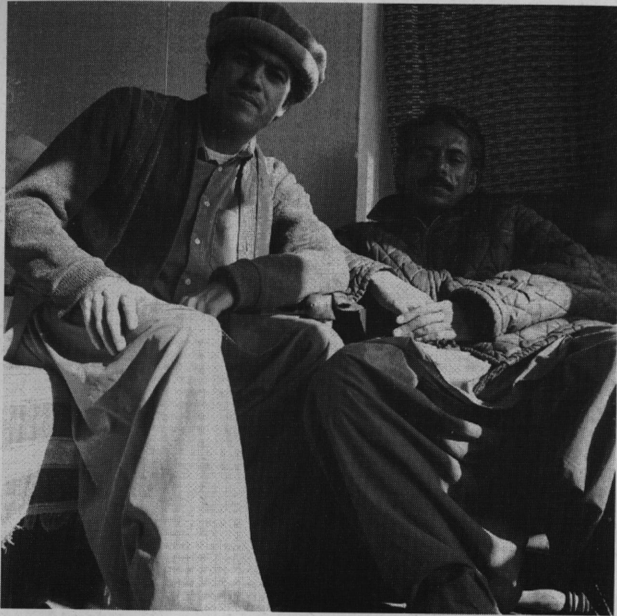
خیر جان بلوچ اور صوفی۔
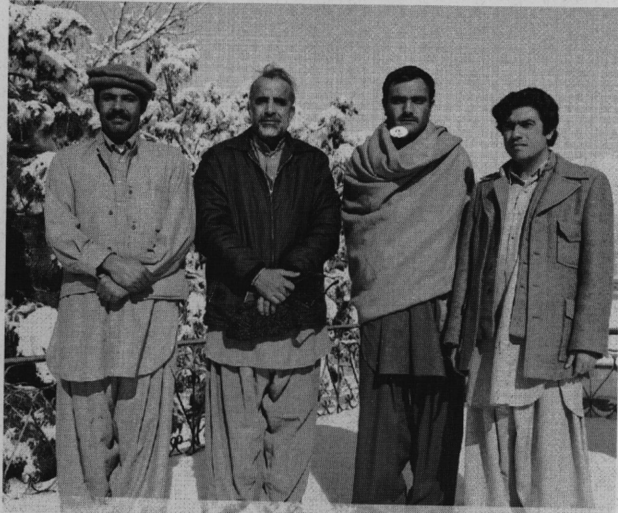
(بائیں سے) کمانڈر ہدایت اللہ، اجمل خٹک، کمانڈر اعظم اور صوفی۔

نومبر 1972ء، گورنر ہاؤس، پشاور: ضیافت کے موقع پر اجمل خٹک اور ذوالفقار علی بھٹو۔

(بائیں سے) میر اکرم، مراد بزنجو اور لال بخش رند۔

پختونستان کا جشن اور قومی 'اتنڑ' (رقص)۔

(بائیں سے) بسم اللہ کاکڑ، میر ہزار مری، اجمل خٹک اور خیر جان۔

جشن پختونستان: اجمل خٹک، کیموراوراعظم واضح ہیں۔

جشن پختونستان: تقریر کے دوران اجمل کے ساتھ اعظم ہوتی۔

اجمل خٹک اورریپبلکن گارڈ میں انٹیلی جنس ڈائریکٹر عبدالحق علومی۔

خیر جان اوراجمل خٹک۔

کمیونزم' کے شعبے میں منتقل کیا جائے۔ میں نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ جب میں کابل سے واپس آیا تو وہ میرے پاس آیا اور میرا شکریہ ادا کیا کہ زراعت کے شعبے کے باعث اسے اچھی نوکری مل گئی، اگر سائنسی کمیونزم میں جاتا تو یہ نوکری کہاں سے ملتی۔ کیوبا دور تھا اور رابطہ مشکل۔ ایک مرتبہ میں نے اسے بوٹ، پتلون قمیص اور پچاس ڈالر بھجوائے۔ یہ سب میں نے ڈاکٹر نجیب کے چھوٹے بھائی روشان کو دیے، جو کیوبا میں طالب علم تھا۔ روشان یہ سب خود ہضم کر گیا اور نعیم کو بھاپ بھی نہ لگنے دی۔ نعیم کو کیوبا میں کوئی تکلیف پیش نہ آئی۔ کیوبا ایک آزاد خیال ملک ہے اور نوجوان وہاں خوش رہتے ہیں۔ وہاں افغانستان کے سفیر، 'مجید سر بلند' نے بھی اس کے ساتھ اچھا رویہ اختیار کیا تھا۔ اسی طرح اجمل خٹک کی چھوٹی بیٹی اور چھوٹے بیٹے کو میں نے پڑھنے کے لیے ہنگری بھجوایا۔ میں نے 'بریالے' صاحب سے بات کی، انھوں نے ہنگری اور چیکوسلواکیہ کے سفراء سے بات کی، دونوں ہی راضی ہوگئے۔ ان میں ہنگری کا انتخاب میرا ہی فیصلہ تھا، کیونکہ ہنگری کے سوشلزم کو 'گولاش' کہا جاتا تھا۔ گولاش ہنگری کا مشہور سوپ ہے، جس میں بہت سارے اجناس ملائے جاتے ہیں۔ ہنگری کا سوشلزم ایسا تھا کہ اس میں کچھ سرمایہ داری بھی شامل تھی۔

پشتون طلبہ، جو افغانستان یا روس میں پڑھنے جاتے، ان کی اسناد اور سیاسی کوائف چیک کرنا اور ان کے روزمرہ مسائل کے حل کے علاوہ ان میں کمیونسٹ پارٹی کے گروپ بنانا اور اسٹڈی سرکل قائم کرنا بھی میرے ہی ذمہ تھا۔ ببرک کارمل کے دور میں مندرجہ ذیل افراد مختلف اوقات میں میرے انتظام اور تربیتی نظام کے تحت رہے:

فضل کریم، عبدالحلیم، غلام حیدر، امیر حتم، انعام، رشید، محمد ایاز، احسان، حسن ناصر، تاجدار، ظہور عالم، زیب، طارق، جہان زیب، ایمل، ہدایت، فرہاد، حضرت شعیب، احسان نبی، صدر اعظم، نعیم، ظفر اقبال، زمان، عبدالرحمان، شیر، بہرام، زرنجن کمار، ایران شاہ، سیف اللہ، عبدالخالق، فیاض، شعیب، اسماعیل، ممتاز، عارف وغیرہ۔

☆☆☆

1981ء میں آٹھ مارچ کو مرتضیٰ بھٹو کے ساتھیوں نے، جو بعد میں الذوالفقار کے نام سے مشہور ہوئے، طیارہ اغوا کر لیا۔ پی آئی اے کا یہ طیارہ ابھی فضا میں ہی تھا، کہ محمود بریالے، جو پارٹی آرگن 'حقیقت انقلاب ثور' کے دفتر میں تھا، نے مجھے بلایا اور کہا، کہ مجھے وزیر اعظم 'کشت مند'
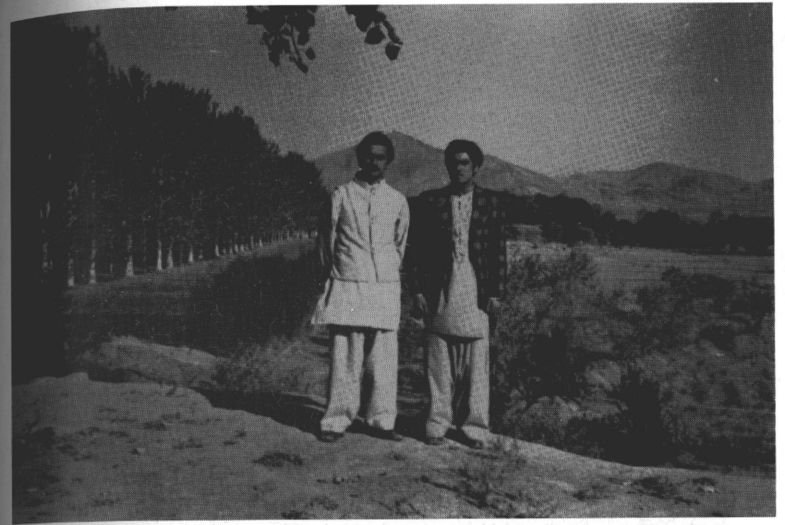
اکتوبر 1975ء، کارزمیر: صوفی اور محمد نعیم۔

21 جنوری 1988ء، جلال آباد، باچا خان کا جنازہ:
ڈاکٹر نجیب اللہ افغان اور بھارتی مہمانوں کے ساتھ۔

صاحب نے میٹنگ کے لیے بلایا ہے، کیونکہ طیارہ اغوا کیا گیا ہے اور وہ کابل کے ہوائی میدان میں اتارنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا دو ہی باتیں ہیں: یہ آپ لوگوں کے خلاف سازش ہے یا پھر کسی نے انتہائی احمقانہ کام کیا ہے۔ میری رائے ہے کہ آپ لوگ طیارے کو اترنے کی اجازت نہ دیں، یہی آپ کے مفاد میں ہے۔ بریالے میرے ساتھ متفق تھا۔ لیکن اختیار سب 'خاد' اور 'کے جی بی' کے پاس تھا اور انھوں نے طیارے کو اترنے کی اجازت دے دی۔ دوسری طرف اغوا کاروں میں سے سلام ٹیپو نے میجر طارق رحیم کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد طیارہ دمشق کی جانب پرواز کر گیا، لیکن افغانستان کے لیے بہت ہی خراب اور خطرناک عواقب کا باعث بنا۔ 'آریانا' کی پروازوں پر تمام یورپ میں پابندی لگادی گئی، افغانستان کے تمام فضائی رابطے بند ہو گئے اور اقوام متحدہ نے افغانستان پر پابندیاں عائد کر دیں۔ افغانستان کو اس ایک واقعے نے حقیقتاً تنہائی کی طرف دھکیل دیا۔ اس کے بعد الذوالفقار اور خصوصاً سلام اللہ ٹیپو کی جانب سے افغان حکومت کو بہت ضرر پہنچا، جس میں موصوف کو بھی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اسی طرح شنواری اور الذوالفقار کے دیگر ساتھی خفیہ طور پر مار دیے گئے اور افغانستان کو زیادہ نقصان پہنچایا گیا۔

☆☆☆

امام علی نازش (کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری) کا کابل میں خفیہ نام 'استاد'، تھا جبکہ افراسیاب کا خفیہ نام 'اکبر خان' طے کیا گیا۔ یہ دونوں غالباً 1980ء میں کابل آئے۔ قطعیت سے یاد نہیں، غالباً 1980ء کے دوسرے نصف میں پہنچے تھے اور پھر ہمارا ان سے تعلق 1981ء میں بحال ہوا۔ یہ بھی یاد نہیں کہ اکٹھے آئے تھے یا الگ الگ۔ 'خاد' نے انہیں 'وزیر اکبر خان مینہ' والے گھر میں مہمان بنایا تھا۔ اجمل خٹک اور میں ان کی آمد سے بے خبر تھے۔ ہم ان کے ساتھ تمام تعلقات ختم کر چکے تھے اور افغانوں کی کوشش تھی کہ یہ تعلق پھر سے قائم ہو۔ ان کوششوں میں ڈاکٹر نجیب سب سے آگے تھا۔ ایک دن ڈاکٹر نجیب میرے پاس آیا اور کہا کہ استاد کا کہنا ہے کہ میرا (صوفی کا) اور اجمل کا معاملہ جدا جدا ہے۔ اجمل خٹک کو کمیونسٹ پارٹی سے نکالا گیا ہے، جبکہ صوفی کا معاملہ یہ نہیں۔ تم کیا کہتے ہو؟ میں نے کہا، نہیں اجمل خٹک اور میرا معاملہ ایک ہے اور میں ان کے ساتھ کھڑا ہوں۔ میں اپنی ذات کے لیے الگ سے فیصلہ نہیں کر سکتا۔ مختصر یہ کہ ہم عام کارکنوں کی طرح دوبارہ کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے۔ جب ہمارے تعلقات پھر سے بحال ہو گئے تو اکثر جب

میں بین الاقوامی امور کمیشن کے کام سے فارغ ہوتا تو دوپہر کا کھانا نازش اور افراسیاب کے گھر کھاتا۔ وہاں گپ شپ، سیاسی تجزیے اور افغانستان پاکستان کے حالات پر بات چیت ہوتی۔

استاد اپنے ساتھ کمیونسٹ پارٹی کا کراچی سے ایک اور راہنما 'رؤف وارثی' بھی ساتھ لایا تھا۔ رؤف وارثی کے ساتھ ان کے گھر والے یعنی بیوی، دو بیٹیاں اور ایک بیٹا بھی تھا اور اسے وزارت اطلاعات وثقافت نے میکروریان میں چار کمروں کا گھر دیا ہوا تھا۔ رؤف افغانستان کی نیوز ایجنسی 'باختر اثرانس' سے منسلک تھے اور تراجم کا کام بھی ان کے حوالے تھا۔ لائق صحافی تھا، لیکن کابل کی صحافتی روایات اسے راس نہ آتی تھیں، تاہم اس کا وجود غنیمت تھا۔ موصوف آخر میں سویڈن میں مہاجر ہو گئے۔ اس کی ایک بیٹی کو تعلیم کے لیے میں نے چیکوسلواکیہ بھجوا دیا تھا، جہاں وہ میڈیکل کا کورس کر رہی تھی۔ اس تحریر کے بعد حالیہ دنوں میں سویڈن میں فوت ہوا کمیونسٹ پارٹی کا اکثر عالمی پروپیگنڈا میرے حوالے تھا اور پارٹی کے متعدد بیانات، جو ورلڈ مارکسسٹ ریویو 'امن اور سوشلزم کے مسائل' اور دیگر کمیونسٹ جرائد میں شائع ہوتے، وہ اکثر میں ہی لکھا کرتا تھا۔ اسی طرح جام ساقی کی جیل سے آزادی کے لیے بھی بہت بڑی مہم چلائی۔

استاد ہمیشہ بیمار رہتے اور ایک روسی ڈاکٹر کے زیر علاج تھے، جو ان کی صحت کا خیال رکھتا تھا۔ کبھی کبھی نازش صاحب اور افراسیاب عالمی کمیونسٹ پارٹیوں کی دعوت پر یا پھر مختلف اجلاسوں میں شرکت کے لیے بیرون ملک بھی جایا کرتے تھے۔ جب بھی واپس لوٹتے، اپنے ساتھ نئے تجزیوں کا انبار لاتے۔

اجمل خٹک کو چھوڑ کر نازش، افراسیاب، رؤف وارثی اور میں کابل کمیونسٹ پارٹی کی خارجہ کمیٹی تھے۔ اجمل خٹک کا رویہ نازش اور افراسیاب سے بالکل مختلف تھا۔ ایک دن ہم اپنے معمول کے مطابق میٹنگ کر رہے تھے کہ اچانک اجمل خٹک نازل ہو گئے۔ نازش نے مجھے اشارہ کیا اور میں نے زیر بحث موضوع کو بریک لگادی اور کارروائی روک دی۔ اجمل خٹک سمجھ گئے اور بہت ناراض ہوئے، کہنے لگے کہ تم لوگ مجھ پر اعتبار نہیں کرتے۔ میں اب سوچتا ہوں، اجمل خٹک کا رویہ درست اور ہمارا غلط تھا۔ ہم نے اپنے گرد ایک خول بنایا ہوتا تھا۔ درحقیقت کمیونسٹ پارٹی پاکستان ایک پارٹی نہیں، بلکہ خفیہ فرقہ تھا جس پر ہم بے جا طور پر ریجھ گئے تھے۔

☆☆☆

نازش اور افراسیاب کئی باتیں ہم سے مخفی رکھتے تھے۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ہمیں بھی تمام باتیں معلوم نہ ہوں۔ 13 جون 1982ء میری شادی کا دن ثابت ہوا۔ شادی کی تقریب بہت عام اور سادہ تھی۔ ایک مختصر سی محفل برپا کی گئی، جس میں ڈاکٹر نجیب اور بیگم، میرے سسر لائق صاحب اور ساس، لائق صاحب کی تین بہنیں اور بہنوئی رشید، سالا اور بیگم، محراب الدین پکتیاوال اور بیگم، رشید، توخی اور بیگم، نور احمد نور کی بیگم، حکیم اور بیگم، بشیر روئی گر اور بیگم، ذبیح اللہ زیارمل اور بیگم، اور رؤف وارثی اپنے خاندان کے ساتھ شامل تھے۔

صفدر کی شادی: میری شادی نے افراسیاب کو شہ دی کہ وہ بھی کابل میں شادی کے بندھن میں منسلک ہو اور اس طرح بہت جلد اس کی شادی بھی کونڑ کے سید گھرانے (پیر بابا صاحب کے سلسلہ نسب) میں طے ہوگئی۔ مگر سب سے عجیب شادی صفدر کی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب افغان پارٹی اور سوویت یونین ابھی تک بلندی پر تھے اور اس امکان کو رد نہیں کیا جاتا تھا کہ انقلاب جلد یا بدیر کم از کم خیبر پختونخوا تک اتر کر رہے گا۔ کارمل صاحب چاہتے تھے کہ مغل بادشاہوں، بالخصوص بابر یا افغان بادشاہوں کی پرانی روایت کو نئے سانچے میں ڈھالیں۔ وہ روایت یہ تھی کہ مختلف قبائل اور عوام سے شادیوں کے ذریعے روابط استوار کیے جاتے تھے۔ کارمل صاحب عظیم تر افغانستان کے نچلے حصے میں ایک کمیونسٹ نوجوان کو داماد بنائیں اور پہلے ہی سے اس رشتہ داری کے ذریعے تعلقات استوار رکھیں کہ کل اگر انقلاب برآمد کیا جائے تو اس کی سلطنت فطری طور پر وسیع اور لوگوں کے لیے قابل قبول ہو۔ دوسری طرف کارمل صاحب کی میرے سسر کے ساتھ بھی رقابت اور آویزش تھی۔

انھوں نے اپنی اس خواہش کا اظہار ڈاکٹر نجیب سے کیا اور اس نے یہ کام نازش اور افراسیاب کے سپرد کیا۔ میں اس منصوبے سے واقف نہ تھا (میں یہاں ایک بات کا اضافہ ضروری سمجھتا ہوں کہ کارمل صاحب کے گھر والے اور بیٹیاں بہت سنجیدہ اور شرافت وعفت کے نمونے تھے)۔ مجھے ایک دن صفدر کی ہونے والی بیوی نے بین الاقوامی امور کمیشن کے دفتر فون کیا کہ آپ سے ملنا چاہتی ہوں، لیکن پھر نہ آئی، شائد مجھ سے مشورہ لینا چاہتی تھی۔ اس سے قبل کارمل صاحب کی چھوٹی بیٹی کبھی کبھار آتی تھی اور مجھ سے انگریزی سیکھتی تھی۔ مجھے اس سارے معاملے کا علم اس طرح سے ہوا کہ میں لائق صاحب کے گھر بیٹھا تھا کہ ان کے بلاک کے سامنے 'خاد' کی موٹر آکر

رکی، جس سے صفدر اترا اور ہمارے بلاک میں سیدھا سیڑھیاں چڑھ کر نجیب کے گھر اوپر چلا گیا۔ مجھے صفدر کی آمد کی اطلاع کسی نے نہیں دی تھی۔ مجھے کارمل صاحب کی بیٹی کے فون اور پھر صفدر کی ایسی گرم جوش مہمانداری سے اس کا خیال آیا۔ پھر ڈاکٹر صاحب کی بیوی نے میری ساس کو مذاق کے طور پر یہ واقعہ بتایا اور ان کے گھر میں صفدر کے بال سنوارنے کا قصہ سنایا، صفدر کے بال قدرتی طور پر گھنے اور گھنگریالے تھے۔ توفانہ بی بی نے میری ساس کو بتایا کہ ہم اس کی بالوں کو سنوارنا، سنگھارنا اور سیدھا کرنا چاہتے تھے۔

میں نے یہ اطلاع اجمل خٹک کو دی اور افراسیاب سے پوچھا، یہ تم لوگوں نے کیا کھیل شروع کر رکھا ہے؟ تب اس نے راز کھولا۔ صفدر بے چارہ پھنس گیا اور یہ منگنی افراسیاب اور نازش کے گھر ہوئی۔ صفدر کو اس سارے معاملے کے پس منظر کا علم تھا اور نہ افغانستان کے اندرونی حالات کا پتا تھا۔ منگنی تو خیریت سے ہوگئی، لیکن بہت جلد سوویت یونین میں اقتدار کی زمام گورباچوف نے سنبھالی۔ اس کا رویہ افغانستان اور اس کے سربراہ کے لیے یکسر مختلف تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کارمل صاحب اس میں ناکام رہے تھے، کہ لوگوں کو انقلاب کا حامی بنا سکیں۔ گورباچوف کی خواہش تھی کہ سرخ افواج کو افغانستان سے نکالیں، جبکہ کارمل چاہتا تھا کہ یہ معاملہ عملی طور پر آگے نہ بڑھے۔ انھیں خطرہ تھا کہ روسی افواج کے بغیر افغانستان اور اس کا انقلاب خون سے رنگ جائے گا۔ جبکہ دوسری طرف پولٹ بیورو میں ڈاکٹر نجیب، سلیمان لائق، اسلم وطن جار اور چند دیگر لوگ اس حق میں تھے کہ روسی افواج واپس جائیں اور افغانستان اپنا دفاع خود کرے۔ اس لیے کارمل صاحب کا پتہ زرد تھا۔ اُس کے بدلے جانے اور اقتدار سے ہٹائے جانے کی افواہیں گرم تھیں، کہ بے چارے صفدر کی شادی کی تاریخ قریب آگئی۔ اس کی شادی میں پولٹ بیورو کے ارکان، کارمل صاحب کا خاندان، جبکہ صفدر کی جانب سے اجمل خٹک، خیر بخش مری اور میں شامل تھے۔ افراسیاب اور نازش اس لیے شریک نہ ہو سکے، کہ وہ روپوش تھے۔ مجھے یاد ہے کہ کارمل صاحب نے مجھے اپنی بانہوں میں جکڑ کر پوچھا تھا 'اب تو ہم آپس میں رشتے دار ہو گئے نا؟' میں نے جواباً کہا تھا 'ہم تو ہمیشہ سے رشتے دار ہیں۔' ساتھ والے کمرے میں شربت و سگریٹ کا دور جاری تھا، جس میں تمام سیاسی افراد موجود تھے اور وہ اپنے سربراہ کی عنقریب معزولی کی خوشی میں جام پر جام نوش کر رہے تھے۔ صفدر کی شادی کے کچھ دن بعد کارمل کو معزول کر دیا گیا، یہ شادی

موصوف کی شاید آخری خوشی تھی۔

☆☆☆

میں کابل میں منعقد ہونے والی تمام عالمی محافل میں شریک ہوا کرتا تھا۔ 1981ء میں ایفرو ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس میں فیض احمد فیض کی شرکت کے باعث، میں فعال رہا۔ اس طرح جب ’آپسو‘ (افروایشیائی عوام کی یکجہتی کونسل) یا ’ورلڈ پیس کونسل‘ کے اجلاس ہوتے، میں رسمی یا غیر رسمی حیثیت میں ان تقریبات میں مددگار کے طور پر موجود رہتا۔ 15 نومبر 1983ء کو ہونے والے ایک ایسے ہی ’ورلڈ پیس کونسل‘ کے اجلاس میں، اس کے ہندوستانی سربراہ (کمیونسٹ پارٹی انڈیا کے پولٹ بیورو کے رکن) رامیش چندرا سے انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل میں چند منٹ کے لیے ملاقات ہوئی۔ میں نے ان سے کہا کہ مہربانی کریں، کہ عالمی فورمز اور پیس کونسل کے اجلاسوں میں پاکستان کی نمائندگی کے لیے ایسے لوگوں کو بلائیں، جو اس سے غلط فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ جیسے کیوبا کے لیے بنگش صاحب اور ڈاکٹر فیروز کو بھیجا گیا اور انھوں نے کیوبا میں پارٹی کو بتایا کہ اصل مارکسسٹ لیننسٹ تو ہم ہیں۔ رامیش چندرا نے بعد میں سادان مکرجی کو یہ فرض سونپا اور سادان نے مجھ سے رابطہ کیا کہ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان انھیں نام تجویز کیا کرے۔

☆☆☆

کمیونسٹ پارٹی کا ہمیں اپنے امور سے بے خبر رکھنے کا ایک اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے، کہ نازش اور افراسیاب نے کابل میں کمیونسٹ پارٹی کی ایک محدود کانفرنس بھی بلائی، جس سے ہمیں بے خبر رکھا۔ اس میں اے این پی بنانے اور چند تنظیمی امور کے بارے میں فیصلے ہوئے۔ یہ ہم سے اس کانفرنس اور اس کے فیصلے چھپایا کرتے تھے۔ مجھے اس کانفرنس میں بلایا بھی نہیں گیا تھا۔ اب حیرت کا مقام یہ ہے کہ پوری دنیا مجھے کمیونسٹ پارٹی کا کرتا دھرتا سمجھتی ہے، لیکن اصل کامریڈ آج دنیا کے سیاسی نظام کے ساتھ خوب مفاہمت سے چل رہے ہیں۔

کابل میں کبھی کبھی میں پشتون اور بلوچ ریڈیو پروگرام اور اسی طرح روزنامہ ’ہیواد‘ کے لیے مقالے لکھا کرتا تھا۔ جیسے زیدہ کے عبدالعزیز خان کاکا کی وفات اور ’فردوس خان کوکو‘ کی برسی پر لکھا۔ اسی طرح جب ارباب سکندر خان خلیل، محمد طاہر نامی شخص کے ہاتھوں قتل ہوئے، تو ایک مقالہ پشتون بلوچ پروگرام کے لیے لکھا۔ یہ میرا معمول تھا کیونکہ اس خطے کی پشتون سیاسی اور سماجی

شخصیات میرا تخصص تھا۔ تمام شخصیات یاد نہیں، کہ کس کس پر لکھا، لیکن تمام اہم خدائی خدمت گاروں کی وفات پر ان کے بارے میں لوگوں کو آگاہ کرنا میں اپنا فرض سمجھتا تھا۔

☆☆☆

باچا خان بھی عجیب انسان تھے۔ پرچمی ان کے دوست تھے اور انھیں بہت عزت دیا کرتے تھے، لیکن آخر میں کسی نے اکسایا کہ اگر پرچمی آپ کے دوست ہیں، تو انھوں نے ایک ہزارہ ’سلطان علی کشت مند‘ کو کیوں وزیر اعظم بنایا ہے۔ ایک مرتبہ صدر ببرک کارمل ایک وفد کے ساتھ جس میں سلطان علی کشت مند، نجیب، محمود بریالے، ڈاکٹر اناہیتا راتب زاد، صالح محمد زیرے، اور نور احمد نور شامل تھے، ان کے پاس آئے۔ باچا خان نے بغیر کسی تمہید کے کشت مند کی طرف اشارہ کر کے ببرک کارمل سے پوچھا ’تم نے اس ہزارہ کو کیوں وزیر اعظم بنایا ہوا ہے؟ تمہیں کوئی اور نہیں ملا تھا؟‘ یہ ایک انتہائی غیر معقول سوال تھا اور تعصب کی بدبو سے بھرا ہوا تھا۔ تاہم حکومت اور پارٹی، موصوف کی ہر بات کو ہنس کر برداشت کرتے تھے۔ ببرک کارمل نے کہا ’بابا! یہ تو پارٹی کا فیصلہ تھا اور پارٹی آپ کے سامنے بیٹھی ہے، ان سے پوچھ لیں‘، اس وقت تو بات رفع دفع ہوگئی، لیکن کشت مند نے یہ بات دل پر لکھ لی اور بعد میں شیعہ اور ہزارہ ہوگیا۔

باچا خان سے ایک ایسا ہی معاملہ اور بھی بگڑا تھا۔ وہ ہندوستان گئے اور وہاں کہیں کارمل اور سوویت یونین کے خلاف بیان دے دیا۔ اس کی اطلاع ببرک کارمل کو پہنچی۔ انہوں نے وزیر منصوبہ بندی اور نائب وزیر اعظم، محراب الدین پکتیاوال کو ہندوستان بھجوایا۔ اس وقت باچا خان گجرات میں گورنر کے بنگلے میں قیام پذیر تھے۔ جوں ہی پکتیاوال کو دیکھا تو باچا خان سمجھ گئے۔ باچا خان کہنے لگے، ہندوستان میں غربت بہت زیادہ ہے اور حکومت غریبوں کے غم سے ناآشنا ہے، جبکہ افغانستان اس معاملے میں یوں بہتر ہے کہ وہاں محنت کشوں کی حامی حکومت آئی ہے۔ الغرض پکتیاوال بے چارے کو کچھ کہنے ہی نہیں دیا۔ پکتیاوال نے بتایا کہ یہ وہ وقت تھا جب ’عظیم تر افغانستان‘ اور ثور انقلاب کے ذریعے اس کے حصول کی باتیں جگہ جگہ ہو رہی تھیں، تو انہوں نے باچا خان سے پوچھا کہ اگر ایسا ’عظیم تر افغانستان‘ وجود میں آگیا تو اس کا سربراہ کون ہوگا؟ باچا خان نے بغیر کسی توقف کے کہا ’ولی خان ہے نا‘۔ یعنی محنت افغانی کریں گے اور حکومت ولی خان کی آئے گی!

☆☆☆

جاسوسی ایجنسیاں بھی عجیب ہی ہوتی ہیں۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے یہ ہر طرح کے فریب اور جعل سازی سے کام لیتی ہیں۔ خلق ڈیموکریٹک پارٹی کے عالمی امور کے شعبہ کا دفتر، جہاں میں کام کیا کرتا تھا، وہاں افغانوں، روسیوں اور کبھی کبھار صرف افغانوں کی جانب سے پریس کانفرنس کا اہتمام کیا جاتا۔ ان کانفرنسوں میں صرف افغانی یا سوشلسٹ ممالک کے اخباری نمائندے شرکت کرتے تھے، کبھی کبھار ہندوستان یا کسی مغربی ملک کے صحافی کو بھی بلا لیا جاتا۔ افغان مجاہد گروپوں کے ساتھ آئی ایس آئی کا تعلق ثابت کرنے کے لیے (جو کوئی ایسا پوشیدہ راز نہ تھا)، یہ اکثر جعلی دستاویزات تیار کرتے تھے۔ کبھی حزب اسلامی یا کسی اور تنظیم کے پیڈ کا ورق ڈھونڈ لاتے یا خود بناتے اور اس کے ساتھ آئی ایس آئی کا پیڈ بھی اسی طرح تیار کیا جاتا۔ اس میں انگریزی میں ہدایات لکھی جاتیں اور نیچے آئی ایس آئی کے کسی میجر یا کرنل کا نام لکھ دیا جاتا۔ اس پر گلبدین یا کسی اور کے جعلی دستخط کیے جاتے اور پھر اسے پیش کر کے دنیا کو دکھایا جاتا کہ امریکا اور پاکستان کا مجاہدین سے کتنا گہرا تعلق ہے، وہ کتنی مدد کرتے ہیں اور کتنی بے شرمی کی حد تک افغانستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرتے ہیں۔ اس پر لکھی جانے والی انگریزی اکثر اغلاط سے پر اور کابلی انگریزی ہوتی۔ میں اکثر اس انگریزی کی اصلاح کرتا اور پھر ٹائپ کیا کرتا تھا۔

☆☆☆

ڈاکٹر نجیب چار مئی 1986ء کو ببرک کارمل کی جگہ پارٹی کے سیکرٹری جنرل مقرر کیے گئے۔ پارٹی کا جنرل سیکرٹری ہی اصل عہدہ تھا، جس نے اقتدار نجیب کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس کے بعد 20 نومبر 1986ء کو کارمل کو انقلابی شوریٰ کی سربراہی سے استعفیٰ دلوایا گیا اور 22 نومبر 1986ء کو حاجی محمد چمکنی اس کی جگہ مقرر کیے گئے۔ یہ محض ایک نمائشی عہدہ تھا جو پارٹی سے باہر کے بے ضرر شخص کے حوالے کیا گیا۔ لیکن 30 ستمبر 1987ء کو یہ عہدہ بھی نجیب نے خود سنبھال لیا، یعنی وہ پارٹی اور ریاست، دونوں کا باقاعدہ طور پر سربراہ بن گیا۔ کارمل کو ہٹانا درحقیقت روسیوں کا فیصلہ تھا، جس پر خلق ڈیموکریٹک پارٹی نے عمل کیا۔

جب نجیب اللہ اقتدار کی کرسی پر براجمان ہوا تو میں نے بین الاقوامی امور کا شعبہ چھوڑ کر اپنا ڈیرہ قبائلی امور کو مربوط کرنے کے کمیشن میں جمایا، جس کا دفتر اعلیٰ حضرت ظاہر شاہ کے فضائی افواج کے سربراہ عبدالرزاق خان کے مکان میں تھا، جو اب حکومت کے قبضے میں تھا۔ اس پر

بریالے بہت ناراض ہوا، لیکن میں نے بھی اوروں کی طرح اب کلی جھکاؤ نجیب کی طرف کر لیا تھا۔ اس دفتر میں آزاد قبائل (فاٹا) کے امور کے بارے میں فیصلے ہوتے اور ان کے مسائل کے حل نکالے جاتے۔ اس طرح پشتون اور بلوچ طلبہ کی راہنمائی بھی اسی دفتر کا فرض تھا۔ کبھی کبھی ڈاکٹر نجیب بھی میٹنگز میں شریک ہوتے۔ اگر سچ کہوں تو اس وقت میری پرانی والی حیثیت نہیں رہی تھی۔ اس کمیٹی کے فیصلوں کے لیے سرحدات، داخلہ، دفاع، اور امنیت کی وزارتوں کے نمائندے بھی آتے، اجمل خٹک اور افراسیاب بھی آتے اور میٹنگز میں شریک ہوتے۔ ان میٹنگز کا ایک ہی مقصد تھا کہ مختلف وزارتیں قبائل کے بارے میں کیے جانے والے اقدامات میں باہمی افہام و تفہیم سے آگے بڑھیں۔ وزارت سلامتی کی جانب سے قبائل کو جو اسلحہ دیا جاتا، افراسیاب وہ معاملات اسی دفتر میں طے کیا کرتا تھا۔ اجمل خٹک اور میں ان لین دین کے معاملات سے دور رہتے۔ میرا بنیادی کام وہاں روسی اور افغانی اداروں میں ہمارے داخل ہونے والے طلبہ کی راہنمائی اور ان کے مسائل کے حل کے سلسلہ میں وزارت سرحدات سے رابطہ کاری تھا۔ کبھی کبھار اہم مضامین کا ترجمہ بھی کر دیا کرتا تھا۔

مختصر یہ کہ تمام معاملات کمیونسٹ پارٹی کے حوالے تھے اور اس کی نمائندگی افراسیاب کیا کرتا تھا اور ان تمام معاملات سے متعلق بھی تھا۔ میں نے بھی جان بوجھ کر خود کو ایک طرف کیا ہوا تھا، نجیب بھی پہلے کی طرح اب پکڑائی نہیں دیتا تھا۔ یوں تو نجیب بہت طاقتور شخصیت کا مالک تھا، لیکن دوستوں کے انتخاب، ان کو دور یا قریب کرنے کے معاملے میں اس کی بیوی 'فتانہ بی بی' کا بڑا ہاتھ رہتا۔ انھوں نے بہت سے قریبی دوستوں کو دور کیا اور کئی دور پرے کے لوگوں کو اُس کے حریم میں داخل کیا، جو بالآخر نجیب کی تباہی پر منتج ہوا۔ لیکن میرے تعلقات عموماً نارمل ہی رہتے، اگرچہ اب وہ پہلے جیسی گرمجوشی نہ رہی تھی اور اس میں کچھ دخل چھوٹے خٹک کا بھی تھا۔ یہی حال اجمل خٹک کا بھی تھا، وہ بھی زیادہ مزے میں نہ تھے، حالانکہ ان کے نجیب کے پورے خاندان سے پرانے اور گہرے تعلقات تھے۔

آزاد قبائل (فاٹا کے قبائل) کا وہ جلسہ جو کارمل صاحب کے اقتدار کے آخری دنوں میں اجمل خٹک کی سربراہی میں منعقد کیا گیا، اس کے انعقاد میں میرا بنیادی کردار تھا۔ یہ جرگہ کافی کامیاب رہا تھا اور کابل انتظامیہ کو اپنے پروپیگنڈے کے لیے ایک اہم سٹیج مل گیا تھا، جس کی

بنیاد پر وہ کافی عرصے تک جگالی کرتے رہے۔

☆☆☆

باچا خان ہندوستان گئے ہوئے تھے اور وہاں بمبئی میں بیمار پڑ گئے تھے۔ پھر وہ کوما میں چلے گئے، انہیں دہلی لایا گیا اور وہاں کے سب سے بڑے سرکاری ہسپتال 'آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز' میں داخل کیا گیا، تاکہ حکومت کے بڑوں کے قریب رہیں۔ 1987ء میں غالباً جون یا جولائی کے مہینے میں ہم کابل سے ایک سرکاری وفد کی صورت میں عیادت کے لیے بھارت گئے۔ وفد میں اجمل خٹک اور میرے علاوہ عبدالحمید محتاط (نائب صدر)، اسلم وطن جار (وزیر دفاع)، سلیمان لائق (وزیر سرحدات)، نور احمد نور اور دیگر نچلے رتبے کے اہل کار شامل تھے۔

میرے ہاتھ میں ہر وقت 60 ہزار ڈالر سے بھرا بریف کیس رہتا، جو لائق صاحب نے اعتبار کی وجہ سے میرے حوالے کیا تھا اور اس وجہ سے میں اپنے آپ کو بیڑیوں میں محسوس کرتا۔ حفاظت کے خیال سے، میں اسے ہر وقت، ہر جگہ اپنے پاس رکھتا۔

اس وفد کا استقبال ہندوستانی حکومت نے بہت شاندار انداز میں کیا اور 'اشوکا ہوٹل' میں ٹھہرایا۔ ان کے وزیر خود ہندوستان کی بنی گاڑیوں 'ایمبسڈر' میں سفر کرتے، لیکن ہمارے سفر کے لیے انہوں نے جاپانی گاڑیاں مہیا کی ہوئی تھیں، ہم کچھ دن ہی وہاں رہے۔ ہر روز باچا خان کی عیادت کے لیے ہسپتال جاتے، ولی خان اور بی بی نسیم بھی آئے ہوئے تھے۔ وہ یونس جان کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے اور ہمارے ساتھ ہر روز ملاقات ہوتی۔ ہمارے اعزاز میں حکومت جو تقریبات اور دعوتیں منعقد کرتی، اس میں وہ بھی شریک رہتے۔ ڈاکٹروں کی زبانی معلوم ہوا، کہ ہوسکتا ہے باچا خان کئی سالوں تک کوما میں رہیں، اور اس کا بہت کم امکان ہے کہ اب وہ دوبارہ صحت یاب ہوسکیں۔ وہ اسی طرح کوما میں رہیں گے اور کوئی پیش گوئی نہیں کی جاسکتی، اس لیے ہمیں لوٹنا پڑا۔ کچھ دن بعد ولی خان اور ان کے گھر والوں نے فیصلہ کیا کہ باچا خان کو پشاور لے جایا جائے اور لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں داخل کیا جائے۔

شائد اسی سال نازش کو تورخم کے راستے پاکستان بھجوا دیا گیا، ان کے ساتھ ہمارے قبائلی دوست تھے۔ اس کے بعد تورخم کا راستہ کبھی بند رہتا، کبھی کھل جاتا، لیکن روسی فوجوں کے چلے جانے کے بعد تو اکثر بند ہی رہتا۔ نازش کی واپسی کا فیصلہ عاقلانہ تھا۔ قبائلی علاقوں کے باقی سارے

راستے مجاہدین کے کنٹرول میں تھے، جبکہ پاسپورٹ پر وہ ہندوستان کے راستے نہیں جاسکتے تھے، کہ اس سے راز فاش ہونے کا ڈر تھا۔ اس کے علاوہ پاکستانی پاسپورٹ نہ موجود تھا اور نہ اس کے لیے درخواست دی جاسکتی تھی۔

باچا خان جنوری 1988ء میں وفات فرما گئے، مرحوم کے جنازے کا انتظام زیادہ تر میرے ہی ذمہ تھا۔ مجھ سے اس معاملے میں ایک بہت بڑی غلطی ہوئی، وہ یہ کہ جنازہ کی ہیلی کاپٹر کے ذریعے فلم بندی کا کام میں نے کسی کے حوالے نہیں کیا۔ یہ ایک تاریخی جنازہ تھا، اس لیے اس کی فلم بندی بہت ضروری تھی۔ میں اس کام کا ماہر نہ تھا، اس لیے جنازے کے انتظامات کرتے ہوئے یہ اہم کام مجھ سے رہ گیا۔

اس حوالے سے میں ایک اور اہم بات ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں کہ باچا خان کا جلال آباد میں دفن کیا جانا نجیب حکومت اور ولی خان کا فیصلہ تھا، اس کے پیچھے کوئی وصیت نہیں تھی۔ باچا خان زندگی بھر کہتے رہے کہ مرنے کے بعد میری میت کسی دریا میں بہا دی جائے۔ البتہ ماسٹر کریم کی وفات پر انھوں نے کہا تھا کہ ہم سب خدائی خدمت گار سردریاب مرکز میں ہی دفن ہوں گے، اس کا لکھا ہوا ثبوت موجود ہے۔ جلال آباد میں دفن ہونا ان کے خاندان اور افغان حکومت کا فیصلہ تھا۔

باچا خان کے کفن دفن کی رسومات کے لیے ہندوستان کے نائب صدر شنکر دیال شرما، کشمیر کے فاروق عبداللہ، غلام نبی آزاد، بیگم ارونا آصف علی وغیرہ آئے تھے۔ جنازے پر ہند کے نائب صدر کی تقریر کا ترجمہ میں نے کیا تھا۔ اس جنازے میں بم پھٹے، جس سے کئی افراد ہلاک ہوئے۔ ان دھماکوں کا الزام مجاہدین پر لگایا گیا، لیکن ایک نظریہ یہ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ 'خاد' کی خواہش تھی کہ مجاہدین اور پشاور کے لوگوں کو آپس میں بدظن کرے، اس لیے یہ دھماکے انھوں نے کرائے تھے۔ اس جنازے میں میرا بھائی بختیار اور والدہ بھی آئی تھیں اور مجھے بتایا گیا کہ ان کی موٹر خاص اس جگہ کھڑی تھی جہاں دھماکے ہوئے۔ دو تین گھنٹے میرے پریشانی میں گزرے، میں ہسپتالوں میں لاشوں اور زخمیوں کو دیکھتا رہا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ خیر خیریت سے واپس پہنچ گئے تھے۔

اس کے بعد ہم نے باچا خان کی زندگی پر ایک ٹیلی ویژن فلم بھی بنائی، جس کا سارا انتظام میں نے کیا تھا۔ باچا خان کی قبر پر ایک بڑا مزار، مزار کے ساتھ ایک کلچرل کمپلیکس، جس میں شیشم باغ بھی شامل کیا جانا تھا، میرا ہی منصوبہ تھا۔ اس منصوبے کا ایک نقشہ 'افغانستان ہنرمندانو

اتحادیہ' (انجمن ہنرمندانِ افغانستان) نے تیار کیا اور ولی خان نے اسے پاس بھی کرلیا تھا۔ مگر اس کے بعد بہت جلد حالات بدل گئے اور نجیب حکومت جنگوں میں مصروف ہوگئی اور کچھ عرصے بعد وہ اقتدار سے الگ ہوگیا۔

☆☆☆

باچا خان کی کتاب: یہاں بہتر ہے کہ باچا خان کی سوانح 'زما جوند او جدوجہد' (میری زندگی اور جدوجہد) کا قصہ بھی تاریخ کے صفحات پر محفوظ کرلیا جائے۔ یہ کتاب اصل میں فقیر محمد بائیزئی کے قلم سے لکھی گئی۔ حسن خان کے گھرانے سے باچا خان کے بہت گہرے تعلقات تھے۔ بائیزئی ہمیشہ باچا خان کی خدمت میں حاضر رہتے اور جب فرصت ملتی وہ باچا خان کے منہ سے سنے گئے سیاسی واقعات کو تحریری صورت دیتا رہتا۔ کارمل حکومت میں تقریباً سب ہی لوگ باچا خان کے عقیدت مند تھے۔ بہت یاد دہانیوں کے بعد باچا خان نے اس بات کی اجازت دی کہ کتاب کو شائع کردیا جائے۔ لیکن کتاب ایسی عبارت میں لکھی گئی تھی کہ جس میں بہت زیادہ تبدیلیوں اور تدوین کی ضرورت تھی۔ جیسا کہ باچا خان کی عادت تھی، ان کے تمام نصائح اور حکایات ہانڈی کا ڈھکن کھلنے کے گرد ہی گھومتی تھیں۔ جب پہلی مرتبہ یہ مسودہ 'صدیق اللہ رشتین' کے حوالے کیا گیا، تو اس نے پڑھنے کے بعد چھوٹتے ہی باچا خان سے کہا: 'بابا یہ کتاب ہے یا روٹی نامہ؟'۔ یوں باچا خان نے مجبوراً اس کتاب سے دعوتوں اور کھانوں سے متعلق واقعات حذف کیے۔

اس کتاب کی ترتیب میں فقیر محمد بائزئی کے علاوہ عبداللہ خدمتگار بختانے صاحب، اجمل خٹک، رشتین صاحب اور دیگر افراد کے علاوہ تھوڑا بہت میرا بھی حصہ رہا۔ اسی تدوین کے دوران معلوم ہوا کہ باچا خان تادم تحریر یعنی 1982ء تک اس سخت مغالطے میں مبتلا رہے تھے کہ اُن کے ساتھ ساری بے وفائی انگریز اور مسلم لیگ نے کی۔ مگر جب مولانا ابوالکلام آزاد کی 1959ء میں شائع ہونے والی کتاب 'آزادی ہند' انھیں ہم نے پڑھ کر سنائی تو انہیں یقین آیا کہ اصل کھیل تو ان کے ساتھ کانگریس والے کھیل گئے تھے۔ اس لیے وہ اپنے لکھاریوں سے کہتے تھے کہ آزادی ہند کی متعلقہ عبارت کا سطر در سطر ترجمہ کیا جائے اور کتاب میں اسے ہر جگہ شامل کیا جائے۔ اس لیے انہوں نے اس کتاب میں جگہ جگہ کانگریس والوں کے خلاف بہت سی باتیں لکھیں ہیں۔ یعنی اس وقت تک انھوں نے اپنے پیروکاروں، افغانوں اور سب کو اپنی ذات کی طرح اس مغالطے میں

رکھا۔ اس طرح میری زندگی اور جدوجہد میں جگہ جگہ کانگریس کے خلاف بھی بات کی گئی ہے، یہ کتاب دس ہزار کی تعداد میں شائع کی گئی، جس میں سے سات ہزار نسخے بابا کو دیے گئے۔ وہ ان میں سے ایک نسخہ بھی کسی کو مفت نہیں دیتے تھے۔

☆☆☆

افغانستان میں کارمل اور نجیب کے دور میں ایران کی خفیہ اور زیرزمین پارٹیوں جیسے 'حزب تودہ' 'سازمان فدایان خلق' وغیرہ کے نمائندے موجود رہے۔ وہ ہوشیار لوگ تھے اور صرف پی ڈی پی اے سے تعلق رکھتے، جبکہ 'خاد' سے سروکار نہ رکھتے۔ نازش، افراسیاب اور میری ان سے کبھی کبھی ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ اس طرح دیگر خفیہ کمیونسٹ پارٹیوں کے راہنما اور کارکن بھی افغانستان آتے رہتے، جیسے سعودی عرب کی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری اور عراق کی پارٹی کے سربراہ وغیرہ۔ وہ بھی ہماری طرف آتے اور ان سے ملاقات ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ علاقائی اور عالمی کمیونسٹ پارٹیوں کے ارکان اور نمائندوں سے بھی ملاقات رہتی، جیسے ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی "مارکسسٹ" کے جنرل سیکرٹری سورجیت سنگھ اور سوشلسٹ ممالک کی پارٹیوں کے نمائندوں سے۔

☆☆☆

جب سوویت یونین نے فیصلہ کیا کہ وہ افغانستان سے نکلنا چاہتے ہیں اور پاکستان افغانستان کے درمیان جنیوا معاہدہ ہوگیا تو انھوں نے ایک مشہور سفارتکار جو روس کا نائب وزیر خارجہ بھی تھا، افغانستان بھیجا۔ اس کا نام یولی وارنسوف (Yuli Voronsov) تھا۔ جنیوا معاہدے کے بعد روس کی کوشش تھی کہ نجیب حکومت اور مجاہدین کے درمیان مفاہمت کرائیں۔ دونوں کے باہمی اختلاف ختم کریں اور دونوں مل کر حکومت کریں۔ اس مقصد کے لیے سفیر موصوف سعودی عرب بھی گیا کہ مجاہد لیڈروں کے ساتھ ملاقات کرے۔ لیکن یہ مذاکرات بری طرح ناکام رہے۔ وارنسوف نے بتایا کہ جب ہمارا مجاہد لیڈروں کے ساتھ کسی بات پر اتفاق ہوجاتا تو وہ نماز، چائے یا کسی اور بہانے سے باہر جاتے، لیکن جب لوٹتے تو اپنے موقف سے ہٹ چکے ہوتے۔ وارنسوف کا کہنا تھا کہ میں نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ معلوم کریں یہ کیا معاملہ ہے۔ آدمیوں نے آکر بتایا کہ ہوٹل کی دہلیز پر آئی ایس آئی کے سربراہ حمید گل چہل قدمی فرما رہے ہیں۔ وارنسوف سمجھ گیا کہ پاکستان نہیں چاہتا، کہ افغانستان میں امن ہو۔

چیکوسلواکیہ، فرانس، انگلستان اور سوویت یونین یاترا

مجھے ایک سال قبل چیک کمیونسٹ پارٹی کی دعوت پر اپنی بیوی کے ساتھ جانا تھا، لیکن کچھ غلط فہمیوں کی وجہ سے ایسا نہ ہوسکا۔ کچھ سہل انگاری، پارٹی کے بین الاقوامی تعلقات کمیشن سے سرزد ہوئی، کچھ غلط فہمی پراگ میں وہاں کے بین الاقوامی تعلقات کے شعبہ سے ہوئی اور انجام یہ نکلا کہ یہ دورہ اُس وقت ممکن ہوا جب میری شادی کو ایک برس بیت چکا تھا اور میری بیٹی 'مینہ' پیدا ہوچکی تھی۔ بہر حال، بروز اتوار 24 جولائی 1983ء دس بج کر چالیس منٹ پر میں کابل ایئر پورٹ سے ماسکو کی طرف روانہ ہوا اور وہاں کے مقامی وقت کے مطابق پانچ گھنٹے پیچھے، دو بج کر پچاس منٹ پر ماسکو کے شیریمیتوا ایئرپورٹ پر اترا۔ 'بین الاقوامی تعلقات کمیشن' کی جانب سے کیے گئے ٹیلی فون کے طفیل افغان سفیر حبیب منگل نے مجھے لینے کے لیے گاڑی بھجوادی تھی۔ سفیر کی اپنی رہائش گاہ، گرمیوں میں رہنے کے مقام، یعنی ڈاچا' (Dacha) میں تھی اور اپنے حسن کی وجہ سے بجا طور پہ ایک رومانوی اقامت گاہ کہلاسکتی تھی۔ میں بھی وہیں پہنچ گیا۔

کچھ دیر بعد اپنے بھائی افضل کو فون کیا۔ وہ آ گیا تو اس کے ساتھ سارے معاملات پر صاف صاف بات کی۔ اسے بتایا کہ روسی بیگم کے ساتھ تم اپنے گاؤں میں نہیں رہ سکتے۔ اس نے کہا، بے شک ایسا ہی ہے، لیکن اب میں بچے کے ساتھ کیا کروں؟ میں نے کہا یہیں رہ جاؤ، گاؤں مت جاؤ۔ لیکن افضل کی ضد تھی کہ نہیں مجھے گاؤں ہی میں رہنا ہے۔ میں نے کہا عجیب متضاد باتیں کر رہے ہو، ایک طرف ضدی پشتون بنے ہوئے ہو، کہ ہر حال میں گاؤں ہی میں رہنا ہے اور دوسری طرف تمہیں ہونے والے بچے کا غم ستا رہا ہے، ایک وقت میں دو کشتیوں کی سواری ممکن نہیں۔

اگلے دن یعنی پچیس جولائی کو سفارتخانے گیا، افضل جمال (فرزند اجمل خٹک) اور غلام حبیب (فرزند تورلالی) سے گپ شپ کی۔ سفارتخانے میں 'شریفی' سے تعارف ہوا، جو تیرھویں پارلیمانی دور میں پارلیمنٹ ممبر تھا اور اب اپنے بیٹے کے ساتھ، جس نے اوڈیسہ میں فوجی تربیت حاصل کی تھی، گھومنے نکلا تھا۔ شام کو ہم لینن پہاڑیوں کی سیر کو گئے۔ وہاں سے واپس ڈاچا آئے اور دریا میں کشتی رانی کی مشق کی۔ رات حبیب منگل کے مہمان تھے۔

26 جولائی کو سید مختار باچا کے بھائی مصطفیٰ باچا سے ملاقات ہوئی۔ اس نے ماسکو کے دوستوں

کی ضروریات سے آگاہ کیا۔ انھیں پاکستانی اخبارات اور جرائد، کابل نیو ٹائمز، افغانستان میں شائع ہونے والی انگریزی زبان کی کتب وغیرہ کی ضرورت تھی۔ میں نے انھیں مزید آنے والے طلبہ کے استقبال، ان کے انتظام، تنظیم کے حوالے سے ماسکو میں مقیم طلبہ کے فرائض سے آگاہ کیا۔

اس کے بعد ماسکو کے مقامی وقت کے مطابق 3:30 بجے فلائٹ روانہ ہوئی اور ہم پراگ 5:35 پر اترے۔ عجیب بات یہ تھی، کہ چلنے سے پہلے میں نے حبیب منگل کے ذریعے یہاں کے سفیر سے خود بھی بات کی تھی اور حبیب منگل نے بھی تاکید کی تھی، لیکن ہمیں لینے کے لیے کوئی گاڑی نہیں آئی تھی۔ چیک میزبان بھی حیران تھا اور ہمیں ہوائی میدان سے مرکزی کمیٹی پراگ ہوٹل لے آیا۔ وہاں سے میں نے سفیر صاحب یعنی 'شریف' کو فون کیا اور نرم لہجے میں کہا کہ ہمارے استقبال کے لیے کوئی نہیں آیا۔ اس نے بہانہ بنایا، کہ فرسٹ سیکرٹری عامر کو بھجوایا تھا، شاید راستے میں موٹر خراب ہوگئی ہو۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ یہاں مرکزی کمیٹی آپ کی آمد سے بے خبر ہے، مجھے یہ بات عجیب لگی۔

اگلے دن سفیر صاحب مصروف تھے اور وہاں پی ایچ ڈی کرنے والے خان محمد وزیر بھی نظر نہ آئے، بارہ بجے تک ان کا انتظار کرتا رہا۔ صبح نو بجے بوڈاپسٹ میں افغان سفیر 'جیلانی باختری' سے گفتگو کے لیے فون کیا، لیکن وہ نہیں تھا، اس لیے عزیزی سے بات چیت کی۔ دوپہر کو سفیر صاحب نے میرے لیے گاڑی بھجوائی اور دو بجے تک سفارتخانے میں رہا۔ وہاں سے سفیر صاحب کے گھر گئے۔ ان کی بیگم 'محبوبہ' سے ملاقات ہوئی، بہت خوش ہوئی، کیوں کہ وہ بھی پارٹی میں تھی، خواتین امور سے متعلق تھی، اور ہمارے ساتھ 'بین الاقوامی تعلقات کمیشن' میں کام کر چکی تھی۔ کابل کے بارے میں بات چیت ہوئی اور کھانا کھایا۔ چار بجے میں، شعیب (طالب علم) اور خالد (شریف کا بھائی) بازار کا چکر لگانے نکلے۔ پراگ کا قدیم شہر بہت خوبصورت ہے، اس کی سیر کی۔ تھک گئے تھے اور شدید پیاس بھی لگی ہوئی تھی، وجہ یہ تھی کہ 32 درجہ مرطوب گرمی پڑ رہی تھی۔ ریستوران گئے اور ایک گھنٹہ وہاں گزارا، واپسی میں میٹرو کے ذریعے ہوٹل تک آیا۔ اس وقت خان مل گیا تھا، اس نے فون کیا تھا، اس سے اگلے دن یعنی 28 جولائی کو ملنے کی ٹھہرائی۔ رات باختری صاحب کے گھر فون کیا، بہت خوش ہوئے۔

28 جولائی کو ابھی میں نے پراگ ہوٹل میں صرف ناشتہ ہی کیا تھا، کہ تو نے دس بجے خان آ پہنچا۔ دوپہر تک اکٹھے گپ شپ کی اور اکٹھے کھانا کھایا۔ پیدل ہی سیر سپاٹے کے لیے نکل

کھڑے ہوئے۔ پراٹ سکا ہیراد (پراگ محل) گئے، کلیسا اور تاریخی مقامات دیکھے، جب خوب تھک گئے اور پیاس نے ستایا تو ایک پرسکون جگہ پہنچے۔ شہر کے بیچ اس کلیسا گئے، جہاں ہر عیسائی سینٹ ولی کے نام کا ہر گھنٹے بعد الگ گھنٹا بجتا ہے۔ راستے میں کارمل کی بہن 'ملالئی'، اس کے شوہر حاجی محمد ولیس اور عنایت پشتون سے ملاقات کی۔ انہوں نے دعوت دی، کھانا انٹر کانٹی نینٹل میں کھایا گیا۔ خان نے مجھے پراگ ہوٹل پہنچایا اور مجھ سے ہاسٹل جانے کے لیے جدا ہوگیا۔

29 جولائی کی صبح قریبی قصبے ترنوف (Turnov) میں مقیم ترنم کو فون کیا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اب تک چیک دوستوں نے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ نوواک کی جانب سے پونے دس بجے فون آیا، جس کے بعد موصوف خود ہوٹل تشریف لائے۔ آداب سے عاری اور سفید چشم انسان محسوس ہوا۔ اس نے پروٹوکول کا کوئی لحاظ نہ کیا۔ اس نے چھوٹتے ہی کہا کہ ہمیں آپ کے آنے کی کوئی اطلاع نہیں اور نہ ہی آپ ہمارے مہمان ہیں۔ واپسی کے ٹکٹ کے بارے بھی اس نے کچھ نہ کہا۔ مجھے کابل میں بین الاقوامی تعلقات کمیشن اور چیک انتظام کاروں دونوں پر بہت غصہ آیا، اگر بیوی کے آنے کا معاملہ نہ ہوتا تو میں اُسی وقت وہ ہوٹل چھوڑ دیتا۔ میں اصل میں افغانی اور چیکوسلاواکی کمیونسٹ پارٹیوں کے پروٹوکول کے تحت گیا تھا۔ میں نے شریف سے بات کی اور دل چاہ رہا تھا کہ محمود بریالے کو ایک سخت خط لکھوں۔

30 جولائی کو خان کے ساتھ گھوما پھرا، دوپہر کو ترنم کے ساتھ ملاقات ہوئی، اس کے ساتھ چودھری فتح محمد کا فرزند جاوید فتح بھی آیا تھا۔ صفیہ سے ملنے کے لیے خان کے ہاسٹل گیا۔ وہاں کراچی کے ڈاکٹر منظور، یعنی صفیہ کے والد صاحب ملے، اگلے دن اُن سے پراگ ہوٹل میں ملنے کی ٹھہرائی۔ خان کے ساتھ سیر وتفریح اور آبِ جو پینے کی جگہ گئے۔

31 جولائی کو آریانا کے ذریعے اسدکشت مند اور میاں گل کے نام خطوط بھیجے۔ میں نے کہا تھا کہ وہ چیک ذمہ داروں سے پوچھیں کہ میرے ساتھ اتنی لاتعلقی کا رویہ کیوں روا رکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر منظور کے ساتھ مفصل بات چیت ہوئی۔ وہ چاہتا تھا کہ مولانا (نازش) سے ملاقات ہو، جبکہ مولانا اور افراسیاب 'صوفیہ' میں تھے۔

یکم اگست کو حبیب منگل کو فون کیا کہ چیک پارٹی کے ذمہ داروں نے میرے ساتھ مذاق کیا ہے تو اس کی اطلاع بین الاقوامی تعلقات کمیشن میں بریالے یا شفیع کو دے۔ تاہم 12 بجے نوواک

وارد ہوگیا۔ اس نے معافی مانگی اور کہا کہ انہیں غلط فہمی لاحق ہوئی تھی، اب سب کچھ ٹھیک ہے۔ جہاں چاہوں، وہاں آپ کے رہنے کے لیے Spa میں جگہ دینے کو تیار ہیں۔ موٹر بھیج رہے ہیں اور ایک ترجمان بھی ساتھ ہوگا۔ میں نے دوبارہ حبیب منگل سے رابطہ کیا، کہ کابل کو اطلاع دینے کا کام نہ کرے۔ ڈاکٹر شریف نے پراگ میں بلغاریہ کے سفیر کے ذریعے صوفیہ میں رابطہ کیا۔ شام سات بجے وارنا میں مولانا سے بات چیت ہوئی۔ فیصلہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر منظور خود صوفیہ چلے جائیں۔

2 اگست کا دن ڈاکٹر منظور کے ٹکٹ کی تبدیلی کے امکانات ڈھونڈنے، نیا ٹکٹ خریدنے، ریل کے ٹکٹ سے بدلنے، ریل کے ٹکٹ کے بارے میں معلومات لینے اور برطانوی سفارتخانے سے اُن کے بچوں کے ویزے لینے میں گزر گیا۔ فیصلہ ہوا کہ محترم کے بچے لندن جائیں گے اور یہ خود ریل کے ذریعے صوفیہ کی راہ ناپیں گے۔ ساتھی خان اور شادی خان نے ہمارے ساتھ بہت بھاگ دوڑ کی۔

3 اگست کا سارا دن ڈاکٹر منظور، مونا اور سہیل کے لیے ریل کے فرسٹ کلاس ٹکٹ لینے کے سلسلہ میں بہت کوشش کی۔ میرے میزبان نے بہت مدد کی اور صفیہ کے لیے لندن کا ٹکٹ حاصل کرلیا۔

4 اگست کو پراگ کے 'امن اور سوشلزم' رسالے میں ہندوستان کمیونسٹ پارٹی کے نمائندے شاردا مترا سے ملاقات کے لیے، اس کے گھر گیا۔ اسے کمیونسٹ پارٹی کا انگریزی زبان کا جریدہ 'کامریڈ' دیا اور ایک نسخہ ایران کی تودہ پارٹی کے دوست 'خاوری' کے لیے اس کے حوالے کیا۔ اس نے کہا کہ ہماری ایک ملاقات اور ہونی چاہیے۔ میں نے اُس سے سبط حسن کی کتاب کے لیے مواد طلب کیا، جس پر اس نے وعدہ کیا کہ مشرقِ وسطیٰ کے پارٹی نمائندوں سے خود ملیں گے اور اس کے لیے تقاضا کریں گے۔ 'ویٹرنیک' گئے، صفیہ منظور کو ساتھ لے گئے اور وہ ایک بجے لندن کو روانہ ہوئیں۔ دو بجے نوواک کے ساتھ ہوٹل میں کھانا کھایا اور 1600 کرونا جیب خرچ کے طور پر دیا گیا۔ شام کو خریداری کے بعد سات بج کر گیارہ منٹ پر ڈاکٹر منظور، سہیل اور مونا 'صوفیہ' کو روانہ ہوئے، یہ چھ اگست کو صوفیہ پہنچیں گے۔ میں نے نوواک سے اس خواہش کا اظہار کیا، کہ بلغاریہ کے بین الاقوامی تعلقات والوں کو اطلاع کر دی جائے، تاکہ وہ ڈاکٹر صاحب کا مقررہ وقت پر صوفیہ کے ریلوے اسٹیشن پر استقبال کریں۔

5 اگست کو نیشنل میموریل کا دورہ کیا، جو 'ژیژکوف' کی چوٹی پر واقع ہے اور چیکوسلواکیہ میں

سیاسی جدوجہد اور دوسری عالمگیر جنگ کی تلخ یادوں کو محفوظ کیے ہوئے ہے۔ 'کلیمنٹ گوٹوالڈ' کی قبر اور مجسمے پر پھول رکھے۔ اس میموریل کے بالکل سامنے ایک بڑے گھوڑے کے اوپر چیک ہیرو 'ژیژکوف' (تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی) سوار ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ میں نازیوں کے ہاتھوں تاراج ہونے والے قصبے 'لیڈیچی' کا دورہ کیا، وہاں بھی ایک بڑا عجائب گھر بنایا گیا ہے۔

6 اگست کو دیر سے جاگا۔ وجہ یہ رہی کہ کل دوپہر کافی دیر سویا رہا، اس لیے رات کو نیند نہ آئی۔ رات بھر باچا خان کی کتاب 'زما جوند او جدوجہد' پڑھتا رہا۔ دس بجے صوفیہ سے ڈاکٹر منظور کا فون آیا اور گلہ کیا کہ ریلوے اسٹیشن پر استقبال کے لیے کوئی نہیں آیا تھا، لیکن یہ اچھا ہوا کہ افغان سفیر وہاں پہنچے تھے۔ میں نے اس سے رابطہ کیا اور اپنا مدعا بیان کیا۔ گیارہ بجے خان اور شادی خان آگئے، کچھ دیر بیٹھے رہے اور پھر ایک بجے کے قریب باہر نکلے، کھانا کھایا۔ میں واپس ہوٹل آیا اور باچا خان کی کتاب پڑھتا رہا۔

7 اگست تقریباً چھ بجے، میری بیوی 'ہوسئی' آریانا کی فلائٹ سے کابل سے پہنچ گئی۔ کھانا کھایا اور پھر سو گئے۔ اُس وقت افغانستان کے پاس DC-10 طیارہ تھا، جو پراگ کے ہوائی میدان میں سب سے بڑا طیارہ تھا۔ جب وہ ہوائی میدان میں اترتا تھا تو چیک لوگ اس کے نظارے کے لیے اکٹھے ہوا کرتے تھے۔

8 اگست صبح سویرے، ڈاکٹر محبوبہ (سفیر صاحب) کے گھر گئے۔ ڈاکٹر نجیب کی بیگم 'فتانہ' کی جانب سے بھیجے گئے تحائف دیے۔ وہ ابھی تیار نہ تھی اور ہمیں کچھ جلدی تھی۔ نیشنل سینی ٹوریم گئے اور خون کے نمونے ٹسٹ کے لیے دیے، ایکس رے اور ای سی جی کرائی، اور بیگم کو گائناکالوجسٹ کے پاس لے گیا۔ کھانے کے بعد ڈھائی بجے کے لگ بھگ پراگ میں سیاحوں اور مریضوں کے شہر 'کارلووا واری' کو روانہ ہوئے۔ وہاں پارٹی کے لیے مخصوص سینی ٹوریم میں ٹھہرے۔ جب ببرک کارمل کو سفارت سے برطرف کیا گیا تھا تو اُس نے بھی یہاں کچھ وقت گزارا تھا۔ یہاں ہماری آمد سے پہلے ہی ڈیموکریٹک فرنٹ فار لبریشن آف پیلسٹائن (DFLP) کی مرکزی کمیٹی کے رکن کمال البقاعد یعنی ابوحسان اپنی بیگم اور سوڈان کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے رکن جیلی عبدالرحمٰن اپنی آذربائیجانی بیوی 'ملاحید' اور دو بیٹیوں کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے۔ عبدالرحمٰن عدن میں رہتا تھا، گاؤٹ کا مریض تھا اور آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے اُس نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ الجزائر

میں رہائش اختیار کرے۔

9 اگست کی صبح ڈاکٹر کے پاس گیا، اس نے میرے تمام امراض کی فہرست بنائی اور ساتھ ہی اس نے مختلف غسل، معدنی پانی میں رہنے کے اوقات، معدنی پانی کے مساج، سانس کی مشقیں، اور معدنی پانی پینے کا معمول طے کیا۔ (کارلووا واری میں ہر مرض کے علاج کے لیے الگ الگ ناموں سے معدنی پانی کے چشمے ہیں اور یہ پانی پینے کے لیے مخصوص چینی کے برتن ہوتے ہیں، جس میں ڈاکٹر کے تجویز کردہ طریقے اور مقدار سے پانی پیا جاتا ہے)۔ بعد میں فلسطینی اور سوڈانی مہمانوں کے ساتھ بازار میں گھوما۔

10 اگست کو پھر ڈاکٹر کے پاس پہنچا، ڈاکٹر نے دانتوں کا معائنہ کیا، ساڑھے سات بجے مساج، آٹھ بجے تنفس مساج، معدنی پانی پینا، پھر نو بجے ناشتہ کرنا اور اس کے بعد گھومنا پھرنا۔

11 اگست کو مذکورہ بالا معمول، ساڑھے گیارہ بجے پانی کا مساج، بارہ بجے نہانے گیا، اس کے بعد سیر۔

12 اگست کو ڈاکٹر کے علاج اور معمولات سے فارغ ہو گیا۔ سات بجے دانتوں کے ڈاکٹر کے پاس گیا، ساڑھے سات بجے مساج، آٹھ بجے تنفس مساج، وہاں سے فارغ ہو کر دوپہر کا کھانا کھایا۔ اس کے بعد مغربی جرمنی سے محض دس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تفریحی مقام 'فرانشسکو لازنی' گئے۔ جنگل کے بیچ میں واقع بہت خوبصورت مقام ہے، چار بجے تک وہیں گھومتے رہے۔

13 اگست ہفتے کے دن قبرص کی برسر اقتدار پارٹی AKEL کے سیکرٹری جنرل 'پاپاپانو' سے بحث مباحثہ میں وقت گزرا۔ اُس نے مجھ سے ببرک کارمل کی صحت کے بارے میں پوچھا، نہ جانے کیوں! موصوف بلحاظ عمر بزرگ ہیں اور اپنی بیگم کے ساتھ ہماری استراحت گاہ میں رہائش پذیر ہیں، جو مرکزی کمیٹی کا معتبر مہمان خانہ ہے۔

14 اگست کو اتوار کا دن تھا، تو اس لیے طبی معمول سے آزادی تھی۔ صبح سویرے سیر کے لیے نکلے، بعد میں پاپاپانو سے گفتگو رہی۔ اُس نے مجھے قبرص کے اتحاد کے بارے میں معلومات دیں۔ میں نے اسے پاکستان اور افغانستان کے حالات سے آگاہی دی۔ اس طرح ہندوستان کی قیادت کے بارے میں بھی اپنی آراء گوش گزار کیں۔

15 اگست کو طبی معمولات سے فراغت کے بعد ڈاکٹر نے معائنہ کیا، پیٹ اور معدے کے

لیے گولیاں دیں۔ پراگ کے سرکاری سینی ٹوریم میں کیے گئے ٹسٹ کے نتائج سے وہ لاعلم تھا۔ ہوسٹی کا بھی معائنہ کیا اور اس کے لیے جمناسٹک اور معدنی پانی میں نہانے اور مساج کا نسخہ تجویز کیا۔

کل زلمے اور داؤد (افغان فوجی افسر جو 'برنوف' میں پڑھتا ہے)، مجھ سے ملنے آئے تھے۔ مجھے ڈھونڈ نہ پائے تھے۔ آج صبح سویرے داؤد 'یاورینا' (Javorina) یعنی ہمارے گیسٹ ہاؤس کے سامنے پھر رہے تھے، تو ملاقات ہوئی، کچھ دیر بعد زلمے بھی پہنچ گیا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد 'پلزن' (Plzen) شہر جو اپنی بیئر کے لیے مشہور ہے، کی سیر کو نکلے، واپس ساڑھے سات بجے پہنچے۔ رات کا کھانا 'کارلوواری کے مسکوا (ماسکو) ریسٹورنٹ میں کھایا۔ ساڑھے نو واپس 'یاورینہ' آیا، تو سارے دروازے بند تھے۔ زلمے کل صبح سویرے مغربی جرمنی جائے گا، جو یہاں سے زیادہ دور نہیں۔ آج گیسٹ ہاؤس میں عراقی کمیونسٹ پارٹی کے ساتھی آئے ہیں۔

16 اگست: جب میں نے اپنی بیگم کو جمناسٹک کی جگہ پہنچایا تو ڈاکٹر نے فون کیا۔ وہاں گیا تو معلوم ہوا کہ اس کے خون میں سرخ خلیوں یعنی آئرن کی کمی ہے اور مثانے میں سوجن ہے، اُسے غذا میں آئرن لینا چاہیے۔ میرے خون کے ساتھ جگر کا بھی معائنہ ہوا تھا جس میں معمولی خرابی ظاہر ہوئی۔ آج منگل کا دن ہے۔ جمعرات کو پھر خون اور پیشاب کا معائنہ کرانا ہے۔ آج قبرص کے ساتھی 'یاپاپا' نو واپس اپنے ملک جانے کے لیے پراگ رخصت ہوئے، کل نکوسیا جائیں گے۔

17 اگست: معمول کے مطابق طبی پروسیجر، ساڑھے سات بجے متعین معدنی پانی کا پینا، 8 بجے تنفس کا مساج، ساڑھے گیارہ بجے معدنی پانی میں پانی کا مساج، پھر شہر میں گھومنا اور دوپہر کا کھانا۔ بعد از دوپہر ابوحسام (کمال البقاعی) کے ساتھ شہر گھوما۔ پھر آرام کیا اور اس کے بعد گھوما پھرا، آئس کریم کھائی، معدنی پانی پیا، یاورینہ واپسی۔ کھانا کھایا، گپ شپ اور پھر ایک مختصر واک، جس میں میرا ساتھ جیلی عبدالرحمان اور ابوحسام اور ان کے بچوں نے دیا۔ دن میں سفیر شریف سے فون پر رابطہ ہوا، پھر نوواک کو فون کیا۔ انھیں بتادیا کہ میں انیس اگست کو واپس پراگ آرہا ہوں اور وہاں پشتو زبان اور ادبیات کے ماہر پروفیسر 'بیچکا' سے ملنا چاہوں گا۔ بیچکا نے ملنے کے لیے پیر 22 اگست چار بجے کا وقت دیا۔

18 اگست: طبی پروسیجر، اپنے خون اور بیگم کے پیشاب کا معائنہ کرایا۔

19 اگست: پراگ پہنچ گئے۔ کارلوواری میں دن بہت اچھے گزرے اور اردگرد تمام چھوٹے

بڑے شہر اور خصوصاً لازنیاں (تفریح گاہیں) دیکھیں۔ کارلوواری سے میڈیکل سرٹیفکیٹ حاصل کیے۔ چونکہ جگر میں خرابی ہے، اس لیے ہر چھ ماہ بعد خون کا معائنہ لازمی قرار دیا گیا ہے۔

20 اگست: پراگ کا پرانا شہر دیکھا۔ پراگ کا محل، کلیسائیں اور خصوصاً نخومی کی کلیسا، پب اور والٹادریا پر کشتی رانی، سب سے محظوظ ہوئے۔

21 اگست: کانا پشتی قلعے کی سیر کی۔ سلاحی گاؤں گئے، جہاں تفریح گاہیں ہیں۔ کانا پشتی، بوہیمیا اور چیک کی تاریخ اور کلچر سے بھرا پڑا ہے۔ وہاں فرڈیننڈ فرانشسکو کے تین سو ہزار مختلف حیوانات اور پرندے ہیں۔ لکھاریوں، شعرا اور فنکاروں کے مقابر دیکھے۔

22 اگست: افغان سفارت خانے گیا، تاکہ وہاں سے انگلستان کے سفارت خانے کو ویزے کے لیے ایک خط لکھوں۔ میرا پاسپورٹ سفارتی تھا، اس لیے انگلستان کے سفارت خانے نے بلا چون وچرا ویزہ دے دیا۔ چار بجے پرانے شہر میں بیچکا کے گھر گیا اور لائق صاحب کی طرف سے بھجوائی گئیں کتابوں کا تحفہ ان کے حوالے کیا، بہت خوش ہوئے۔

23 اگست: ثقافتی محل دیکھنے گئے، پھر ثقافتی پارک گئے۔ رات 'پراگ میں ایک دن' کے نام سے نمائش نامہ دیکھا۔ ہمارے ترجمان میزبان کا نام 'پیٹر دوکلادل' ہے۔

☆☆☆

میں جب ماسکو کے راستے چیکوسلواکیہ اور پھر لندن، پیرس اور جرمنی جارہا تھا تو ڈاکٹر نجیب، نازش، اجمل اور اپنے ڈیپارٹمنٹ نے مجھے بعض ذمہ داریاں سونپی تھیں۔ نجیب نے ماسکو میں اپنے سفیر حبیب منگل کو کہلا بھیجا تھا کہ ان کے پھوپھی زاد نواسے فرید کارگر کے بیٹے عزیز کو کہے کہ روسی خاتون سے شادی نہ کرے، کیوں کہ اس کا باپ اس بات کا مخالف ہے، لیکن معلوم ہوا کہ عزیز یہ شادی پہلے ہی کر چکا تھا۔ نازش وغیرہ کی طرف سے شاہد حسن کے لیے یہ پیغام تھا کہ ماسکو میں مقیم ساتھی فقط 'ورلڈ فیڈریشن آف ڈیموکریٹک یوتھ' (WFDY) سے رابطہ رکھ سکتے ہیں اور بس۔ شاہد اور دوسرے تعلیم ختم کرنے کے بعد واپس پاکستان چلے جائیں۔ مگر زاہد حسن، شاہد اور عارف ماسکو سے ہلنے کو تیار نہ تھے۔ بھائی افضل نے مجھ سے کہا کہ وہ پاکستان میں سید مختار کے گروپ میں تھا اور باقاعدگی سے چندہ دیتا تھا، مگر جب ماسکو آگیا تو سید مختار نے کہا کہ تم بغیر پوچھے ماسکو چلے گئے لہٰذا اب گروپ سے باہر ہو۔ یاد رہے کہ افضل کو میں نے ماسکو بھیجا تھا اور اس میں کمیونسٹ

پارٹی آف پاکستان کا کوئی کردار نہ تھا۔

پراگ کے لیے نجیب نے 21 جولائی کو کہلایا تھا کہ سفیر کو کہوں کہ جس قالین کو میں لندن میں عطاء اللہ مینگل کے لیے پراگ لا رہا تھا، وہ سفیر چیک حکام کے ذریعے لندن بھجوائے۔ چونکہ آریانا طیارے کو پراگ سے آگے جانے کی اجازت نہ تھی، تو لندن جانے والے مسافر چیک جہاز میں سوار ہو کر لندن جاتے تھے۔ قالین کو لندن پہنچایا گیا، لیکن سفیر نے اس کا کرایہ نہیں دیا تھا۔

پراگ میں دوسری ڈیوٹی یہ تھی کہ کراچی کے ساتھی رؤف وارثی کی بیٹی حمیرا کو، جسے میں نے طب کے لیے بھجوایا تھا اور وہ افغان پاسپورٹ پر تھی، اس کے پاسپورٹ کے لیے یورپی ممالک کا اجازت نامہ (Endorsment) حاصل کروں، کیوں کہ اس کے والدین سویڈن میں مہاجر ہو گئے تھے۔ ورلڈ مارکسسٹ ریویو میں بھارتی کمیونسٹ پارٹی کے نمائندے 'شارد امترا' سے ملوں اور انھیں 'کامریڈ' جریدہ دوں اور ان سے سبط حسن کی زیر تصنیف کتاب "Muslim Contribution to Socialism" (سوشلزم میں مسلمانوں کی عطا) کے لیے مواد طلب کروں۔ چیکوسلواکی اکیڈمی آف سائنسز کو اطلاع دی کہ افغانستان کی علوم اکیڈمی کا وفد ان کی منعقدہ کانگریس میں شرکت کرے گا۔ میں نے سوشلسٹ پارٹی کی طرف سے بھیجے گئے طلبا سے بھی ملاقات کی۔ اسحاق توخی کے لیے پلزن سے بیئر خریدی اور آریانا کے حوالے کی۔

حمیرا چونکہ کراچی سے افغان پاسپورٹ پر آئی تھی، اس لیے افغان لڑکیاں اس کی مخالف تھیں، اس کا حل نکالا۔ عطا محمد شیرزئی کا بیٹا اجمل ایک سمسٹر میں فیل ہوا تھا اور سفیر پرچمی تھا، تو اس نے خلقی کی مدد کرنے سے معذرت کے لیے بہانہ بنایا۔ سفیر نے شکایت کی کہ پراگ میں کابل ریڈیو صحیح نہیں سنائی دیتا، جانے کے بعد کابل میں اس مسئلے کو حل کروں۔ میں نے کئی نوجوانوں سے ملاقاتیں کیں اور چیکوسلواکی کمیونسٹ پارٹی کے لیے پاکستان کمیونسٹ پارٹی کا پیغام نوواک کے ذریعے پہنچایا۔

ڈاکٹر منظور نے کچھ یوں رپورٹ دی ہے:

''اگر بزنجو، ایم آر ڈی کی جدوجہد سے کندھا ملاتا ہے تو ہم ان سے لیفٹ یونٹی کی بنیاد پر اتحاد کریں گے یا کمیونسٹ پارٹی، علیحدہ حیثیت برقرار رکھے ہوئے سوشلسٹ پارٹی، شمیم اشرف ملک گروپ، رشید حسن خان گروپ، زاہد حسن گروپ وغیرہ سے مل کر ایک وسیع تر اتحاد بنائیں

گے۔ شمیم اشرف گروپ پارٹی میں شامل ہوا ہے۔ لیفٹ یونٹی اس لیے کرتے ہیں کہ اپنی پارٹی کو حملہ سے بچائیں۔ پی این پی میں جانے کے بعد پارٹی کا وقار بلند ہوا ہے۔ بعض اور گروپ بھی آئے ہیں، دیگر لوگ بھی آنے والے ہیں۔ پنجاب لوک پارٹی نے یونٹی کانگریس کے انعقاد کی کوشش کی اور ہماری پارٹی کو دعوت دی، مگر یہ کوشش ناکام ہوئی۔ صرف 25 صفحات پر مشتمل ایک ڈاکومنٹ تیار کیا۔ جون 1983 میں یوسف مستی خان اور قسور گردیزی افضل سے ملنے گئے، بلور بھی ساتھ تھا مگر انھیں نکالا۔ افضل خان نے کہا کہ ایسا سمجھیں کہ آپ ولی خان سے گفتگو کر رہے ہیں اور ہم مزاری اور بیگم نسیم ولی کی سیاست سے تنگ آ چکے ہیں۔ پھر اضافہ کیا کہ یہ فیصلہ ہم (افضل خان، ولی خان، قسور گردیزی اور یوسف خان مستی) کریں گے۔ افضل خان نے بتایا کہ اگر پاکستان نیشنل پارٹی، نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی میں مدغم ہو جائے تو بہتر ہوگا۔ قسور نے جواب دیا کہ اگر یہی تجویز میں آپ کو دوں کہ این ڈی پی کو پی این پی میں ضم کر دیں؟ کیوں کہ اگر ہماری پارٹی ضم ہو گئی تو وہ پاش پاش ہو جائے گی، پھر وہ ولی خان سے ملے۔ ولی خان نے کہا، غوثی (غوث بخش بزنجو) کدھر ہے؟ مجھے غوثی سے ملوائیں، ڈاکٹر اعزاز نذیر تو ہمارا بندہ ہے۔ ولی خان نے بہت باتیں کیں۔ یوسف مستی خان نے پھر ساری رپورٹ کارکنان کو سنائی اور پوچھا کہ اب ہم کیا کریں؟ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے ساتھیوں نے کہا کہ ہم بات کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں۔ بزنجو کا ہمیشہ سے یہی رویہ رہا ہے کہ ہم این ڈی پی سے نہیں مل سکتے۔ بزنجو نے کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کا اثر زائل کرنے کے لیے سوشلسٹ پارٹی سے اتحاد کیا ہے، اس کے باوجود کہ موصوف پہلے پہل اتحاد کی تجویز کو مسترد کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر سیاست ایک ہے تو پی این پی میں آ جائیں۔ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان نے یوسف مستی خان سے کہا ہے کہ ایس پی سے اتحاد کی بات فی الحال ملتوی کرے، لیکن بزنجو اور قسور نے دستخط کر دیے۔ جب مستی خان واپس آیا تو سیدھا شیر باز مزاری کے پاس گیا اور سوات میں کی گئی تمام باتیں بحیثیت بلوچ بتا دیں۔ اس کے بعد انھوں نے قسور سے کہا کہ میں نے اس طرح سے کیا ہے۔ قسور نے پھر مستی خان کو کہا کہ مزاری سے پھر ملے اور یہی باتیں رسمی طور پر بتا دیں، تو پھر اس نے ساری باتیں بیان کیں۔

پی این پی کا رویہ پی پی پی سے مخالفت کا ہے، خصوصاً مستی خان کا، جو بزنجو کا غیر رسمی

ترجمان ہے۔ بزنجو این ڈی پی کے ساتھ محاذ کا بھی مخالف ہے۔ مئی کے مہینے میں بزنجو کو امریکی لابی (داؤد، کرنل احسان الٰہی، ملٹری انٹیلی جنس اور دو دیگر سی ایس پی افسران) نے ناشتے کی دعوت دی تھی۔ جو رپورٹ ہمیں ملی ہے، اس کے مطابق تو اس اجلاس میں بزنجو کا رویہ بہت جمہوری تھا اور اپنا حقیقی موقف وہاں بھی ظاہر کیا۔ اس میٹنگ میں یوسف مستی خان بھی موجود تھا۔ یہ رپورٹ پھر ہمیں ڈاکٹر علی ہاشمی نے دی، جو اپنے آپ کو لیفٹسٹ کہتا ہے اور ڈیموکریٹک سٹوڈنٹس فیڈریشن کے وقت پارٹی ممبر رہا تھا۔ جون میں نبی احمد، لودھی، امتیاز عالم، شفیع قریشی، فضل الرحمان وغیرہ نے کراچی میں ایک میٹنگ کی اور کہا کہ تمام ٹریڈ یونینز کو ایک ہی یونین میں اکٹھا کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔

سفیر صاحب نے خواہش کی کہ ان کے خطوط کے جواب جلد آنے چاہئیں۔ بریالے اور نور احمد نور کس وقت 'صلح' اور 'سوشلزم' (جریدہ) کی دعوت پر آئیں گے؟ 25000 ڈالر اس جریدے کی فارسی، پشتو اور بلوچی کے لیے بھیجے گئے تھے، ان کا کیا بنا؟ [۲۴] انھی زبانوں میں شائع شدہ جرائد کا مجموعہ بھیجا جائے۔ فلسطین کیمونسٹ پارٹی کے نام پیغام بھجوانا چاہیے۔ 'صدائے وطن' جریدے کے شمارے نہیں بھیجے گئے۔ نوواک سے میں (صوفی) نے بات کی اور ان کی پارٹی نے سال میں دو مریضوں کا علاج کرانا اپنے ذمہ لیا ہے۔

بین الاقوامی تعلقات کے شعبہ کے مشیر سیلنکن نے خواہش ظاہر کی تھی کہ پارٹی اور حکومت کے بارے میں معلومات کو نشر اور تقسیم کرنا چاہیے۔ مغربی عقائد اور نظریات کو افشا کرنا چاہیے۔ پارٹی کی بین الاقوامی امور کی طرف سے شائع شدہ مواد کس ذریعے سے بھجوائے جائیں؟ بریالے نے کہا تھا کہ تمام سفارت خانوں سے قریبی رابطہ رکھوں، ان کا سروے کروں، لیکن کسی سے کوئی وعدہ وعید نہ کروں۔

29 اگست: پیر کے دن میری بیگم ساڑھے بارہ بجے صبح کابل کے لیے پراگ سے روانہ ہوئیں۔ میں 30 اگست کو گیارہ بجے ٹرین سے لندن کے لیے روانہ ہوا۔ ساڑھے تین بجے 'ذِجب' (Cheb) پہنچا اور چار بجے مغربی جرمنی میں داخل ہو گیا۔ دوسرے دن دو بجے فرانس کی سرحد تک پہنچ گیا۔ راستے میں ایک دلچسپ واقعہ یہ ہوا کہ میں کابل سے عطاء اللہ مینگل کے لیے ایک قالین لایا تھا، جسے پراگ سے لندن کے لیے روانہ کیا تھا۔ لیکن جو دو بھاری کارٹن خیر بخش مری نے دیے

تھے، وہ بہت بڑی مصیبت کا باعث تھے۔ جس سٹیشن پر ریل رکتی تو سیکورٹی والے چڑھ آتے، مسافروں کے سامان اور اسناد کی چیکنگ کرتے۔ میرے پاس ڈپلومیٹک پاسپورٹ ہوتا تو حیران ہوتے اور مختلف سوالات پوچھتے۔ میں بھی پریشان ہوا، اس لیے دونوں کارٹن کو چیک کیا کہ کہیں کوئی خطرناک چیز نہ ہو۔ ایک میں ہاتھ ڈالا تو کیمپوں میں مریوں کی بنائی ہوئی چھریاں، خنجر اور چاقو برآمد ہوئے۔ اب مزید پریشان ہوا کہ کہیں پستول یا کوئی اور آتشی اسلحہ نہ ہو۔ جب دوسرے کارٹن کو چیک کیا تو تسلی ہوئی کہ اس میں خشک میوہ تھا۔ دونوں کارٹنوں کے مال کو میں نے ایک ہی کارٹن میں سمویا اور اپنی مشکل آسان کی۔

31 اگست صبح ساڑھے سات بجے پیرس ریلوے سٹیشن پہنچا۔ لندن جانے کے لیے ریل دوسرے سٹیشن سے لینی تھی۔ خیر بخش کے دونوں کارٹن سے بنا ایک کارٹن بہت بھاری تھا۔ دوسری طرف میرے پاس اپنا بکس اور اٹیچی کیس بھی تھا، میں تھا بھی اکیلا۔ بہت مشکل سے کارٹن کو ایک چیک ہم سفر کی مدد سے اتارا، لیکن ہتھ گاڑیاں سب ختم ہو چکی تھیں۔ میں نے ادھر ادھر بہت کوشش کی کہ کہیں کوئی گاڑی مل جائے اور اس پر سامان لادوں، لیکن بے سود۔ آخر کار ایک گاڑی ملی، سامان اس میں رکھا اور چونکہ لندن والا سٹیشن بہت دور تھا، اس لیے سارا سامان ریلوے سٹیشن میں سامان رکھنے کی جگہ میں بند کر کے چابی ساتھ لے لی۔ ٹیکسی پکڑی اور سیدھا افغان سفارت خانے پہنچا۔ تھوڑا ستانے کے بعد فرسٹ سیکرٹری نظام آ گیا۔ پھر پیرس گھومنے پھرنے کے لیے نکل پڑا، رات کو مہاراجہ ہوٹل میں کھانے کی دعوت دی گئی۔ سفارت خانے کا عملہ دعوت میں موجود تھا۔ تمام پیرس کی سیر کی۔

سفارت خانے کی ریذیڈنسی میں رات گزاری۔ ولی خان برمنگھم میں تھے، ان کو فون کیا کہ میں آنے والا ہوں۔ موصوف کو پہلے سے معلوم تھا۔ مذاق میں کہا کہ 'مزے کرو، سفارتی پاسپورٹ پر ہو، جہاں جی چاہے جا سکتے ہو۔'' ولی خان نے اجمل، لائق اور نجیب کے بارے میں پوچھا۔ برلن میں افغان سفیر شفیع کو اور سویڈن میں ڈاکٹر نذیر، جو اپنی محبوبہ کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا، فون کیے۔ ڈاکٹر نذیر نے بتایا کہ انھیں ولی خان نے کہا تھا کہ افغانستان کی موجودہ حکومت کے اجمل کے ساتھ تعلقات ٹھیک نہیں، کیوں کہ اجمل ترہ کی اور امین حکومت کے بہت قریب تھا۔ انھیں بعض خطوط لکھے تھے، جو موجودہ حکمرانوں کے ہاتھ لگے ہیں، مگر جب میں (ولی خان) کابل گیا تو

حالات درست کیے۔ نذیر تشویش میں تھا، لیکن میں نے اس کی تشویش دور کی۔[ولی خان نے آدھا سچ بولا تھا، اجمل کے تعلقات کو بہتر بنانے میں میرا اور سوویت دوستوں کا ہاتھ تھا۔]

دس اور گیارہ ستمبر کو فرانسیسی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے ترجمان اخبار 'لی ہیومنتے' کا جشن تھا۔ افغانستان سے انقلابی کونسل کے نائب سربراہ گل آقا آنے والے ہیں۔ نظام نے مرکزی کمیٹی کے بین الاقوامی تعلقات کے نائب 'شارل نیگر کو فون کیا کہ میں (صوفی) کابل سے آیا ہوا ہوں، انھوں نے یکم ستمبر کو ساڑھے تین بجے ملاقات کا وقت دے دیا۔ خلیل، کمیونسٹ پارٹی کا بندہ، بہت دور تھا اور ان کا اتا پتا معلوم نہ تھا۔ پھر بھی میں نے نظام کو مواد دیا کہ اسے ڈھونڈے اور ان تک یہ سب مواد پہنچا دے۔

یکم ستمبر کو مقررہ وقت پر شارل نیگر، جو ہمارے خطے کا انچارج ہے، سے ملاقات کرنے گئے۔ میں نے پاکستان کے بارے میں معلومات دیں اور کمیونسٹ پارٹی کا کردار واضح کیا اور اپنے سفر کا مدعا بھی بیان کیا۔ پاکستان کے بارے میں ان کا سوال یہ تھا، کہ موجودہ حالات کی روشنی میں مستقبل کا منظر نامہ کیا ہوگا؟ اور یہ کہ دوسری فوجی بغاوت کا امکان ہے یا نہیں؟ یا موجودہ ایم آر ڈی کی جدوجہد کی ناکامی کی صورت میں ایک اور کودتا ہوگا؟ چھوٹے صوبوں کے ذہن میں پنجاب کے متعلق سوالات اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ پاکستان میں بورژوا ڈیموکریٹک انقلاب بھی مسلح جدوجہد کے بغیر نہیں آسکتا یا پاکستان کے عوام اٹھ کھڑے ہوتے ہیں یا ایک سول حکومت عام انتخابات کے نتیجے میں بنتی ہے۔ سامراج پیچھے ہٹے گا، جو ایک آئیڈیل صورت ہوگی۔ میں نے بعض قیدی ساتھیوں کے فوجی ٹریبونل میں ٹرائل کے بارے میں معلومات فراہم کیں۔ شارل نے کہا، کہ میں انھیں ٹھوس معلومات دوں تا کہ ان کے جنرل سیکرٹری جارج مارشے اپنی قیادت میں ہونے والی سلامتی کمیٹی کے اجلاس میں ان سے متعلق بات کریں۔ میں نے انھیں ولی خان کے بارے میں بتایا۔ شارل نے کہا، کہ ان کی پارٹی آمادہ ہے کہ موصوف کا فرانس میں استقبال کرے۔ 'لی ہیومنتے' کے جشن میں پارٹیاں اور قومی آزادی کی تحاریک اپنے اپنے سٹال سجائیں گی اور اپنی مطبوعات ونشریات رکھیں گی۔ مجھے بھی جشن میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ رات کو سمیع زے کے مہمان تھے، جس میں سفارت کے عملہ کے علاوہ اور بھی کئی دوست مدعو تھے۔

2 ستمبر کو پیرس کے گارڈینارڈ ریلوے سٹیشن سے صبح آٹھ بج کر دس منٹ پر لندن کے لیے

روانہ ہوا۔ کیلے میں اترا، وہاں پر پاسپورٹ وغیرہ کی چیکنگ کے بعد بحری جہاز 'سی لنک' کے ذریعے روانہ ہوا اور انگلستان کے فوک سٹون میں اتر گیا۔ معمول کی امگریشن چیکنگ کے بعد ٹرین میں لندن وکٹوریا سٹیشن پہنچ گیا۔ خشک میوے کا کارٹن پیرس میں سفارت خانے کے حوالہ کر دیا تھا، کہ وہ اسے لندن بھیج دیں۔ سفارت خانے کے ریذیڈنس میں ٹھہرا۔ ریذیڈنس عالی شان تھی مگر دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے بوسیدگی ٹپک رہی تھی۔

جب میں پراگ جا رہا تھا اور مغربی یورپ جانے کی بھی ٹھانی تھی، تو سب سے زیادہ نجیب اللہ نے، جو اس وقت خاد (افغان خفیہ سروس) کے سربراہ تھے، مجھے ترغیب دی کہ لازماً لندن جاؤں، ولی خان اور عطاء اللہ مینگل سے ملوں اور اس میں بھی ولی خان سے ملنا میرے لیے از حد ضروری ٹھہرایا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ ان کی طرف سے ولی خان کو پیغام دوں کہ "ہمارے بڑے لیڈر [کارمل] اپنی گفتگو کی بنیاد آپ کی باتوں پر رکھتے ہیں۔ آپ [ولی خان] کے تمام بیانات واضح طور پر ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات میں پیش کیے جاتے ہیں۔ آپ کی سرگرمی اور کارکردگی کو تحسین کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ نہ صرف ہمارا خیال ہے، بلکہ دوست [سوویت یونین] بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ نیشنل عوامی پارٹی کی طرح تمام جمہوری اور ترقی پسند قوتیں آپ کی قیادت میں اکٹھی ہوں۔ جب آپ لندن جا رہے تھے تو ہمیں اطلاع ملی کہ آپ بھی یہی چاہتے ہیں کہ این ڈی پی اور پی این پی کی وحدت کا معاملہ حل کریں۔ اس سلسلے میں ہم آپ کی پشت پر کھڑے ہیں۔"

اس کے علاوہ اجمل نے بھی پیغام دیا تھا، جو یہ تھا: "افغانستان اور سوویت یونین آپ کو اپنا سمجھتے ہیں اور پاکستانی سیاست میں فقط آپ کی طرف دیکھتے ہیں۔ ہم خود بھی آپ کے بغیر کام نہیں کرتے۔ جو بھی آتا ہے تو آپ کے پاس بھیجتے ہیں، جیسے بسم اللہ اور دیگر قبائلی مشران۔ ہم کمیونسٹ پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں، اب تو پارٹی بھی اسی موقف کی حامی ہے۔ آپ کی طرف سے 186 اسناد آئی تھیں اور ان تمام طلبہ کو داخلہ دیا گیا۔ ابھی تک بیرون ملک جانے کے لیے 22 اسناد پہنچ چکی ہیں۔ روزانہ قونصلیٹ کو ٹیلیکس دیتے ہیں، کہ مزید بھجوائیں۔"

اس طرح ڈاکٹر نجیب نے عطاء اللہ مینگل کے لیے جو پیغام بھیجا تھا، وہ یہ تھا: "ہم نے آپ کے آنے کے 'لیے تیاریاں کیں تھیں، مگر معلوم نہیں کہ آپ کیوں نہ آسکے۔ ہر مرتبہ خیر بخش کو کہتے

ہیں، کہ ہماری جانب سے نیک تمنائیں اور سلام دعا آپ تک پہنچائے۔ ہم قوموں کی خود ارادیت کی بنیاد پہ علیحدگی کی حد تک حامی ہیں، تاہم پہلے تحریک کو پکا ہونے دیں۔ اس کے لیے اب آپ کو پختونوں، افغانستان اور پاکستان کی جمہوری قوتوں کی حمایت کی ضرورت ہے۔ جب تحریک بالغ ہو جائے، تو پھر سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اگر مسلح جدوجہد کی نوبت آئی تو ہم اس کے پیچھے کھڑے ہوں گے، لیکن اس طرح نہیں جیسے داؤد نے کیا تھا۔ ہم پھر آخر دم تک ساتھ نبھائیں گے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ تحریک پختہ ہو جائے۔ ہم سب کچھ کر سکتے ہیں، البتہ احتیاط سے کام لیتے ہیں کہ امریکا کے ہاتھ بہانہ نہ لگے اور وہ اپنی فوج اس طرح بلوچستان میں نہ اتار دے۔''

مجھے یہ بھی کہا گیا تھا کہ افضل بنگش سے ملوں اور انھیں اس اتحاد میں شامل ہونے کی ترغیب دوں۔ میرے سوویت دوست بوریس (Boris) نے، جو پاکستان میں رہ چکا تھا اور بنگش کو جانتا تھا، انھوں نے بھی بنگش صاحب کو نیک تمنائیں پہنچانے کا کہا تھا۔

نواب خیر بخش مری نے افغانستان سے نکلنے سے پہلے مجھ سے جو فرمائشیں کی تھیں اور ہدایات دی تھیں، ان کا خلاصہ یہ ہے: افغانستان کے بارے میں لوئی دوپرے کی کتاب، مرارجی ڈیسائی پر امریکا میں لکھی گئی کتاب، جس میں کہا گیا ہے کہ وہ امریکی سی آئی اے کا ایجنٹ تھا، انگریز۔روس رقابت کے بارے میں 'فریزر ٹیٹلر' (Fraser Tytler) کی کتاب اور اس طرح دیگر کتابوں کی ایک فہرست۔ اگر ولی خان کوئی کتاب پڑھنے کے لیے تجویز کریں تو وہ بھی ساتھ لے آنا۔ خیر بخش نے یہ بھی کہا کہ ولی خان سے کہوں کہ خود پاکستان کے بارے میں کتاب لکھے۔ بی بی سی نے کارل مارکس کی صد سالہ برسی پر پروگرام کی جو سیریز نشر کی تھیں، اس کی کیسٹس ڈھونڈوں۔ عطاء اللہ مینگل سے گوریلا جنگ اور حکمت عملی پر کتابیں مانگیں تھیں۔ امریکا نے کاؤنٹر انسرجنسی پر ایک مجموعہ شائع کیا ہے، وہ اور لندن میں لارنس لیفشاج (Lawrence Lefschatge) کی کتاب۔ فریڈ ہالیڈے کے بارے میں تاکید کی تھی کہ ان سے خود ملوں اور آئرلینڈ کے بارے میں کتاب مانگوں۔ سردار سے بات کریں کہ وہ ہالیڈے سے کہے کہ وہ میرے ساتھ خط وکتابت کرے۔'' اسی طرح مجھے یہ ہدایت بھی دی کہ عارف، اصغر موسیٰ، چغتائی اور نظامانی سے بھی ملوں، پختونوں سے ملوں، مہاجر پارٹیوں، کمیونسٹ پارٹی، پی پی پی اور پی این پی وغیرہ کے بارے میں معلومات اکٹھی کروں اور بی بی سی اردو سروس کے عملے سے ملاقات کروں وغیرہ۔

3 ستمبر بروز ہفتہ صبح ولی خان سے ملنے برمنگھم روانہ ہوا اور ساڑھے گیارہ بجے پہنچ گیا۔ سارا دن گپ شپ میں گزارا۔ سارا حال احوال سنایا۔ ان کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے:

''پاکستان میں اندرونی حالات تشویشناک ہیں۔ چھوٹے صوبوں کے لوگ کہتے ہیں کہ اب پاکستان کا ٹوٹنا ہی سب مسائل کا حل ہے۔ سندھی، جو Docile اور تشدد کے خلاف ہیں، انھوں نے بھی تشدد کا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ جب تک باہر سے ایک قوت کی امداد نہ ہو تو یہ مقصد [پاکستان کا ٹوٹنا] حاصل نہیں ہو سکتا۔ سندھی شکایت کرتے ہیں کہ افغانستان کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں۔ پختونوں اور بلوچوں کا تو افغانستان کے بغیر دوسرا راستہ ہی نہیں ہے۔ امریکا پاکستان میں بڑے پیمانے پر داخل ہوا، وہی منصوبہ، جس کے لیے برطانیہ نے پاکستان بنایا تھا، اس پر اب امریکا عمل کر رہا ہے۔ اس کی کوشش ہے کہ پاکستان میں انقلاب کا راستہ روکے۔ چھوٹے صوبوں میں ہم یہ احساس پیدا کر چکے ہیں، کہ پاکستان میں ان کی جگہ نہیں۔ دوم یہ کہ امریکی عوامی سطح پر نہیں چل سکتے۔ جماعت اسلامی امریکا کی پارٹی ہے، مگر وہ علی الاعلان امریکا کے حق میں بات نہیں کر سکتے۔ میں جو کتاب لکھنا چاہتا ہوں، تو اس کے لیے American Role in Pakistan کو آپ پڑھیں تو میرے نکتہ نظر کو سمجھ لیں گے۔ ہم نے لوگوں میں اتنا شعور بیدار کر دیا ہے کہ اب حکومت امریکا کو براہ راست اڈے نہیں دے سکتی، اس لیے اب یہ کوشش کی جاتی ہے کہ سعودی عرب اور دیگر مسلمان ممالک کے نام پر اڈے تعمیر کریں۔ اطلاع یہ ہے کہ بلوچستان میں اڈے بنانے کے لیے 'سفید چمڑی' والے آئے ہیں اور وہاں پاکستانیوں کو بھی جانے کی اجازت نہیں۔ اس دائرے کو امریکا دن بہ دن تنگ کرتا جا رہا ہے۔ دوست حضرات [سوویت یونین] کو سوچنا چاہیے کہ اب پاکستان کے موجودہ حالات سے کس طرح فائدہ اٹھائیں۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ اب صرف دائیں بازو کی قوتیں میدان میں رہ جائیں۔ پاکستان کا امریکا سے خفیہ رابطہ ترکی کے ذریعے ہوتا ہے۔ جس طریقے سے امریکا افغان شر پسندوں کی تربیت کرتا ہے، اسی طرح جماعت اسلامی کو بھی تربیت دی جاتی ہے۔ پشاور یونیورسٹی میں حالیہ دنوں میں جو طالب علم مارے گئے، ان میں ایک افغان مہاجر بھی مارا گیا تھا، لیکن اس کی موت کو چھپایا جا رہا ہے۔ اوپر امریکا، نیچے افغان مہاجر اور جماعت اسلامی! ان کے علاج کے لیے آپ لوگوں [افغان حکومت] کو سرگرم ہونا چاہیے۔ ہمارے ساتھ رابطہ نہیں، آپ کیوں رابطہ نہیں بنا سکتے؟ یہ شکایات رفع ہو سکتی ہیں اور پاکستان کے استحکام اور یکجہتی

کا ہوا ٹوٹ سکتا ہے۔ وہ دو بندوقیں نیچے آگئیں؟ یہ تو آپ لوگوں کا حال ہے کہ دو بندوقیں نہیں بھجوا سکتے! این ڈی پی کی قوت آپ کی قوت ہے، البتہ راستہ پروپیگنڈے کا ہے۔ پاکستان کے سارے اخبارات آپ تک پہنچنے چاہییں اور اس طرح پاکستان کے لیے پروپیگنڈا کیا جائے۔ امرتسر ٹی وی کا نمائندہ کے، نیر (K. Nayyer) کہتا تھا کہ لاہور میں دو جگھوں پہ گیا اور دونوں جگہ ایک بات ہو رہی تھی کہ تقسیم ہند کی وجہ سے پنجاب تقسیم ہو کر رہ گیا ہے۔ انھی خطوط پر پروپیگنڈا کیا جائے، جس طرح لائق صاحب نے تورخم میں باتیں کی تھیں۔ [وہ باتیں یہ تھیں کہ عربوں کی شلوار اسرائیل نے اتار دی ہے تو اب یہ لوگ ازار بند سر پر باندھے افغانستان چلے آئے ہیں۔] قبائل ہمیشہ اس فریق کا ساتھ دیتے ہیں، جو فاتح ہو۔ اب سب کچھ تمہارے ہاتھ میں ہے: پروپیگنڈا، اسلحہ اور طلباء و طالبات کی ضروریات۔

بھارت اور سوویت یونین کے ساتھ مفاہمت و ہم آہنگی ہو تو پھر سب کچھ ہو سکتا ہے۔ امریکی فوجیں آنے کی باتیں فقط دھمکی ہو سکتی ہے، وہ نہیں آسکتے۔ آپ قبائلیوں کو اسلحہ اور پیسا نہیں دے سکتے؟ صرف بھارت، سوویت یونین اور آپ کا مشترکہ فیصلہ چاہیے۔ کشمیر اور سندھ میں بھارت، بلوچستان اور پختونوں میں آپ کام شروع کریں۔ امریکا نہیں آسکتا۔ وی سی آر کی کیسٹیں تیار کریں اور طلبہ کو بھجوائیں اور ساتھ اسلحہ اور مادی امداد بھی دیں۔

حفیظ پیرزادہ کہتا ہے کہ سندھ کے دس اضلاع آرمی کے کنٹرول میں ہیں۔ اس طرح ولی خان نے جماعت اسلامی کے کردار کے بارے میں بہت سی باتیں کیں اور کہا، ''جماعت اسلامی نے تیمرگرہ میں گیارہ لاکھ روپے سے ایک دارالعلوم بنایا ہے۔ مردان میں تفہیم کالونی اور کوئٹہ میں دو کروڑ روپے سے چار کالج بنائے ہیں۔ مدین کے نزدیک پہاڑ میں تعمیرات ہو رہی ہیں۔ ان کی بلوچستان کمیٹی میں اب تک 25 کروڑ روپوں کا غبن ہو چکا ہے۔''

''میں اپنی خدمات پیش کرنے کے لیے آمادہ ہوں اور کابل آسکتا ہوں۔ بھارت سے بات کریں۔ سوویت یونین سے مفاہمت بہت ضروری ہے، ورگرنہ پاکستان میں جدوجہد کے راستے مسدود ہو چکے ہیں۔''

ولی خان چاہتے تھے کہ باچا خان کے علاج کے بہانے کابل جائیں، تاہم اسی اثنا میں باچا خان نے غلط بیان دے دیا اور قید ہو گئے۔ اب بیگم نسیم ولی اور باچا خان نے کہلا بھیجا ہے کہ ان

کے کہنے تک ولی خان انگلستان سے واپس نہ آئیں۔ [دراصل ہوا یوں کہ ایم آر ڈی کی تحریک جاری تھی، تمام صوبوں کے لوگ باری باری گرفتاریاں دے رہے تھے، سندھ میں حالات بہت کشیدہ تھے۔ ایک بہت بڑا طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا، لیکن جب صوبہ سرحد کی باری آئی تو باچا خان نے بیان داغ دیا کہ پاکستان کی جمہوری تحریک سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں اور نہ پاکستان میں جمہوریت ہمارے مفاد میں ہے، خدائی خدمت گار تحریک پھر سے زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ غلام احمد بلور، جو صوبائی صدر تھے، انھوں نے استعفیٰ دے دیا اور باچا خان سے مل گئے۔ اس طرح صوبے میں ضیاء مخالف تحریک میں پھوٹ پڑ گئی اور تحریک کو نقصان پہنچا۔ ولی خان نے برمنگھم سے بیگم نسیم ولی کو بابا کے پیچھے بھیجا کہ وہ اس جاری تحریک میں مداخلت سے باز رہیں، لیکن نقصان بہرحال پہنچ چکا تھا۔]

4 ستمبر کو اتوار کے دن میں ولی خان کے ہمراہ شہر کی سیر کے لیے نکلا۔ دوکانیں بند تھیں، ہم نے کچھ سفر گاڑی میں کیا، کچھ پیدل۔ پھر پارک میں گھومے اور واپس ولی خان کے داماد جاوید خٹک کے گھر آ گئے۔ میں الائیڈ بینک کے اوپر واقع کوارٹر میں ٹھہرا ہوا تھا۔

5 ستمبر کو برمنگھم سے واپس لندن آیا۔ نجیم بیگ چغتائی چونکہ گھر میں نہیں تھے، اس لیے سیدھا سفارت خانے چلا گیا۔ کھانا سفارت خانے میں کھایا، چغتائی صاحب آ گئے تو پکاڈلی سرکس گھومنے گئے۔ رات دس بجے ظہیر آفریدی آ گئے تو دیر تک گپ شپ ہوتی رہی۔

6 ستمبر کی صبح اولمپیا میں افغان دستکاروں اور چھوٹی صنعتوں کی نمائش گاہ تھی۔ سفارت کے ناظم الامور اعظم شہیم کے ہمراہ نمائش دیکھنے گئے۔ کابل سے جمیلہ بدخشی، سرابی صاحب اور حق مراد کمپنی کے نمائندے حاجی بھائی آئے تھے۔ واپس آ کر تین بجے لندن گھومنے نکلا اور رات پھر نمائش گاہ گیا۔ رات کو سرابی صاحب، جمیلہ اور نور زاد (قراقل کمپنی کا سربراہ) آ گئے۔ ظہیر آفریدی بھی آئے اور رات کو اعظم شہیم کے مہمان بنے۔ میں رات گزارنے ظہیر آفریدی کی دعوت پر اس کے ساتھ چلا گیا۔

7 ستمبر کی صبح ظہیر آفریدی نے بی بی سی فون کیا تا کہ خیر بخش نے جن کیسٹوں کا دریافت کیا ہے، ان کی دستیابی سے متعلق بات کرے۔ پھر برٹش میوزیم گئے۔ 5 بجے افغانستان کے دوستوں کی انجمن کا نمائندہ اصغر موسیٰ آیا اور پھر اس کے ساتھ عارف کے گھر گئے، وہاں پر چغتائی بھی تھے۔ شام سات بجے میں سردار مظہر علی خان کا مہمان تھا، موصوف کے گھر گئے۔ اصل میں یہ

ضیافت فیض احمد فیض کے لیے ترتیب دی گئی تھی۔ وہاں عثمان خالد بمعہ بیگم، قیوم بٹ، راجہ افضل، عطاء، ٹیپو، شجاع، ڈاکٹر نیازی، موسیٰ اور گلزار حسین وغیرہ جمع ہوئے۔

8 ستمبر: دن سفارت خانے میں گزرا۔ صوفیہ سے ظفر اقبال لندن آیا تھا، وہ مجھ سے ملنے آ گیا۔ ہوائی اڈے سے مینگل صاحب کے لیے قالین وصول کیا۔ میں نے سردار مینگل صاحب کو فون کیا کہ قالین وصول کرنے کے لیے کسی کو بھیج دیں۔ ڈھائی بجے، ان کا بیٹا جاوید اور جمعہ خان بلوچ آئے۔ قالین حوالے کیا۔ شام ساڑھے پانچ بجے جاوید آئے اور مجھے ساتھ لے کر لندن کے شمال مغرب میں واقع 'بورہام وڈ' (Borehamwood) اپنے گھر لے گئے۔ سردار عطاء اللہ کو حال احوال سنایا، کھانا کھایا۔ سردار صاحب کی گفتگو کا خلاصہ یہ تھا: ''بھوکے اور پیٹ بھرے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ہم بھوکے ہیں اور آپ بھوکے نہیں، بھوک ہمیں تنگ کرتی ہے۔ آپ کی ہمدردی سے انکار نہیں، ہم توقع کرتے ہیں کہ ہماری رہنمائی کی جائے کہ کس وقت کیا کریں۔ ہم سادہ لوگ ہیں، ہم سے دوٹوک بات کریں۔ ڈپلومیسی ہم نہیں سمجھتے۔ صاف کہہ دیں، تاکہ ہم جواب دیں کہ کیا کر سکتے ہیں اور کیا نہیں۔'' میں نے کہا کہ سردار صاحب لوگوں کو خالی ہاتھ نہیں چھوڑنا چاہیے۔ تیر کی ضرورت ہے، مگر تیر کو گیدڑ پر نہیں ضائع کریں گے۔ ہم میں بھی خامیاں موجود ہیں، لیکن ابھی تک کوئی ٹھوس کام نہیں ہو رہا کہ ہم کہیں کہ پختونخوا اور بلوچستان میں کچھ ہو رہا ہے۔

سردار صاحب: ''پنجابی کے ہاتھوں تھپڑ کھانے سے ہم نے پنجابی استعمار کا جواز پیدا کیا۔ ڈاکٹر خان صاحب اور بھٹو کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ پنجاب کے ساتھ گذارہ ناممکن ہے۔ ولی خان کہتے ہیں کہ پہلے جمہوریت کی بات کریں۔ میں ان کی منطق کو نہیں سمجھ پاتا۔ پنجاب کی جمہوریت کی سیاست مجھے اپیل نہیں کرتی۔''

سردار صاحب کو لائق صاحب کی طرف سے بھیجا گیا دعوت نامہ نہیں ملا تھا، گلہ کیا کہ، ''اسلم گچکی کابل جا رہا تھا مگر آریانا ہوائی کمپنی نے ان سے کہا کہ تمہارا پاسپورٹ پاکستانی ہے، اسے پھر وہاں سے دوبئی جانا تھا۔ اگر مجھے فوری کابل آنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو جلد کابل آؤں گا۔ پیرس میں افغان سفارت خانے کو کہوں گا کہ میں خود آ رہا ہوں اور بھارت میں افغان سفیر (ابوی صاحب) کو اطلاع کی جائے کہ سردار صاحب کا آدمی آئے گا۔ سردار صاحب نے مزید کہا کہ اب ہم کنفیڈریشن کے لیے تیار ہیں۔ سردار مظہر علی سے کہا کہ ہم نے تو توڑنے کی

بات کی ہے، اب تم بچا لو۔ بچانے کا ایک راستہ ہے کہ تاش کے 52 پتے چھوٹے صوبوں کو دیے جائیں۔ [یہ بات سردار صاحب نے سردار مظہر علی کی اس خواہش کے اظہار میں کہی کہ پاکستان ٹوٹ رہا ہے، اس کو بچائیں]۔

گوادر میں پاکستانیوں نے دو پوسٹیں بنائی ہیں، جن پر کیمرے نصب کیے گئے ہیں اور وہاں کسی کو جانے کی اجازت نہیں۔ ہر پندرہ دن بعد وہاں فوجی آتے ہیں، پرانی فلمیں لے جاتے ہیں اور نئی ڈال جاتے ہیں۔ ایک پوسٹ بحری نگرانی کے لیے اور دوسری ہوائی نگہبانی کے لیے ہے اور پھر یہی فلمیں کراچی جاتی ہیں اور ان کا کوڈ امریکی توڑتے ہیں۔ جیونی تو امریکا کی وسیع الحرکت قوت کے لیے بنا ہے، اور مڑہ میں فوجی بحری اڈہ ہے۔ کینیڈا کے میگزین میں شائع ہوا ہے کہ پاکستان نے بلوچستان میں سعودی عرب کو اڈے کی سہولیات دی ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے اندھے کو عینک دینا۔ فار ایسٹرن اکنامک ریویو میں چھپا ہے کہ پاکستان کی جو دو ڈویژن فوج سعودی عرب میں تھی، اس میں سے ایک کو خلیج (غالباً مسقط) منتقل کر دیا گیا ہے اور اس کی جگہ بنگلہ دیشی ڈویژن نے لے لی ہے۔

ولی خان سے دوبارہ ملنا چاہتا ہوں۔ سنا ہے سندھ میں نئی تحریک سے ان میں تبدیلی آ گئی ہے اور اب وہ بھی پاکستان کے ساتھ نہ رہنے کی بات کر رہے ہیں۔ میں نے جب پہلے ولی خان سے باتیں کی تھیں تو وہ جمہوریت کی بات کرتے تھے۔ میں نے بتا دیا کہ ہم نے پنجاب کے لیے جمہوریت لانے کی بہت تگ و دو کی لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا، وہ ہماری غلطی تھی۔ میں ان کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا، اس لیے اس بات کو آگے نہیں بڑھایا۔'' دوسری طرف ولی خان کہتے ہیں کہ، ''میں نے مینگل کو کہا کہ آپ (سردار اور خیر بخش) ملک سے باہر آئے ہیں تو کیا کمایا؟ اپنے ساتھیوں کو حکومت کے سامنے بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔ یہ سیاست جو آپ لوگ کرتے ہیں، ظاہر ہے وہ تمہارے ساتھی اندر پاکستان میں نہیں کر سکتے، تو آپ لوگ تنہا ہو گئے۔'' مینگل کہتا ہے، ''ولی خان کو باہر رہنا چاہیے، اب وہاں پاکستان میں جمہوریت کی بات بھی نہیں کی جا سکتی۔ اب صرف آزادی کی سیاست کی بات ہو سکتی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ وہ یہاں رہے، میں ان سے اس سلسلے میں بات کروں گا۔''

ہم نے فرسٹ ستمبر کو پاکستان کے سفارت خانے کے باہر جو مظاہرہ کیا، تو اس میں ہم نے

صرف سندھیوں، بلوچوں اور پختونوں کی بات کی، کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ طارق علی کو مشکل نے گھیر لیا کہ وہ پنجابی ہے، وہ کیا کہے؟ تو اس نے فوج کو برا بھلا کہنا شروع کیا۔ طارق علی نے Can Pakistan Survive (کیا پاکستان جانبر ہو سکتا ہے) کے عنوان سے بہت اچھی کتاب لکھی ہے۔ پاکستان کی فوج اور پنجاب کا بہت اچھا تجزیہ کیا ہے۔

کلیم دل خان آمادہ ہے کہ پختون کے نام سے جدوجہد کرے۔ میں نے سندھیوں کو بھی تیار کیا ہوا ہے۔ پختون کے نام سے ولی خان سے بات ہونی چاہیے، اس ضمن میں میں ان سے ملنے والا ہوں۔"

میں نے سردار صاحب کو بتایا کہ ڈاکٹر نجیب آپ کے بیٹے جیسا ہے اور بالکل ہی ہماری طرح سوچ رکھتا ہے۔ البتہ وہ اکیلا نہیں، حالات اور بین الاقوامی دوستوں کو بھی خاطر میں لاتا ہے۔

ڈاکٹر فیروز احمد نے سردار صاحب کو بتایا کہ اجمل خٹک نے بیان دیا ہے کہ ہم ڈیورنڈ لائن کو تسلیم کرتے ہیں اور یہ بیان اس نے عام لوگوں کے سامنے دیا ہے، اس کو میں نے مسترد کر دیا۔

9 ستمبر کو صبح سویرے تیار ہوا، ظفر اقبال اور اصغر موسیٰ آئے تھے۔ اصغر نے ٹیکسی میں وکٹوریہ کوچ سٹیشن پہنچایا۔ ساڑھے آٹھ بجے کوچ روانہ ہوئی، ساڑھے دس بجے 'ڈوور' (Dover) پہنچ گیا اور پھر وہاں سے انگلش چینل کو بحری جہاز میں عبور کیا۔ سوا چھ بجے پیرس کوچ سٹیشن سٹالن گراڈ پہنچا۔ سات بجے کمیونسٹ پارٹی کو ٹائم دیا تھا، لیکن مجھے لینے کے لیے کوئی نہیں آیا۔ رات افغان سفارت خانے میں گزاری، ولی خان سے فون پر بات ہوئی۔

10 ستمبر ہفتے کے دن 'لی ہیومنتے' کے جشن کے علاقے کی جانب روانہ ہوا۔ عجیب بات یہ تھی کہ میں اور افغانستان کا نائب صدر فرانسیسی پارٹی کے ایک ممبر کی چھوٹی سی سیٹروین گاڑی میں سوار تھے، جبکہ ہماری حفاظت کے لیے پیچھے ایک لمبی شاندار گاڑی سیکورٹی گارڈ کی تھی۔ جشن کا علاقہ میلوں میں پھیلا ہوا تھا۔ فرانسیسی کمیونسٹ پارٹی، مزدوروں، کسانوں، عالمی کمیونسٹ تحریکوں، قومی اور انقلابی جمہوری تنظیموں، آزادی کی تحریکوں نے رنگا رنگ سٹال لگائے تھے۔ 11 بجے میٹنگ میں، کمیونسٹ پارٹی کے سیاسی دفتر کے رکن اور 'لی ہیومنتے' کے مدیر 'غولام لوغواں' نے تقریر کی اور اس جشن کا افتتاح ہوا۔ امید ہے کہ پارٹی اس جشن سے 6 ملین فرانک جمع کر لے گی۔

مجھے کمیونسٹ پارٹی نے پیرس ہوائی اڈے کے قریب BIS ہوٹل میں کمرہ دیا تھا۔ رات

گزار نے وہاں چلا گیا مگر دوسرے دن گل آقا صاحب نے مجبور کیا کہ ان کے ساتھ سفارتی اقامت گاہ میں رہوں۔

11 ستمبر، اتوار کو گل آقا کے ساتھ مہماندار کی کار میں جشن میں گئے۔ دوپہر کا کھانا ادھر ہی کھایا۔ چار بجے اس عالم میں، کہ کمیونسٹ پارٹی کا جنرل سیکرٹری 'جارج مارشے' خود بیٹھا ہوا تھا، پولٹ بیورو کے رکن اور مرکزی کمیٹی کے سیکرٹری نے خطاب کیا۔ سات بجے کمیونسٹ پارٹی کی دعوت میں برطانوی کمیونسٹ پارٹی کے مرکزی کمیٹی کے رکن اور مارننگ سٹار کے نامہ نگار کے ساتھ افغانستان کے مسئلہ پر گل آقا سے تیز و تند بحث ہوئی۔ (برطانوی کمیونسٹ پارٹی سوویت فوجوں کی افغانستان میں آمد کے خلاف تھی۔) وہاں 'لی ہیومنتے' کے ایک نمائندے سے ملاقات ہوئی، جو پاکستان جانا چاہتے تھے۔ اس طرح میں نے غولام لوغواں، گریمتیس، شارل نیگر اور ماکسیز سے بھی ملاقات کی۔ ایران کے حزب تودہ کے لیڈر ربابک سے ملا۔ انھوں نے درخواست کی کہ انھیں یہ مدد دوں کہ ان کے رفقا پاکستان میں ٹھہر سکیں اور انھیں پاسپورٹ مہیا کیے جائیں۔ اس طرح سفارت خانہ کی دعوت میں اسی پارٹی کے ایک اور لیڈر 'نظری' سے بھی ملاقات ہوئی۔

ڈاکٹر اکبر وردگ نے، جو پیرس کے مرکزی ہسپتال میں ڈاکٹر تھے، دعوت دی۔ وہ انقلاب کے مخالف اور ضیاء الحق کے حمایتی تھے۔ پھر چند دن ہم نے مختلف ریستورانوں میں دعوتیں اڑائیں۔ افغانوں نے گھروں میں مہمان کیا اور سیاحت کے ساتھ ساتھ فوٹوگرافی سے لطف اندوز ہوا۔

16 ستمبر: رات دس بجے پیرس سے روانہ ہوا اور 17 ستمبر صبح سات بجے لندن پہنچا۔ اسی دن سردار عطاء اللہ مینگل کو فون کیا اور ان کو کابل سے بھیجے گئے تحائف دیے۔ معلوم ہوا کہ سردار صاحب کابل جانے کے لیے بے تاب ہیں۔ مجھے کہا کہ معلوم ہوتا ہے، آپ (صوفی) سے ملنے کے بعد ولی خان میں بہت فرق آیا ہے۔ مجھے (سردار) کہتا ہے کہ سارے لوگ آپ کی طرف آرہے ہیں۔ یہ بھی کہتا ہے کہ ہم (ولی خان) پاکستان میں آپ لوگوں کی طرح باتیں نہیں کر سکتے۔ میں نے جواب میں کہا کہ مت کرو۔ مگر ہمارا بلوچوں، سندھیوں اور پختونوں کا باہمی کوآرڈینیشن ضروری ہے۔ مجھ سے کہا کہ ہم کنفیڈریشن کی بات کریں گے، اس پر میں نے جواب دیا، کہ مار پڑے گی۔ کنفیڈریشن تو خود مختار اور آزاد ملکوں کے درمیان رضا کارانہ طور پر ہوتا ہے۔ اس لیے آپ کو چاہیے کہ برابری (Parity) کی بات کریں، تا کہ سارے صوبے فوج، نوکر شاہی،

نمائندگیوں، فنڈز وغیرہ میں برابر کے حصہ دار ہوں۔

سردار صاحب نے مجھ سے خواہش کی کہ میں ولی خان کو سمجھاؤں کہ سندھی ویسے بھی پختونوں سے شاکی ہیں کہ وہ پنجابیوں کا ساتھ دیتے ہیں۔ اب اگر پختون خاموش رہ گئے تو ان کا شک یقین میں بدل جائے گا۔ پنجاب کسی قیمت پر برابری کے اصول کو تسلیم نہیں کرے گا۔ آپ لوگ پاکستان کے اندر عوام کو اس نام پر متحرک نہیں کر سکتے۔ البتہ میں (سردار) اپنی باتوں سے واپس نہیں پھر سکتا۔ کنفیڈریشن صرف بلوچستان، سندھ اور سرحد کا ہو سکتا ہے۔ پنجاب نہ صرف اس طرح کے منصوبے کی مخالفت کرے گا، بلکہ ہر ایسی کوشش کو خون میں ڈبو دے گا۔ سردار صاحب سے معلوم ہوا کہ ولی خان، سردار عطا اللہ مینگل، جام صادق علی، عبدالحفیظ پیرزادہ اور مصطفیٰ کھر وغیرہ اکٹھے لندن میں پریس کانفرنس کرنے والے ہیں۔

'لی مانڈ' نے مینگل صاحب کا انٹرویو شائع کیا ہے، جس میں وہ کہتے ہیں کہ مغرب اپنا آپشن کھلا رکھتا ہے۔ آزاد بلوچستان ایک کیمپ میں ہوگا، تو مغرب کے لیے اس کی کنفیڈریشن قابل قبول ہے۔ اس طرح وہ بائیں بازو اور انقلابی عناصر کو منع کر سکے گا۔ جام صادق علی اور پیرزادہ دونوں اچھے ہیں، وہ کنفیڈریشن کی بات کرتے ہیں، صرف بھٹو خاندان اپنے آپ کو پاکستان سمجھتا ہے۔

☆☆☆

عطاء اللہ مینگل نے اپنا بورھموڈ والا گھر جو 35 ہزار پونڈ میں خریدا تھا، 45 ہزار پونڈ میں بیچ دیا اور لندن کے مغربی علاقے 'ایلنگ' میں واقع دوسرا گھر جو 60 ہزار پونڈ میں خریدا تھا، وہاں دوبارہ منتقل ہو گئے۔ میں دوسری مرتبہ ان سے ملنے کے لیے وہاں گیا۔

میں انڈیا آفس لائبریری گیا اور فائلیں دیکھیں۔ لیکن ان کے مطالعہ کے لیے بہت زیادہ وقت درکار ہے۔

16 ستمبر کو قادر بخش نظامانی اور اس کے داماد اکبر بارکزئی سے ملاقات: وہ چاہتے تھے کہ بلوچی زبان میں شائع ہونے والا جریدہ 'سوب'، حقیقت انقلاب ثور اخبار، کابل نیو ٹائمز وغیرہ انہیں بھجوانے کا انتظام کروں۔ لندن میں معلوم ہوا کہ پیپلز پارٹی کا ایک گروپ غلام مصطفیٰ کھر کی قیادت میں، دوسرا حفیظ پیرزادہ اور جام صادق علی کی قیادت میں سندھی گروپ اور تیسرا پنجاب کالیفٹ قیوم بٹ اور سردار مظہر علی کے زیر قیادت کام کر رہا ہے۔

20 ستمبر کو ولی خان کو فون کیا۔ انھوں نے بتایا کہ حفیظ پیرزادہ نے کہا ہے کہ ہم سندھی، مینگل صاحب (بلوچ) اور تم (پختون) ایک مشترکہ پریس کانفرنس کریں گے۔ کھر نے کہا ہے کہ پنجاب کی طرف سے میں بولوں گا اور ولی خان کو پاکستان پر بات کرنی چاہیے۔

میں نے جنوبی افریقا کی کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر یوسف داؤد کی موت پر تعزیتی خط بھیجا۔

22 ستمبر: برمنگھم چلا گیا، دن ولی خان کے ساتھ گزارا۔ رات نارک فوک ہوٹل میں رہا، صبح پھر ولی خان کی طرف گیا۔

23 ستمبر: ولی خان نے پھر اپنی باتیں دہرائیں۔ انھوں نے کہا کہ جب تک آپ لوگ (افغانستان) کچھ نہ کریں، پاکستان باز آنے والا نہیں۔ اس پالیسی میں نقصان بھی ہے، لیکن بڑے مقصد کے حصول کے لیے اسے برداشت کرنا چاہیے۔ ہم مرکز کو چار محکمے دفاع، کرنسی، مواصلات اور خارجہ پالیسی دینا چاہتے ہیں، یہ بھی ایک قسم کی کنفیڈریشن ہے۔ اس کے علاوہ ہم پاکستان میں علیحدگی یا آزاد بلوچستان کے نعرے نہیں لگا سکتے۔ عطاء اللہ مینگل کی آزاد بلوچستان اور خیر بخش مری کے ملک سے باہر آنے نے ان کے حمایتی ساتھیوں کو اکیلا چھوڑ دیا۔

''بزنجو پر بی ایس او اور اسی طرح دوسرے لوگ بھی اعتماد نہیں کرتے (موصوف کی بزنجو کے ساتھ خاص رنجش ہے)، وہ مجبور ہے کہ پنجاب اور سندھ کی سیاست کرے یا کراچی میں اپنے اجلاس طلب کرے۔'

میں نے ولی خان کے سامنے اپنا تجزیہ رکھا: پی پی پی میں دائیں اور بائیں کی پھوٹ پڑنے والی ہے، پنجابی اور سندھی کی، ان تمام متضاد گروپوں کو ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع کرنا چاہیے۔ یہ تب ممکن ہے کہ آپ اس طرح جمہوری اتحاد یعنی نیپ کی طرح بنانے کے لیے کوشش کریں، تبھی لوگ اس اتحاد میں آئیں گے۔ مگر اس کے لیے ایک طریقہ کار طے کر لینا چاہیے، ولی خان نے یہ بات مان لی۔

سردار صاحب کی باتیں ولی خان سے کیں، جو انھوں نے سندھیوں کے حوالے سے کی تھیں، کہ وہ (پختون) بھی پنجاب کے ساتھ فوج، بیوروکریسی، ٹرانسپورٹ، سرمایہ وغیرہ میں شراکت کی وجہ سے ان کو لوٹتے ہیں۔ تو اگر پختون خاموش رہتے ہیں تو ان کا شک یقین میں بدل جائے گا۔ ولی خان نے جواب دیا کہ انھوں نے تو ہمیشہ کہا ہے کہ پختون ایک غاصب قوم ہے اور

یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے راستے پختونوں سے علیحدہ کیے۔ اب یہ کہتے ہیں کہ بلوچ اور سندھی فطری اتحادی ہیں۔ اب جو یہ پختونوں کی بات کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں آپ (افغانستان) کی ضرورت ہے۔ ولی خان نے ماسکو جانے کی خواہش کا اظہار کیا اور چاہتا ہے کہ روسیوں کے ساتھ تعلقات قائم کرے۔

رات کو افضل بنگش آ گئے۔ اشارے کنائے میں کہنے لگے، کہ میرے مہمان ہو جاؤ، اگر 'کوئی' اجازت دے۔ میں نے کہا، کہ میں خود مختار اور آزاد ہوں اور آپ کی دعوت بسر و چشم۔ ولی خان بول اٹھے کہ بنگش تم نے پھر اپنا حرامی پن شروع کر دیا؟ بنگش نے افراسیاب کے بارے میں پوچھا اور کہنے لگا، چھپاؤ مت، ولی خان نے کہا کہ اسے افغانستان میں اکبر خان کہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔

دوپہر کو ولی خان کے پاس پیرزادہ آنے والے تھے، مشترکہ پریس کانفرنس کے مسودے پر پیرزادہ اور کھر کا اتفاق نہ ہو سکا تھا۔ اب پیرزادہ دوسرا ڈرافٹ تیار کر کے لانے والے تھے، اس لیے میں بنگش صاحب کے ساتھ رخصت ہوا۔ دوپہر کا کھانا ڈاکٹر نواز بنگش کے گھر کھایا۔[۲۵] رات کا کھانا بھی ادھر تھا، کیونکہ خالد سعید اور راجا مجھے لینے بریڈفورڈ سے آئے تھے۔

بنگش صاحب نے خواہش کی کہ میں اپنے سسر اور ڈاکٹر نجیب سے یہ پوچھوں کہ اگر ہم سال میں ایک دو بار کابل آئیں اور اپنے ساتھیوں سے مل لیا کریں تو آپ کو کیا اعتراض ہے؟ ہم تو انقلاب کے لیے کام کر رہے ہیں اور آپ پر کوئی بوجھ بھی نہیں ڈالتے، صرف اجازت کے طلب گار ہیں۔ بنگش صاحب نے باتوں ہی باتوں میں میری معروضات کی تائید کی، کہ خلقی بہت بے وقوف اور احمق ہیں۔ میں نے اصرار کیا کہ ولی خان سے بنا کر رکھو اور اگر ایک اتفاق و اتحاد بنتا ہے تو آپ بھی اس میں شامل ہو جائیں۔ مجھ سے کہا کہ میرے ولی خان کے ساتھ تعلقات اچھے ہیں، میں اکثر انھیں ملنے جاتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اب بھی پختون نیشنلزم کے لیے ان کا کردار بہت بڑا ہے۔ بنگش صاحب نے ریفرنڈم (1947) کے موقع پر باچا خان کے کردار پر تنقید کی اور کہا کہ ان کا مؤقف دوٹوک نہ تھا۔ اس طرح ولی خان اور نیپ نے 1972ء میں صوبائی حکومت کے دوران زبان کے مسئلہ پر سب کچھ گنوا دیا اور پشتو کی جگہ اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا۔ مگر پھر بھی میں ان کے رول کی نفی نہیں کرتا۔

اجمل خٹک کے بارے میں بنگش صاحب نے کہا کہ انھوں نے ڈاکٹر فیروز احمد کو کہا تھا کہ ہم ڈیورنڈ لائن کو تسلیم کرتے ہیں اور بہت جلد واپس آ جائیں گے۔ لیکن افغان حکومت کس طرح ڈیورنڈ لائن مانتی ہے، جبکہ پاکستان کچھ بھی ماننے کو تیار نہیں۔ انقلاب کو بچانے کے لیے اگر ڈیورنڈ لائن مان لی جائے تو بری بات نہیں، مگر اس طرح بلا سبب ماننا خودکشی کے مترادف ہے۔ میں نے یقین دلایا کہ افغان حکومت نے کبھی یہ اظہار نہیں کیا کہ وہ ڈیورنڈ لائن تسلیم کرتے ہیں۔ اگر ضیاء الحق نے اس طرح کا تاثر دیا ہے تو وہ دوسری بات ہے۔ البتہ افغانستان رسمی مذاکرات میں اس پر کسی قسم کے سمجھوتے پر آمادہ نہیں۔ بنگش کی باتوں سے مترشح تھا کہ پی پی پی کے ساتھ قریبی رابطے میں ہیں اور وہاں پر ان کے بہت ساتھی ہیں اور موصوف کے لیے اب صرف یہی پلیٹ فارم باقی رہ گیا ہے۔

بنگش نے گلہ کیا کہ ولی خان پختونوں کو منظم کرنے کے لیے کوئی خاص کوشش نہیں کر رہے، ورنہ اس کام کے لیے مددگار ساتھی بہت موجود ہیں۔ پختونوں میں انقلاب ثور کے بعد اور بالخصوص روس کی آمد کے بعد بہت سے شکوک نے جنم لیا ہے، ولی خان انھیں دور کر سکتا ہے۔ میں نے موصوف (ولی خان) کی توجہ دلائی، تو بہانہ کیا کہ میرے پاس وقت نہیں، میں کتاب لکھ رہا ہوں۔ افغانستان کا سفارت خانہ فعال ہونا چاہیے، تاکہ ان پختونوں کے سر پر ہاتھ رکھے۔

23 ستمبر: رات ساڑھے دس بجے خالد سعید کے ساتھ بریڈفورڈ روانہ ہوا اور صبح ساڑھے بارہ بجے پہنچ گئے۔

24 ستمبر: خالد سعید کے گھر پی پی پی کے پرانے سیکرٹری جنرل ڈاکٹر غلام حسین کے ساتھ سویڈن میں فون پر گفتگو کی، آدمی کھرا معلوم ہوتا ہے۔

مجھے معلوم ہوا کہ جس وقت بھٹو صاحب جیل میں تھے، اس وقت ابوظہبی کے حکمران سلطان النہیان نے ڈیڑھ لاکھ پونڈ ان کی رہائی کی مہم چلانے کے لیے دیے، لیکن انھیں کھر ہڑپ کر گیا۔ الطاف عباسی کہہ رہا تھا کہ ٹیپو سلطان (عالمگیر) لیبیا کے وزیر سالم کو قتل کرے گا، یہ بات مرتضیٰ بھٹو کو سیٹھی (علی) نے بتائی تھی۔ قذافی کا خیال یہ تھا کہ شنواری کو عالمگیر نے نہیں مارا بلکہ کے جی بی نے مارا ہے، اس لیے عالمگیر کو بچانا چاہیے۔ لیکن مرتضیٰ نے تصدیق کی کہ شنواری کو عالمگیر نے مارا ہے۔ الطاف عباسی جون کے مہینے کی بات کر رہا تھا۔ انھوں نے کہا کہ رحمت اللہ انجم

نے لاہور میں آرمی بیرک پر حملہ کیا، 14 ستمبر کو گرفتار کیا گیا، اس کے ساتھ بم باندھ کر اڑا دیا گیا۔ مرحوم چودھری ظہور الٰہی کے قتل میں بھی ملوث تھا۔

میں نے بریڈفورڈ میں لیبر پارٹی کے مقامی لیڈر اور خالد سعید کے بھائی امین قریشی سے ملاقات کی۔ عمر خان اور دیگر پختونوں سے ملا اور روابط وسیع کرنے کے بارے میں فیصلے کیے۔ پی پی پی کی مقامی برانچ کے دفتر گیا اور ان کی میٹنگ میں شرکت کی۔ شام کو میاں نواز (گجرات)، سردار رحمان (کشمیری استاد)، سردار بوٹا (کشمیری) کے ساتھ رات کا کھانا ایک ریسٹورنٹ میں کھایا اور پاکستان اور افغانستان کے حالات پر بحث کی۔

26 ستمبر: واپس لندن چلا گیا۔

27 ستمبر: فارغ بخاری سے ملنے شیفرڈ بوش (Shepherd Bush) گیا، مگر وہ موجود نہیں تھے۔ دوسرے دن گیا، لٹریچر دیا اور کابل آنے کی دعوت دی۔ مگر انھوں نے کہا کہ ان کا بیٹا قمر عباس جب جیل سے چھوٹ کر ادھر آ جائے، تو پھر کابل جانے کا فیصلہ کروں گا۔

عارف کے گھر ان کے والد کی وفات کی تعزیت کے لیے گیا۔ عارف لندن میں افغانستان کے دوستوں کی انجمن کے سربراہ ہیں اور نجیم بیگ چغتائی اور اصغر موسیٰ کارکنان۔ معلوم ہوا کہ کلیم دل اور صفدر علی شاہ چاہتے ہیں کہ جلاوطنی میں پاکستان کی جلاوطن حکومت تشکیل دیں۔

☆☆☆

مرحوم داؤد خان کے زمانے میں لندن سے 'ڈیموکریٹک پاکستان' کے نام سے ایک میگزین چھپتا تھا، جس کے مدیر راولپنڈی سازش کیس میں ملوث ایک ملزم ریٹائرڈ ایئر کموڈور، ایم کے جنجوعہ تھے۔ وہ فوت ہو گئے تھے، میں مرحوم کی بیوہ سے تعزیت کرنے ان کے گھر گیا۔

30 ستمبر 1989: براستہ ڈوور اور اوسٹنڈ (Ostende) وکٹوریہ سٹیشن سے روانہ ہوا، رات ساڑھے سات بجے بون (مغربی جرمنی) پہنچ گیا۔ جاتے ہی افغان ناظم الامور سادات نے گانوں، فلموں، کلچرل پروگراموں، شرپسندوں کے مظالم کے بارے میں ریڈیو اور ویڈیو کیسٹوں کا مطالبہ کیا۔ کابل سے نشر ہونے والا 'وطن غگ' (صدائے وطن) ریڈیو نہیں سنا جاتا، صرف سردیوں میں سنا جا سکتا ہے۔ اسے قوی فریکوئنسی پر منتقل کیا جائے۔ میں نے سفارت خانے سے مسعود مرزا، انور باجا اور علی خان محسود سے فون پر بات چیت کی۔

معلوم ہوا کہ سرزمین کیمور نے اس جلسے میں شرکت کی تھی، جو روم میں اعلیٰ حضرت ظاہر شاہ کے مخالفین نے منعقد کیا تھا۔ گلبدین جب جرمنی گیا تھا تو کیموران کی ترجمانی پر مامور تھا اور اس طرح دس بارہ ہزار مارک بھی کمائے تھے۔

علی خان نے فون پر لمبی چوڑی باتیں کیں، کہہ رہا تھا کہ میں تبدیل نہیں ہوا، آپ لوگ ہی میرا نہیں پوچھتے۔ خط اس لیے نہیں بھیجتا کہ آتے وقت اجمل خٹک نے بتایا تھا کہ میں ناراض نہیں ہوتا، اگر کوئی مجھے خط نہ لکھے۔ ایک ہی سانس میں کہا، کہ ہم اب بھی سوویت یونین کی قیادت مانتے ہیں اور اس کے ساتھ اب بھی تعلقات رکھتے ہیں۔ سوویت سفارت خانے میں ایک سیکرٹری تھا جو اب ماسکو واپس گیا ہے، اس کے ساتھ رابطہ میں تھے۔ یہاں جرمنی میں جرمن کمیونسٹ پارٹی اور سوشل ڈیموکریٹک پارٹی سے تعلقات ہیں۔ افغان پارٹی پی ڈی پی اے سے اس لیے رابطہ نہیں رکھتے کہ وہ خود اختلافات کا شکار ہے، کوئی پرچمی ہے تو کوئی خلقی، البتہ ہماری سیاست ایک ہے۔ پختون ایس پی پی سے تعلق ہے، ایک لیاقت تھا، دیوانہ ہو گیا (لیاقت نے ثور انقلاب کی مخالفت کی تھی) اب ہالینڈ گیا ہے اور دوسرا کبیر لال ہے جسے پاکستان نے گرفتار اور قید کیا ہے۔ المبہ تو، لیاقت کا آرگن تھا۔ ہم (علی خان، شاہ جہان، اور قدوس مردانے) نے اسے کہا کہ اگر افغانستان اور سوویت یونین کے خلاف باتیں لکھتے ہو تو پھر ہم ساتھ نہیں ہیں۔ پھر کبیر لال نے دو شمارے پختون کے نکالے اور پتا نہیں اس پر کیوں میرا ایڈریس لکھ ڈالا، میں نے بتا دیا کہ میرا پتا نہ لکھیں۔ (عجیب آدمی ہے ایک ہی سانس میں اتنی متضاد باتیں کیں، ایک طرف کہتا ہے کہ ہم بے خبر ہیں اور لوگ ہمیں نہیں سمجھاتے اور دوسری طرف کہتا ہے کہ ہماری سیاست وہی پرانی سیاست ہے۔ ایک جانب کہتا ہے کہ اندھیرا ہے، اچھے اور برے کا پتا نہیں لگتا، اور دوسری جانب اوروں کو الزام دیتا ہے اور کی گئی بکواسیات پر مٹی ڈالتا ہے۔ مجھ سے کہا کہ آپ آ جائیں کہ ایک ساتھ فوٹو لے لیں)

4 اکتوبر: بون سے زلمے کے ساتھ گاڑی میں شٹوٹ گارڈ کی طرف روانہ ہوئے۔ فرینکفرٹ میں ہمایوں زلمے کے گھر دوپہر کا کھانا کھایا۔ ہمایوں زلمے وزارت مالیہ میں افسر تھا اور اب جرمنی میں مہاجر تھا اور ساتھ ہی اس کا برادر نسبتی امین سائل بھی رہ رہا تھا۔ امین روسیوں کے افغانستان میں آنے کے بعد علاج کے لیے آیا تھا، مگر رہ گیا۔ اسے کابل یاد آ رہا تھا اور اپنے آپ پر اسے غصہ آتا تھا۔ میں نے موصوف کی حوصلہ افزائی کی کہ پرواہ نہیں، واپس چلے جاؤ، ہم ذمہ داری

لیتے ہیں اور اگر جرمنی میں رہنا ہے تو رہو، مگر افغان سفارت خانے سے تعلقات رکھو۔ اگر ہو سکے تو فرینکفرٹ میں جبهه ملی پدر وطن (پدر وطن محاذ) کی ایک شاخ کھولو اور اس کے انچارج بن جاؤ، موصوف نے بات مان لی۔ اب یہ محاذ کے سیکرٹری غروال پر منحصر ہے کہ اس کے ساتھ رابطہ رکھے۔

رات ساڑھے نو بجے سرگردانی کے بعد شسٹوٹ گارڈ پہنچے۔ وہاں پر یوسف طوطا خیل کی رہائش پہ گئے۔ وہاں پر اکبر خان (میڈیکل سٹوڈنٹ) ڈاکٹر برہان الدین، صابر خان (خوست سے) اور انور باچا موجود تھے، وہ سب پشتو اور پختونوں کی محرومیوں کا رونا روتے تھے۔ لیکن میں نے انھیں انقلاب کی غرض و غایت بیان کی اور بتادیا کہ کوشش ہو رہی ہے کہ پشتو اور پشتونوں کے نام سے پشتونوں کو سوویت یونین سے لڑائیں، اس جال میں نہ پھنسیں۔

5 اکتوبر: یوسف لالہ اور جان محمد سے ملاقات: انور باچا کی رہائش سے نانٹگن چلے گئے۔ انور باچا کی جگہ پر دو پنجابی (جن کے نام میں بھول گیا) آدھمکے، غالباً گجرات سے تھے، انھوں نے جرمن حکام سے اپنے آپ کو نیپ، ولی خان اور باچا خان کے نمائندوں کی حیثیت سے تعارف کرایا تھا، لیکن انھیں یہ تک معلوم نہ تھا کہ ولی خان باچا خان کا باپ ہے یا بیٹا! چونکہ وہ پناہ مانگنے والوں کی نیپ سے تعلق کا تصدیق نامہ دیتے تھے کہ پرانے نیپ کے کارکن ہیں اور پاکستان میں زیر عتاب ہیں، تو ایسی ہر تصدیق کے بدلے ہزار ہزار مارک لیتے تھے۔ انھوں نے بلاتاخیر میرے ساتھ تصاویر کھنچوائیں، انور باچا بہت ہنسا اور مجھ سے کہنے لگا کہ سمجھ رہے ہو نا کہ کیا ہو رہا ہے؟ یہی تصاویر پھر جرمن پولیس کو دکھائیں گے کہ دیکھیں ہمارا لیڈر آیا ہوا تھا۔

جان اور یوسف سے نیپ کے دوبارہ اعادے کے بارے میں بات چیت ہوئی۔ پختونوں کو چاہیے کہ فعال ہو جائیں، البتہ پاکستان کے پختون افغانوں سے جدا نیپ کے دائرہ کار میں رہیں اور افغانوں سے دوستی رکھیں۔

6 اکتوبر: رازق اور سلیم شمس سے بات چیت ہوئی، معلوم ہوا کہ 28-27 اگست کو نذیر عباسی کی برسی کے موقع پر جو کانفرنس اور پریس بریفنگ ہوئی تھی، جس میں پیپلز پارٹی اور مزدور کسان پارٹیوں نے بھی شرکت کی تھی، وہاں ساتھیوں کے بیچ خصوصاً تمکین جعفری، مطیع الحسن عابدی اور ڈاکٹر فدا حسین کے درمیان مخاصمت اور رقابت رہی۔ اس طرح کے تنازعات وحید جمالی، محمد نصیر باجوہ اور محمد رفیق کے درمیان بھی ہیں اور ان کا پی این پی سے تعلق ہے، شیر محمد اور سلیم شمس

کے بیچ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے پیسوں کے حوالے سے تنازعات چل رہے تھے۔ پختون سوسائٹی کا کام رازق کے حوالے کیا گیا اور انھیں بتایا گیا کہ باچا خان اور ولی خان ہمارے مشران ہیں۔ ہمیں ان کی سامراج دشمن سیاست کو آگے لے کر چلنا چاہیے، پختونوں کو افغان انقلاب کی حمایت اور پاکستان میں جمہوریت کے لیے آمادہ کریں اور بین الاقوامی سوشلسٹ نظام کی تائید میں متحرک کریں۔ خطہ میں انقلاب ثور ہماری آرزوؤں کا سرچشمہ ہے۔ رازق سے پختونوں کے پتے مانگے۔

8 اکتوبر: سرفراز سے گفتگو ہوئی، انھوں نے کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے 'کامریڈ' اور دیگر مواد کا تقاضا کیا، یہ ملاقات فرینکفرٹ میں تھی۔ وہ تمکین جعفری سے بے زار تھا اور مفصل رپورٹ سنا رہا تھا۔ ڈاکٹر فیروز احمد کہتے ہیں کہ کمیونسٹ پارٹی، پاکستان میں نہیں، صرف بیرون ملک ہے، جس کا تمکین رکن تھا، مگر شاہد حسن ایک ڈرامہ ہے۔ تمکین کو تین سال پہلے افضل بنگش نے بلایا تھا اور وہاں پر اس نے خوشامد بھری تقریر کی تھی۔

وارثی: تمکین تو نیپ میں نہیں آنا چاہتا مگر میں نے کہا کہ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے رکن بن جاؤ تو خود بخود نیپ جائن کر لو گے اور اسی طرح ہوا۔ ہم تو جھک مار مار کر تھک گئے، تب جا کر کہیں رکن بنے، مگر تمکین کو اتنی جلدی رکنیت مل گئی۔ محمد دین سے کہا کہ پی این پی میں کیا کرتے ہو، کمیونسٹ پارٹی میں آجاؤ۔ مزدور کسان پارٹی فعال ہے، پی این پی فعال ہے تو تمکین مجبور ہو کر پی این پی میں شامل ہو گیا۔ پی این پی کے بارے میں رپورٹ دی اور تنظیم و تشکیل کے بارے میں رپورٹ دی۔

شیر محمد سے 'چنگاری' کے بارے میں بات ہوئی اور ہدایت کی کہ اپنا قاعدہ وسیع کرے اور این ڈی پی کے لیے بھی گنجائش چھوڑے۔ ابھی تک مغربی جرمنی میں کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان نے کوئی میٹنگ نہیں کی بغیر رؤف وارثی کے جس میں صرف تمکین، انور اور سلیم رضا موجود تھے۔ عباس نہیں جاسکے اور اقبال وارثی تھے نہیں۔ شیر محمد کہتے ہیں کہ ہم تمکین کے ساتھ نہیں چل سکتے، برلن کی شاخ کو جدا کر دیا جائے۔ دوسری طرف سلیم شمس اور رازق سلیم رضا پر تنقید کرتے ہیں اور شیر محمد، تمکین پر، عجیب صورت حال ہے۔

میں نے دوٹوک انداز میں کہا کہ تمھیں سیل میں رہنا ہے اور تمکین آپ لوگوں کا سیکرٹری

ہے۔ میں (صوفی) اس پوزیشن میں نہیں کہ فیصلہ کروں، جب تک آپ لوگ آمنے سامنے ایک میٹنگ میں موجود نہ ہوں۔ شیر محمد جرمن کمیونسٹ پارٹی کا گروپ ممبر ہے اور نوجوانوں کا سیکرٹری بھی ہے۔ کہتے ہیں کہ تمکین کے ساتھ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان میں نہیں چل سکتے تو پی این پی بھی نہیں چل سکتی۔ ہم تمکین کے مشورے کے بغیر پمفلٹ اور اشتہارات چھاپتے ہیں، ہمارے کام پی این پی کے حوالے سے چلتے ہیں، نہ کہ کمیونسٹ پارٹی پاکستان کے حوالے سے۔ دیگر ساتھیوں سے بھی ملا اور سب نے مدد چاہی اور ایک دوسرے کی شکایات کرتے رہے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ جو مشکلات آپ لوگ خود اپنے بیچ مل کر نہیں حل کر سکتے تو انھیں آپ (سرفراز) اور تمکین ہمیں کابل بھجوائیں گے، پھر پارٹی فیصلہ کرے گی کہ کیا کیا جائے۔

محمود شہباز (افغان) کے ساتھ دوائیوں کے بارے میں بات چیت کی۔ وہ دوائیاں جمع کرے گا اور کابل پہنچانے کا کام ہم کریں گے۔

13 اکتوبر: عباس سے فون پر بات چیت، ان کے گِلے اور میری طرف سے نہ جانے کی معذرت۔ وہ بھی کہتے ہیں کہ تمکین کام نہیں کرتا۔ جب سید اختیار ادھر تھا تو کام ہو رہا تھا، اب ان کے جانے کے بعد کچھ نہیں ہو رہا۔ سادات کو پی ڈی پی اے میں شمولیت کی درخواست بھیجی تھی، جو اس نے نہیں مانی، اس بنا پر اس سے ناراض تھا۔

ایک بات جو مجھے سفر کے دوران معلوم ہوئی، وہ یہ ہے کہ افغان سفارت خانوں میں کوئی سے دو آدمیوں کا مزاج بھی آپس میں نہیں ملتا، سب ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچتے رہتے ہیں اور سارا وقت اسی کھینچا تانی میں ضائع ہوتا ہے۔ سفارت کے ناظم الامور عنایت سادات کے بھائی محمود شہباز کو شکایت تھی کہ مجھے 1800 مارک تنخواہ کے بہانے لایا گیا اور اب 400 مارک دیے جا رہے ہیں۔ ڈیڑھ سال کا عرصہ ہو گیا اور سفارتی عملہ پیسے اپنے اپنے دھڑے کو بھیجتے ہیں۔

15 اکتوبر: بون سے مشرقی برلن پہنچا اور پھر وہاں سے مغربی برلن گیا۔ شفیع (سفیر) کے ساتھ کھانا کھایا، پھر دس بجے مغربی برلن تمکین کے ہاں پہنچا۔ وہاں پر انور صدیقی، وقار اور انعام بھی تھے، بحث مباحثہ کیا، پی این پی پر بات ہوئی۔ کہتے ہیں کہ شیر محمد سب فیصلے خود کرتا ہے اور کسی سے مشورہ نہیں کرتا۔ اپنے فیصلوں پر دوسروں کو عمل کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ 'چنگاری' کا کام زیادہ تر عباس کرتا ہے، ایڈیٹوریل اور دوسرے مطالب وہ لکھتا ہے، شیر محمد بیکار لاف زنی کرتا ہے کہ میں

ہی اسے چلاتا ہوں۔ چنگاری کا زیادہ کام ماسکو سے ہوتا ہے۔ جرمنی، ہالینڈ اور دیگر یورپ کے بارے میں بحث ہوئی۔ مختلف سیاسی کرداروں اور سرگرمیوں کے بارے میں سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ میں نے ان کے ذمہ لگایا کہ تمام ساتھی اکٹھے ہو کر میٹنگ کریں، بحث مباحثہ کریں، اور اختلافی باتیں پارٹی کو روانہ کریں، پھر آخری فیصلہ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کا ہوگا۔ مغربی برلن کا تفصیلی دورہ بھی کیا۔

18 اکتوبر: دوپہر مغربی برلن سے دارالخلافہ مشرقی برلن پہنچا۔ جب سفارت خانے پہنچا تو معلوم ہوا کہ سفارت خانے میں کوئی نہیں۔ سارا عملہ کمیونسٹ ممالک کی اقتصادی کونسل (COMECON) کی میٹنگ میں شرکت کے لیے گیا ہوا ہے۔ میں نے اپنا بکس، جس میں میرا اوورکوٹ، ڈائریاں اور فون نمبر تھے، سفارت خانے میں رکھا۔ یہی سوچا کہ جلد لوٹ آؤں گا یا دوسرے لوگ آ جائیں گے، یوں میں مشرقی برلن کے مرکز 'الیکزرانڈر پلاتس' گھومنے نکل گیا۔ تین بجے سفارت خانے فون کیا، مگر کوئی موجود نہ تھا۔ اس طرح بار بار تین وقفوں کے بعد فون پر فون کرتا رہا، کوئی نہ مل سکا۔ مجھے صرف سفارت خانے کا فون نمبر یاد تھا اور زمان (فرسٹ سیکرٹری) کا فون نمبر بھی میرے حافظے میں تھا۔ دونوں ہی نمبروں سے جواب موصول نہیں ہو رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ زمان قطب یار اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ تھا، مگر وہ جھوٹ بول رہی تھی۔ مجبوراً کانفرنس کی جگہ ہوٹل شٹاڈ برلن چلا گیا۔ سیکیورٹی بہت سخت تھی۔ پہلے تو اندر جانے کی اجازت نہیں دے رہے تھے، کافی تگ و دو کے بعد اندر جانے میں کامیاب ہوا۔ انتظار کرتا رہا، سیکیورٹی والوں نے کہا کہ کانفرنس جاری ہے، پانچ بجے آنا۔ میں چونکہ مغرب سے گیا تھا، اس لیے مجھ پر شک ہو سکتا تھا۔ میں پر جوش اس بات پر تھا کہ کابل سے میرا دوست ڈپٹی فارن منسٹر سرور یورش کانفرنس میں شرکت کے لیے آیا تھا، پانچ بجے پھر ہوٹل آیا اور چٹ لکھ کر بھیجی۔ کوئی نہ آیا۔ دو گھنٹے بعد پھر فون ملانے کا سلسلہ جاری کیا۔ یہ سب فون میں سڑک کنارے نصب فون بوتھ سے کرتا تھا۔ مجبوری یہی تھی کہ دو ہی نمبر حافظے میں رہ گئے تھے اور وہی ملا سکتا تھا۔ زمان نہیں مل رہا تھا اور اس کی گرل فرینڈ کو پوری طرح انگریزی نہیں آتی تھی۔ ناچار پھر ہوٹل گیا، پھر بھی کسی نے نہ پوچھا۔ سفیر دیگر سفارت کاروں کے ساتھ پوش ایریا پاسکو میں رہتا تھا، لیکن اس کے گھر کا فون اور پتا معلوم نہ تھا۔ توکل کر کے روانہ ہوا اور پولیس سے پوچھتے پوچھتے آخر کار تھانے چلا گیا۔ انھوں نے بھی شفیع کے

گھر کا پتا یا فون نمبر نہ دیا۔ مغربی جرمنی میں زلمے کا نمبر یاد تھا، اسے فون پر فون ملاتا رہا لیکن وہ بھی نہیں تھا۔

آخر ساڑھے گیارہ بجنے میں دو منٹ باقی تھے اور مغربی اور مشرقی برلن کے درمیان آخری انڈر گراؤنڈ ٹرین (U-Bahn) چلنے والی تھی، اس میں سوار ہوا۔ [کمیونسٹ ممالک میں بغیر تعارفی خط کے ہوٹل میں قیام ممکن نہ تھا] اس وقت نہ میرے پاس پاسپورٹ تھا نہ کوئی اور اسناد۔ سب کچھ بکس میں بند تھا البتہ جیب میں کچھ ڈالر تھے۔ مغربی برلن آیا۔ تمکین کا ایڈریس بھی نہیں تھا، بس اتنا معلوم تھا کہ گوئیز ویلی سڑک پر 127 نمبر پر ہے۔ ریلوے سٹیشن پر کسی سے پوچھا تو اس نے غلط راہنمائی کی اور مجھے 'گورزویلتس' (Gorzviltz) سٹیشن بتا دیا، جبکہ یہ آخری ٹرین تھی۔ وہاں پہنچ کر اندازہ ہوگیا کہ غلط جگہ آ گیا ہوں۔ ادھر ادھر گھوم پھر کر ڈیڑھ بجے ایک ترکی ریسٹورنٹ گیا۔ ڈالر دے کر روٹی کھائی، تین بجے تک وہیں بیٹھا رہا۔ وہ ریسٹورنٹ بند کر رہے تھے تو مجبوراً نکل آیا، تاکہ مرکزی سٹیشن 'سو' (Zoo) پہنچ جاؤں۔ سردی کے مارے ٹھٹھر کر رہ گیا، جلدی جلدی لبنانی بار میں داخل ہوا اور چند گھونٹ پی کر سردی سے چھٹکارا حاصل کیا۔ سوا چار بجے تک بار میں تھا، پھر اوباہن سٹیشن آیا اور پہلی ٹرین پکڑ کر سو پہنچ گیا۔ وہاں پر کافی وغیرہ پی اور پھر نکل پڑا۔ بڑی دیر بعد جب دفتروں کا ٹائم ہوا، تو زمان کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہوا اور اس طرح مغربی برلن سے مشرقی برلن میں سفارت خانے تک ساری رات جاگ کر گزارنے کے بعد پہنچا اور اسے سارا قصہ غم سنایا۔ جب شفیع (سفیر) آئے تو گاڑی میں بٹھا کر اپنے گھر لے گئے اور میں وہاں پہنچتے ہی بستر پر دراز ہوگیا۔ اس طرح سویا کہ میرے دوست سرور یورش، جو اسی گھر میں مہمان تھے، ان سے ملنے کے لیے بھی نہیں جگایا گیا اور نہ انھیں میرے بارے میں بتایا گیا۔

22 اکتوبر: پونے دس بجے (برلن ٹائم) برلن سے جہاز میں روانہ ہوا اور ماسکو کے وقت کے مطابق ڈھائی بجے 'شریمتوا' ہوائی اڈے پر اتر گیا۔ وہاں کے سفیر حبیب منگل نے گاڑی بھجوائی تھی۔ موصوف کے گھر گیا، وہاں بہت بھیڑ تھی، اس لیے گورکی سٹریٹ پر واقع سنتر النایا گاتسنیتسا (مرکزی ہوٹل) میں ٹھہرا۔ میرا سیدھا کابل جانے کا ارادہ تھا، مگر سفیر نے کہا کہ انھوں نے محمود بریالے سے بات کی ہے اور ان کا مشورہ یہ تھا کہ جب میں (صوفی) یورپ سے واپس آجاؤں تو وہاں پر افغان پاسپورٹ کے ذریعے پختون اور بلوچ طلبہ جنھیں سوویت یونین

بھجوایا گیا تھا، ان کی تنظیم و ترتیب کے لیے اقدامات کروں۔ یوں مجبوراً مجھے ماسکو رکنا پڑا۔

یہ سٹوڈنٹس زیادہ تر پختون سٹوڈنٹس فیڈریشن اور ڈیموکریٹک سٹوڈنٹس فیڈریشن سے این ڈی پی اور پی این پی کے تعلق سے بھجوائے گئے تھے۔ ان کے علاوہ کوئٹہ سے پختونخوا ملی عوامی پارٹی اور بلوچ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن سے متعلق کچھ طلبا بھی بھیجے گئے تھے۔ تین چار کشمیری طلبہ بھی آئے تھے۔ ان مختلف الخیال طلبہ کو ایک تنظیم میں اکٹھا کرنا تھا اور ان کے مسائل حل کرنے تھے، اکثر کا مضامین میں تبدیلی کا مسئلہ تھا۔ بعض طلبہ جس فیکلٹی میں آئے تھے، انھیں اس میں داخلہ نہیں دیا گیا، دسویں پاس کو یونیورسٹی بھیج دیا گیا اور بارہویں پاس کو تخنیکوم دیے گئے۔ کوئی میڈیکل چاہتا تھا تو کوئی آرٹس کے طالب علم کو میڈیکل بھیج دیا گیا تھا۔ بعض یہاں تنگ آ چکے تھے اور واپس جانا چاہتے تھے، بعض پر الزام تھا کہ دراصل جمعیت یا مخالف پارٹیوں کے ہیں اور پی ایس ایف کے لبادے میں آئے ہیں۔ لہٰذا ان سارے مسائل کے حل کے لیے حکومت افغانستان نے مجھے ذمہ داری سونپی کہ ان کو باقاعدہ ایک تنظیم میں اکٹھا کروں اور ایک ہی ڈسپلن کا تابع کروں۔ افغان ہمارے طلبہ اور ہمارے طلبہ افغانوں کے مسائل اور نزاکتوں سے بے بہرہ تھے۔

میں ڈی ایس ایف اور پی ایس ایف کے لڑکوں سے علیحدہ علیحدہ ملا۔ ڈی ایس ایف والوں کی ساری شکایات شاہد حسن سے تھیں۔ شاہد حسن بہت تیز تھا، وہ کمیونسٹ پارٹی کے لیڈروں سے خوشامد کی مدد سے اچھے تعلقات رکھنے میں ماہر تھا اور پھر اسی بنیاد پر اوروں پر رعب گانٹھتا تھا اور کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے تعلقات، مراعات اور شناخت پر اپنا اجارہ قائم کیے ہوئے تھا۔ ماسکو پارٹی کمیٹی میں سخت اختلافات تھے، بلکہ تمام سوویت یونین کی تنظیم میں افراتفری تھی۔ الزام ہی الزام تھے، جو ایک دوسرے پہ لگائے ہی جا رہے تھے۔ وہ سب پاکستان سٹوڈنٹس یونین میں بھی اکٹھے تھے، مگر افغانستان سے افغان پاسپورٹ پر گئے طلبہ ان کی یونین میں شامل نہیں ہو سکتے تھے۔

25 اکتوبر: میں کمیونسٹ پارٹی کے اکتوبر ہوٹل منتقل ہوگیا، جو معتبر مہمانوں کے لیے مخصوص تھا۔ ایک دن پہلے میں نے مرکزی کمیٹی میں پاکستان کے شعبہ سے متعلق کارندے پراوالوف سے مفصل باتیں کیں اور سفر کی غرض و غایت بیان کی۔ میں نے وضاحت سے بتایا کہ ایم آر ڈی کی جاری تحریک کچلے جانے والی ہے، اس کے لیے متبادل پروگرام بنانا چاہیے۔ پختونوں، بلوچوں اور سندھیوں کی قومی تحریکوں کو پاکستان کے عمومی جمہوری تحریک سے جوڑنے کے لیے اقدامات

کرنے چاہییں اوراس کے لیے پروپیگنڈے کی ضرورت ہے۔

ہم افغان پاسپورٹ پر گئے طلبہ سے ملنے مختلف شہروں کو گئے۔ 29 اکتوبر کو 'زاپاروژا'، 31 اکتوبر کو 'روستوف نادنو' اوراس طرح بعد میں 'کیف' (یوکرائن) خارکوف (یوکرائن) اور لینن گراڈ ملنے گئے۔ سب کو افغان سفارت خانے کے ہال میں جمع کیا۔ ان کے لیے سوویت یونین میں زندگی گزارنے اور روزمرہ کے کام نمٹانے کے لیے رہنما اصول طے کیے اور ایک تنظیم بنائی گئی۔ میں مختصراً ان مسائل پر روشنی ڈالتا ہوں جن سے مجھے اس دورے میں واقفیت حاصل ہوئی:

خیال اکبر آفریدی کا بھائی ذبیح اللہ اور پاؤس خان آفریدی کا بھتیجا سرفراز گھر واپس جانے کے درپے ہیں۔ زاپاروژا میں رشید خان ولد گلبدین کو میڈیکل میں داخلہ ملا تھا، حالانکہ وہ آرٹس کا سٹوڈنٹ تھا، وہ لاء میں داخلہ لینا چاہتا تھا۔ نوراعظم ولد حاجی امیرزادہ خان کو دندان تخنیکوم دی گئی حالانکہ وہ میڈیکل جانا چاہتا تھا، اس طرح سائنس کے طلبہ کو آرٹس بھیج دیا گیا تھا۔ روستوف نادنو میں محمد نعیم ولی مومن خان کو تخنیکوم میں داخلہ ملا تھا، حالانکہ وہ ایف ایس سی پری میڈیکل پڑھا ہوا تھا۔ یہی معاملہ مختار گل ولد بختیار اور محمد ریاض ولد پیاؤ خان کا بھی تھا، وہ میڈیکل جانا چاہتے تھے۔ بعض مسائل مقامی طور پر حل کرنے تھے اور بعض کے لیے وزارت اعلیٰ تعلیم اور وزارت خارجہ سے رابطہ ضروری تھا۔ ویزے کے مسائل بھی شدید تھے، ان طلبہ کے پاس افغان پاسپورٹ تھے، جن پر صرف سوویت یونین اور کابل کا سفر ہی ممکن تھا۔ بعض گرمیوں کی چھٹیاں یورپ میں گزارنے کے خواہاں تھے۔ جو کابل آتے، وہ قانوناً پاکستان نہیں جاسکتے تھے اور راستے سارے افغان مجاہدین کے قبضے میں تھے۔ ان کی بودوباش اور جیب خرچ ہمارے ذمہ ہوتا تھا، جو ہماری استطاعت سے باہر تھا۔ بعضوں نے شادیاں کی تھیں اور بعض شادی کرنا چاہتے تھے۔ رسمی طور پر شادی کی کسی کو اجازت نہ تھی، لیکن اس فطری ضرورت کا راستہ بھلا کون سا قانون روک سکتا ہے؟ شادی کے لیے متعلقہ خاندانوں اور خاص کر والدین کی رضامندی ضروری تھی۔ بعض روسی بیویاں اپنے شوہروں کے ساتھ پاکستان آنا چاہتی تھیں۔ افغان پاسپورٹ پر خود ان کے شوہران نامدار پاکستان نہیں آسکتے تھے، چہ جائیکہ ان کی نئی نویلی اور چہیتی روسی بیویاں!

کمیونسٹ پارٹی کے تمام رفقاء افراتفری کا شکار تھے۔ سید مختار باچا کے بھائی مصطفیٰ باچا نے پارٹی سے استعفیٰ دیا تھا، پیر ریاض جو خود افغان پاسپورٹ پر گیا تھا اور ان طلبہ کا انچارج تھا،

ان سے بہت سی شکایات تھیں۔ بعض شاہد حسن کو تنقید کا نشانہ بناتے تھے، جس نے چار لڑکوں کی اسناد گم کردی تھیں۔ عارف علی خان نے تو گویا ماسکو ٹھیکے پر لیا ہوا تھا اور شاہد سے بھی پرانا تھا، انھوں نے بھی شکایات کیں، ایک لمبی داستان تھی۔ اگرچہ عارف کے لیے نوجوانوں میں اتنی زیادہ حساسیت نہیں تھی، جتنا کہ شاہد حسن کی وجہ سے پریشان تھے۔ عارف نرم خو اور شریف النفس انسان تھا، البتہ پارٹی کے کاموں میں اتنا سرگرم نہیں تھا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ بظاہر مینڈیٹ شاہد کے پاس تھا اور سارے خارجی امور وہ چلا رہے تھے۔ میں نے تجویز دی کہ جب یورپ میں کوئی کانفرنس یا میٹنگ ہو تو ماسکو یا دوسرے سوشلسٹ ملکوں سے ہمارے ساتھی ان میں شرکت نہ کریں۔

میں نے ماسکو میں سوویت اعلیٰ تعلیم کی وزارت میں سکالرشپ کے ذمہ داران مثلاً کاملوف وغیرہ سے ملاقاتیں کیں اور یہ تمام مشکلات اور مسائل ان کے سامنے رکھے، ان کے حل کے لیے انھوں نے حامی بھری۔ بعض مسائل فوری طور پر حل کیے جاسکتے تھے، البتہ آمدورفت سے متعلق مسائل اس وقت حل ہوئے، جب 1987ء میں میں ماسکو گیا اور سب کو اپنی طرف سے پاکستانی پاسپورٹ وصول کرنے کی اجازت دی۔ ایسا ہو بھی گیا، اور اس پر میرے خلاف بہت سے لوگوں نے پروپیگنڈا بھی کیا۔ لیکن اس معاملے پر میں نے پہلے سے ہی ڈاکٹر نجیب سے بات کی تھی اور وہ راضی تھا۔

میں نومبر 1983ء کو ماسکو سے کابل واپس آیا۔ یہاں پر ایک دلچسپ بات ریکارڈ کا حصہ بنانا چاہتا ہوں۔ میں تمام مغربی یورپ گھوما لیکن اپنے لیے اور اپنے خاندان کے لیے کچھ نہیں خریدا، وجہ یہ تھی کہ مجھے کئی جگہ گھومنا تھا اور میں اپنا سفر ہلکا پھلکا رکھنا چاہتا تھا۔ یہ طے کیا تھا کہ سارا سودا سلف، سفر کے اختتام پر آخری شہر، ماسکو میں کرلوں گا۔ مجھے واشنگ مشین کی ضرورت تھی، سارا ماسکو چھان مارا، صرف ایک آٹومیٹک مشین دریافت کرسکا لیکن اسکا وزن 95 کلوگرام تھا۔ اسے طیارے میں لے جانے کا خرچ بہت زیادہ تھا۔ اپنے لیے شرٹس خریدنا چاہیں تو تمام ماسکو میں جہاں گیا بہت گہرے رنگ کی ملیں۔ آخر کار مرکزی کمیٹی کی مخصوص دوکان، جہاں غیر ملکی مہمانوں کے لیے باہر کی اشیاء سستے داموں ملتی ہیں، گیا۔ اس دوکان پر خود روسی ترجمان اور مرکزی کمیٹی کے کارندے مہمانوں کے نام پر اپنے لیے اور اپنے دوستوں کے لیے خریداری کو بے تاب رہتے تھے۔ یہاں خریداری روبل پر ممکن تھی اور بلیک مارکیٹ میں ڈالر کے مقابلے میں روبل بہت سستا ملتا تھا (اگرچہ سرکاری طور پر روبل ڈالر سے مہنگا تھا) یوں یہاں خریداری بہت سستی پڑتی تھی۔ اس

لیے میں جب بھی جاتا، سوویت دوست مجھے گھیر گھار کر اس سٹور پر ضرور لے جاتے۔ میں وہاں گیا لیکن میرے سائز کی ایک بھی قمیص نہ مل سکی، سوائے پاکستانی تابانی گروپ کی بنائی گئی قمیصوں کے۔ یوں میں نے ماسکو میں پاکستانی قمیص غنیمت جان کر خریدی اور گھر کے لیے دیگر خریداری بھی کی۔ سوشلسٹ روس میں روزمرہ کی چیزیں بنانے والی چھوٹی صنعتوں کا بہت برا حال اور معیار تھا۔

لندن میں جن دوستوں سے ملا، ان کو سفارت خانے سے اور ڈاکٹر نجیب سے متعارف کروایا۔ لندن میں ناظم الامور، جس کے بارے میں پہلے ہی میں پیش گوئی کر چکا تھا کہ یہ بھاگے گا، جب اسے تبدیل کیا گیا، تو اس نے لندن میں سیاسی پناہ لے لی۔ اس کی جگہ دوسرا آدمی گیا تو اسے بھی اپنے دوستوں سے متعارف کرایا اور وہ ان کے لیے کابل سے تحائف لے کر گیا۔ پھر جب نجیب کا سالا سرور سفارت خانے میں فرسٹ سیکرٹری اور پھر ناظم الامور بنا تو اسے بھی پاکستانی دوستوں کے نام پتے دیے، جن میں افضل بنگش کے داماد نواز بنگش کا نام بھی شامل تھا۔ وہ ڈاکٹر نواز بنگش کے لیے تحائف لے کر گیا۔ نواز بنگش کی فیملی نے پھر نجیب کی فیملی سے اتنے قریبی تعلقات استوار کیے کہ بیچ میں مجھے بھی بھلا دیا۔ نجیب کی شہادت کے بعد بھی وہ تعلقات قائم رہے، حتیٰ کہ نجیب کی ایک بیٹی نواز کے بیٹے سے بیاہی گئی۔ افسوس کہ یہ شادی زیادہ دیر نہ چل سکی اور جدائی پر اختتام پذیر ہوئی۔

عدن کا سفر

4 مارچ 1985ء کو میں اور امام علی نازش ایروفلوٹ کے ذریعے کابل ایئرپورٹ سے روانہ ہوئے اور اسی دن ماسکو کے 'شریمتوا' ہوائی اڈے پر اتر گئے۔ ماسکو میں پارٹی ہوٹل میں قیام کیا۔

چھ مارچ کو 2:50 پر عدن کی طرف روانہ ہونا تھا، مگر ٹکٹ میں گڑبڑ کی وجہ سے ہم شام کو آٹھ بجے روانہ ہوئے۔ پونے دو گھنٹے پرواز کے بعد طیارہ ایک گھنٹے کے معمول کے وقفے کے لیے سینتاروپل ایئرپورٹ پر اتر گیا، تاہم طیارے میں فنی خرابی کی وجہ سے وہاں ہم سوا دو گھنٹے رکے اور اس کے بعد قاہرہ کی جانب سفر شروع ہوا۔ ماسکو کے وقت کے مطابق ہم چار بجے قاہرہ پہنچے۔ طیارے سے اترنے کی اجازت نہ تھی، اس لیے ایک گھنٹہ بیٹھے بیٹھے انتظار کیا اور پھر عدن روانہ ہوئے۔ صبح سوا آٹھ بجے عدن ایئرپورٹ پر اترے۔ ہمیں اتار کر طیارہ نیروبی کی طرف روانہ ہوا جہاں سے اسے مڈغاسکر جانا تھا۔

ہوائی اڈے پر شہری پارٹی کے سیکرٹری احمد ناصر اور پارٹی کے بین الاقوامی امور میں ایشیا افریقا اور لاطینی امریکا کے انچارج علوی نے ہمارا استقبال کیا۔ ہمیں وہاں سے سمندر کنارے 'معاشیق' نامی جگہ ایک گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا گیا۔ چند منٹ کے رسمی جملوں کے بعد احمد ناصر ہم سے رخصت ہو گئے۔

نازش تھک چکے تھے، اس لیے ہم آرام کرنے اپنے اپنے کمرے چل دیے۔ علوی سے معلوم ہوا تھا کہ آج یعنی 7 مارچ کو کوئی پروگرام نہیں اور کل بروز جمعہ خواتین کے عالمی دن کی مناسبت سے چھٹی ہوگی۔ یوں مجھے اطمینان ہوا کہ نازش آرام کر لیں گے۔ دوپہر کا کھانا علوی صاحب کے ساتھ گیسٹ ہاؤس میں کھایا۔ ہم یہاں یمن سوشلسٹ پارٹی کے مہمان تھے۔ کچھ دیر بعد علوی بھی رخصت ہو گئے اور بتایا گیا کہ کل ہمیں دوسرے گیسٹ ہاؤس منتقل کیا جائے گا۔

عدن میں سخت گرمی تھی۔ پہنچتے ہی ہمیں بتایا گیا کہ عدن کی صبح کا درجہ حرارت 24 درجے ہے۔ چونکہ ہوا میں نمی بہت زیادہ تھی اس لیے گرمی ناقابل برداشت تھی۔ ماسکو سے عدن تک کی پرواز بارہ گھنٹے کی تھی تو موسم اور سفری صعوبت کے باعث نازش کے دمے کی تکلیف میں اضافہ ہوا تھا، یوں سارا دن ہم نے گیسٹ ہاؤس میں گزارا۔

8 مارچ کو چھوٹے عدن میں ساحل سمندر پر ایک عالیشان جگہ منتقل کیے گئے۔ وہاں پر عدن میں مقیم غیر ملکی سیاح نہانے آتے تھے۔ میں شام کو ایک یمنی خفیہ سلامتی کے کارندے کے ہمراہ پا پیادہ سیر کو نکل پڑا اور ہم 'الخیص' نامی جگہ دیکھنے چل دیے جہاں بدو عرب رہتے تھے۔ یمن پہنچتے ہی مجھے ایک بات نے بہت حیران کیا کہ سڑکوں، بازاروں اور گاڑیوں میں جس جگہ دیکھا، اکثر افراد کا ایک گال پھولا ہوا ملتا اور وہ جانوروں کی طرح کچھ جگالی کر رہے ہوتے۔ میں نے اپنے میزبان سے پوچھا کہ کیا ان سب لوگوں پر کسی بیماری نے حملہ کیا ہے؟ اس نے ہنس کر جواب دیا نہیں یہ سب 'قاط' کھاتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو قاط کھانے کے لیے لوگ پکنک مناتے ہیں اور اتوار کی چھٹی کے دن تو ہمارے لیڈر بھی قاط کھاتے ہیں۔ یہ بھی بتایا کہ اس خطے میں یمن کا قاط بہت مشہور ہے۔ سعودی عرب نے اس پر پابندی لگا رکھی ہے، اس لیے وہاں یہ سمگل ہو کر جاتا ہے۔ میں جب کئی سال بعد لندن گیا اور صومالیہ کے دوستوں سے تعلق بنا تو معلوم ہوا کہ وہ بھی اس لت کا شکار ہیں۔ دیگر یورپی ممالک نے اس پر پابندی عائد کر رکھی ہے لیکن انگلستان میں اس کی درآمد قانونی ہے۔ انگلستان سے پھر صومالی حضرات دیگر یورپی ممالک سمگل کرتے ہیں۔ علوی صاحب نے ایک چھوٹی سی گڈی مجھے بھی لا کر دی، لیکن مجھے اس کی بو اور ذائقہ ناگوار لگا۔ یہاں یہ عام خیال ہے کہ یہ قوت باہ کے لیے بہت مفید ہے۔

9 مارچ کو شمالی یمن کی پاپولر یونٹی پارٹی کے فرسٹ سیکرٹری 'جار لاع عمر' اور مرکزی کمیٹی کے رکن 'عبدالواحد المرادی' آ گئے۔ وہ چاہتے تھے کہ پاکستان میں ڈکٹیٹر شپ کے خلاف عوامی جدوجہد اور اس میں کمیونسٹ پارٹی کے کردار کو سمجھیں اور اس کے بعد اپنا نکتہ نظر بیان کریں۔ نازش نے انھیں اسرائیل کی طرح پاکستان کے قیام میں مذہب کے کردار اور ملک میں دائیں بازو کی قوتوں کی طاقت کے بارے میں تفصیل سے آگاہ کیا اور اس ضمن میں کمیونسٹ پارٹی کی انڈر گراؤنڈ حیثیت اور اس کی مشکلات بیان کیں۔ پاکستانی ڈکٹیٹر شپ کی عوام دشمن پالیسیوں کی روشنی میں جدوجہد کی نئی شکلوں پر بھی روشنی ڈالی۔

اسی دن پاکستان اور افغانستان کے لیے یمنی سفیر 'قاسم عبدالرب صالح' بھی آئے اور تبادلہ خیال ہوا۔ زیادہ بحث بلوچستان پر مرکوز رہی۔ اومان کی نیشنل لبریشن فرنٹ کے پولٹ بیورو کے رکن اور مرکزی کمیٹی کے رکن 'حسن شکری' بھی آئے اور ان سے بھی تبادلہ خیالات ہوا۔ انھیں بھی

زیادہ تر خلیج اور بلوچستان کے مسائل سے دلچسپی تھی۔ وہ بعض وضاحتوں کے طالب بھی تھے۔

10 مارچ کو شام سات بجے پھر 'معاشیق' کے گیسٹ ہاؤس منتقل ہوئے اور سارا دن کوئی خاص پروگرام نہ تھا۔ رات کو پولٹ بیورو کے رکن 'ابوبکر بادیب' مرکزی کمیٹی کے ایک رکن، ڈپٹی سیکرٹری اور پارٹی کے خارجہ امور کے شعبہ کے سربراہ کے ہمراہ تشریف لائے۔ موصوف نے معذرت چاہی کہ وہ پہلے نہ آسکے۔ اپنی پارٹی کی پولٹ بیورو، مرکزی کمیٹی اور جنرل سیکرٹری علی ناصر محمد کی طرف سے ہمیں خوش آمدید کہا اور توقع ظاہر کی کہ ہمارا سفر دونوں پارٹیوں کے درمیان تعلقات کو مزید استحکام بخشے گا۔ پاکستان کے بارے میں معلومات کے طالب تھے اور خوشی کا اظہار کیا کہ اس سلسلے میں ہماری گفتگو ان کے لیے مفید ثابت ہوئی۔

موصوف نے سوال کیا کہ پاکستان کمیونسٹ پارٹی بھارت میں کس پارٹی یعنی 'کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا' یا 'کمیونسٹ پارٹی مارکسسٹ' سے تعلق رکھتی ہے؟ ہم نے بتایا کہ تعلق دونوں سے ہے، البتہ رسمی تعلقات کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا سے ہیں۔ اُن کا دوسرا سوال تھا کہ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے ارکان کی کل تعداد کتنی ہے؟ ہم نے بتایا کہ تعداد کم ہے جس کی وجہ پارٹی کا انڈر گراؤنڈ ہونا ہے اور مزید یہ کہ ماضی میں تقسیم در تقسیم کے عمل سے گزرتی رہی ہے۔ بھارت کی طرح ماؤازم نے پاکستان میں بھی کمیونسٹ پارٹی کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ اس طرح انھوں نے کئی سوالات پاکستان اور پاکستانی فوج کے بارے میں کیے، یہ ایک مختصر تعارفی ملاقات تھی اس لیے تفصیلی بحث کا موقع نہ تھا۔

11 مارچ 1985ء کو ریاستی سلامتی کی وزارت کے ڈپٹی منسٹر 'علی منصور رشید' اور اسسٹنٹ ڈپٹی منسٹر 'محمد عبدالرب' سے ملاقات: خوش آمدیدی کلمات کے بعد انھوں نے بھی جلد ملاقات نہ ہونے پر معذرت کی۔ گفتگو کی ابتدا انھوں نے اس بات سے کی کہ وہ رجعتی قوتوں کے محاصرے میں ہیں یعنی ان کے ارد گرد سعودی عرب، اومان اور صومالیہ جیسے ممالک ہیں۔ ہم نے ان رجعتی قوتوں کی ٹھوس سازشوں کی نوعیت پوچھی تو انھوں نے بتایا کہ وہ معلومات اور اطلاعات اکٹھی کرتے ہیں، فوجی قوت کے ذریعے ہراساں کرتے ہیں، سوشلسٹ حکومت کے خلاف پروپیگنڈا کرتے ہیں، مذہبی افکار کا غلط استعمال کرتے ہیں اور یہ کہ امریکی سی آئی اے انھی کے توسط سے مصروف عمل ہے۔ اس حوالے سے سب سے زیادہ سرگرم سعودی عرب ہے، کیوں کہ ان کے وسائل بہت زیادہ

ہیں اور وہاں یمنی باشندوں کی کثیر تعداد رہائش پذیر بھی ہے۔ اومان میں یمنی نہیں ہیں اور ان کے وسائل بھی کم ہیں، البتہ امریکی مواصلات اور ٹیکنالوجی کا استعمال وہ کرتے ہیں۔ مگر سب سے خطرناک اور بڑی جارحیت کا سامنا شمالی یمن (یمن عرب جمہوریہ) کی جانب سے ہے، اس کی وجہ ہے کہ ہم لوگ مشترک تاریخ اور کلچر کے حامل ہیں۔ امریکا اور سی آئی اے نے ان سے ہاتھ ملایا ہے۔ یہ لوگ پروپیگنڈے کے علاوہ معاشی تخریب میں بھی مصروف ہیں اور ان کی کوشش ہے کہ ہماری معیشت تباہ ہو جائے۔ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے ذریعے بھی یہ کوششیں جاری ہیں۔ یوں ہم اس خطے میں اکلوتے انقلابی ملک ہونے کے ناطے دشمنوں کے بیچ گھرے ہوئے ہیں۔ پروپیگنڈہ، نظریاتی جنگ، فوجی خطرہ اور اقتصادی محاصرہ، ان سب کا ہمیں سامنا ہے۔ چونکہ ہم عرب ہیں، اس لیے ہماری پس ماندگی اور عرب شناخت کا بھی استحصال کیا جاتا ہے۔

ملک کی عام صورت حال پر امن ہے۔ ترقی پسندانہ نظریات نوجوانوں میں سرایت کرتے جا رہے ہیں۔ کم وسائل کے باوجود ہم نے کئی معاشی ادارے تشکیل دیے ہیں۔ محافظات (صوبوں) کو ترقی دی جا رہی ہے۔ سڑکیں اور انفراسٹرکچر بن چکے ہیں، تعلیم عام ہے۔ مختلف منطقوں کو آپس میں جوڑ دیا گیا ہے، صحت عامہ میں بھی ممکنہ حد تک بہتری آئی ہے، توانائی کے منبعوں کو استعمال میں لایا جا رہا ہے۔ فی الحال چار محافظات میں ٹی وی نشریات دیکھی جا رہی ہیں، بہت جلد اس کا دائرہ تمام محافظات تک پھیلا دیا جائے گا۔ لوگ اپنی مدد آپ کے تحت مواصلات، ٹی وی نیٹ ورک، پانی اور بجلی کے منصوبوں کے لیے چندے دیتے ہیں۔ محاصرے کے باوجود ہم نے کافی ترقی کی ہے۔ خواتین نے آزادی اور زیادہ حقوق حاصل کیے ہیں اور اب وہ اپنے حقوق کے دفاع میں آواز اٹھانے کا حوصلہ رکھتی ہیں۔ ہم پاکستان کے حالات کا بہت غور سے جائزہ لیتے ہیں، جہاں مذہبی قوتیں مضبوط ہو چکی ہیں۔

اس سوال کے جواب میں کہ شمال کی طرف ... اتنے خطرے کے باوجود یمن کی وحدت کا کیا مستقبل ہے؟ انھوں نے بتایا کہ یہ ہمارے لیے بہت اہم مسئلہ ہے۔ ہمارا اولین مقصد سوشلزم ہے۔ چونکہ خطرہ شمال کی طرف سے ہے تو اس لیے ہم مجبور ہیں کہ یونٹی کی طرف قدم بڑھائیں، ہمارے لوگ بھی یہی چاہتے ہیں۔ شمالی یمن میں حکومت سعودی عرب اور امریکا سے جڑی ہوئی ہے، جسے جاگیرداروں، کمپراڈوروں اور فوجیوں کے ذریعے چلایا جا رہا ہے۔ ایک

طرف ہم پرامن بقائے باہمی پر عمل کرتے ہوئے شمالی یمن سے معاشی اور سیاسی تعلقات رکھ رہے ہیں، تو دوسری طرف وہاں پر ترقی پسند قوتوں کے استحکام میں مدد کرتے ہیں۔ ہم رضا کارانہ اتحاد کے حامی ہیں، فتح کرنا نہیں چاہتے۔ اگر شمالی یمن میں ترقی پسند اور جمہوری قوتوں کی حکومت معرض وجود میں آ جائے تو پھر یہی وحدت جمہوری طریقے سے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ ہم شمال اور جنوب کے درمیان جنگ کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ شمال میں برسر اقتدار طبقہ وحدت چاہتا بھی ہے اور اس کی مخالفت بھی کرتا ہے۔ سعودی عرب ہمارا تاریخی دشمن ہے، وہ سرحدوں پر بزور قبضہ کرتا ہے۔ یمن میں کرائے کے لوگوں کو استعمال کر رہا ہے۔ یہاں سے بھاگے ہوئے استحصالی عناصر سعودی عرب میں بڑی عزت سے رہتے ہیں اور ہمارے خلاف استعمال ہو رہے ہیں۔ وہاں پر وہ باقاعدہ دفاتر رکھتے ہیں، انقلاب دشمنوں کو عسکری تربیت دیتے ہیں اور انھیں مسلح کرتے ہیں۔

سعودی عربین لیگ (سال) ہمارے خلاف تخریب کاری کو منظم کرتی ہے۔ ابھی ابھی جو تخریب کار گروہ پکڑا گیا ہے، انھوں نے سعودی عرب میں تربیت حاصل کی تھی۔ ان کا ایک ریڈیو اسٹیشن ہے، جو ہمارے خلاف پروپیگنڈہ کرتا ہے، جسے پیسہ سعودی عرب کی طرف سے مہیا کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہم سعودیہ اور اومان کے ساتھ سرحدی تنازعات میں بھی پھنسے ہوئے ہیں۔

ہم نے اس ملاقات میں اپنے میزبانوں کو پاکستان کے بارے میں اپنے تجزیے سے مطلع کیا۔

11 مارچ: ابوبکر بادیب کی رپورٹ:

بادیب کے ہمراہ وفد میں مرکزی کمیٹی کے رکن اور خارجہ امور کے شعبہ کے ڈپٹی سیکرٹری 'محمود نجاشی' اور 'اسماعیل'، وزارت خارجہ میں ایشیا ڈیسک کے ڈائریکٹر 'محمد حسن ثابت' اور بادیب کے دفتر کے انچارج 'رئیس محمد الحاج' شامل تھے۔ ہم نے پاکستان کے بارے میں اپنی رپورٹ سنائی۔ بادیب نے اظہار خیال کیا کہ:

''پاکستان خلیج میں سامراج کی جانب سے کردار ادا کرتا ہے۔ خطہ میں پاکستان کی سیاسی اور فوجی موجودگی اور رجعت پرست حکومتوں کا تحفظ، ہمارے جمہوری یمن کے لیے بھی خطرہ ہے۔ ہم پاکستان میں رونما ہونے والے واقعات اور خصوصاً حزب مخالف کی سرگرمیوں کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ہماری توجہ خصوصی طور پر بائیں بازو اور قومی جمہوری تحاریک کی سرگرمیوں پر مرکوز ہے۔ ہم اس لیے آپ سے قریبی تعلقات چاہتے ہیں اور آپ کے آنے کے منتظر تھے، ایسی آمد و رفت

تسلسل سے ہونی چاہیے۔

ہمارے اندرونی حالات کچھ اس طرح ہیں: اہم ترین واقعہ یہ ہے کہ ہم پارٹی کی تیسری کانگریس کے لیے تیاریوں میں مصروف ہیں۔ پہلی کانگریس کا انعقاد اکتوبر 1978ء میں، دوسری ایمرجنسی کانگریس اکتوبر 1980 میں منعقد ہوئی۔ اب تیسری کانگریس آئندہ اکتوبر میں ہونی ہے۔ کانگریس میں دوبارہ نئے انتخابات ہوں گے، نئی تنظیم کاری ہوگی۔ انتخابات اگست میں ہوں گے اور مندوبین کا انتخاب کیا جائے گا۔[۲۶]

سیاسی اور نظریاتی میدان میں ہم کانگریس کے لیے مرکزی دستاویز تیار کر رہے ہیں، جس پر کانگریس میں بحث ہوگی۔ سیاسی رپورٹ جنرل سیکرٹری پیش کرے گا۔ دوسری دستاویز اقتصادی منصوبے کے اہم خدوخال پر مشتمل ہوگی۔ چند ہی مہینوں میں یہ دستاویز پارٹی ساتھیوں کو بحث کے لیے دے دی جائے گی۔ جہاں تک پارٹی کی اندرونی سرگرمیوں کا تعلق ہے تو دوسری ہنگامی کانگریس کے بعد خاص طور پر پارٹی کا راہنما کردار بڑھ چکا ہے۔ معیشت اور فوجی فرنٹ پارٹی کی اہم قوت میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ ہم نے عوام سے مضبوط رشتے قائم کیے، پارٹی ممبر شپ وسیع ہوگئی۔ ہزاروں مزدور اور کسان پارٹی میں داخل ہوئے۔ کسان تنظیمیں مختلف علاقوں میں قائم ہو چکی ہیں۔ زراعتی کوآپریٹو وجود میں آگئے ہیں اور زراعتی فارمز بن گئے ہیں۔

ہمارا ایک پارٹی سکول ہے اور اس کی مختلف شاخیں مختلف محافظتوں میں قائم ہیں، پچھلے چند سالوں میں پارٹی سکولوں سے بہت طالب علم فارغ ہوئے۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں طالب علم سوویت یونین، کیوبا، جرمن ڈیموکریٹک ریپبلک، بلغاریہ اور دیگر سوشلسٹ ممالک میں پڑھتے ہیں اور وہ سب ریاستی اور پارٹی تنظیموں میں راہنما کردار ادا کرتے ہیں۔ تیسری کانگریس تک پارٹی دوسرے اقتصادی منصوبے پر بحث کرے گی، اس کا جائزہ لے گی اور اس بنیاد پر تیسرے منصوبے کے اہم اہداف کا تعین کیا جائے گا۔ ہم دوسرے پنج سالہ منصوبے کے آخری سال میں ہیں اور اسی منصوبے کی برکت سے مختلف حاصلات بھی کمائے ہیں۔ قومی اقتصادی ڈھانچے، صنعت، زراعت اور معاشرتی میدان میں ساڑھے نو فیصد اوسط شرح سے بڑھوتری ہوئی ہے، جو دیگر ترقی پذیر ممالک کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ قومی آمدنی اور انفرادی آمدنی میں اضافہ ہوا ہے۔ ریاستی سیکٹر مضبوط ہوا ہے۔ کوآپریٹو کا سیکٹر بھی بڑھا ہے، اس میں پارٹی نے زیادہ کردار ادا کیا

ہے۔ قومی معیشت کا 53 فیصد حصہ ریاستی سیکٹر کے کردار پر مشتمل ہے، جو سوشلسٹ جہت کا حامل ہے۔ ہمارا مقصد محض شرح نمو نہیں بلکہ حقیقی سماجی بہبود ہے۔

اس ضمن میں کامیابیوں اور مشکلات دونوں کا سامنا ہے۔ مشکلات یہ ہیں: امکانات اور وسائل کم ہیں، لوگوں کو منظم کرنا بہت مشکل کام ہے، لیکن یہ کام پارٹی سرانجام دے رہی ہے۔ دیگر پڑوسی ممالک جیسے سوڈان، صومالیہ اور حتیٰ کہ شمالی یمن کے مقابلے میں ہم آگے بڑھ رہے ہیں۔ معاشی حالت بہتر ہے۔ سوشلسٹ ممالک اور خصوصاً سوویت یونین کے ساتھ اچھے تعلقات ہمارے لیے مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ سوویت یونین ہمارے پیشہ ور طبقے کی تربیت کرتا ہے اور معیشت میں ہمارا ساتھ دیتا ہے، ہمارے دفاع کو مضبوط کر رہا ہے۔ ہم دشمن ریاستوں کے نرغے میں ہیں، اس لیے دفاع پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ سوویت یونین کی مدد کے باوجود ہم دفاع پر نسبتاً زیادہ خرچ کرنے پر مجبور ہیں۔ ہمارا تیسرا منصوبہ کوالٹی پلان ہے۔ ہمارا مقصد صنعت، زراعت اور نئے وسائل ڈھونڈنا ہے۔ ہم معدنیات اور پٹرول کی تلاش میں ہیں۔ اب تک کے نتائج حوصلہ افزا ہیں۔ تیل کی تلاش میں سوویت یونین، اٹلی، برازیل، کویت، برطانوی اور فرانسیسی کمپنیاں مدد کر رہی ہیں۔ تیل کے علاوہ سونے کے ذخائر کے بھی بہت زیادہ امکانات ہیں، اگرچہ ان کا زمین سے نکالنا زیادہ وقت کا متقاضی ہے۔

پارٹی میں 20 فیصد مزدور ہیں، جو ملکی شرح کے عین مطابق ہیں۔ ہماری اکثریت کسانوں کی ہے۔ پارٹی کی سماجی ساخت معاشرے کی سماجی ساخت کے مطابق ہے۔ 20 فیصد وائٹ کالر مزدور ہیں، 50 فیصد دانشور ہیں، جن میں ریاستی کارندے بھی شامل ہیں۔ ایک بنیادی مسئلہ پارٹی میں خواتین کی کمی ہے، ہماری کوشش ہے کہ پارٹی میں زیادہ سے زیادہ خواتین شامل ہوں۔ نوجوانوں کی تنظیم میں 50 ہزار ارکان ہیں اور ہماری کوشش ہے کہ یہ تعداد 90 ہزار تک پہنچائی جائے۔ ان میں طالب علم اور کسان شامل ہیں۔

یمن میں ہم بہت قدیم مزدور یونین یعنی سینڈیکیٹ رکھتے ہیں، جو برطانوی استعمار کے خلاف افتخار آمیز جدوجہد کے شاندار ماضی کی حامل ہے۔ یہ یونین معاشرے میں گہرا رسوخ رکھتی ہے۔ ہم اپنے ملک میں خواتین کی تنظیم، کسان اتحاد، عوامی دفاعی کمیٹی کی تنظیم اور دیگر پیشہ ور یونینز جیسے صحافیوں، وکیلوں، انجینئرز، ڈاکٹروں، اور مصنفین کی انجمنیں بھی رکھتے ہیں، جو

سوشلسٹ ممالک میں اپنی ہم پیشہ جماعتوں سے تعلقات رکھتے ہیں۔ ہماری دفاعی کمیٹیاں کیوبا کے طرز پر بنائی گئی ہیں۔

خارجہ امور میں ہم تمام پڑوسیوں سے پرامن بقائے باہمی کی بنیاد پر اچھے تعلقات کے حامی ہیں۔ کویت اور متحدہ عرب امارات سے بہت اچھے تعلقات قائم ہیں۔ سعودی عرب کے ساتھ روابط نارمل ہیں۔ ہمارے تعلقات سب قومی تحریکوں کے ساتھ ہیں اور ان کی مدد بھی کرتے ہیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ ان ملکوں میں تبدیلی اندر سے آنی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ حالیہ دنوں میں ہمارے تعلقات اومان سے بہتر ہوئے ہیں۔ ہمارے روابط تنظیم آزادیِ فلسطین (پی ایل او) سے فطری ہیں اور بحرین کے قومی آزادی فرنٹ سے بھی ہم ارتباط رکھتے ہیں۔ اپنے دفاع سے بے خبر نہیں، بعض امارات میں امریکا کے دفاعی اڈے ہیں اور ہمیں اس خطرے کا احساس ہے۔ اس لیے ہم سوویت یونین کے ساتھ دفاعی تعلقات رکھتے ہیں۔

ہماری آبادی کا بڑا حصہ سعودی عرب اور امارات میں مقیم ہے اور ہمارے زرمبادلہ کا دارومدار انھی ممالک پر ہے۔ یہ حقیقت ہم ہروقت اپنے پیش نظر رکھتے ہیں اور وہاں پر مقیم یمنیوں کے آبائی وطن سے قریبی تعلقات بھی ہیں۔

شمالی یمن کے ساتھ خصوصی تعلقات ہیں۔ ہم ایک ہی لوگ ہیں، مگر دو رژیموں میں زندگی گزارتے ہیں۔ ہماری کوشش ہے کہ ان کے ساتھ تعلقات بہتر ہوں، مگر یہ شمال میں تبدیلی پر منحصر ہے۔ ہمارے شمالی یمن کی قومی تحریک کے ساتھ اچھے روابط ہیں، مگر ان کے ساتھ کچھ مسائل بھی ہیں۔ شمالی یمن سعودی عرب کی دفاعی لائن ہے اور سعودی عرب خطرہ محسوس ہونے پر کئی مرتبہ شمالی یمن میں مداخلت کر چکا ہے۔ ہم خود کو ٹکراؤ سے بچانا چاہتے ہیں اور گذشتہ تین برسوں میں ہمارے تعلقات مزید بہتر ہوئے ہیں۔ ہم نے شمالی یمن کے ساتھ مل کر سپریم یمنی کونسل تشکیل دی ہے، جو دونوں ممالک کے صدور پر مشتمل ہے۔ اس کا ایک سیکریٹریٹ بھی ہے، جو دونوں ممالک کے وزارتی کونسلوں کے اقتصادی اور دیگر تعلقات کی نگرانی کرتا ہے۔ دونوں مل کر تیل اور دیگر معدنیات کی تلاش کرتے ہیں۔ شمالی یمن میں ایسی قوتیں ہیں، جو ان اچھے تعلقات کے مخالف ہیں، جن میں ایک اہم قوت اخوان المسلمون ہے، جو شمالی یمن یعنی 'یمن عرب ریپبلک' میں خاصی قوت رکھتی ہے۔ انھیں سعودی عرب کی حمایت حاصل ہے اور ان کا بڑا مرکز جرمنی میں ہے۔ ہم

سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی جماعت اسلامی بھی ان کی مدد کرتی ہے۔

خطے میں رجعت اور سامراج کے حق میں قوتوں کے توازن کی دو وجوہات ہیں:
اول کیمپ ڈیوڈ سمجھوتہ اور لبنان پر اسرائیل کا حملہ۔ دوسری وجہ سوڈان میں منفی تبدیلیاں اور عراق کا سامراج کی جانب کھسکنا ہے۔ ہم پی ایل او اور فلسطینی انقلاب کے خاتمے کی کوششوں کے شاہد ہیں۔ پی ایل او میں یاسر عرفات کی قیادت میں دایاں بازو بھی کوشش کرتا ہے کہ سامراجیت کی قربت سے وہ فلسطین کا مسئلہ حل کرلیں۔ عرب حکومتیں، جن میں 'شام' بھی شامل ہے، پی ایل او کی قیادت پر دباؤ ڈال رہی ہیں۔ گذشتہ کچھ عرصے میں اردن کے شاہ حسین اور عرفات کے درمیان مسئلہ فلسطین کے حل کے طریقہ کار پر اتفاق نظر آتا تھا۔ ہم نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ قومی مزاحمت کی بنیاد پر سامراج اور صیہونیت کے خلاف پی ایل او کو پھر سے متحد کریں، مگر ہماری کوششیں بے نتیجہ ثابت ہوئیں۔ اس ناکامی کا بنیادی سبب شام کا دباؤ اور پی ایل او میں دائیں بازو کے عناصر ہیں۔ رونالڈ ریگن (امریکی صدر) کی پہلکاری پر یہ کوشش کی جارہی ہے کہ فلسطینی مزاحمت کو تباہ و برباد کر دیا جائے۔ ہماری 'ڈیموکریٹک فرنٹ فار دی لبریشن آف پلسٹائن' (DFLP) سے قریبی مفاہمت ہے اور ان کے کمیونسٹ پارٹی، 'پاپولر لبریشن آف پلیسٹے نین فرنٹ' (PLPF)، 'ڈیموکریٹک فرنٹ فار لبریشن آف پلیس ٹائن' (DFLP) اور 'پلیس ٹائن لبریشن فرنٹ' (PLF) کے جمہوری اتحاد کی پشت پر کھڑے ہیں۔ ہم شام کے ساتھ سوشلسٹ ممالک کی طرح یک جہتی رابطے میں ہیں۔ ہماری پارٹی کے جنرل سیکرٹری نے شام، لیبیا اور الجزائر کا سفر کیا تاکہ اردن، عراق، مصر اور مراکش کی سازشیں ناکام بنائیں۔ اس مشن کے نتائج حوصلہ افزا ہیں اور امکان یہ ہے کہ یہی چار ممالک ایک اعلیٰ ترین 'سمٹ' (Summit) بلائیں، جس کا اہم مقصد مذکورہ ممالک کے معاندانہ اتحاد کو پارہ پارہ کرنا ہوگا۔ اس کا ایک مقصد یہ بھی ہوگا کہ شاہ حسین اور عرفات کے درمیان عمان سمجھوتے کو بے اثر کیا جائے۔ فلسطینی تنازعہ مسائل کی جڑ ہے، اس لیے ہماری ساری توجہ اس پر مرکوز ہوگی۔ عالمی سطح پر ہم سوویت پہل کاروں کے ساتھ اور ریگن کی کوششوں کے خلاف کھڑے ہیں۔ ہم افغانستان میں واقعات کی نگرانی کر رہے ہیں اور اس کے ساتھ قریبی تعلقات رکھتے ہیں۔ افغانستان میں بیرونی اور خاص طور پر امریکا اور پاکستان کی مداخلت کی بھرپور مذمت کرتے ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ آپ کی پارٹی اور اتحادیوں سے اچھے تعلقات قائم کریں، اطلاعات کا تبادلہ

کریں، ہمیں یقین ہے کہ موجودہ دور ہمارے درمیان تعلقات کو مزید وسیع اور گہرا کرے گا۔ میں ایک بار پھر اپنی مرکزی کمیٹی، سیاسی بیورو اور جنرل سیکرٹری کی طرف سے آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔"

12 مارچ کو پارٹی سکول دیکھنے گئے۔ پارٹی سکول کے پرنسپل اور مرکزی کمیٹی کے رکن صالح حسن محمد نے درج ذیل رپورٹ سنائی:

"یہ سکول 1970ء میں معرض وجود میں لایا گیا۔ پہلے پہل صرف ایک سالہ کورس ہوا کرتا تھا جس کی شاخیں محافظات میں بنائی گئیں۔ پھر دو سالہ کورس پڑھانا شروع کیا۔ لیکن چھ سال پہلے تین سالہ کورس رائج ہوا اور دو سالہ کو ختم کر دیا گیا۔ اس انسٹی ٹیوٹ (مرکزی سکول) میں تین سالہ اور ایک سالہ کورس ہیں اور ہر شعبہ میں ایک سالہ کورس پڑھائے جاتے ہیں۔ ہمارے سٹوڈنٹس پارٹی ارکان ہوتے ہیں۔ سکول کی عمر پارٹی سے زیادہ ہے۔ نظریاتی جدوجہد میں ہم نے تمام قومی قوتوں کو اکٹھا کیا اور پھر پارٹی بنانے کی طرف گئے۔ یہ پارٹی قومی اور ترقی پسند قوتوں کے اتحاد کے لیے وجود میں لائی گئی، پھر یہ قوتیں متحد ہوئیں، 'نیشنل لبریشن فرنٹ' (NLF) میں سرگرم کردار ادا کیا۔ این ایل ایف نے قومی اور ترقی پسند قوتوں کو متحد کیا اور پھر عرب دنیا کی مارکسی اور لینینی نظریے کی بنیاد پر ترقی پسند قوتیں یکجا ہوئیں اور سوشلسٹ پارٹی کی تاسیس ہوئی۔ اس پارٹی کے بنانے کے لیے بہت سی تبدیلیاں لائیں گئیں، جیسے زرعی اصلاحات کا نفاذ، عوامی تنظیموں کا قیام، فوجی قوت کو بنانا، ملیشیا کو منظم کرنا، یہ سب کچھ مزدوروں اور دہقانوں کے بیٹوں کی طرف سے سرانجام ہوئیں۔ عوامی حکمرانی کو قائم کیا گیا، سپریم کونسل کے ساتھ تعلقات استوار کیے اور واحد یمن کے لیے جدوجہد کو آگے بڑھایا۔

جس وقت سکول بن گیا تو فیصلہ کیا گیا کہ ثانوی سے لے کر اعلیٰ ترین تعلیم تک مارکسی اور لینینی نظریات پڑھائے جائیں گے۔ 1981ء میں اور بعدازاں ٹریڈ یونین کا انسٹی ٹیوٹ، نوجوانوں کا انسٹی ٹیوٹ، ملیشیا کے لیے انسٹی ٹیوٹ وغیرہ بنائے گئے۔ ہم مختلف کورسز پڑھاتے ہیں۔ اب تک فارغ التحصیل طلبا کی تعداد آٹھ سے نو سو کے درمیان ہے۔ سکول میں سارے مبارزین جذب ہوتے ہیں، جن میں شمالی یمن کے سٹوڈنٹس بھی ہیں۔ سکول کی ایک شاخ عرب قومی تحریکوں کے لیے مخصوص ہے۔ ہمارے ہاں دیگر عربی اور خلیجی ریاستوں کے طالب علم بھی پڑھتے ہیں۔

طویل دورانیے کے کورسز کے علاوہ ہم پندرہ روزہ اور ماہانہ کورسز بھی پڑھاتے ہیں۔ ان

اساتذہ کے لیے، جو سماجی علوم پڑھاتے ہیں، الگ سے کورسز ترتیب دیے گئے ہیں۔ پارٹی پروپیگنڈہ کی تربیت کے لیے الگ کورسز ہیں۔ پارٹی کی ابتدائی تنظیم کے سیکرٹریوں، نئے ارکان اور معاشی شعبہ جات کے سربراہان کے لیے بھی الگ سے کورسز تیار کیے گئے ہیں۔ مزدوروں، کسانوں، مسلح ملیشیا اور غیر پارٹی عناصر کے لیے بھی مختصر مدت کے کورس ترتیب دیے گئے ہیں۔

ہم نے دیگر انسٹی ٹیوٹس کے ساتھ اشتراک میں مرکزی کمیٹی اور پولٹ بیورو کے ارکان کے لیے مخصوص کورسز کا آغاز کیا ہے۔ سوشلسٹ ممالک کے سماجی علوم کی اکیڈیمیوں اور اداروں کے ساتھ مفاہمت نامے دستخط کیے ہیں۔

درج ذیل مضامین پڑھائے جاتے ہیں:

۱۔ مارکسزم کے تین اجزائے ترکیبی: سیاسی اقتصاد، فلسفہ اور سائنسی کمیونزم

۲۔ بین الاقوامی کمیونسٹ تحریک

۳۔ پارٹی کی تعمیر کے لوازمات

۴۔ ریاست اور قانون

۵۔ سماجی نفسیات

۶۔ تاریخ یمن

۷۔ نظریاتی سرگرمی

۸۔ زرعی مسئلہ

۹۔ قومی اور پارٹی اقتصادیات

۱۰۔ روسی، جرمن اور عربی زبان

ہمارے اساتذہ کا تعلق سوویت یونین، جمہوری جرمنی اور یمن سے ہے۔ 23 استاد اور ترجمان سوویت یونین سے ہیں، 7 جرمن استاد اور ترجمان ہیں، جبکہ یمن کے 24 اساتذہ یہاں تدریس اور تربیت کا فرض انجام دیتے ہیں۔

انسٹی ٹیوٹ کا کمپلیکس سوویت کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی طرف سے تحفتاً دیا گیا ہے، جو 1979ء میں مکمل ہوا، اس کے ساتھ رہائشی کمپلیکس بھی ہے۔ داخلہ لینے والوں کو تنخواہ ملتی ہے، داخلے کے لیے چند شرائط بھی ہیں: تین سالہ کورس کے لیے پارٹی کی پانچ برس سے رکنیت، علاوہ

ازیں اس سے قبل ایک سالہ کورس کی تکمیل اور ثانوی سطح تک تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔ مزدوروں اور کسانوں کے لیے ان شرائط میں نرمی برتی جاتی ہے۔

ہم ایک نو آبادی تھے تو مزدوروں، کسانوں اور خواتین کے لیے تعلیم کے مواقع نہیں تھے۔

ہم نے ان کی تعلیم و تربیت کا خاص خیال رکھا اور نہیں چاہتے کہ ہماری پارٹی صرف دانشوروں پر مشتمل ہو۔ ایک ہی کورس میں مختلف تعلیمی سطح کے طالب علم ہوتے ہیں اور اساتذہ پر لازم ہے کہ سب کو سمجھائیں۔ ہر برس داخلی سیمینار منعقد کرتے ہیں، مشکلات پر بحث ہوتی ہے، غور ہوتا ہے، اساتذہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں، بحث مباحثہ کرتے ہیں، اور درس و تدریس کو بہتر بنانے کے لیے تجاویز دیتے ہیں۔

ہمارے ہاں سائنسی آلات ہیں، جن پر ہم طلبا کو تربیت دیتے ہیں۔ سوشلسٹ ممالک سے پروفیسر آتے ہیں اور تجربات کا تبادلہ ہوتا ہے۔''

اس کے علاوہ بھی پرنسپل نے بہت تفصیل سے ہمیں سکول سے متعارف کرایا اور کئی جزیات سے باخبر کیا جیسے طلبا کی تعداد، ان کی مختلف محافظتوں میں تقسیم وغیرہ۔

12 مارچ کو یمن سوشلسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے رکن اور ٹریڈ یونینز کنفیڈریشن کے جنرل سیکرٹری، سلطان سے ملاقات:

رسمی علیک سلیک اور نیک خواہشات کے تبادلے کے بعد ہمارے جنرل سیکرٹری امام علی نازش نے مختصراً بیان کیا:

''پاکستان کا مزدور طبقہ ہمیشہ عوامی جمہوری جدوجہد میں ہراول دستہ ثابت ہوا ہے۔ البتہ استحصالی قوتوں کی جانب سے مزدور اشرافیہ بھی پیدا کی گئی ہے، جس نے بائیں بازو کی فیڈریشنوں کو منقسم کر دیا ہے۔ پاکستانی پرولتاری طبقہ بہت استحصال زدہ ہے۔ ہر حکومت کی تبدیلی سے ان کے حقوق مزید غصب ہوتے جا رہے ہیں۔ ضیاء الحق کی حکومت نے ان کی پیشہ ور سرگرمیوں پر پابندیاں لگائی ہیں۔ تمام قیود اور پابندیوں کے باوجود وہ مظاہرے کرتے ہیں اور ان میں سے بعض گولیوں کا نشانہ بھی بنتے ہیں۔ ہماری کوشش ہے کہ سب ترقی پسند اور جمہوری تنظیموں کو ایک ہی یونین میں اکٹھا کر دیں اور ساتھ ساتھ کسانوں کو بھی منظم کر رہے ہیں۔''

سلطان: '' ہم افغانستان میں پاکستان کمیونسٹ پارٹی کو ڈھونڈ رہے تھے، جن سے ہم

پاکستان میں ٹریڈ یونینوں کے بارے میں معلومات حاصل کر سکیں۔ بین الاقوامی فورمز میں بھی پاکستانی ٹریڈ یونینوں کے بارے میں پوچھا۔ بھارت کی ٹریڈ یونینوں کے ساتھ ہمارے تعلقات استوار ہیں، اگر ممکن ہو تو اب پاکستان کی ٹریڈ یونین سے بھی ہمارے تعلقات کا آغاز ہو جانا چاہیے۔ ہمارا رقبہ بڑا اور آبادی کم ہے۔ ملک دو حصوں میں بٹ چکا ہے جو امریکا اور برطانوی پالیسی کے باعث اب دو الگ حصوں کی صورت میں موجود ہے۔ ہماری معیشت پس ماندہ اور مزدور طبقہ تعداد میں بہت کم ہے۔ ان کی مجموعی تعداد جو معیشت میں مصروف عمل ہے، نصف ملین تک ہے۔ جب 129 سال قبل انگریزوں نے ہمیں نو آبادی بنایا تو ہماری کوئی بھی معاشی بنیاد نہ تھی۔ ہم نے صفر سے ابتدا کی ہے۔ معیشت صرف خدمات تک محدود ہے۔ آزادی کے بعد ہم نے اقتصادی منصوبہ بندی کا راستہ اپنایا۔ ہم اس وقت دوسرے پنج سالہ منصوبے کے آخری سال میں ہیں۔ تیسرے پنج سالہ منصوبے کا آغاز 1986ء سے ہوگا۔ رفتہ رفتہ مزدور طبقے کی تعداد بڑھ رہی ہے، ہمارے ہاں امکانات بہت کم ہیں۔ سارا انحصار زراعت اور ماہی گیری پر ہے۔ صنعت بہت چھوٹی ہے اور نئے صنعتی منصوبوں کو بروئے کار لانے کی کوششوں میں ہیں۔ معاشی اور سماجی پیچیدگیوں کی صورت حال سے سامنا ہے۔ ٹریڈ یونین کی عمر 29 سال ہے، آئندہ برس ہم تیس سالہ جشن منائیں گے۔

1960ء کے بعد چھ ٹریڈ یونینوں نے اتحاد کیا اور جدوجہد شروع کی، جن سے موجودہ یونین معرض وجود میں آئی۔ اپنے قانونی شعبہ جات کے توسط سے ٹریڈ یونین ترقی کے پروگراموں میں حصہ لیتی ہے۔ علاوہ ازیں یونین پارٹی اور حکومت میں حصہ لیتی ہے، انتظامی کاموں میں شریک ہوتی ہے اور منصوبہ بندی میں اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ قانون پر عمل درآمد میں حصہ دار ہے، مزدوروں کے مفادات کے حصول اور دفاع میں اپنا فریضہ نبھاتی ہے۔ قومی معیشت کو مضبوط کر رہی ہے اور قومی اور ذاتی مفادات کو مربوط بنانے میں کوشاں ہے۔ سارے حاصلات حکومت کی جانب سے فراہم کیے جاتے ہیں، مزدروں کا بیمہ حکومت کے پیسوں سے ہوتا ہے، تعلیم اور صحت کی سہولیات مفت ہیں، جبکہ گھروں کا کرایہ بس علامتی ہی ہے۔

ہم بین الاقوامی سطح پر سرگرم ہیں۔ دنیا بھر میں 75 ٹریڈ یونینوں سے تعلقات ہیں۔ ہم 'ورلڈ فیڈریشن آف ٹریڈ یونینز' (WFTU) اور 'انٹرنیشنل فیڈریشن آف عرب ورکرز' میں شامل ہیں۔ ہم

رضا کارانہ خدمات بھی سرانجام دیتے ہیں، مختلف مہارتوں میں مقابلے بھی منعقد کرائے جاتے ہیں، سیاسی اور نظریاتی تربیت کی فراہمی بھی ہمارے فرائض میں شامل ہے۔ ہم ایک ہفت روزہ جریدہ بھی شائع کرتے ہیں اور مزدوروں کی تعلیم کے لیے ایک انسٹی ٹیوٹ بھی ہے۔ کھیلوں اور سماجی خدمات میں حصہ لیتے ہیں۔ ہمارے کام بہت وسیع ہیں، بہت سی تقاریب کا اہتمام کرتے ہیں، خصوصاً اس برس پارٹی کانگریس کے لیے۔ چونکہ ٹریڈ یونین مزدوروں کی تنظیم ہے، تو اس لیے پارٹی سے مضبوط تعلق رکھتی ہے، کیونکہ مزدور ہی پارٹی کا ہراول دستہ ہیں۔"

اس رات جمہوری جرمنی کے سفیر مہمان خانے، نازش سے ملاقات کے لیے تشریف لائے اور ان سے تبادلہ خیالات ہوا۔

13 مارچ: عراقی کمیونسٹ پارٹی سے حبیب (ابوسلام) اور دو اور ساتھی ملاقات کے لیے آئے۔ انھوں نے کہا کہ چودھویں پارٹی کانگریس کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ جون جولائی 1984ء میں ہماری مرکزی کمیٹی کا وسیع اجلاس (پلینوم) منعقد کیا گیا جس میں جنرل سیکرٹری اور دوسرے غیر ملکی مہمانوں نے حصہ لیا۔ سارے خطے میں پارٹی تنظیمیں بنائی ہیں۔ دشمن چاہتا ہے کہ پارٹی میں پھوٹ ڈالے لیکن ناکام رہا۔ ہمارے گوریلا گروہ بہت سرگرم ہیں اور اچھی طرح مسلح ہیں۔ ہم کردستان کی قومی تحریک میں بھی فعال ہیں۔ پارٹی میں کرد، شیعہ، سنی، عرب، غیر عرب سب شامل ہیں۔ جنگ کا خاتمہ عراقی اور ایرانی جمہوری تحریکوں کے مفاد میں ہے۔ ہمارا نیشنل ڈیموکریٹک فرنٹ بھی ہے، جس میں کمیونسٹ پارٹی، کردستان ڈیموکریٹک پارٹی اور کردستان سوشلسٹ پارٹی شامل ہیں۔ دوسرا محاذ شامی پارٹی کا حصہ ہے اور ان سے تعلقات قائم کر رہے ہیں۔ این ڈی ایف میں دراصل سات پارٹیاں 'سوشلسٹ عرب موومنٹ'، 'عوامی انقلاب آرمی'، 'عراق ڈیموکریٹک ایسوسی ایشن' اور 'پیپلز پارٹی آف کردستان' وغیرہ شامل ہیں۔ عراقی رژیم اب تمام مثبت اقدامات کو ختم کر رہی ہے۔ زراعتی کوآپریٹوز کو کالعدم قرار دے رہی ہے، صنعتوں کو پرائیوٹائز کر رہی ہے، خواتین کے جمہوری حقوق پر ڈاکہ ڈالا جا رہا ہے۔ عربی رجعت پرست عراق کے بہت قریب ہو چکے ہیں۔ عراق جمہوری یمن کے خلاف سازشوں میں حصہ لیتا ہے اور شام کے خلاف بھی سازشیں کی جا رہی ہیں۔ الجزائر کو بھی معاف نہیں کیا گیا۔ افغان مجاہدین کو پاسپورٹ مہیا کیے جا رہے ہیں۔

1978ء میں جب سلطان علی کشت مند عراق گئے تو ہم ان سے ملے۔ اس کے بعد مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ عراق مغرب اور امریکا کی جانب کھسکتا جا رہا ہے۔ امریکا کو تسلی دی ہے کہ ہم اسرائیل کے خلاف محاذ میں شامل نہیں۔ صدام حسین کو فوج کے اندر بھی تنقید کا سامنا ہے۔ عراقی ڈاکٹرز، اساتذہ اور فن کار جمہوری یمن میں زندگی گزار رہے ہیں۔ ہم کردوں کے حق خود ارادیت کی حمایت کرتے ہیں۔ اس طرح ایران میں کردوں کے لیے خود مختاری کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ترکی میں کمیونسٹ کردوں کے لیے ایک الگ ریاست مانگتے ہیں۔ امریکا مخالف احساسات عرب دنیا میں پھیل چکے ہیں اور سوویت یونین کے حق میں مثبت احساسات پائے جاتے ہیں۔

13 مارچ کو اومان نیشنل لبریشن فرنٹ سے مرکزی کمیٹی کے رکن اور خارجہ تعلقات کے سربراہ، سہیل علی، مرکزی کمیٹی اور خارجہ تعلقات کے شعبہ کے رکن 'سالم ساجد'، مرکزی کمیٹی اور خارجہ امور کے متبادل رکن 'سعید دبلان' ملاقات کے لیے آئے۔

سہیل علی: "پہلی بار ہے کہ ہم پاکستان کمیونسٹ پارٹی سے مل رہے ہیں۔ اگرچہ ہم بہت نزدیک ہیں، چند سال پہلے آپ کا ایک رکن بلوچستان سے آیا تھا۔ 1975ء کے بعد سے ہم نے ظفار سے اپنے جنگجوؤں کو بلایا کہ انھیں پھر سے منظم کریں۔ ابھی ہم سیاسی اور نظریاتی تنظیم سازی میں مصروف ہیں۔ اومان کے اندر مسقط اور ظفار (مغربی اومان) میں ان کی تنظیمیں ہیں۔ اب ہماری تنظیمی حالت بہتر ہوئی ہے۔ 9 جون 1982ء کو پیپلز فرنٹ فار لبریشن آف اومان کی تیسری کانگریس منعقد ہوئی، تاکہ ایک نئی مارکسی اور لیننی پارٹی بنائیں۔ 1984ء میں اپنا منشور تقسیم کیا۔ اب سیاسی اور نظریاتی سرگرمیاں شروع کی ہیں۔ عرب ممالک کی کمیونسٹ پارٹیوں، سوویت، بھارت، ایتھوپیا، فرانس اور اٹلی کی پارٹیوں سے اب تک تعلقات استوار ہوئے ہیں۔

اومان کے علاقے 'میسرا' میں امریکی اڈہ ہے، جو ڈیگو گارسیا کے بعد دوسرا بڑا اڈہ ہے۔ ایسا ہی ایک اڈہ ہرمز کے دہانے 'خصب' میں ہے۔ جنوب میں 'تمرید' ہماری سرحد سے متصل ہے۔ ظفار کے سلالہ میں برطانوی اڈہ ہے۔ یہاں امریکی، برطانوی اور پاکستانی عساکر موجود ہیں، تقریباً ڈیڑھ سو فوجی افسران ہیں۔ تقریباً چار ہزار پاکستانی مزدور اومان میں ہیں۔ ہماری نیشنل ورکرز کمیٹی، ویمن اور یوتھ آرگنائزیشنز ہیں۔ فرنٹ کے ساتھی چاہتے ہیں، کہ انھیں افغانستان آنے کی دعوت دی جائے۔"

13 مارچ کو سوڈان کی کمیونسٹ پارٹی کے نمائندے کی آمد: 1971ء میں ہمارے لیڈر شہید کیے گئے۔ اس واقعے کے بعد پارٹی نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ ہمارے 60 فیصد اراکین 1971ء کے بعد پارٹی میں شامل ہوئے ہیں۔ گرفتاریاں، کام سے برطرفی، گھومنے پھرنے پر پابندیاں اور دیگر تعزیرات کا سامنا ہے، تاہم آگے بڑھ رہے ہیں۔ ٹریڈ یونینوں اور طالب علموں میں کام کامیابی سے جاری ہے۔ گذشتہ سال خرطوم یونیورسٹی کی یونین اخوان المسلمون کے ہاتھ میں تھی، اب نہیں ہے۔ اخوان کے تین لیڈر چند دن پہلے گرفتار ہوئے اور گرفتاریوں کا سلسلہ جاری ہے، ہمیں اس کا سبب معلوم نہیں۔ پانچ دن پہلے فلسطینی لیڈر جارج حباش خرطوم میں تھے، شاید اس نے کوئی مشورہ دیا ہوگا۔ اقتصاد کو اسلامی اصولوں پر چلانے کی تدبیریں ہو رہی ہیں۔

پارٹی انڈر گراؤنڈ ہے۔ لیڈر اندرون ملک ہی ہیں، جان گورین 'پیپلز لبریشن آرمی' کی قیادت کرتے ہیں اور جنوبی سوڈان میں کارروائیاں کر رہے ہیں، جس کا مقصد سوڈان کو متحد کرنا ہے۔ وہ سوشلسٹ حکومت کا قیام اور 'نمیری' حکومت کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ ہم نمیری مخالف قوتوں کے اتحاد کے خواہاں ہیں۔ امہ پارٹی، ایس پی ایل اے، نیشنل یونینسٹ پارٹی، بعث پارٹی اور ناصریستانوں کا اتحاد چاہتے ہیں۔

نمیری کی قوت کی بنیاد فوج، پولیس، فوجی بیوروکریٹک سرمایہ اور امریکی امداد ہے۔ ہم شمال اور جنوب میں قومیتوں کے مسئلہ سے دوچار ہیں۔ 250 زبانیں بولی جاتی ہیں، جبکہ بنیادی زبان عربی ہے۔ جنوب میں بہت سی زبانیں ہیں اور انگریزی کا استعمال بھی ہوتا ہے، جس کا اثر جنوب میں زیادہ ہے۔ جنوب اور شمال، دونوں میں عیسائی ہیں۔ مسلمان فقط 40 فیصد ہیں، باقی عیسائی اور دیگر مذاہب سے ہیں۔ تاہم قوت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے، جو بیوروکریسی کے 60 فیصد پر قابض ہیں۔ صرف عیسائیوں میں تعلیم یافتہ افراد زیادہ ہیں۔

13 مارچ کو 'ابوالعز' (ابو رجب) پاپولر فرنٹ فار لبریشن آف پیلسٹائن (PFLP) کے نمائندے سے ملاقات: ''شاہ حسین اور یاسر عرفات کے درمیان 'عمان معاہدہ' انتہائی خطرناک ہے، جس نے پی ایل او کو نقصان پہنچایا ہے۔ یہ معاہدہ ہمارے مقصد کے خلاف ہے۔ عرفات نے پی ایل او شاہ حسین کے سپرد کر دی ہے اور وہ ہمارے سروں کا سودا کرتا ہے۔ معاہدے نے پی ایل او کو تقسیم کر دیا ہے، اس کا برا اثر تمام لوگوں او رمبارزین پر پڑا ہے۔ الفتح اور

عرب لبریشن فرنٹ (عراق کا حمایت یافتہ) کے علاوہ کوئی بھی اس معاہدے کی تائید میں نہیں۔ اس معاہدے نے پی ایل او کو دائیں جانب دھکیل دیا اور امریکی موقف کے قریب لانے کا موقع فراہم کیا، تاکہ ہمارے سروں کا سودا اسرائیل سے کیا جاسکے۔

ہمارا موقف یہ ہے کہ ہم ایک وسیع قومی فرنٹ کا تقاضا کرتے ہیں، یعنی وہ تنظیمیں جو یاسر عرفات کے خلاف ہیں اور وہ شخصیات جو عرفات کے طریقہ کار سے متفق نہیں، انھیں اکٹھا ہونا چاہیے، تاکہ عرفات کو ہٹایا جاسکے اور عمان معاہدے کو کالعدم قرار دیا جائے۔ یہی نیشنل فرنٹ عرفات کے بغیر الفتح کو اپنی طرف کھینچ لے، یعنی پی ایل او کو قومی پالیسی پر استوار کرے۔ فلسطینی بورژوائی اور پی ایل او سے ہٹ کر الفتح کے وہ عناصر، جو ہماری لائن کو سپورٹ کرتے ہیں، وہ ہم سے مل جائیں۔ کچھ عرصے تک یہ پالیسی ہمارے لوگوں کو منقسم رکھے گی، خصوصاً مقبوضہ خطہ کے فلسطینی یاسر عرفات کی طرف جائیں گے۔ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس طرح ہماری مزاحمت عارضی طور پر کمزور ہو جائے گی۔ ہمارے اس موقف کو الصاعقہ، جنرل کمانڈ، پاپولر سٹرگل فرنٹ اور ترقی پسند الفتح کی حمایت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ کمیونسٹ پارٹی، ڈی ای ایل ایف اور پی ایل ایف کے ساتھ بات چیت جاری ہے، کہ انھیں بھی اس موقف پر راضی کیا جائے۔ تاہم وہ ابھی تک اس پر راضی نہیں۔ نائب حاتمہ کہتا ہے کہ الفتح کی مرکزی کمیٹی کے ساتھ یاسر عرفات لائن کو ناکام بنایا جائے۔ کمیونسٹ پارٹی کہتی ہے کہ اس طرح کرنے سے پی ایل او کی قیادت خراب ہو جائے گی۔ انھوں نے دو ماہ کا وقت مانگا ہے۔

لبنان میں حالت اچھی ہے، کیونکہ صرف مسلح جدوجہد ہی سے ہم اسرائیل کو شکست دے سکتے ہیں۔ جنوب میں لبنان کے مزاحمتی محاذ سرگرم ہیں، وہ ہماری تائید کرتے ہیں۔ ہماری وہاں پر موجودگی تو ہے، البتہ ہم اس کا اعلان نہیں کرتے، صرف ایل آر ایف کے ذریعے جدوجہد کرتے ہیں۔ حالات وہاں اب بہتر ہیں، ہماری قوتیں آمد و رفت کر سکتی ہیں۔ کل ہی اسرائیل کے خلاف چار کارروائیاں ہوئیں۔ لبنان کے واقعات ہمارے سارے خطے پر اثرانداز ہوں گے۔ پہلی بار ہے کہ اسرائیل بغیر کسی رعایت کے عرب علاقوں سے واپس ہوگا۔ فلانجستان یعنی عیسائی ملیشیا بھی اسرائیل کے ساتھ ہی ہٹ گئی۔ لبنانی صدر اب دونوں طاقتوں کے درمیان توازن کا متمنی ہے اور شام کی طرف دیکھتا ہے، کیوں کہ شام کے بغیر صدر اپنے عہدے پر نہیں رہ

سکتا۔ اردن کی آبادی کا 60 فیصد فلسطینی ہے اور ان کے عمومی جذبات یاسر عرفات کے خلاف ہیں۔ پی ایل او میں 9 تنظیمیں ہیں۔''

14 مارچ: یمن سوشلسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے اقتصادی شعبہ میں ملاقات: خوش آمدیدی کلمات کے بعد ''آپ جیسے انقلابی اپنے وطن میں دیکھتے ہیں تو بہت مسرت ہوتی ہے۔ یہ اچھا موقع ہے کہ آپ کو اپنے تجربے کا خلاصہ پیش کریں۔ اب پاکستان کے بارے میں بھی سنتے ہیں۔ 1967ء میں ہم نے آزادی حاصل کی، دو سال تک راہ ڈھونڈنے کے چکر میں پڑے رہے، آخر کار سوشلسٹ راستہ اپنایا۔ 1969ء کے بعد پارٹی کی قومی اصلاحات کا نفاذ ہوا۔

زراعت: زرعی قانون نافذ ہوا جس کے اپنے امتیازات ہیں۔ حکم نہیں تھا کہ لوگوں سے زمین لی جائے، بلکہ ان کو آمادہ کیا کہ کس طرح اپنی زمین کی حفاظت کریں۔ زراعت کی نئی شکل معرض وجود میں آئی۔ باغات اور بڑے بڑے فارمز ریاستی ملکیت ہو گئے، باقی ماندہ کو آپریٹو ملکیت میں بدل دیے گئے۔ سخوز (ریاستی فارمز) اور کلخوز (اجتماعی فارمز) وجود میں آئے۔ 54 ریاستی فارمز ہیں، 59 اجتماعی۔ 43 ملین دینار مالیت کی زرعی پیداوار ہو رہی ہے، جس میں ریاستی فارمز کا حصہ ساڑھے چھ ملین ہے۔ نجی ملکیت ابھی تک ہے، جو چھوٹے مالکان پر مشتمل ہے۔

ہماری قدرتی مشکلات سے آپ آگاہ ہیں۔ ہمارے پاس دریا نہیں، بارش نہ ہونے کے برابر ہے۔ زرعی رشتے بہت پیچیدہ تھے، لیکن پارٹی کی راہنمائی میں بہت مثبت قدم اٹھائے گئے، جنھوں نے نئے رشتوں کو جنم دیا۔ نصف ملین ہیکٹر قابل کاشت اراضی ہے۔ 577000 جریب زمین زیر کاشت ہے، جو قابل کاشت اراضی کا 60 فیصد ہے۔ عام حالات میں 22000 سے لے کر 27000 جریب، یعنی 23 فیصد کو کاشت کیا جا سکتا ہے۔ ریاست رفتہ رفتہ اس شرح کو بڑھا رہی ہے۔ ہمیں سب سے پہلے زراعت کی بنیاد مستحکم کرنی ہوگی۔

پہلے پنج سالہ منصوبے میں زراعت کے لیے 580000 دینار مختص تھے، دوسرے منصوبے میں 620000 دینار کا 70 فیصد حصہ آب پاشی کے لیے مختص کیا گیا۔ زرعی پیداوار بڑھ رہی ہے۔ ہم نے ساری توجہ میوہ جات اور دالوں کی کاشت پر مرکوز کر رکھی ہے۔ 1969ء میں آبادی کا 70 فیصد حصہ کسانوں پر مشتمل تھا، اب صرف 40 فیصد افراد اس پیشے سے منسلک ہیں۔

پہلے پہل صرف 75 کلومیٹر پکی سڑک تھی، اب یہ چار ہزار کلومیٹر تک پہنچ چکی ہے۔ تعمیرات

جاری ہیں۔ کچھ عرصہ قبل تک صرف پانچ سیکنڈری سکول تھے، اب بہت بڑھ گئے ہیں، خصوصاً دیہاتی علاقوں اور محافظات اور اضلاع میں۔ اب تین لاکھ تک بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں، دس ہزار آبادی کے لیے تین ڈاکٹر ہیں اور صحت عامہ کی سہولیات کا جال پھیلا ہوا ہے۔ اجتماعی زرعی فارم قانون کے ذریعے نہیں بلکہ ترغیب اور تلقین کے ذریعے بنوائے گئے۔ ہم بہت نرم پالیسی پر گامزن ہیں۔ مارکیٹ میں پیداوار کی فروخت، تخم مہیا کرنا، ٹریکٹر اور دیگر مشینری دینا ہماری زرعی خدمات کا ایک حصہ ہے۔

14 مارچ ہی کو شمالی یمن کے ساتھی پھر آئے۔ ہم اپنی پارٹی کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ ہمیں پاکستان کے حالات کی خبر دی اور وہاں پر کمیونسٹوں کی جدوجہد کی نوعیت کے بارے میں مطلع فرمایا۔ پاکستان چونکہ جزیرہ نما عرب پر زیادہ اثر رکھتا ہے تو فطری طور پر پاکستان پر بہت مباحثہ کیا۔ پاکستان سارے عربوں کے لیے ایک خطرہ ہے، خاص طور پر سعودی عرب کے ساتھ قریبی تعلقات نے اس خطرے کی شدت دوگنا کر دی ہے۔ وہ چیزیں اسلامی رنگ میں رنگ دیتے ہیں۔ اس لیے تمام جمہوری اور ترقی پسند قوتوں کو متحد ہونا چاہیے۔

26 ستمبر 1962ء: یمنی انقلاب برپا ہوا۔ یہ انقلاب فوج لائی اور عوام نے اس کی حمایت کی اور سیاسی پارٹی کی تائید اسے حاصل رہی۔ امام کا رژیم فیوڈل اور قرون وسطائی تھا۔ انقلاب اپنے ساتھ ہی رد انقلاب عناصر کو بھی لاتا ہے۔ ان عناصر نے زور پکڑا، جن کا مقصد امام کو بحال کرانا تھا۔ تاہم مسلح جدوجہد کی وجہ سے وہ کامیاب نہ ہو سکے، کیونکہ منظم سیاسی سرگرمی اور مسلح جدوجہد جاری تھی۔ اس وقت برطانوی سامراج جنوبی یمن میں موجود تھا، وہ پرانے نظام کی حمایت میں تھا اور امام کے پیروکاروں کو اسلحہ بھی فراہم کر رہا تھا۔ اسلحہ مغرب کا تھا اور پیسہ سعودی عرب کا۔ سعودی عرب آج بھی یمنی عوام کا تاریخی دشمن ہے۔

امام رژیم کی قبائل اور ان کے سرداروں کی جانب سے حمایت کی جاتی رہی۔ مقامی رجعت اور بیرونی مداخلت کے خلاف جنگ جاری رہی۔ سماج میں امام کے حمایتیوں اور جمہوریت پسندوں کے درمیان لڑائی ہو رہی تھی۔ اسلام کا اثر، حب امام، جہالت اور سعودی پیسہ ہر چیز پر اثر انداز ہو رہا تھا اور ہو رہا ہے۔ جمال عبدالناصر نے اپنی افواج انقلابی عناصر کی مدد کے لیے بھیج دیں۔ ان کی تعداد ستر ہزار سپاہ تھی، انھوں نے انقلاب کو بچا لیا۔ پھر ناصر نے اپنی فوج کو واپس بلا لیا۔ یہ

واپسی عرب معاشرے کے اتفاق کے بعد لائی گئی۔ جب مصر نے فوجیں واپس بلالیں تو سعودیوں کو انقلاب دشمنوں کی مدد بند کردینی چاہیے تھی، کیونکہ مفاہمت میں یہی طے پایا تھا۔ تاہم سعودیوں نے معاہدے کا پاس نہ کیا اور شاہ پرستوں کی مدد جاری رکھی۔ سعودی مدد سے فوجوں نے صنعا کا محاصرہ کیا جو 72 دن تک جاری رہا، نومبر 1967 میں شروع ہوا اور فروری 1968ء تک جاری رہا۔ انھیں یقین تھا کہ صنعا پر قبضہ کرلیں گے، لیکن محاصرہ ناکام رہا اور وہ شکست سے دوچار ہوئے۔ گو کہ اضلاع پر قابض ہوگئے اور منصوبوں کو تباہ کردیا۔ عوام نے از حد جدوجہد کی اور بیرونی قومی قوتوں نے ان کی حمایت کی۔

پھر برطانیہ عدن سے نکل گیا، یہ ترقی پسندوں کی بڑی کامیابی تھی۔ پہلے جنوب دشمن تھا، اب دوست خطہ بن گیا۔ پھر ہمارے ترقی پسند یکجا ہوئے اور یمنی پیپلز یونائیٹڈ پارٹی کے نام سے پارٹی تشکیل دی۔ رفیق شامی انھی کے قائدین میں سے ایک تھا۔ فوج کے ترقی پسندوں میں ایسا اتحاد قائم ہوا جس میں جمہوریت کا دفاع یا موت تھی۔ مگر ان کے نظریات متفاوت تھے۔ سامراج دشمن جدجہد نے نظریاتی پیش رفت کا راستہ ہموار کیا اور یوں بعد میں مارکسیت نظریے کی طرف بڑھنا ممکن ہوا۔ پانچ تنظیمات تھیں:

۱۔ الاتحاد الشعب دیموقراطیہ (یہ مارکسی تھا)۔
۲۔ حزب العمل (عرب قومی تحریک سے نکلی تھی)
۳۔ حزب البعث
۴۔ انقلابی دفاعی شوریٰ
۵۔ نام ضبط نہیں

ان پانچ پارٹیوں نے کوشش کی اور جدوجہد کو مارکسیت اور لینینی راستے پر ڈال دیا۔ امام کی رژیم کے بعد جمہوریت میں پھوٹ پڑ گئی، جمہوری قوتیں ایک طرف، بورژوائی اور جاگیردار دوسری طرف ہوگئے۔ یہ ایک طبقاتی جدوجہد تھی۔ دوسری طرف کی قوتوں نے اپنی حاکمیت کو سعودی مدد اور اندرونی رجعت کے بل بوتے پر استوار کیا اور انقلاب کو دائیں جانب موڑ دیا۔ فوج اور پولیس سے انقلابیوں کو نکالا گیا اور جیلوں میں بھر دیا گیا۔ 1970ء میں سعودیوں سے معاہدہ طے پا گیا کہ انقلابی قائدین کو ہٹا دیا جائے گا اور جاگیردارانہ نظام مسلط کیا جائے گا۔

اس کے بعد جدوجہد سارے یمن میں پھیل گئی۔ شمال اور جنوب کے درمیان جنگ ہوئی۔ شمالی یمن میں اب بھی ترقی پسندوں کو قتل کیا جاتا ہے۔ دیہاتوں میں جاگیرداروں کے خلاف سرگرم جدوجہد تھی۔ ہم قومی جمہوری محاذ چاہتے تھے۔ 1976ء میں اس طرح کا قومی جمہوری فرنٹ بن گیا تھا، جس میں پانچ لیفٹ اور ایک قومی پارٹی اکٹھے ہوگئے تھے۔ ستمبر انقلاب کے قائدین نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ ایک پروگرام بنایا گیا۔ 78-1976ء تک فرنٹ کے عراقی بعث پارٹی کے ساتھ تعلقات تھے اور ایک ہی محاذ تھا۔ پھر شامی بعث پارٹی سے تعلقات استوار کیے۔ 1978ء میں سعودی مدد سے شمالی یمن میں ایک انقلاب دشمن کودتا برپا ہوئی۔ اس کے بعد دیہاتوں میں قتل قتال اور لڑائی شروع ہوئی۔ کسانوں نے مسلح جدوجہد کا راستہ اپنالیا۔

مارچ 1978ء میں مارکسی پارٹیوں نے فیصلہ کیا، کہ مارکسزم اور لینینزم کی بنیاد پر 'یمنی ڈیموکریٹک یونائیٹڈ فرنٹ' (YDUF) تشکیل دیں۔ اس کے بعد فوجی گروپس بنائے گئے اور رژیم کے خلاف جنگ کا آغاز ہوا۔ 1982ء میں فرنٹ اور صدر عبداللہ صالح الصالح کے درمیان مفاہمت ہوگئی، جس کا بنیادی نکتہ مسلح جدوجہد کا راستہ ترک کرنا تھا۔ اب سیاسی راستوں سے جدوجہد کر رہے ہیں۔

ہمارا ایک نشریہ بھی ہے، جو فرنٹ کے نام سے نہیں ہے۔ اس طرح ایک جریدہ بھی ہے، وہ بھی فرنٹ کے نام سے نہیں، مگر فرنٹ کے نظریات اور افکار کی اشاعت کرتا ہے۔ صدر صالح سمجھوتے کے باوجود قتل و غارت کرتا ہے۔ 1982ء کے بعد 150 افراد شہید کیے گئے ہیں۔ معاہدے کے بعد مرکزی کمیٹی کے سات ارکان قتل ہوچکے ہیں۔ جیلیں بھری پڑی ہیں، اب جدوجہد کے نتیجے میں کئی رہا ہوکر واپس آئے ہیں۔

مسلح جدوجہد کے علاقوں میں کسان اپنی زمینوں کو کاشت نہیں کرسکتے۔ بہت سے ایران کے خلاف جنگ کے لیے جبری بھرتی کیے جاچکے ہیں۔ ہم اعلانیہ اور مخفی پلیٹ فارموں میں کام کرتے ہیں۔ ہم مزدوروں، کسانوں اور طالب علموں کی رسمی یونینوں میں کام کرتے ہیں اور اس طرح ایک انڈر گراؤنڈ ترجمان نشریہ بھی نشر کرتے ہیں اور خفیہ طور پر اسے بانٹتے ہیں۔ قومی حاکمیت کے لیے اور سامراج اور سعودی عرب کے خلاف جمہوریت کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ سیاسی قیدیوں کی آزادی، قتل و قتال کا خاتمہ، جمہوری حقوق کا احیا اور معیشت کی بہبود چاہتے

ہیں۔ مشترکہ جدوجہد کے لیے قومی تنظیموں اور شخصیات کے ساتھ مباحثے کرتے ہیں۔ امریکا اور مغرب کا اثر بڑھ رہا ہے۔ سعودی عرب اخوان کو مضبوط کر رہا ہے۔ فوجی بورژوائی اور جاگیرداروں کے مابین بھی تضاد ہے۔ اخوان تعلیمی میدان میں سرگرم ہیں۔ آزادی اور جمہوریت کا فقدان ہے۔ معاشی اور سماجی بحران موجود ہے۔ 8 ملین کی آبادی ہے، دس ہزار سیاسی قیدی تھے۔ ابھی تک ہزار کے لگ بھگ جیلوں میں ہیں، باقی رہا کیے جا چکے ہیں۔

سوویت یونین اور شمالی یمن کے درمیان 1928ء میں پہلا تجارتی معاہدہ ہوا۔ دوسرا معاہدہ 1964ء میں ہوا۔ انقلاب سے پہلے سوویت یونین یمن کو اسلحے کی مدد دیا کرتا تھا۔ یہ تاریخی تعلقات ہیں، بعد کا معاہدہ اس کی تجدید ہے۔ جس وقت صنعا کا محاصرہ ہو، اتو سوویت یونین نے انقلابیوں کی مدد کی۔ ان تاریخی تعلقات کے ساتھ موجودہ قریبی روابط بھی ہیں۔ اندرون ملک جمہوری قوتوں کی موجودگی اور جنوب میں جمہوری یمن کا وجود شمالی یمن کو مجبور کرتا ہے، کہ سوویت یونین کے ساتھ اچھے تعلقات قائم رکھے۔ ہم نئے معاہدے کا استقبال کرتے ہیں۔ یمن کوشش کرتا ہے کہ اپنے آپ کو مغرب اور مشرق دونوں کے ساتھ غیر جانبدار رکھے۔ اختلافات اور تنازعات کے باوجود ہم عبداللہ الصالح صالح سے ملتے ہیں۔ گذشتہ دنوں میں فرنٹ کے سربراہ سلطان احمد اور اس کے ساتھی نے صدر صالح سے ملاقات کی۔

15 مارچ 1985ء: ہادی احمد ناصر اور علوی صاحب نے ہوائی اڈے پر ہمیں رخصت کیا۔ جہاز ساڑھے تین بجے عدن اور ماسکو ٹائم پر روانہ ہوا۔ سوا تین گھنٹے میں قاہرہ پہنچے۔ ایک گھنٹے کے توقف کے بعد بارہ بجے رات کو ماسکو کے شریمتو اہوائی اڈے پر اتر گئے۔ جہاز میں بھرے سگریٹ کے دھویں سے میری طبیعت خراب ہوئی اور میں نے الٹیاں کیں۔ یہ سفر میں نے افراسیاب کی جگہ پر، جو اس وقت مشرقی برلن میں تھا، کیا تھا۔ چونکہ نازش کو زبان نہیں آتی تھی اس لیے مجھے ساتھ لے لیا تھا۔

19 مارچ کو نازش علاج کی غرض سے ماسکو سے مشرقی جرمنی چلے گئے اور میں نے ان کے ہاتھ افراسیاب کو خط بھجوایا۔ سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی میں پاکستانی امور کے ذمہ دار 'پلیشوف' اور 'پراوالوف' سے ورلڈ پیس کونسل اور افروایشیائی یک جہتی تنظیم (آپسو) میں کمیونسٹ پارٹی کی نمائندگی کے بارے میں باتیں ہوئیں اور میری تجاویز مان لی گئیں۔ پراوالوف

نے مجھے بمعہ فیملی آرام کی غرض سے سوویت پارٹی کی طرف سے دعوت دی۔ میری یہ بات بھی مان لی گئی کہ ہر سال دس طالب علم اور پانچ آدمی علاج اور آرام کے لیے سوویت یونین میں قبول کیے جائیں گے۔

میں ہمیشہ سوویت دوستوں کی جانب سے عزت و احترام سے مستفید ہوتا رہا۔ اگر بغیر دعوت اور پروگرام کے بھی ماسکو چلا جاتا تب بھی مجھے پارٹی ہوٹل میں ٹھہرایا جاتا۔ موٹر اور ترجمان مہیا کیے جاتے اور دیگر تمام مراعات بھی حاصل ہوتیں۔ ایک مرتبہ میں سوویت یونین میں تھا کہ وزارت دفاع کی طرف سے افغان وزارت دفاع میں سیاسی کیسار اور سوویت وزارت دفاع کی طرف سے افغان وزارت داخلہ کے سیاسی کیسار ذبیح اللہ زیارمل اور منترو کے منگل کورسز کے لیے ماسکو آئے ہوئے تھے۔ وہ اپنی میزبان وزارتوں کے مہمان خانوں میں مقیم تھے۔ میں ہر شام انہیں بیلے، کنسرٹ، میوزک اور دیگر پروگراموں میں مفت ٹکٹ پر ساتھ لے جاتا۔ یہ ٹکٹ صرف مرکزی کمیٹی کے معتبر مہمانوں کا ہی استحقاق تھا۔ سوویت دوستوں کی فراخ دلی، محبت، خلوص اور توجہ میری زندگی کی خوش گوار یادوں میں سے ایک روشن باب ہے۔

کارمل اور نجیب دور کی متفرق یادداشتیں

5 مارچ 1982ء: اجمل، تورلالی، محراب الدین پکتیاوال اور میں بھارتی ہسپتال کے بھارتی ڈاکٹر مہربان سنگھ کے ہمراہ جہاز میں جلال آباد آئے۔ باچا خان کا پاؤں قالین پر سے پھسل گیا تھا اور ان کے کولہے کی ہڈی کھسک کر دوسری ہڈی کے خلا میں دھنس گئی ہے۔ دوپہر کا کھانا ننگرہار خاد کے سربراہ ڈاکٹر ضمیر کے ہاں کھایا۔ چار بجے باچا خان کو ساتھ لے کر واپس کابل آگئے اور باچا خان کو چارصد بستر ہسپتال داخل کیا۔

6 مارچ: معلوم ہوا ہے کہ باچا خان کی ہڈی میں درز ہے۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ اس عمر میں اس کا علاج مشکل ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کا اثر پھیپھڑوں اور دیگر اعضا تک پھیل جائے۔ خدا کرے ایسا نہ ہو، کیوں کہ موصوف کی موت سیاسی طور پر خطرناک ہے۔ اس لیے تجویز کیا گیا ہے کہ موصوف کو علاج کی غرض سے بھارت لے جایا جائے۔ ایک تو وہاں علاج کی سہولیات بہتر ہیں اور دوسرے سیاسی خطرے سے افغانستان بچ جائے گا۔ [لیکن باچا خان معجزانہ طور پر شفایاب ہونے لگے۔]

24 مارچ: ولی خان، بیگم نسیم ولی، یحییٰ جان لالہ اور اس کی بیوی جو باچا خان کی بیٹی ہے مہرتاجہ، باچا خان کی عیادت کے لیے تورخم کے راستے جلال آباد آئے۔ ہم نے ان کا استقبال تورخم پر کیا۔ تورخم پر ان کا استقبال سلیمان لائق، کور کمانڈر میاں خیل، زون کے سربراہ سرور یورش، ننگرہار پارٹی کے سیکرٹری خدائیداد بشرمل، گورنر قدیر ہوتک، ڈاکٹر ضمیر، اجمل خٹک اور میری طرف سے کیا گیا۔ راستے میں جگہ جگہ لوگ ان کے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ پھر وہاں سے طیارے کے ذریعے کابل چلے آئے، شام پانچ بجے کابل پہنچے۔ کابل ہوائی اڈے پر حکمران پارٹی کے لیڈروں نور احمد نور، سلیمان لائق، نجیب اللہ، صالح محمد زیرے، دستگیر پنجشیری، عبدالرشید آرین، ڈاکٹر پکتیاوال، نظر محمد، ڈاکٹر اناہیتا راتبزاد، رشید وزیری اور مفتاح الدین صافی نے ان کا استقبال کیا۔ چوں کہ دوپہر کا کھانا جلال آباد میں باغ جمہوریت میں کھایا تھا، تو مہمان ایئرپورٹ سے سیدھے باچا خان کو دیکھنے ہسپتال روانہ ہوئے۔ [وہ معتبر مہمانوں کی طرح کابل میں مقیم رہے اور پھر اسی شان اور دبدبے کے ساتھ انھیں تورخم پر رخصت کیا گیا۔]

28 اپریل 1982ء: تورخم کے راستے باچا خان پشاور کے لیے رخصت ہوئے۔ سلیمان لائق، اجمل خٹک اور میں ان کے ساتھ تھے۔ تورخم پر ہزاروں لوگ ان کے استقبال کے لیے آئے تھے۔ وہ نعرے لگا رہے تھے: افغان انقلاب زندہ باد، باچا خان زندہ باد، ولی خان زندہ باد، اجمل خٹک زندہ باد اور ببرک کارمل زندہ باد! اس طرح ببرک ولی بھائی بھائی کے نعرے بھی بلند ہوئے۔ میں وہاں پر عبدالعزیز خان کاکا، ثمین جان خان، لطیف آفریدی، میاں شاہین شاہ، جلال الدین اکبرجی، اسفندیار، بشیر مٹہ، کیمور، ہدایت باچا، بشیر بلور، غلام بلور، ارباب ہمایوں، ارباب سیف الرحمان، ارباب نثار، نثار لالہ، شاہ منصور کے سیکرٹری، دلبر خان ٹکر، بابو اکرم اور اجمل کے گھرانے سے ملا۔ اکبرجی، میاں شاہین شاہ اور لطیف آفریدی سے پرانے نیپ کے احیا کی ضرورت پر بات کی۔

کابل میں ولی خان کی منطق (مارچ 1982ء)

بھٹو پختونوں اور بلوچوں کو جدا کرنا چاہتا تھا۔ پہلے پختونوں پر کوشش کی۔ مگر جب اس نے بلوچستان حکومت کو برطرف کیا، اور پختونوں نے بلوچستان حکومت کی برطرفی پر استعفے دے دیے تو یہ سکیم ناکام ہوگئی۔ پھر سید احمد خان اور ایف ایس ایف کے چیف مسعود محمود جیسے لوگوں نے مشورہ دیا کہ پختون اپنے دوستوں کو نہیں چھوڑتے، بلوچوں پر کام کرنا چاہیے۔ اس کے بعد سید احمد خان نے انھی خطوط پر کام کرنا شروع کیا۔ گل خان نصیر کو ساتھ ملایا اور اس میں عطاء اللہ مینگل نے بھی مدد کی۔ بلوچوں اور خصوصاً بزنجو نے حیدر آباد ٹریبونل کے ٹوٹنے سے پہلے ضمانتوں کی درخواستیں جمع کروادیں، مگر ہم نے انکار کر دیا۔ ہم کہتے تھے کہ مقدمہ باقی ہے اور مدعی خود جیل چلا گیا ہے۔ مقدمہ پر دستخط کنندہ وزارت قانون کا سیکرٹری نظریۂ پاکستان کی تشریح نہ کر سکا اور اس نے بیان دیا کہ میں نے بند آنکھوں سے دستخط کیے تھے۔ یوں وہ بھی منکر ہو گیا اور مقدمے کی بنیاد ختم ہوگئی۔ اسی بنیاد پر ٹریبونل اور مقدمہ کالعدم ہیں تو پھر ضمانت کس لیے؟

ولی خان کہتے ہیں کہ جب نیپ پر پابندی لگی تو وہ پارٹی رہ گئی، اس لیے میں نے بلوچوں (مری، بزنجو اور مینگل) کو کہا کہ اس کے بعد ہم نئے سرے سے بندھن میں بندھیں گے۔ ایک دوسرے پر اپنے آپ کو واضح کریں گے، ویسا نہیں ہوگا جیسا کہ پہلے ہوا۔ ایک تو ہم نے پہاڑوں پر چڑھنے کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔ دوسرا میں باچا خان کے عدم تشدد کے فلسفے کا پیرو کار ہوں، آپ لوگوں کا ساتھی بن گیا۔ خیر بخش نے کہا کہ مجھے خود بھی پتا نہیں کہ یہ سب کس طرح ہوا؟ پارٹی (نیپ) ایک تھی، پارٹی کو فیصلہ کرنا چاہیے تھا۔ آپ لوگ نہ صرف پارٹی کے فیصلے کے بغیر پہاڑوں پر چڑھ گئے، بلکہ آپ کے ہاں پنجاب اور سندھ اور کراچی کے فورتھ انٹرنیشنل والے بھی ساتھ تھے اور یوں نئی داستانوں نے جنم لیا۔[۲۷]

30 اکتوبر 1982: بی بی سی نے شام کو خبر نشر کی ہے کہ باچا خان کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ باچا خان کی عمر نوے برس ہے، بیمار ہیں، پاؤں ٹوٹا ہوا ہے اور چارپائی سے نہیں اٹھ سکتے۔ لیکن پھر بھی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اس گرفتاری سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف کی سرگرمیاں ضیاء الحق حکومت کے لیے کس درجے میں قابل قبول ہیں۔ اس سے پہلے ان کو پختون رسالے کے

اجراء کے لیے ڈیکلریشن دینے سے انکار کیا گیا۔ [بعد میں باچا خان کے تعلقات ضیاء سے بہتر ہوگئے تھے۔ ضیاء الحق کی کودتا کے بعد ولی باغ کے تعلقات فوجی حکمرانوں سے قربت کے تھے۔ اس ضمن میں باچا خان کئی بار جنرل ضیاء الحق سے ملے اور ضیاء الحق کا باچا خان کے بارے میں تبصرہ یہ تھا کہ وہ ایک وفادار پاکستانی ہیں، اس سلسلے میں دونوں کے بیچ خط و کتابت بھی ہوئی۔ باچا خان نے ایک خط ضیاء کو لکھا تھا، جس کا جواب ضیاء الحق کے دفتر نے دیا۔ یہ خط کابل میں پاکستانی سفارت خانے کے توسط سے آیا تھا۔][۲۸]

وعدہ جو وفا نہ ہو سکا

5 اپریل 1983ء: آج جمعہ کا دن تھا۔ میں نے دوپہر کا کھانا گھر میں کھایا، اگرچہ لائق صاحب نے اپنے گھر بلایا تھا۔ جب میں اوپر لائق صاحب کے اپارٹمنٹ گیا تو معلوم ہوا کہ وہ پانچویں منزل پر ڈاکٹر نجیب کے گھر انھیں جنرل بننے پر مبارک باد دینے گئے ہیں۔ میں نے 'تو کل' ڈاکٹر نجیب کو سیڑھیوں پر چڑھتے دیکھا، تو اسے مبارک باد دی۔ آج بھی ڈاکٹر نجیب کے گھر گیا تو وہ بہت اخلاص سے ملا اور دل کی گہرائیوں سے باتیں کیں، جن کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

''میرا بڑا آدمی بننا کوئی اتفاق نہیں۔ میری شخصیت کو نیچے (پاکستان) کی تحریک نے چمکایا ہے۔ اس بات کو میں اور سوویت رفقا جانتے ہیں اور اس میں تم (صوفی) نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ تم فکر نہ کرو، تحریک میں تم بہت بڑے آدمی ہو۔ ہم آپ کو کبھی نہیں بھلائیں گے۔ آپ کی حیثیت ہمارے لیے ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں ایک کی سی ہے۔ میری استطاعت میں جو کچھ ہوا، تمہاری خدمت میں حاضر ہوگا۔ مجھے حقیقی خوشی اس وقت ملے گی جب آپ لوگ اپنے ہی وطن میں برسرِ اقتدار آئیں گے، وہ ہماری اصلی مسرت کا دن ہوگا۔''

تبصرہ: مگر جب یہ حضرت بلاشرکت غیرے اقتدار کا مالک ہوا تو پیسوں کے بنڈل دوسروں کے گھر بھیجتا رہا اور مجھے میرے حریفوں کی شہ پر آئی ایس آئی کا ایجنٹ قرار دیا۔ حتیٰ کہ میری گرفتاری تک کے درپے ہوا۔ ہم پختون بہت کوتاہ فکر اور بے اعتبار لوگ ہوتے ہیں اور پھر سیاست تو ہے ہی بہت لعنتی چیز۔ نجیب کو اردو اور انگریزی سکھانے میں میرا بنیادی کردار رہا تھا اور اسے پاکستانی تحریک سے آگاہ کرنے میں بھی بنیادی کردار میرا ہی تھا!

افغانستان سے واپسی اور آمد ورفت

سوویت یونین کی فوجوں کی واپسی شروع ہو چکی تھی اور چند مہینے بعد یعنی اپریل 1989ء میں یہ عمل مکمل ہونے والا تھا۔ یہ دسمبر 1988ء کا مہینہ تھا۔ میرے پورے خاندان، بیوی اور دونوں بیٹیوں کو سوویت دوستوں نے دعوت پر بلایا، ہم پارٹی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہمارا پروگرام یہ تھا کہ 'سوچی' کو سیر اور آرام کے لیے جائیں گے اور وہاں سے واپسی پر گھر والے کابل، جبکہ میں بلغاریہ نکل جاؤں گا۔ صوفیہ میں افغان سفیر محراب الدین پکتیا وال میرا دوست تھا اور اس نے دعوت دے رکھی تھی کہ کچھ وقت اُس کے ساتھ گزاروں اور میں نے وعدہ کرلیا تھا۔ یوں بھی افغانستان میں اب ہماری زندگی محض انتظار کا ہی دوسرا نام تھی اور کرنے کو کوئی کام نہیں تھا۔

لیکن یہ سب منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ اجمل خٹک نے کابل سے ٹیلی فون کیا کہ ہم نے فیصلہ کیا ہے، واپس پاکستان چلے جائیں۔ میں نے تفصیلات جاننی چاہیں تو کوئی واضح جواب نہ دیا، بس اتنا بتایا کہ صدر نجیب اللہ سے بھی بات ہوئی ہے اور اُن کا بھی مشورہ ہے کہ ہمیں واپس جانا چاہیے۔ سوویت یونین کی فوجوں کی واپسی میں چند ماہ رہ گئے تھے۔ اس وقت پر یہ فیصلہ مجھے بہت عجیب لگا، لیکن جب فیصلہ ہو چکا تھا تو میرے بس میں کچھ نہ تھا۔ میں رفاقت، غیرت، مصلحت اور پشتون روایات کے اصولوں سے بندھا ہوا تھا۔

ماسکو سے سیدھا کابل آیا اور وہاں اجمل خٹک کے گھر پہنچا۔ میں نے پوچھا کہ کیا پاکستان میں ولی خان وغیرہ سے بات ہوئی ہے، کمیونسٹ پارٹی کی کیا رائے ہے؟ لیکن میرے سوالوں کا کوئی شافی جواب اُن کے پاس نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ فیصلہ اجمل اور افراسیاب نے میری غیر موجودگی میں کیا اور اب مجھے طے شدہ باتوں پر محض عمل کرنا تھا۔

ماحول ایسا تھا کہ جب کابل میں نسبتاً امن تھا، کابل حکومت مضبوط تھی، ہم سب کابل حکومت کی مہمانداری کے لطف اٹھا رہے تھے، لیکن اب سوویت فوجوں کی واپسی پر نجیب حکومت خطرے میں تھی تو ہم انھیں اکیلا چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ اُس وقت ساری دنیا، بشمول سوویت یونین اس مغالطے میں تھی کہ سوویت فوجوں کے نکلتے ہی نجیب حکومت ختم ہو جائے گی۔ ذاتی طور پر میں حکومت کا مہمان نہ تھا، بلکہ اپنے گھر میں رہ رہا تھا۔ حکومت نے مجھے دیگر کوئی سہولت جیسے

محافظ، گاڑی وغیرہ کچھ فراہم نہیں کی تھیں۔ میری حیثیت وہی تھی جو دیگر افغانوں کی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ میرے سسر حکومت اور پارٹی کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ یہ الگ بات کہ اس رشتے داری نے مجھے ہر جگہ نقصان ہی پہنچایا۔ اس کی دو وجوہات تھیں پہلی یہ کہ وہ کارمل کے مخالفین میں رہے تھے، اس لیے نجیب کے لیے قابل اعتماد نہ تھے۔ صرف انہیں استعمال کرتا تھا اور دوسرا یہ کہ اُن کی طبیعت ہی ایسی تھی، جسے کابلیوں کے محاورے میں 'خودکش بیگانہ پرست' یعنی اپنوں کو مارنے والا اور بیگانوں کو پوجنے والا۔

پھر وہ دن آیا، جب صدر نجیب نے ہمیں الوداعی پارٹی دی۔ اس میں خیر بخش مری بھی مہمان کی حیثیت سے شامل تھے۔ اس پارٹی میں خیر بخش مری نے پوچھا کہ یہ لوگ تو واپس جا رہے ہیں، کیا آپ لوگوں کا میرے لیے بھی یہی جواب ہے؟ اُس موقع پر صدر نجیب نے بے ساختہ کہا کہ جانے کا فیصلہ اِن کا اپنا ہے۔ جب یہ نہیں رکنا چاہتے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں نے نہ انھیں جواب دیا اور نہ ہی آپ کو جواب دے رہا ہوں۔ یہ سنتے ہی میں نے سوالیہ نظروں سے اپنے ساتھیوں کو دیکھا۔

اگلے دن میں اجمل خٹک کے پاس گیا اور پوچھا کہ ڈاکٹر نجیب نے ہمیں واپسی کا نہیں کہا، ولی خان اور کمیونسٹ پارٹی نے نہیں بلایا تو آخر ہماری واپسی کی منطق کیا ہے؟ اجمل خٹک روٹھے ہوئے تھے۔ کہنے لگے ڈاکٹر صاحب کبھی ایک بات کرتے ہیں کبھی دوسری، میرے پاس اس مرض کا کوئی علاج نہیں۔ واپسی کے معاملے میں افراسیاب اجمل سے بھی دو قدم آگے تھا اور کابلیوں کے محاورے کے مطابق اپنے دونوں پاؤں ایک ہی موزے میں ڈالے، تیار بیٹھا تھا۔

لائق صاحب نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب کا تاثر یہ ہے کہ اب تک ہم مضبوط تھے تو یہ ہمارے ساتھ تھے، اب مشکل وقت آنے والا ہے تو یہ نصف راہ میں ہمیں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ میں نے کہا میں مجبور ہوں، کیا کر سکتا ہوں۔ اگر اِن کے ساتھ نہ گیا تو پورے پاکستان میں یہ میرے خلاف پروپیگنڈا کرتے پھریں گے کہ صوفی کے تو کابل میں مزے ہی مزے ہیں، اس لیے تو وہ پاکستان نہیں آتا۔ لیکن کم از کم میں اپنا مقدر آپ سے جدا نہیں سمجھتا۔

لائق صاحب کے مشورے پر میں اُن کے ساتھ ڈاکٹر نجیب کے پاس گیا۔ میں نے اُن سے کہا کہ میں ابھی اِن کے ساتھ واپس جا رہا ہوں، لیکن میرے اور آپ کے راستے یا مقدر جدا نہیں۔

میں بہت جلد واپس آؤں گا۔ اگر موت آنی ہے تو اکٹھے مریں گے۔ میں آپ کا ساتھی ہوں، یہیں رہوں گا۔ اسی لیے میں اپنا خاندان اپنے ساتھ پاکستان نہیں لے جا رہا۔ (اُس وقت میری اور لائق صاحب کی کیفیت یہی تھی کہ ہم ایک ایسے کھیل کا شکار ہو گئے ہیں جس میں کوئی بھی سرا ہمارے ہاتھ میں نہیں)۔ نجیب نے میری باتیں غور سے سنیں اور کوئی وعدہ نہیں کیا۔ البتہ اُس کے سامنے لائق صاحب نے کہا کہ اگر تم واپس آئے تو تمہیں وزارت خارجہ میں نائب وزیر کا عہدہ دے دیں گے، جسے نجیب نے رد نہیں کیا۔

ہمارے پاس پاکستان کے پاسپورٹ تو تھے نہیں۔ سفارت پاکستان میں سفیر نہیں تھا، سارا کام ناظم الامور نمٹاتا تھا جو اُس وقت فدا یونس تھا۔ میری ایک غلط فہمی یہ تھی کہ ہماری واپسی کی بنیاد یہ ہے کہ بے نظیر بھٹو نے تمام سیاسی مخالفین کی عام معافی کا اعلان کیا ہے۔ اس لیے اسی بنیاد پر فدا یونس نے وزارت خارجہ اور دیگر حکام کی رضامندی سے ہماری واپسی کا راستہ ہموار کیا ہوگا۔ کئی سال بعد مجھے معلوم ہوا کہ بے چارہ فدا یونس بھی ان سب امور سے بے خبر تھا۔ اسے بس اتنا معلوم تھا کہ ہم واپس جا رہے ہیں اور اسلام آباد وزارت خارجہ سے کلیرنس آ چکی ہے۔ کابل کے سفارت خانے نے ہمیں پاسپورٹ کے بجائے سفری دستاویزات (جنھیں افغان 'ورق عبور' کہتے ہیں) دیں، جن پر ہمارے فوٹو چپکا دیے گئے۔

ان سفری دستاویزات پر بھارتی سفارتخانے سے ٹرانزٹ ویزے لگوائے گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مجاہدین نے کابل کا محاصرہ کر رکھا تھا اور طورخم کا راستہ مسدود تھا۔ پاکستان آنے کے لیے سب سے محفوظ سفر براستہ دہلی تھا۔ بھارتی سفارتخانے کے عملے میں کئی افراد سے میری شناسائی تھی۔ میں سفیر سے ملا، ان کے علم میں تھا کہ ہم واپس جا رہے ہیں۔ اُس نے ویزے لگائے اور ساتھ ہی کہا کہ چوں کہ ہم دہلی کے راستے جا رہے ہیں، تو بہتر ہوگا کہ چند دن دہلی میں بھارتی حکومت کے مہمان کی حیثیت سے گزاریں۔ میں نے اپنے لیے یہ دعوت فوراً قبول کر لی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مجھے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ 'آریانہ ایئر لائن' کا جو طیارہ دن بارہ بجے دہلی کے لیے روانہ ہوتا ہے وہ کبھی وقت پر روانہ ہی نہیں ہوا کرتا۔ اس لیے ہم دہلی سے چار بجے کی پی آئی اے کی فلائٹ نہیں لے سکیں گے اور رات بہر حال ہمیں دہلی میں ہی گزارنی ہے۔ اس لیے حکومتی مہمان کے طور پر عزت سے وقت گزارنا زیادہ بہتر ہوگا۔

اجمل اور افراسیاب کو واپسی پر میں نے بھارتی سفیر کی دعوت سے آگاہ کیا۔ اجمل نے انکار کر دیا اور افراسیاب نے یہ حاشیہ بھی چڑھایا کہ اس طرح تو ہم ماسکو۔ کابل۔ دہلی مثلث کی تکمیل کر لیں گے۔ پاکستان میں ہمارے پہنچنے سے پہلے کہا جائے گا کہ ماسکو، کابل اور دہلی سے ہدایات لے کر آئیں ہیں۔ میں نے انھیں بہت سمجھایا کہ ہمیں ہر حال میں رات دہلی میں ہی گزارنی ہے تو یہ طریقہ زیادہ باعزت ہے۔ پاکستان کے حوالے سے اُن کے خدشات پر میرے منہ سے وہ محاورہ بھی نکل گیا کہ 'نو سو چوہے کھا کر بلی حج کو چلی'۔

اجمل خٹک کا کہنا تھا کہ ہم بغیر کسی اطلاع کے رات کے وقت لاہور پہنچیں گے۔ وہاں سے ٹیکسی لے کر راتوں رات اپنے گاؤں میں ہوں گے جب لوگ صبح نیند سے بیدار ہوں گے تو ہم اپنے گھروں میں ہوں گے۔ کسی کو پتا بھی نہیں ہو گا کہ ہم اپنے گھر پہنچ چکے ہیں۔

کابل سے رخصتی سے پہلے ڈاکٹر نجیب تھیلیوں کے ساتھ اجمل اور افراسیاب سے ملے۔ چوں کہ میں نے واپس کابل آنے کا کہا تھا اس لیے یہاں بھی تھیلی سے محروم رہا۔ البتہ مجھے فقط جیب خرچ دیا گیا۔ میرے پاس سامان سفر میں صرف کپڑے تھے۔ افراسیاب اپنا سامان قبائلی راستے سے بھجوا چکا تھا، جبکہ اجمل نے کچھ سامان بھجوایا تھا اور کچھ ساتھ لے کر دہلی روانہ ہو رہے تھے۔ افغان دوست کابل ایئر پورٹ پر رخصت کرنے آئے تھے۔

دہلی ایئر پورٹ پہنچے تو پی آئی اے لاہور کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔ میں تو اکیلا تھا لیکن اجمل اور افراسیاب اپنے بیوی بچوں اور ڈھیر سارے سامان کے ساتھ پریشان کھڑے تھے۔ بھارتی حکومت کی مہمانداری کی پیش کش ٹھکرا چکے تھا اور اب رہنے کا کوئی ٹھکانہ معلوم نہ تھا۔ میں نے ایئر پورٹ سے اپنے بھارتی دوست صحافی 'راجندرہ سرین' کو فون کیا اور آنجہانی کو پورا ماجرا سنایا۔ اُس سے درخواست کی کہ ہمارے لیے کسی ہوٹل میں کمرے بک کروائے۔ آدھے گھنٹے بعد سرین نے فون کیا کہ دہلی کے 'اشوکا نیو اس ہوٹل' میں کمرے بک ہو چکے ہیں، وہاں چلے جائیں۔ ٹیکسیاں کر کے ہوٹل گئے، رات وہاں گزاری اور دوسرے دن پی آئی اے سے لاہور پہنچے۔

توقع کے بالکل خلاف لاہور ایئر پورٹ پر ہمارا بہت پرجوش استقبال ہوا۔ ایئر پورٹ کے باہر لاہور کے تمام ترقی پسند ساتھی اور اے این پی کے کارکن کثیر تعداد میں موجود تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ کل بھی ہمارے استقبال کو آئے تھے لیکن جب فلائٹ سے ہم برآمد نہ ہوئے تو مایوس ہو کر لوٹ

گئے۔ وہ سب ایک جلوس کی صورت میں ہمیں اپنے ساتھ لے گئے اور ہمیں مجبور کیا کہ رات ہم عبداللہ ملک کے گھر گزاریں اور پشاور کے لیے پرواز اگلے دن پکڑیں۔

عبداللہ ملک کی میزبانی کا لطف اٹھانے کے بعد اگلے دن ہم پشاور پہنچے۔ ہوائی اڈے پر ولی خان نے ہمارے بھرپور استقبال کے لیے پوری اے این پی کو جمع کر لیا تھا۔ وہاں سے یہ قافلہ ایک جلوس کی صورت میں اکوڑہ خٹک گیا اور ایک بڑا جلسہ ہوا۔ جلسے کے بعد ہم اپنے گاؤں روانہ ہوئے۔ کئی دن تک رشتہ داروں، دوست احباب اور پارٹی کارکنان کی جانب سے دعوتوں کا سلسلہ جاری رہا۔

ولی خان سے تفصیلی ملاقات کے بعد معلوم ہوا کہ ہماری پاکستان واپسی میں اُنھوں نے کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ انھوں نے بتایا کہ افغان قونصل خانے نے اطلاع دی کہ یہ لوگ واپس آ رہے ہیں تو میں نے کہا آ رہے ہیں تو خوش آمدید، بخیر و عافیت آئیں۔ پھر میں نے کمیونسٹ پارٹی کے اُس وقت کے انچارج سید مختار باچا سے پوچھا، لیکن وہ بھی اس سارے معاملے سے لاعلم تھے اور انھیں ہماری واپسی کی اطلاع اے این پی سے ملی تھی۔ چند سال بعد یہی سوال میں نے کابل میں اُس وقت کے ناظم الامور فدا یونس سے کیا۔ اُس نے کہا کہ اس سلسلے میں انھیں اسلام آباد سے اطلاع آئی تھی کہ یہ لوگ واپس جا رہے ہیں اور یہ کہ ذاتی حیثیت میں انھوں نے اس کے لیے کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ مدتوں بعد یہی سوال مجھ سے اجمل خٹک نے انور زیب کے سامنے پوچھا۔ میں نے کہا واپسی کا فیصلہ تو آپ دو خٹکوں (اجمل اور افراسیاب) کا تھا، میں تو اِس فیصلے میں اس لیے فریق نہیں کہ میں تو اُس وقت ماسکو میں تھا۔ اس ساری بات سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ صرف افراسیاب ہی جانتا ہے کہ ہماری واپسی کا منصوبہ کہاں بنا اور کس نے بنایا۔

پاکستان آنے کے بعد ہم تینوں کو اے این پی کی مجلس عاملہ کا رکن بنایا گیا اور پہلی میٹنگ میں ہمیں بولنے کا موقع دیا گیا۔ اجمل خٹک نے حسب عادت 'دربار عالیہ' کی توصیف سے شروع کر کے اپنی تقریر اسی پر ختم کی۔ افراسیاب نے بھی اپنی باتیں کیں۔ جب میری باری آئی تو میں نے ایک بات افغانستان کے حوالے سے ایسی کہی جو ولی خان کو بری لگی۔ میں نے کہا کہ افغانستان کے حوالے سے اے این پی نے کماحقہ اپنی ذمہ داری پوری نہیں کی۔ میں نے اس کا سارا الزام ولی خان پر نہیں دھرا۔ اُس کے بعد سے اے این پی میں میرے بارے میں شکوک اور

بدمزگی پیدا ہوئی۔ میں اپنا یہ تجزیہ بعد میں پیش کروں گا کہ مجھے اُس موقع پر ایسا کہنا چاہیے تھا یا نہیں لیکن فی الحال تو میں صرف وہ بیان کر رہا ہوں، جو اُس مجلس عاملہ کے اجلاس میں ہوا۔

میں نے ولی خان کی طرف سے افغان حکومت کے حق اور پاکستان کی پالیسیوں کے خلاف چند خطوط اقوام متحدہ کے جنرل سیکرٹری، ایران کے راہنما آیت اللہ خمینی، امریکہ کے صدر بش، ہندوستان کے وزیر اعظم، پاکستان کے وزیر اعظم، چین کے لیڈر اور سوویت یونین کے سربراہ میخائل گورباچوف کے نام ارسال کیے۔ ان خطوط کا بہت چرچا ہوا اور اخبارات نے نمایاں حیثیت سے شائع کیا۔ گورباچوف نے جواب میں ولی خان کو ایک مفصل خط لکھا۔ پاکستان اور باہر کے اخبارات میں ان خطوط پر کافی تبصرے ہوئے۔

دوسرا کام میں نے یہ کیا کہ پشاور شہر کی دیواروں پر مجاہدین جلاوطن حکومت کے خلاف نعرے لکھوائے۔ میں نے چند لڑکوں کی یہ ڈیوٹی لگائی اور انہوں نے یہ کام کر دکھایا۔ بعض اور چیزیں بھی اسی موضوع پر شائع اور تقسیم کیں۔ یہ وہ وقت تھا، جب ہمارے بائیں بازو کے ساتھی سوات کانفرنس کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اجمل نے پوچھا، اس کانفرنس کے حوالے سے مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں نے کہا میں تو نہیں جا رہا اور آپ کو بھی نہیں جانا چاہیے۔ میں نے محسوس کیا کہ افراسیاب کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے ساتھ ساتھ اے این پی کو بھی توڑنے جا رہا ہے۔

اس لیے میں نے یہ کیا کہ روئیداد خان کی سفارش پکڑی، پاسپورٹ پر انڈیا کی انڈورسمنٹ لی (اُن دنوں پاکستانی پاسپورٹ سے اسرائیل اور انڈیا کے سفر نہیں کیے جا سکتے تھے) اور اپنے وعدے کے مطابق دہلی کے راستے کابل جا پہنچا۔ اپریل 1989ء میں سوویت فوجوں کی واپسی مکمل ہو چکی تھی۔

یہاں اپنے ایک احساس کے بارے میں بھی بتانا چاہوں گا۔ میں اور اجمل تقریباً سولہ برس بعد اپنے وطن آئے تھے۔ سولہ برس پوری ایک نسل ہوتی ہے۔ یہاں آکر مجھے سب کچھ بدلا ہوا ملا۔ بوڑھے مر چکے تھے، ہم عمر بوڑھے ہو چکے تھے، نوجوان نسل سے میں آشنا نہ تھا۔ مجھے اب اپنی ہی جڑوں سے جُڑنے میں دشواری کا سامنا تھا۔ بالکل اُسی طرح، جیسے ایک درخت کی شاخ کاٹنے کے بعد اُسے دوبارہ وہیں جوڑنے کی کوشش کی جائے۔ میری یہ مشکل آج تک قائم ہے کہ میں اپنے قریبی رشتہ داروں تک سے وہ تعلق قائم نہیں کر پاتا، جس کا حق ہے۔ وہ سوچتے ہوں گے میں بدل گیا ہوں۔ اگر ایسا سوچتے بھی ہیں تو درست ہی ہے کہ وقت، مقام، واقعات انسان کو بہت

زیادہ تبدیل کر دیتے ہیں۔ اُن کی سوچ درست ہے، لیکن وہ میری مشکل کو شاید سمجھ نہیں سکتے۔ میری بدقسمتی ہے کہ جب میں سولہ برس بعد پاکستان واپس آیا تو گھر، پڑوس، محلہ، گاؤں سب کچھ بدل چکا تھا۔ اُس کے بعد یہ سلسلہ تھما نہیں۔ میں واپس افغانستان گیا، لیکن 1992 کے بعد افغانستان اور خصوصاً کابل کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔ جس افغان نسل سے میری شناسائی تھی، وہ سب دنیا کے مختلف ممالک میں منتشر ہو گئے یا وقت کے جبر کا شکار ہو کر رزق خاک ہو گئے۔ یوں اب میں ایک ایسے خلا کا باسی ہوں، جہاں گھر سے باہر کوئی جاننے والا اور میرے احساسات کو سمجھنے والا اُس طرح نہیں ملتا، جیسا کہ ایک عام زندگی گزارنے والوں کو میسر ہوتے ہیں۔ جس گاؤں سے نکلا، وہ میرے نکلنے کے بعد بدل گیا اور جس جگہ پہنچا اُسے تباہ کر دیا گیا۔

مختصر یہ کہ پاکستان سے میں واپس کابل چلا گیا، لیکن اس مرتبہ پاکستانی پاسپورٹ پر اور کابل میں اپنے گھر۔ محض ان چند ماہ میں، جن میں، میں پاکستان گیا اور آیا، کابل میں بہت کچھ بدل چکا تھا۔ دنیا کو توقع تھی کہ سوویت فوجوں کے انخلا کے ساتھ ہی کابل حکومت مجاہدین کے دباؤ کے مقابلے میں نہیں ٹھہر پائے گی۔ تاہم یہ پیش گوئیاں نہ صرف غلط ثابت ہوئیں بلکہ جنرل حمید گل کے تحت براہ راست مجاہدین تنظیموں اور ان کے عرب اتحادیوں کا جلال آباد پر بھرپور حملہ اور اس کے بعد اِسے مجاہدین حکومت کے دارالخلافہ میں بدل دینے کا خواب بھی چکنا چور ہو گیا۔ ان کامیابیوں نے ڈاکٹر نجیب کو مغرور بنا دیا، اس کے علاوہ اس کا یہ تاثر بھی تھا کہ اُن کی بھرپور سیاسی اور مالی مدد کے باوجود کابل اور کوئٹہ کے قوم پرست لیڈروں نے افغانستان سے بے وفائی کی۔ اس لیے میرے متعلق اس کا رویہ لاتعلقی کا سا ہو گیا۔ میں نے پانچ مہینے کابل میں گزارے، لیکن وہ مجھ سے نہ ملا۔ بلکہ الٹا تحریفانہ سیاست اور مشکوک عناصر، جن کا تعلق خود جاسوسی ایجنسیوں سے تھا، کی مہربانی سے اسے میرے بارے میں طرح طرح کے وہم بھی لاحق ہو گئے۔

مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کے یہ شکوک صرف میری ذات تک نہیں تھے، بلکہ وہ میرے سسر کے بھی خلاف تھے۔ گویا وہ اس پورے خاندان پر بھروسہ کرنے کو تیار نہ تھا۔ گویا محض ان چند ماہ میں، میں نے کابل میں اپنی پرانی حیثیت کھو دی تھی۔ لیکن مجھے اپنے گھر اور بال بچوں کی ذمہ داری تو پوری کرنی تھی۔ پاکستان میں اپنے گاؤں کا گھر میں دیکھ آیا تھا۔ اب اُس میں میرے دو بھائی اپنے بال بچوں کے ساتھ رہ رہے تھے اور میرے گھرانے کی گنجائش مشکل ہی نکلتی

تھی۔ پھر میرے بچے گاؤں کے ماحول کے عادی نہ تھے۔ مشکل یہ تھی کہ میرے پاس پیسے نہ تھے۔
اس لحاظ سے کابل یوں گوارا تھا کہ کم ازکم میرے پاس ایک گھر تھا اور میری بیوی اپنے والدین کے
قریب آرام سے رہ رہی تھی۔ مجھے بھی زیرہ ملتا تھا۔ اگرچہ کابل کی صورت حال یہ تھی کہ ہر لمحے
موت سر پر منڈلاتی رہتی۔ دن رات مجاہدین اسلام کی جانب سے اندھے اور بے دریغ راکٹ ہم
کابل کے باسیوں پر برسائے جاتے۔ ہر روز بلا امتیاز بچے، بوڑھے، خواتین ان راکٹوں کا نشانہ
بن کر دوسری دنیا کو روانہ ہو جاتے۔

ہمارا اپارٹمنٹ میکروریان کے خاص اُس بلاک میں تھا جہاں حکمران پارٹی اور حکومت کے
سرکردہ راہنما رہتے تھے۔ اس لیے یہ بلاک مجاہدین کے راکٹوں کا خاص نشانہ رہتا۔ ہم اپنے بچوں
کو باہر نہیں کھیلنے دیتے تھے۔ اُن کا سکول جو اسی میکروریان میں تھا اکثر بند رہتا۔ ایک روز میں خود
ایک ایسے ہی راکٹ کی زد میں آتے آتے بچا۔ میں پیدل 'قبائلی امور' کے پرانے دفتر جا رہا تھا، جو
'چار راہی زنبیق' میں واقع تھا۔ جب میں وزیر اکبر خان مینہ میں باچا خان کے گھر کے قریب پہنچا تو
شوں کر کے راکٹ میرے اوپر سے گزرا اور چند قدم آگے گر گیا۔ خوش قسمتی سے راکٹ اور میرے
درمیان ایک دیوار تھی، ورنہ میرے جسم کے ٹکڑے اکٹھے کرنا بھی مشکل ہوتا۔ ایسے کئی راکٹ میری
نظروں کے سامنے گرے، جس میں لوگ مرتے بھی تھے۔ یہی حالت کارمل اور نجیب کے دور میں
تھی، خصوصاً انقلاب کے آخر میں بہت شدید ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر نجیب محل کے قریب اپنے گھر میں مقیم
تھا، جس کی دیواروں کو ریت بھری بوریوں سے محفوظ بنایا گیا تھا اور چھتوں پر ٹائر رکھے گئے تھے۔ وہ
محل نہیں بلکہ ایک جنگی مورچہ تھا۔

....

اگست 1989ء میں میں نے اپنی بیوی اور دو بچیوں کے ساتھ گاؤں جانے کے لیے دہلی کا
راستہ لیا۔ میں عموماً نئی دہلی میں 'وسنت وِہار' میں رہنا پسند کرتا۔ چند روز دہلی میں گزارے۔ ایک
دن آگرہ کا تاج محل دیکھنے گئے۔ چار پانچ روز شملہ گزارے۔ شملہ جانے کے لیے ہم دہلی بذریعہ
ریل پنجاب اور چندی گڑھ کے راستے ہماچل پردیش کے 'کالکا' سٹیشن پہنچے۔ وہاں سے تنگ پٹڑی
والی ریل میں سوار ہو کر پہاڑوں اور دروں کے بیچ پر فضا ماحول میں سفر کرتے ہوئے شملہ پہنچ گئے۔
شملہ میں وہ تمام تاریخی مقامات دیکھے جو متحدہ ہندوستان سے متعلق ہیں۔ شملہ میرے گھر

والوں کو بہت پسند آیا کیوں کہ نسبتاً سستی جگہ تھی، ہوٹل کا کرایہ بھی مناسب تھا اور کھانا پینا بھی سستا
تھا۔ ایک سکھ کی دکان سے بچوں کے لیے دھوپ کی عینک لینے گیا تو معلوم ہوا کہ وہ 'پاڑا چنار' کا
ہے۔ اُس سے پشتو میں دام ٹھہرائے اور گپ شپ کی۔

چند روز بعد شملہ سے ریل کے ذریعہ دہلی، وہاں سے ہوائی جہاز سے لاہور اور پھر اسلام آباد
اور ائرپورٹ سے گاڑی کرایہ پر لے کر گاؤں پہنچا۔ چند روز مہمان نوازی اور دعوتوں وغیرہ میں
گزارے۔ گھر چھوٹا تھا، فقط چار کمرے تھے، اور میرے بچے گاؤں کے ماحول کے عادی نہ تھے۔
اس کے علاوہ بچوں کی تعلیم کا مسئلہ تھا، انھیں جلد کسی سکول میں داخل کرنا ضروری تھا۔ اس لیے
پشاور میں حیات آباد اپنے بڑے بھائی کے سرکاری گھر پہنچا۔ چند روز وہاں مقیم رہ کر اپنے لیے کرایہ
کا گھر ڈھونڈا۔ وہاں خوش قسمتی سے D4 میں چودہ سو روپے ماہانہ میں ایک بہت مناسب گھر مل گیا۔
اس کی صفائی ستھرائی اور چونا وغیرہ مکمل کروایا۔ لیکن جب بڑے فخر سے میں بیوی کو گھر دکھانے لایا
تو پاس پڑوس میں بڑی بڑی داڑھیوں والے مجاہدین کو دیکھ کر میری بیوی نے اس گھر میں رہنے
سے صاف انکار کر دیا۔ اس کی وجہ صاف ظاہر تھی کہ ابھی کابل میں نجیب برسراقتدار تھا اور میرے
سسر لائق صاحب بھی شریک اقتدار تھے۔ اگرچہ اس گھر میں مجاہدین ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا
سکتے تھے کہ یہ افغانستان نہیں پاکستان تھا۔ لیکن بیوی کا ڈر دور کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔

حیات آباد کے پانچ مرلے کے گھر تو سب مجاہدین سے بھرے پڑے تھے۔ یوں مجبوراً
دگنے کرائے یعنی اٹھائیس سو میں یونیورسٹی ٹاؤن میں فتح اللہ کی دو دکانوں کے اوپر ایک خستہ حال
فلیٹ کرائے پر لیا۔ یہاں میرا پہلا پڑوسی افغان قونصل خانے کا تھرڈ سیکرٹری الیاسی تھا۔[۲۹] بعد
میں اسی مکان میں اس کی جگہ سیکنڈ یا فرسٹ سیکرٹری ضیاء الحق نے اپنا گھرانہ منتقل کیا۔ اس کام سے
فارغ ہو کر میں نے اپنے بچوں کو سکول میں داخلہ دلوایا۔ اُس وقت تک میرا بیٹا 'سپین خان' پیدا
نہیں ہوا تھا۔ میں اس فلیٹ میں کافی اذیت میں رہا، گنجائش بھی کافی نہ تھی اور جیب بھی بہت جلد
خالی ہو گئی۔

کابل سے لوٹ کر جب پشاور میں گھر بنایا تو چوبیس گھنٹے جاسوس میری نگرانی کرتے۔ اگر
لمبا سفر ہوتا تو میری نگرانی کا فریضہ ایک علاقے تک پہنچ کر جاسوس اگلے ساتھی کے حوالے کر دیتا۔
ایک دن میں اپنے رشتہ داروں کے گھر گیا اور انھوں نے غلطی سے میرا سراغ کھو دیا۔ اُن بے

چاروں نے گاؤں، اٹک، ولی باغ غرض تمام ممکنہ مقامات اور گزرگاہوں پر جاسوس اہل کاروں کو اطلاع دی کہ میں گم ہو گیا ہوں۔ جب میں انھیں نظر آیا تو انھوں نے باقاعدہ مجھ سے گلہ کیا کہ آپ کی گمشدگی سے، ہمیں بہت تکلیف ہوئی۔ اُس کے بعد میں نے اُن کی تکلیف کے خیال سے یہ اہتمام کیا کہ جہاں جانا ہوتا انھیں بتادیتا۔ اُن دنوں بھارت کا سفارت خانہ سخت نگرانی میں ہوا کرتا تھا۔ لیکن میرا پاسپورٹ دیکھ کر جاسوس اہل کار مجھ سے کوئی تعرض نہ کرتے۔ میں بغیر کسی پوچھ گچھ کے آگے بڑھ جاتا۔

ضیاء الحق کے افغان قونصل خانے میں آنے کے بعد نئے نئے انکشافات ہوئے۔ وہ قونصل خانے میں 'خاد' (وزارت سلامتی) کا نمائندہ تھا۔ اس نے تحقیقات کیں اور بتایا کہ کابل سے ولی باغ کو دی جانے والی رقم کی مالیت تقریباً ایک کروڑ اسی لاکھ ڈالر کے برابر تھی۔ یہ رقم سینیٹر عبدالخالق مختلف اوقات میں دہلی کے راستے بیگ میں بھر بھر کر لاتا رہا۔ قونصل خانے سے یہ رقم الیاس ولی باغ پہنچاتا جبکہ ایک مرتبہ شائد اعظم خان خود بھی یہ رقم وصول کر کے لایا تھا۔

اس رقم میں قبائلی مشران جیسے حاجی نادر خان ذخہ خیل، میاں شاہ جہان، خلیفہ عبداللطیف، امیر نیاز علی خان (اوران کی وفات کے بعد اُن کے فرزند شیر محمد) کا حصہ تھا۔ لیکن ولی باغ نے ان لوگوں کو آٹے میں نمک کے برابر حصہ دیا، جبکہ باقی رقم خود ہڑپ کر گئے۔ اس تمام رقم کے عوض جو کارکردگی دکھائی گئی، وہ میر علی (شمالی وزیرستان) اور لواڑگی (خیبر ایجنسی) میں دو جرگے، بلکہ جلسے تھے۔ جب کہ کابل کا مطالبہ اتنا تھا کہ تورخم جلال آباد روڈ کو قبائلیوں کے توسط سے کھلا رکھا جائے۔ جرگوں میں راستے کھولنے کا کوئی ذکر نہیں ہوا تھا۔ ان ملکان صاحبان نے قبائلی امن مشن کے نام سے ایک کاغذی تنظیم بھی بنائی تھی۔ انھوں نے شور بھی مچایا کہ اس ساری رقم میں انھیں بہ مشکل ایک لاکھ ڈالر تک دیے گئے اور باقی معاملہ صرف وعدے وعید تک رہا۔

اصل میں ہوا یہ تھا کہ پیسوں کی تقسیم کا کام اور مجاہدین کے ساتھ مفاہمت کی ذمہ داری اعظم خان کو بھی سونپی گئی تھی۔ گویا بلی کو گوشت کا چوکیدار بنا دیا گیا تھا۔ جب ضیاء الحق نے ان تمام امور کی تحقیق کی تو اس نے کابل میں بہت شور مچایا اور یوں پیسے آنا بند ہو گئے۔ قبائلی ملک اور روسی حکومت کا اعتماد اٹھ گیا اور افغان حکومت بھی پھنس گئی۔ افغان حکومت یوں پھنسی کہ یہی ڈالر افغانوں کے ساتھ قومی مفاہمت کی پالیسی کی کامیابی کے لیے بھی وقف تھے، جو سوویت یونین نے

مہیا کیے تھے۔[۳۰]

اُس کے بعد سے کابل اور ولی باغ کے تعلقات خراب ہو گئے۔ پھر جب اے این پی نے اسلامی جمہوری اتحاد میں نواز شریف سے ہاتھ ملایا تو کابل جو پہلے ہی شکوک کا شکار تھا، اب اُن کا اعتبار بالکل ہی اٹھ گیا۔ بھارتی وزیر اعظم راجیو گاندھی قتل ہوئے تو اُن کی آخری رسومات میں شرکت کے لیے پاکستان سے ولی خان اور کابل سے ڈاکٹر نجیب بھارت گئے۔ وہاں ولی خان کی تمام کوششوں کے باوجود ڈاکٹر نجیب نے ملاقات سے انکار کر دیا تھا۔ بات یہاں تک بگڑی کہ جب اے این پی کے صدر کی حیثیت سے اجمل خٹک نے ماسکو کا دورہ کیا اور وہاں سے واپسی پر کابل جانا چاہا تو صدر نجیب نے ویزا دینے سے انکار کر دیا۔

پشاور میں دن بہ دن ہماری حالت خراب ہوتی جا رہی تھی۔ تنگدستی اب خطرناک حد کو چھونے لگی تھی۔ پیسے ختم ہونے والے تھے۔ گھر کا کرایہ اور بچوں کے سکول کی فیس اب بوجھ بنتا جا رہا تھا۔ آخر مجبور ہو کر میں نے جنوری 1990ء کو اپنا خاندان واپس کابل بھجوا دیا۔ جنوری میں کابل بہت سرد ہوتا ہے۔ وہاں سکول تو پہلے ہی راکٹوں اور تباہی کی وجہ سے بند پڑے تھے۔ میں بہت جلد پشاور آ گیا اور خاندان کو ماں باپ کے پاس چھوڑا۔

ایک کام اور بھی ایسا ہوا جس کا مجھے اب تک افسوس ہے۔ وہ یہ کہ جب کابل سے سولہ سالہ جلاوطنی کے بعد واپس پاکستان لوٹ رہے تھے تو اجمل خٹک نے اپنی ذاتی ڈائریاں بطور امانت اپنے افغان دوست 'رؤف تنڑی وال' کو دیں۔ جب رؤف کو کابل چھوڑنا پڑا اور وہ جرمنی جا رہا تھا تو اُس نے یہ خواہش ظاہر کی کہ یہ امانت کسی طرح میں اجمل خٹک تک پہنچا دوں۔ میں دہلی کے راستے واپس آ رہا تھا تو یہ بکس اُٹھا لایا۔ اس بکس میں ہماری سولہ سالہ جدوجہد کی تاریخ محفوظ تھی۔ مجھے یہ بکس اپنے گھر لانا چاہیے تھا اور اُس ناشکرے بندے کے حوالے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ لیکن مجھ پر اخلاقیات غالب آئیں اور میں یہ بکس لے کر سیدھا اکوڑہ خٹک پہنچا۔ میں فروری کے آخر میں پشاور پہنچ گیا تھا۔ اس حوالے سے افغان بھائی رؤف کی ایمانداری ملاحظہ ہو کہ کچھ عرصے بعد موصوف نے پختون لیڈروں سے اپنے تعلق کے بارے میں جب مضمون انٹرنیٹ پر ایک جریدے میں لکھا تو اس میں بکس کے حوالے سے یہ درج کیا کہ میں نے اجمل خٹک کی امانت اُس کے بھانجے کے حوالہ کر دی!

اے این پی کی لیڈر شپ کا تعلق مجھ سے مخاصمانہ تھا۔ انھیں وہ لوگ پسند تھے جو کسی نہ کسی طرح ایجنسیوں سے تعلق رکھتے تھے، جبکہ میں ایجنسیوں کی سیاہ فہرست میں تھا۔ انھوں نے پہلے سے ہی اپنا قبلہ درست کیا تھا اور میری طرح کے لوگ اب اُن کے مشترکہ دشمن تھے۔ میں اگست 1990 میں پھر کابل گیا۔ میری کمر میں شدید درد تھا۔ اٹھنا، بیٹھنا، چلنا، پھرنا دوبھر تھا۔ کابل میں بس میں یا گھر پڑا رہتا یا 'قبائلی امور' کے دفتر چلا جاتا۔ میں علاج کے لیے ہڈیوں کے مشہور معالج موسیٰ وردگ کے پاس گیا، جنھوں نے اپنے چار سو بستروں والے بڑے ہسپتال میں بے شمار جنگ زدہ فوجیوں کی ٹوٹی پھوٹی ہڈیوں کو جوڑا تھا۔ انھوں نے مائیلو گرافی (ریڑھ کی ہڈی کا رنگین ایکسرے) کرایا اور آپریشن کے لیے دہلی یا ماسکو جانے کا مشورہ دیا۔

مجھے یوں بھی پاکستان جانے کے لیے دہلی کا راستہ اختیار کرنا تھا، اس لیے جب ویزہ لینے بھارتی سفارت خانے گیا تو اس کا تذکرہ سفیر 'نمبیار' سے کیا۔ اُس نے کہا یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ میں دہلی ٹیلیکس کر دیتا ہوں، آپ کا علاج آرمڈ فورسز ہسپتال میں ہوجائے گا۔ مجھے یہ اس لیے قابل قبول ہوا کہ میں نے درخواست نہ کی، بلکہ سفیر نے خود پیش کش کی تھی۔ جنوری 1991ء میں دہلی گیا، نمبیار صاحب نے ٹیلیکس کر دیا تھا، دہلی پہنچ کر ہندوستانی وزارت خارجہ میں ایڈیشنل سیکرٹری کو فون کیا جو ایک زمانے میں افغانستان میں رہ چکا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ دوسرے دن جواب دے گا۔ اگلے دن اُس نے بتایا کہ اس ہسپتال میں ہم نے علاج کے لیے کچھ کوٹہ افغان مہمانوں کے لیے مخصوص کر رکھا ہے، لیکن آپ تو پاکستانی شہری ہیں۔ میں نے جواب میں کہا کہ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ میں نے علاج کے لیے درخواست نہیں کی تھی بلکہ آپ کے سفیر نے پیش کش کی تھی۔

علاج کے لیے میں نے اپنے صحافی دوست 'راجندرہ سرین' کو فون کیا اور اُس نے مجھے 'گنگا رام' ہسپتال میں سکھ سرجن پروفیسر پی ایس مینی سے متعارف کرایا۔ سی ٹی اسکین اور دیگر معائنوں کے بعد انھوں نے رائے دی کہ آپریشن کی ضرورت نہیں، البتہ درد کے لیے دوا تجویز کر دی۔ انھوں نے چند جسمانی مشقیں تجویز کیں اور ساتھ ہی اپنا فون نمبر دے دیا کہ اگر درد انتہائی شدت اختیار کر جائے تو مجھ سے رابطہ کریں۔

فروری کو واپس پاکستان پہنچا اور اس بات پر بہت افسوس ہوا کہ ہندوستانی سفارت کار جن سے میرا برسوں کا تعلق رہا، وہ کتنے بے وفا، خودغرض اور مطلبی نکلے۔ جوں ہی اُن کی مراد پوری

ہو جاتی ہے پھر وہ بالکل انجان بن جاتے ہیں۔ یہی سلوک انھوں نے نجیب کے ساتھ بھی کیا۔ جب اُن کی حکومت ختم ہوئی اور اُنھوں نے کابل میں اقوام متحدہ کے دفتر میں پناہ لی تو اُنھیں بھی کوئی سفارتی مدد بھارتی سفارت خانے نے فراہم نہ کی۔ فدا یونس کی افغانستان پر لکھی ایک کتاب افغانستان ساتویں جلد میں ڈاکٹر نجیب اللہ کے بارے میں اس واقعے کی تفصیل موجود ہے کہ کس طرح بھارتی سفیر اقوام متحدہ کے اہل کاروں کے سامنے نجیب کو پناہ دینے اور بھارت لے جانے سے منکر ہو گئے۔ الٹا یہ ہوا کہ پاکستان نے دعوت دی کہ نجیب پاکستان آجائیں جو نجیب نے ظاہر ہے اس لیے قبول نہیں کی کہ سیاسی طور پر یہ اُن کے لیے مناسب نہ تھا۔

یہاں پاکستان میں، میں نے کمیونسٹ پارٹی کے بچے کھچے لوگوں سے بھی اپنے آپ کو الگ کر لیا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے تھے اور باہمی اختلافات کی وجہ سے تقسیم در تقسیم کا عمل جاری تھا۔ طرح طرح کے قبضہ گروپ سامنے آرہے تھے۔ کمیونسٹ پارٹی کے اثاثے ہڑپ کرنے کی ایک دوڑ تھی، جن میں افراسیاب، سید مختار، اور شفیق زیادہ ہوشیار ثابت ہوئے۔ اس حوالے سے میں نے کابل میں بھی محسوس کیا تھا کہ آنے والے وسائل اسی طرح کی بدعنوانیوں میں ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ سب دیکھ کر میں نے فیصلہ کیا کہ ولی خان سے اپنے تعلقات بہتر کروں اور یوں میرا ولی باغ آنا جانا پھر سے شروع ہو گیا۔

مئی 1991ء میں ایک بار پھر کابل گیا۔ راستے میں دہلی میں ڈاکٹر کے پاس گیا اور اُس نے حرام مغز میں انجکشن لگوانے کی تجویز دی۔ میں نے یہ علاج کروایا اور کابل پہنچ گیا، جہاں یہ احساس ہوا کہ اب یہاں انقلاب یتیم ہو چکا ہے۔ آنے والے سیٹ اپ میں پارٹی کے مفادات محفوظ کرنے کے لیے تگ و دو جاری تھی، پارٹی والوں نے رشوت لینا شروع کر دی تھی اور اس میں سوویت اہل کار بھی سب سے زیادہ متحرک تھے۔ کابل میں سرمایہ دارانہ نظام آنے والا تھا۔ مستقبل کی غیر یقینی کیفیت نے پیسا بٹورنے کی فکر لاحق کر دی تھی۔

کابل ائیر پورٹ پر وقتاً فوقتاً کے جی بی کا ایک طیارہ اترتا، جس میں ماسکو میں چھپی ہوئی افغان کرنسی اور دیگر ضروری ڈاک ہوتی۔ یہ طیارہ امیگریشن قوانین سے مستثنیٰ تھا۔ میں، میرا بہنوئی فضل الحق غرزے اور ایک حاجی تاجر بغیر ویزے پاسپورٹ کے اس جہاز کے ذریعے ماسکو پہنچے۔ وہاں سوویت دوستوں کے مہمان تھے اور حسب سابق مرکزی کمیٹی کے ہوٹل 'آکتیا برسکایا

(اکتوبر)' میں ٹھہرائے گئے۔

ماسکو میں دو باتیں ایسی ہوئیں، جن کا تذکرہ ضروری ہے۔ پہلی یہ کہ میرا روسی دوست 'ولادیمیر آرتیموف' جو 1972ء میں پارٹی سکول میں میرا استاد تھا اور اسی کی دہائی میں افغان پارٹی کی مرکزی کمیٹی میں مشیر رہا تھا، مجھے ملنے آیا تھا۔ ہمارے آپس میں محبت اور بے تکلفانہ تعلقات تھے۔ اُنھوں نے کہا یہاں ہوٹل میں بات نہیں ہوسکتی، اور پھر مجھے اپنی کار میں بٹھا کر ماسکو کی سڑکوں پر گھومتا رہا۔ راستے میں اُنھوں نے وہ باتیں چھیڑ دیں، جو ہوٹل کے کمرے میں ممکن نہ تھیں۔ وہ میرا نکتہ نظر معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ سوویت کمیونسٹ پارٹی کی اکثریت گورباچوف کی پالیسی پر خوش نہیں ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ تبدیلی لے آئیں۔ یہ ساری بات آرتیموف نے بغیر لگی لپٹی یوں شروع کی، کہ ہم گورباچوف کو ہٹانا چاہتے ہیں، آپ کا کیا خیال ہے؟ میں نے کہا سوویت یونین اپنا پہلے والا وقار اور دبدبہ کھو چکا ہے۔ دنیا بھر کے ترقی پسندوں کا اعتماد پھر سے بحال کرنا بہت مشکل ہوگا۔[۳۱]

دوسری بات یہ ہوئی کہ سوویت کمیونسٹ پارٹی کے مرکزی کمیٹی کے بین الاقوامی تعلقات کے شعبہ سے تعلق رکھنے والے میرے میزبان، 'گنریخ پولیاکوف' نے مجھ سے دو دن بعد کہا کہ آج ہم کارمل صاحب کو کابل واپس بھجوا رہے ہیں۔[۳۲] لیکن پرواز میں کچھ رکاوٹ پیدا ہوئی۔ میں یہ بات سن کر ہنس دیا اور کہا پولیاکوف! اب یہ کوئی نیا کھیل شروع کر رہے ہیں؟ اُس نے کہا ہم تو کچھ نہیں کر رہے، موصوف کو خود نجیب نے فون کیا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ لوگ اب کارمل سے کام لینا چاہتے ہیں، اب یہ پتا استعمال کریں گے۔ اتنی بات درست تھی کہ نجیب نے کارمل سے کہا تھا کہ وہ واپس آجائے۔

کارمل صاحب کے دور میں امریکی اور سوویت سیاسیات کے عالموں اور فضلاء کا سترہ افراد پر مشتمل ایک مشترک وفد کابل آیا تھا۔ اس کی میزبانی افغانستان کی طرف سے سائنسز اکیڈمی کے سربراہ سلیمان لائق کے سپرد تھی۔ یہ ثور انقلاب، بالخصوص سوویت فوجوں کی آمد کے بعد پہلا امریکی وفد تھا، جو افغانستان میں قدم رنجہ فرما رہا تھا۔ امریکی وفد کی سربراہی تھنک ٹینک 'انٹرنیشنل سنٹر فار پیس' کے صدر 'رابرٹ وائٹ' کر رہے تھے، جبکہ 'میٹی سن' (Mattison) اس تھنک ٹینک 'آئی سی پی' کا ایگزیکٹو ڈائریکٹر تھا۔ سوویت یونین کی طرف سے 'سوویت اکیڈمی آف سائنسز'

کے صدر 'یفگنی پریماکوف' وفد کی سربراہی کر رہے تھے، یہ بعد میں صدر یلسن کے وقت میں وزیر اعظم بھی بنا۔

اس وفد کی افغانوں کے ساتھ جو میٹنگ تھی، اس میں بھارت سے آیا ہوا میرا دوست 'راجندرہ سرین' بھی شامل رہتا جو بعد میں ہمیں اپنے تاثرات سے آگاہ کرتا۔ اُس کا تجزیہ یہی تھا کہ روسی حتمی طور پر افغانستان سے نکلنے والے ہیں، گو کہ یہ بات کم از کم اُس وقت نا قابل یقین لگتی تھی۔

اسی وفد والا میٹیسن مجھے 'اکتوبر ہوٹل' میں ناشتے کی میز پر ملا۔ موصوف کے ہمراہ دیگر امریکی بھی تھے۔ وہ مجھ سے افغانستان کے بارے میں اور افغان مسئلے کے حل کے حوالے سے سوالات کرتا رہا۔ میرے جوابات سے وہ اتنا خوش ہوا کہ اس نے ساتھ والی دوسری میز پر ناشتہ کرتے ہوئے امریکی سینیٹر 'ڈیک کلارک' کو اپنی میز پر بلایا اور اس گفتگو میں شریک کیا۔ 'ڈیک کلارک' نے نوید سنائی کہ ہم نے مجاہدین کو مزید اسلحہ فراہم کرنے پر بندش کا فیصلہ کرلیا ہے۔

ناشتے کے بعد میٹیسن نے مجھ سے کہا کہ وہ ظہر کے بعد ماسکو سے لینن گراڈ اور وہاں سے 'ہنوئی' جا رہے ہیں تاکہ وہاں ویت نامی حکام سے، اُن کی سرزمین پر مارے جانے والے امریکیوں کی ہڈیاں ڈھونڈنے پر بات چیت کرسکیں۔ اور مجھے خاص طور پر کہا کہ تم ڈیک کلارک سے ملنے 'ساوٗوے (Savoy)' ہوٹل جاؤ اور اُن سے تفصیلی بات کرو۔ میں نے وضاحت کی کہ میں تو کسی حکومت کا نمائندہ ہوں اور نہ پارٹی کا۔ اُس نے کہا تمھاری باتیں دلچسپ ہیں۔ میں نے اُس کے اصرار پر ڈیک کلارک سے ملنے کا وعدہ کرلیا۔

جب دوپہر کا وقت ہوا تو میں ہوٹل کی لابی میں کافی پی رہا تھا۔ میٹیسن بھی آ نازل ہوا۔ اس دوران میرے میزبان نے میرا تعارف کرایا تھا، کہ میں 'سلیمان لائق' کا داماد ہوں۔ اس تعارف کے بعد موصوف کا جوش و خروش ختم ہوگیا تھا اور لہجہ بدل چکا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ کابل کی مسافرت کے وقت میں نے محسوس کیا کہ لائق صاحب متوازن اور معتدل انسان ہیں۔ لیکن جب میں پشاور گیا تو صبغت اللہ مجددی نے مجھے بتایا کہ دراصل افغانستان میں کمیونزم پھیلانے، نجیب کو کمیونزم کی تربیت دینے والا اور تمام خرابیوں کی جڑ یہی سلیمان لائق ہے۔ اس لیے میری رائے تو یہی ہے کہ اگر نجیب بھارت جلاوطن کیا جاتا ہے تو ساتھ سلیمان لائق کو بھی بھیجنا چاہیے۔ اس ساری گفتگو سے مجھے اتنا معلوم ہوگیا کہ نجیب کو بھارت بھجوانے کے فیصلے عالمی سطح پر ہو چکے ہیں۔

بعد میں میں نے کئی بار پولیا کوف کو یاد دلایا کہ ڈیک کلارک کی طرف جانا ہے لیکن وہ ٹالتا رہا۔ پولیا کوف ذاتی حیثیت میں نجیب کے بجائے کارمل کا حامی تھا اور شائد مجھے نجیب کا طرف دار خیال کرتا تھا۔ یوں ڈیک کلارک کی ملاقات سے محروم رہ گیا۔

سوویت یونین کے اندر یہ حال تھا کہ سخت افراتفری تھی۔ لوگ پیسوں کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ خود پولیا کوف نے مجھ سے درخواست کی کہ اُس کے لیے پاکستان سے ہاتھ سے سمیٹی ہوئی چندٹن کپاس کا انتظام کروں۔ میں نے کراچی میں خالق خان کے بیٹے اورنگزیب سے بات کی، مگر بات نہ بنی۔ اگر جیب میں نقدی ہوتی تو اس وقت ماسکو میں ہر چیز سستے داموں حاضر تھی۔ لیکن میری جیب خالی تھی اور مجھے پیسا کمانے کا گر بھی نہیں آتا تھا۔ چند دن مزید روس میں گزار کر، بغیر کسی نتیجے کے واپس کابل آ گیا۔ یہ جون کا مہینہ تھا اور کابل کے حالات بھی دگرگوں تھے۔

مری بلوچوں کا قضیہ

مری کمانڈر 'میر ہزار رحمکانی' مارا مارا پھر رہا تھا۔ اُس کی بری حالت تھی۔ مجھے دیکھا تو پکڑ کر اپنی داستان شروع کی۔ ساری کہانی تو میں بھول گیا، مگر خلاصہ یہ تھا کہ حکومت افغانستان کے تمام دروازوں پر دستک دی تھی۔ صدر نجیب نے ملاقات کے لیے وقت تک نہیں دیا۔ وزیر سلامتی غلام فاروق یعقوبی نے اپنے دروازے تک نہیں چھوڑا۔ سرحدی امور کے وزیر 'سرجنگ جاجی' بے دست و پا تھا اور اُسے طریقہ بھی نہ آتا تھا۔ یوں جب میں اُسے ملا تو اس نے اپنا سارا غبار میرے سامنے نکالا۔

اُس نے بتایا کہ جب میں ہلمند سے آیا تو کیمپ میں ہمارے لوگ بہت بری حالت میں تھے۔ تقریباً ایک سال سے انھیں راشن نہیں دیا گیا تھا۔ میں خیر بخش کے پاس گیا، ساری حالت بتائی اور کہا کہ بہتر ہوگا کہ وہ خود ہلمند جا کر یہ حالت دیکھے اور اپنے لوگوں کو مطمئن کرے۔ نجیب نے خیر بخش کو کچھ راشن اور پیسے دے دیے۔ خیر بخش وہاں گیا، لیکن سارا راشن صرف اپنے لوگوں میں تقسیم کیا اور میرے لوگوں کو کچھ نہیں دیا۔ [۳۳] اب میرے لوگ 'بجارانی' مجھے گریبان سے پکڑ رہے ہیں۔ جب یہ شکایت میں نے خیر بخش سے کی تو بجائے 'بجارانیوں' کو خوش کرنے کے اُس نے اپنے مسلح آدمی میرے گھر بھجوائے اور میرا سارا اسلحہ، بمع اُس اسلحے کے جو میں نے پاکستانی فوج سے بزور چھینا تھا، ساتھ لے گئے۔ اس میں فائرنگ کا تبادلہ بھی ہوا، جس میں ایک آدمی مر گیا اور ایک زخمی ہوا۔

اب میں افغانستان حکومت کے پاس آیا ہوں۔ یہ بلوچ غیرت کا معاملہ ہے، میں اُس اسلحے کی بات نہیں کر رہا جو افغان حکومت نے ہمیں دیا ہے۔ مجھے صرف وہ اسلحہ چاہیے جو میں نے جنگوں میں پاکستانی فوج سے بزور چھینا تھا۔ اگر افغان حکومت اس معاملے میں نہیں پڑنا چاہتی تو صرف اتنا کرے کہ میرے اور خیر بخش کے معاملے میں غیر جانبدار رہے۔ میں اپنا اسلحہ بزور واپس لا سکتا ہوں، شرط یہ ہے کہ افغان حکومت خیر بخش کی مدد نہ کرے۔ میں بس اتنی بات افغان حکومت تک پہنچانا چاہتا ہوں، لیکن کوئی مجھ سے ملنے کے لیے بھی تیار نہیں۔ میں نے یہ سب سن کر اُسے تسلی دی۔

یہ داستان میں نے لفظ بہ لفظ لائق صاحب کے گوش گزار کی اور اس طرف اشارہ کیا کہ اگر

بلوچ خون افغان سرزمین پر بہہ گیا تو یہ افغانستان کے لیے بہت بڑی بدنامی ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب (نجیب) کو یہ بات سمجھانے کی ضرورت ہے۔ یہ سیاسی لحاظ سے وہ وقت تھا، جب مختلف قوتیں نجیب کو تنہا کرنا چاہتی تھیں۔ یوں وہ ہر شخص اور ہر بات کو شک کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اُنھوں نے اس دور میں اپنے تمام دوستوں کو اپنے سے دور کرلیا تھا اور فقط چند لوگ ان کے گرد رہ گئے تھے، جو مصلحت کے تحت اُن کے دوست بنے تھے۔ اس معاملے میں ڈاکٹر نجیب نے خیر بخش کی طرف ہلمند کے وزارت سلامتی کے صوبائی سربراہ کو بھجوایا، جس کی بات مری صاحب نے ٹھکرا دی۔ پھر کور کمانڈر کی ڈیوٹی لگائی۔ نواب تو نواب ہوتا ہے، اپنے سے چھوٹے اور حقیر لوگوں سے ملنا انھیں برا لگا۔ آخر کار صدر صاحب سے کہا کہ ہلمند جاکر دونوں فریقین کے درمیان صلح کرائیں۔

ہلمند جانے سے پہلے لائق صاحب نے میر ہزار کو اپنے پاس بلایا اور صاف صاف بتادیا کہ ہم ہلمند اکٹھے جارہے ہیں، لیکن حکومت خیر بخش کو ہی لیڈر مانتی ہے۔ آپ کی حیثیت ہمارے نزدیک خیر بخش کے ایک کمانڈر کی ہے۔ اس لیے تمھیں یہ حقیقت تسلیم کرنی ہوگی۔ میر ہزار نے جواب میں کہا کہ میں نے خیر بخش کے حکم پر جنگیں لڑی ہیں، وہ میرا لیڈر تھا اور اب بھی اُن کو اپنا لیڈر تسلیم کرتا ہوں اور ہر عذر کے لیے تیار ہوں۔ بس اتنا چاہتا ہوں کہ میرے گھر سے چھِنا ہوا اسلحہ، جو میں نے پاکستانی فوج سے چھینا تھا وہ واپس دلادیں۔ مجھے افغانستان کی طرف سے دیا ہوا اسلحہ نہیں چاہیے۔ کیونکہ ہم بلوچوں کے لیے اسلحہ اور بیوی دونوں کی حیثیت ایک برابر ہے۔ میر ہزار کا مطالبہ جائز تھا اور لائق صاحب نے انھیں یقین دلایا کہ انجام بخیر ہوگا۔ ہم ایک ہی طیارے سے ہلمند چلے گئے۔ چوں کہ سٹنگر میزائلوں کا خطرہ زیادہ تھا اس لیے بہت نیچی پرواز کرتے ہوئے لشکر گاہ تک پہنچے۔

میں جان بوجھ کر خیر بخش سے نہیں ملا۔ دو بلوچوں کے درمیان ایک پشاوری پٹھان کا پڑنا نواب صاحب کے نازک مزاج پر گراں گزرا۔ نواب صاحب کے مزاج کا خیال رکھا گیا اور سارے مذاکرات لائق صاحب ہی کرتے رہے۔ لائق صاحب نے لاکھ جتن کیے، میر ہزار بھی سب کچھ ماننے کو تیار تھا، لیکن نواب صاحب کو یہ بات ہضم نہیں ہورہی تھی کہ اُن کے اپنے قبیلے کا ایک فرد جو ہمیشہ اُن کا محکوم رہا ہو، اُن سے مذاکرات کا فریق بنے... وہ میر ہزار کو کسی قیمت پر ماننے

کو تیار نہ تھا۔ آخر یہ فیصلہ ہوا کہ نواب صاحب کے کیمپ سے تمام 'بجارانی' جو آٹھ سو گھرانوں کے لگ بھگ تھے، الگ ہوجائیں اور قندھار میں دوسرے بجارانیوں کے کیمپ میں جاشامل ہوں۔ قندھار کیمپ پہلے ہی یعقوب خان بجارانی کے زیر انتظام تھا، جو خیر بخش کا مخالف اور بہرام خان اور شیر محمد مری کے زیر اثر تھا۔ اُس وقت شاید شیر محمد مری واپس آنے کے بعد وفات پاچکے تھے۔ ہلمند اور قندھار کے بیچ کا راستہ مجاہدین کے کنٹرول میں تھا، جو بلوچ مہاجرین کے جانی دشمن تھے۔

اس لیے منتقلی کا طریقہ یہ طے کیا گیا کہ بوڑھے، بچے اور خواتین طیاروں کے ذریعے منتقل کیے جائیں اور دیگر بجارانی اپنی بھیڑ بکریوں کے ساتھ پیدل قندھار پہنچیں۔ قبیلے کے معتبر افراد چند پروازوں میں قندھار منتقل کردیے گئے اور ہم واپس کابل چلے آئے۔ بعد میں جب میر ہزار کابل آیا تو معلوم ہوا کہ اُن کے بہت سے لوگوں کو راستے میں مجاہدین اسلام نے لوٹا اور بعض کو قتل کیا۔ جو قندھار کیمپ پہنچے، وہاں اُن کے ٹھہرنے کا انتظام نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس لیے انھوں نے لوٹنے کو غنیمت جانا اور واپس بلوچستان چلے گئے۔ ایک مرتبہ پھر اُن سے راستے میں مجاہدین نے اسلحہ اور جانور چھینے اور یوں وہ نامراد اور لٹے پٹے واپس بلوچستان اپنے علاقوں کو پہنچے۔

میر ہزار ناراض، مایوس اور غضبناک تھا۔ مجھے ساری صورت حال بتانے کے بعد اُس نے کہا اب میں کیا کروں؟ میں نے مشورہ دیا کہ واپس پاکستان جاؤ۔ وہ بضد تھا کہ یہ تو بڑی بے غیرتی کی بات ہوگی۔ میں نے ساری زندگی، لڑکپن، جوانی پاکستان کے خلاف جنگیں لڑتے ہوئے گزار دی، اب وہاں کس منہ سے جاؤں؟ میں نے جواب میں کہا کہ دوسرا کوئی راستہ نہیں۔ افغانستان میں خیر بخش کے موجود ہوتے ہوئے آپ کی کوئی حیثیت نہیں۔ اور یوں بھی نجیب کی حکومت جلد یا بدیر جانے والی ہے، وہ خود اس وقت بقا کی جنگ میں مصروف ہے، وہ آپ کی کیا مدد کرے گا۔ اس نے کہا اگر ایسا ہے تو میں بلوچستان کے پہاڑوں پر چڑھ کر جنگ کروں گا۔ میں نے سمجھایا کہ یہ تو خودکشی ہوگی، اکیلے کیسے اتنی بڑی جنگ لڑو گے؟ کافی سوچنے کے بعد کہا، پھر میں بھارت جاتا ہوں اور اُن سے مدد مانگتا ہوں۔ میں نے بہت سمجھایا کہ ہندوستان بھی خیر بخش ہی کو لیڈر تسلیم کرتا ہے، وہ آپ لوگوں کی مدد نہیں کرے گا۔

لیکن اُس بے چارے کے پاس کوئی راستہ نہ تھا۔ کہنے لگا، میں ہندوستان جاتا ہوں، تم میری مدد کرو۔ میں نے اُن سے وعدہ کرلیا کہ اگر ہندوستان تمھارا ساتھ دینے کو تیار ہوجائے تو

بطور پختون میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ہندوستان کسی قیمت پر تمہارا ساتھ نہیں دے گا۔ دراصل مجھے معلوم تھا کہ ہندوستانی بنیا کسی وفاداری کا قائل نہیں، جب تک اُس کا اپنا مقصد نہ ہو۔ تاہم میر ہزار کی دل جوئی کے لیے اس کے دس ساتھیوں کے ہمراہ میں بھی دسمبر 1991ء میں دہلی چلا گیا۔ اتنے لوگ نہ ہوٹل میں ٹھہر سکتے تھے اور نہ میر ہزار کے پاس اتنی رقم تھی۔ 'راجندر نگر' میں ایک چھوٹا سا گھر کرایہ پر لیا گیا۔ میر ہزار کے پاس کچھ فون نمبر تھے۔ اُس نے وہاں 'را' کے کچھ لوگوں سے ملاقاتیں کیں۔ میں ایسی ملاقاتوں میں شریک نہیں ہوتا تھا، کہ میں اس معاملے میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ آخر نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان نے نفی میں جواب دے دیا۔

اُس کے بعد میر ہزار میرے گلے پڑ گیا۔ کہنے لگا پاکستان میں ہماری بات ولی خان، اجمل خٹک سے کراؤ، تاکہ وہ ہماری مدد کریں۔ یہاں حالت یہ تھی، کہ میری اپنی حیثیت تو میر ہزار بجارانی سے بھی بدتر تھی۔ ولی خان اور اجمل خٹک، نواب خیر بخش کی مرضی کے بغیر کیسے اُن کے کمانڈر کی سفارش کر سکتے تھے۔ اور اُس سے بھی پہلے یہ بات، کہ وہ دونوں میری بات کب ماننے والے تھے۔ وہ تو نواز شریف کی حکومت کا حصہ تھے۔ آخر میں نے کہا میں پاکستانی ہائی کمیشن سے بات کرتا ہوں۔ اس میں سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ ہائی کمیشن بھارتی جاسوسوں کے نرغے میں رہتا۔ میں ہائی کمشنر شفقت کاکاخیل کو جانتا تھا، اُسے فون کیا۔ یہ سارے ٹیلی فون ریکارڈ ہوتے تھے اور بھارتی اُسے سنتے تھے۔ میری بات سن کر وہ ڈر گیا، اُنھوں نے بہانے بنائے اور مجھ سے ملنے سے احتراز کیا۔ لیکن میں مجبور تھا کہ میرے گلے یہ ان پڑھ بلوچ پڑ گئے تھے۔ آخر شفقت نے تنگ آ کر مجھے اندرابی کا ٹیلی فون نمبر دیا۔ وہ شاید آئی ایس آئی کا بندہ تھا، جسے کچھ عرصہ بعد بھارتیوں نے ناپسندیدہ شخص قرار دے کر نکالا۔

اندرابی نے کہا کہ ہائی کمیشن آ جاؤ۔ میرے پاسپورٹ میں ویسے بھی صفحے ختم ہو رہے تھے، دوسری کاپی کی ضرورت تھی۔ ہائی کمیشن گیا اور ساری کہانی اندرابی کے گوش گزار کی اور میر ہزار کا پورا تعارف کرایا۔ اندرابی مجھ سے واقف نہیں تھا، اس لیے اس دوران اُنھوں نے میرے گاؤں بندے بھیج کر میرے کوائف معلوم کیے۔ اس بات کا مجھے بہت بعد میں پتا چلا۔ اندرابی نے سارا قصہ سننے کے بعد کہا، کہ میں ہیڈکوارٹر سے اجازت لے لوں، پھر آپ کو اطلاع کروں گا۔

میر ہزار کو اب میری باتوں پر یقین آ گیا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ اگر آپ خیر بخش کا مقابلہ کرنا

چاہتے ہیں تو خون بہانا کسی کے مفاد میں نہیں، سیاسی جنگ لڑو۔ پاکستان کو قائل کرنا بھی مشکل تھا۔ آخر میر ہزار نے حامی بھر لی۔ چند دن میں اور انتظار کرتا رہا اور آخر فیصلہ کیا کہ ان بلوچوں کو یہاں دہلی میں چھوڑ کر خود پاکستان واپس چلا جاؤں۔ وہ سب افغان پاسپورٹ پر تھے، اس لیے ابھی اگر وہ پاکستان جانے کے لیے تیار ہو جاتے اور پاکستان انھیں قبول کرنے کے لیے تیار ہو جاتا، تب بھی سفری دستاویزات تیار کرنے میں وقت لگتا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ حکومت پاکستان نے انھیں واپس آنے کی اجازت دے دی۔ اُس کے بعد میر ہزار نے کئی بار فون کیا، وہ چاہتا تھا کہ اجمل خٹک سے ملے۔ مگر اجمل خٹک تو مجھے پکڑائی نہیں دیتا تھا، چہ جائیکہ میر ہزار کو۔

میر ہزار صرف جنگ میں ماہر تھا اور سیاست کے میدانِ کارزار سے ناواقف تھا۔ اُس کے لیے یہ بہت مشکل تھا کہ وہ اپنے نئے کردار کے لیے اپنے آپ کو تیار کرے۔ نومبر 1994ء میں اُس نے مجھے فون کیا کہ وہ میری طرف آنا چاہتا ہے، لیکن میں لندن جانے والا تھا، اس لیے معذرت کر لی۔

جب نجیب حکومت ختم ہو گئی تو وزیر اعظم نواز شریف نے پی آئی اے کا ایک خاص طیارہ نواب خیر بخش مری اور اُس کے خاندان کو کوئٹہ لانے کے لیے بھجوایا۔ نواز شریف نے مری قبیلے کی دوبارہ آبادکاری کے لیے 15 کروڑ روپے نواب صاحب کو دیے۔ میر ہزار رحمکانی کے طرف دار محروم رہ گئے۔ ظاہر ہے کہ وہ پیسے کسی اور کے جیب میں گئے۔ مری تو مرئیان (غلام) ہیں، انھیں لڑنے کے لیے رکھا گیا ہے۔

میر ہزار مجبور ہو گیا کہ مرکزی حکومت سے صلح کرے۔ سنا ہے کہ وہ اب ایک ملیشیا کی کمان کر رہا ہے۔ ایک دفعہ خیر بخش تقریباً دو سو بندوں کے ساتھ ان کی طرف گئے، تو میر ہزار نے کوئی چھ سو بجارانیوں کے ساتھ اُن کا محاصرہ کر لیا۔ آخر کار پاکستانی فوج کی مداخلت سے خیر بخش بخیریت محاصرے سے نکالے جا سکے۔ آزادی اور حقوق کی لڑائی بعض پختونوں اور بلوچ لیڈروں کے لیے ایک کاروبار ہے اور میر ہزار جیسے لوگ اس میں بطور ایندھن استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ نوابوں اور خانوں کے لیے ایک لاش گرنے کے بعد اور زندہ جسم ہتھیار سجائے آ جاتے ہیں اور یہ کاروبار چلتا رہتا ہے۔

☆☆☆

کابل میں ہر معاملے میں غلط فہمیاں اور خوش فہمیاں بہت جلد پھلتی پھولتی ہیں۔ صدر نجیب

نے افغانستان کے لیے اقوام متحدہ کے نمائندے 'بینن سیوان' کے کہنے پر اعلان کیا کہ اگر افغانستان کے مسئلے کے حل کے لیے اقوام متحدہ کی طرف سے مقرر کردہ غیر جانبدار افراد پر مشتمل حکومت لائی جائے اور وہ عام انتخابات کا انعقاد کرے تو میں رضا کارانہ طور پر اُس حکومت میں شامل نہ ہونے کے لیے تیار ہوں۔ یہ ایک انتہائی بے تکا اور نا معقول بیان تھا۔ اس سے ایک طرف حمایتیوں کے مورال کو نقصان پہنچا، پارٹی کے اندر حکومت مخالفین کو شہ ملی اور دوسری طرف مجاہدین کے حوصلے بڑھ گئے۔ جب کہ بینن سیوان محض اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کا نمائندہ تھا اور اُس کے پیچھے نہ سلامتی کونسل کی قرار داد تھی نہ ہی ارادہ۔ گویا اُس کے وعدے پانی پر لکھی تحریر سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ یہ سارے مشورے ایسے ہی ہوتے ہیں کہ ریاست کی سطح پر مان لیے گئے تو خوب، نہ ماننے تو کوئی حرج نہیں۔

میں پاکستان میں تھا اور خاندان کابل میں۔ لائق صاحب اس خوش فہمی میں تھے کہ سب کچھ ٹھیک چل رہا ہے اور کوئی زلزلہ نہیں آنے والا۔ لیکن بینن سیوان کا مشورہ سب کچھ لے ڈوبا۔ سب سے پہلے نجیب کے خلاف اپنی ہی پارٹی میں بغاوت ہوئی۔ پھر مجاہدین اور ان کے لیڈروں نے بشمول نواز شریف حکومت (اے این پی جس کا حصہ تھی) نے اقوام متحدہ کے منصوبے کو سبوتاژ کیا۔ اسی اثنا میں مجھے کابل سے فون آیا کہ فوراً پہنچو اور اپنے خاندان کی فکر کرو۔ وقت کم تھا اور راستے مجاہدین کے قبضے میں۔ میں نجیب اللہ مجددی کی مدد سے چمرکنڈ۔ ناوہ۔ سرکانڑو کے راستے جلال آباد گیا اور وہاں سے کابل پہنچا۔ جس دن کابل پہنچا، اس سے ایک رات پہلے نجیب ایئر پورٹ گئے تھے اور انھیں ملک سے باہر جانے سے روک دیا گیا تھا، جس کے بعد انھوں نے مجبوراً کابل میں اقوام متحدہ کے دفتر میں پناہ لی۔

میں بڑی عجلت میں تھا، حالات خراب تھے۔ نفسا نفسی کی کیفیت تھی اور حکومت کی عمل داری تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ نجیب کے اس طرح حکومت سے بھاگنے پر اس کے طرف دار ناراض اور غضبناک تھے۔ ان سب کا خیال تھا کہ اس طرح ہمارے مشورے کے بغیر چلے جانا ہمیں موت کے منہ میں دھکیلنے کے مترادف تھا۔

کارمل کے ساتھی خوش اور سرگرم تھے۔ پورا شمال حکومت کی دسترس سے نکل چکا تھا۔ احمد شاہ مسعود 'چاریکار' تک پہنچ چکا تھا اور ہوائی اڈہ عبدالرشید دوستم کی ملیشیا کے قبضے میں تھا۔

حکمت یار 'چہار آسیاب' سے فاتحانہ نعرے بلند کر رہا تھا۔ میں نے بھاگم بھاگ اپنے خاندان کے لیے بھارتی سفارت خانے سے ویزہ حاصل کیا۔ کابل جانے کے تیسرے ہی روز میں اپنے خاندان کے ساتھ کابل ایئر پورٹ پر دہلی جانے کے لیے کھڑا تھا۔ ایئر پورٹ پر ہمارے پاسپورٹ قبضے میں لے لیے گئے، ہمیں دھمکیاں دی گئیں اور کہا گیا کہ ہم کابل نہیں چھوڑ سکتے۔ ایک فیصلہ تو یہ بھی ہوا کہ ہمیں گرفتار کر لیا جائے۔ خیر واپس گھر آ گئے۔ پاکستانی سفارت خانے کو اطلاع ملی تو انھوں نے میرے پورے خاندان کو سفارت خانے میں پناہ دینے کی پیش کش کی۔ لیکن اپنے پورے سسرال کو خطرے میں چھوڑ کر صرف اپنی جان بچانا مناسب نہ لگا، اس لیے سب کو لے کر ہم خفیہ طور پر ایک غیر معروف جگہ منتقل ہو گئے۔ حکمران اور حکومتی پارٹی مسلسل میٹنگز کر رہے تھے اور مجاہدین کی شمال اور جنوب، دونوں طرف سے آمد و رفت جاری تھی۔ فیصلے ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے نشر ہو رہے تھے۔

مرحوم جنرل عبدالحق علومی ہمارے قدیمی دوست اور شریف النفس انسان تھے۔ اس وقت وہ صدر نجیب کے مخالف اور ببرک کارمل کے حامی تھے۔ اُنہیں ہماری حالت کا علم ہوا تو وہ ہمارے ساتھ 18 اپریل 1992ء کو ائیر پورٹ گئے۔ ہمارے پاسپورٹ واپس دلائے اور ائیر پورٹ کے عملے سے کہا کہ جن لوگوں نے چوریاں کی ہیں انھیں تو جانے دیتے ہو اور ان کی طرح کے شریف لوگوں کو روک رہے ہو۔ اس دن اگر چہ وزیر دفاع علام فاروق یعقوبی کا جنازہ تھا۔ یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ انھیں قتل کیا گیا یا انھوں نے خودکشی کی۔ علومی صاحب ہماری خاطر جنازے میں بھی شریک نہ ہو سکے۔

دہلی پہنچ کر ہم نے انتظار شروع کیا کہ میری ساس اور سالی بھی آ جائے۔ میری سالی کا جرمنی میں افغان سفارت خانے میں فرسٹ سیکرٹری کے طور پر تقرر ہوا تھا۔ اُن دونوں کے لیے میں نے جرمن سفارت خانے سے ویزے حاصل کیے اور انھیں جرمنی رخصت کیا، جس کے چند دن بعد تک ہم دہلی میں مقیم رہے۔ 6 مئی کو ہم پشاور پہنچے۔ ایک مرتبہ پھر حیات آباد، فیز1 D4 میں پانچ مرلے کا مکان کرائے پر حاصل کیا اور ایک مرتبہ پھر صفر سے زندگی کا آغاز کیا۔ بچوں کو ایک عام سکول میں داخل کیا، اُن کے دو تعلیمی سال پہلے ہی ضائع ہو چکے تھے۔ ہم دہلی میں تھے، جب نجیب حکومت کے سقوط کی خبر آئی۔ شمال اور جنوب کے مجاہدین کے درمیان خونریز جنگ جاری تھی۔

صبغت اللہ مجددی کی حکومت، جو پشاور سمجھوتے کے تحت وجود میں آئی تھی، ایک بے بس حکومت تھی۔ مجاہدین ٹڈی دل کی طرح افغانستان کی سرزمین کے ہر حصے پر حاوی ہو چکے تھے اور اسے لوٹ رہے تھے۔ کسی کا مال اور عزت محفوظ نہ تھی۔ میرے سسر چند قبائلی دوستوں کی مدد سے پہلے قبائل پہنچے اور پھر ولی باغ آ گئے۔ کچھ عرصہ وہ ولی باغ کے مہمان رہے اور پھر پولٹ بیورو کے ارکان اسلم وطن جار اور محمد رفیع بھی آن ملے۔ میرے ولی باغ سے تعلقات نارمل تھے اور آنا جانا رہتا تھا۔ اجمل پارٹی کے صدر تھے، لیکن مہمانوں سے ملنے سے کتراتے تھے۔

اس دوران میری ساس جرمنی میں سخت علیل ہو گئیں۔ اُن کی تلی کا آپریشن بگڑ گیا، جس نے جگر کو شدید طور پر متاثر کیا تھا۔ اُس کے بعد جگر کا آپریشن کرنا پڑا۔ وہ تقریباً بستر مرگ پر پڑی تھیں اور ہم یہاں اُن کے کفن دفن کا انتظام کرنے والے تھے۔ لائق صاحب جرمنی سدھارے اور یوں ولی باغ کی میزبانی کو خیر باد کہا۔

میں جب کابل سے آ رہا تھا تو اپنا مکان، ساز و سامان اور کتابیں لائق صاحب کے حوالے کر کے آیا تھا کہ کسی بااعتماد آدمی یا گھرانے کے حوالے کر دیں۔ لیکن میرا مکان بھی مجاہدین کی لوٹ مار سے اور بعد میں غاصبانہ قبضے سے محفوظ نہ رہ پایا۔ وہ مکان اصل میں میری بیوی کے نام تھا۔ پشاور سمجھوتے کے مطابق صبغت اللہ مجددی کی حکومت دو مہینے کے لیے تھی اور اُس کے بعد برہان الدین ربانی چار مہینے کے لیے صدر بنے۔ ربانی کا دور بھی ختم ہونے کے قریب تھا۔ اکتوبر کا مہینہ تھا، میں سینیٹر عبدالخالق کے جنازے کے بعد اگلے دن پروفیسر رسول امین، حکیم آریوبی اور شاہ آغا وغیرہ کے ہمراہ کابل گیا، تاکہ اپنے مکان کا حال احوال معلوم کروں۔ تاہم وزیر داخلہ احمد شاہ احمد زئی کے حکم اور ڈسٹرکٹ پولیس کی کوششوں کے باوجود میں اپنا مکان قابضین سے خالی نہ کرا سکا۔ میں جب اپنے دوست جنرل عبدالحق علومی کے گھر گیا تو وہ بہت ناراض ہوا۔ کہنے لگا ان حالات میں کیوں آئے ہو، کوئی مار ڈالے گا۔ میں نے انھیں یقین دلایا کہ میں بااعتماد لوگوں کے ساتھ آیا ہوں اور محفوظ جگہ ٹھہرا ہوں۔ میں نے کہا، مجھے چھوڑو اپنی فکر کرو، تمہیں کوئی نہ مار دے۔ کہنے لگے میری فکر نہ کرو میں فوجی ہوں، وردی میں ہوں، اور میرے تحت مسلح سپاہی ہیں۔ یہ وہ وقت تھا جب کابل میں کارمل صاحب اور احمد شاہ مسعود اور رشید دوستم کی مسلح سپاہ ساتھ ساتھ کابل میں موجود تھیں۔ انھیں میں سے کچھ فوج علومی صاحب کے زیر کمان بھی تھیں۔ افسوس کہ کچھ ہی

عرصے بعد اطلاع آئی کہ علومی صاحب کو کسی نامعلوم قاتل نے میکروریان چوک میں اپنی موٹر میں گولی مار کر شہید کر دیا۔

☆☆☆☆

میرے ولی خان سے تعلقات نہ صرف یہ کہ اچھے تھے بلکہ وہ چاہتے تھے کہ اپنی خواب گاہ کے قریب والا کمرہ اوپر کی منزل میں میرے حوالے کر دیں۔ اور میں مرحوم کی لکھت پڑھت کا کام سنبھالوں۔ احمد کا کا کی کتاب میں بڑی عرق ریزی سے کابل سے شائع کر چکا تھا۔ وہ میں نے یونیورسٹی بک ایجنسی کے مالک مرحوم فضل منان کے ذریعے دوبارہ چھپوائی، جس پر میرے دیباچے کی جگہ ولی خان نے اپنا دیباچہ لکھا۔ باچا خان اور خدائی خدمتگاری کے پورے سلسلے کی میں نے تدوین کی، جو چند جلدوں میں شائع ہوئی۔ ولی خان چاہتے تھے کہ میں مرحوم کی خودنوشت لکھوں۔ مجھ سے کہا کہ میرا گھر، میری موٹر، نوکر چاکر، سب تمہارے اختیار میں ہیں۔ لیکن میں خالی خولی اختیار کا کیا کرتا۔ مجھے اپنے خاندان، بچوں کی تعلیم کا خرچ، کھانا پینا اور آنے جانے کے لیے وسائل کی ضرورت تھی۔ یہ لوگ حکومت میں تھے۔ ایک دن میں ولی باغ سے حیات آباد آ رہا تھا تو نسیم بی بی کے ساتھ موٹر میں بیٹھ گیا۔ جب اسمبلی ہاؤس تک پہنچے تو بجائے اس کے کہ خود اتر جاتیں اور ڈرائیور 'بسم اللہ' سے کہتیں کہ صوفی کو گھر تک پہنچاؤ، مجھے کہنے لگیں مجھے تو اسمبلی جانا ہے، اب آگے تم اپنا بندوبست کرو۔

میں سمجھ گیا کہ یہ لوگ اب مجھے بھی احمد کا کا بنانا چاہتے ہیں کہ ان کے تمام کام کرو، اس کے عوض فقط روٹی کھاؤ اور اسمبلی کو یہ اپنے چہیتے بھجواتے رہیں گے۔ 1993ء میں میں نے اپنے حلقے سے صوبائی اسمبلی کے لیے درخواست بھی دی تھی، جو رد کر دی گئی۔ وجہ شائد یہ تھی کہ میں ایجنسیوں کی کالی فہرست میں شامل تھا۔ یا پھر یہ وجہ رہی ہو گی کہ انھیں بے زبان، لکیر کے فقیر اور جی حضوری کرنے والوں کو ٹکٹ دینے کی عادت تھی۔ یوں ولی باغ سے میرا دل کھٹا ہو گیا۔ پارٹی سے تو مجھے پہلے ہی فارغ کر دیا گیا تھا۔ اس لیے میں نے سوچا کہ اپنے لیے، اگر ممکن ہو، آزاد اور مستقل حیثیت خود پیدا کروں۔ یہ الگ بات کہ خالی جیب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس سب کے باوجود ولی خان سے میں نے تعلقات جاری رکھے۔ [۳۴]

لندن جلاوطنی

وطن چھڑاتی ہیں دو ہی چیزیں
شکم کی آگ یا پھر آتشِ عشق

(پشتو لوک ٹپہ)

تمام راستے بند تھے۔ کوئی دستِ دوستی دراز کرنے کو تیار نہ تھا۔ وہ لیڈر جن کے ہمیشہ ہم نے گن گائے، اقتدار کی مسند پر پہنچ کر اُن کی گردن میں سلاخیں آگئیں تھیں۔ اجمل پر تو علیحدہ سے بات کروں گا کہ جس کے ساتھ میں نے اپنی جوانی خاک کی، وہ کس کردار کا انسان تھا۔ اگر دل کی بات کہوں تو اُس شخص سے میری شناسائی اور دوستی میری زندگی کی پہلی اور آخری بھول تھی۔ بائیں بازو والے دوست سب افراسیاب کے گرد جمع ہوگئے اور ان کی ضروریات پوری کرنے میں جتے ہوئے تھے اور نجیب اللہ نے بھی اس کا خاص خیال رکھا تھا۔

میری بدقسمتی یہ رہی کہ کابل سے آنے کے بعد خاندان سے لے کر دوست احباب اور پارٹی کے اور نظریاتی ساتھیوں کو میرے بارے میں ایک غلط فہمی رہی۔ وہ یہ کہ چونکہ میں کابل میں صدر داؤد سے لے کر نجیب تک سب کے قریب رہا اور میرا اسرا افغانستان میں نجیب کے بعد دوسرے نمبر کا لیڈر تھا، اس لیے میں وہاں سے مالا مال لوٹا ہوں۔ پھر یہ بات بھی عام تھی کہ پارٹیوں، سیاسی شخصیات اور لیڈروں کو کابل حکومت نے خوب پیسے دیے ہیں، جو درست بھی تھا۔ تو اس صورت میں وہ یہ سوچنے میں حق بجانب بھی تھے کہ صوفی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ اس دولت سے محروم رہا ہو۔ ان کا یہ خیال تھا، کہ میں ٹشو پیپر کی جگہ بھی ڈالر کا نوٹ استعمال کرتا ہوں گا۔

کاش انھیں معلوم ہوتا کہ میرا تعلق ایسے بندے سے تھا، جو غریبی کو فیشن سمجھتا تھا اور اسے سیاست سے محض صوفیانہ اور افلاطونی قسم کی محبت تھی۔

میری دوسری بدقسمتی یہ تھی کہ افغانستان حکومت کا تعلق اکثر بڑے ملک، سردار اور خان قسم کے لوگوں سے رہا تھا۔ نجیب حکومت کے خاتمے کے بعد جو رشتہ دار، عزیز اور دوست پشاور آئے تو ان کی توقع تھی کہ میں ان کی میزبان کی حیثیت سے خدمت کروں۔ اُن کے رہنے اور کھانے پینے کا بندوبست کروں۔ وہ خود اُس وقت مصیبت کے مارے تھے، اس لیے اُنھیں یہ خیال نہ آیا کہ جن

لوگوں کی جیبیں، گھر اور بینک بیلنس انھوں نے بھرے، یہ وقت انھیں کے پاس جانے کا تھا۔ میرے پاس تو پیسا کمانے کے لیے جو سرمایہ تھا، یعنی جوانی اور علم، وہ دونوں تو میں افغانستان کے قبائلی سوچ رکھنے والے معاشرے میں نچھاور کر آیا تھا۔

اس حوالے سے مجھے ایک بات یاد آرہی ہے۔ لندن کے مغرب میں ڈل سیکس کے علاقے میں 'ہیرو ہوٹل' میں مقیم افغان مہاجر 'نظام الدین تہذیب' (ترہ کی اور کارمل۔ نجیب کے وقت کے وزیر سرحدات اور چیف جسٹس) سے میں اپنی مالی بدحالی کا رونا رو رہا تھا۔ انھوں نے حیران ہو کر کہا تمھارے پاس پیسے کیوں نہیں ہیں؟ میں نے کہا زندگی تو آپ لوگوں کے ساتھ گزاری تو پیسے کب کماتا۔ بولے میں یہ بات بالکل تسلیم نہیں کرسکتا۔ میں نے کہا اچھا، آپ بھی تو پیسوں کے بہت بڑے خزانے (وزارتِ سرحدات) کے مالک تھے، آپ نے مجھے کتنے پیسے دیے؟ خاموش ہوگئے اور کہا، تم نے مانگے ہی نہیں۔ میں نے کہا اچھا اگر میں مانگتا تب ہی آپ دیتے، آپ خود یہ نہیں سوچ سکتے تھے کہ میں ایک انسان ہوں اور اپنے چوبیس گھنٹے آپ ہی کی خدمت میں لگا ہوں، تو میری بھی کچھ ضروریات ہوں گی۔

یوں پاکستان اور افغانستان دونوں طرف سے مایوس اور ناامید، جلاوطن ہونے میں عافیت جانی اور دسمبر 1994ء میں انگلستان روانہ ہوگیا۔ مجھے پختون عالمی ایسوسی ایشن کے صدر ڈاکٹر نواز بنگش (جو افضل بنگش کے داماد بھی تھے) نے ایسوسی ایشن کے سالانہ اجلاس میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ [۳۵] یہ برطانوی ہائی کمیشن سے ویزہ لینے کے لیے اچھا جواز بن گیا۔ یوں میں برمنگھم پہنچا اور چند دن نواز کے ساتھ گزار کر لندن روانہ ہوا۔ چلنے سے پہلے اپنے دوست پروفیسر عارف سے بات کرچکا تھا۔ لندن پہنچنے پر انھوں نے فریدی صاحب سے مجھے متعارف کرایا۔ فریدی صاحب کا ساؤتھ ہیرو میں چار کمرے کا ایک مکان تھا، جس میں ایک کمرہ مجھے دے دیا گیا۔ باقی تین کمروں میں کرایہ دار مقیم تھے۔ عارف سے مشورہ کیا اور 'سرے (Surrey)' میں ہوم آفس کے امیگریشن اور نیشنلٹی ڈائریکٹریٹ چلا گیا۔ وہاں ایک افغان کے طور پر مہاجرت کے لیے درخواست جمع کرائی۔ اپنی سفری دستاویزات جمع کرائیں۔ ایک مختصر انٹرویو ہوا اور مجھے عارضی سکونت کی سند تھما دی گئی۔ چند دن بعد ہوم آفس سے جواب آگیا اور ساتھ ہی نیشنل انشورنس نمبر بھی حاصل کرلیا۔ دوسرے دن یہ اسناد ہیرو کے سوشل سیکیورٹی بینفٹ لے گیا۔ متعلقہ فارمز پر کیے

اور کھانے پینے اور کرایہ کے پیسے دے دیے گئے۔ پہلے چھ مہینے مجھے کام کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس عرصے میں کوئی تربیت یا تعلیم کے سلسلے میں بھی شریک نہیں ہو سکتا تھا۔

عام طور پر لوگ اس قانون کی پابندی نہیں کرتے، کام کر کے پیسے بھی کماتے ہیں اور سوشل سیکیورٹی کے ریاستی وظیفے بھی حاصل کرتے ہیں۔ لیکن میں زندگی کے اس موڑ پر تھا کہ جوانی گزر گئی تھی، کمر میں تکلیف تھی، غیر قانونی کام جیسے ٹیکسی چلانا، یا کسی دکان میں کام کرنا اپنے بس کی بات نہ تھی۔ اور اگر جوانی ہوتی بھی تو مجھے کون سا ہاتھ پاؤں کی مزدوری کرنے کا تجربہ تھا۔ ساری زندگی تو سیاسی اور ذہنی کاموں میں گزاری تھی۔ یہ غیر قانونی کام بہت منافع بخش ہوتے ہیں۔ ہر ہفتے حکومت کی طرف سے رہائش اور کھانے پینے کا خرچہ مل جاتا ہے اور غیر قانونی کاموں سے جو آمدنی ہوتی ہے اس پر ٹیکس بھی نہیں دینا پڑتا، یعنی جو کمائیں وہ براہ راست بچت ہے۔ قانونی طریقہ یہ ہے کہ اگر آپ اس عرصے میں کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو بینیفٹ آفس کو اطلاع دیں گے، وہ آپ کا ہفتہ وار وظیفہ بند کر دے گا۔ اُس کے بعد اپنے کھانے پینے اور رہائش کا بندوبست خود کرنا ہوگا اور جو کمائیں، اس پر ٹیکس بھی دیں۔ یوں یہ ساری صورت حال ان پڑھ اور ہاتھ سے کام کرنے والے مزدور طبقے کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ پڑھے لکھے لوگ جو کام کریں، کمپیوٹر کے اس دور میں اسے چھپایا نہیں جا سکتا۔

چند ماہ میں نے بے روزگاری میں گزارے اور شدید تنگ آ گیا تھا۔ حکومت کے ملنے والے پیسوں سے میرا گزارا تو خوب ہو رہا تھا، لیکن گھر بھجوانے کے لیے پیسے نہیں تھے۔ آخر شمالی لندن کے تربیتی مرکز میں کمپیوٹر سیکھنے گیا۔ انھوں نے میری درخواست منظور کی لیکن 'جاب سینٹر' نے اعتراض کیا کہ ابھی میرے چھ مہینے پورے نہیں ہوئے۔ میں نے احتجاج کیا اور ایک خط علاقے کے حاکم، کنزرویٹو پارٹی کے رکن پارلیمنٹ کو لکھا۔ اس نے معذرت کا خط لکھا اور مجھے دوبارہ ٹریننگ سنٹر جانے کا کہا۔ لیکن اب وہاں جاری کورس نصف تک پہنچ گیا تھا اور اگلا کورس شروع ہونے میں کئی دن باقی تھے۔ غرض وہاں داخلہ لیا اور کمپیوٹر سیکھنے کا ساڑھے تین ماہ کا کورس مکمل کیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ کمپیوٹر پر ابھی 'ونڈوز' رائج نہ تھیں۔ سارا کام کمپیوٹری نظام 'ڈاس DOS' پر چلا کرتا تھا۔ تربیت مکمل ہونے پر مجھے سند تھما دی گئی۔

اُسی زمانے میں 'نارتھ ہولٹ' میں 'برٹش امیرکن ٹوبیکو' کمپنی اپنی عمارت بنام 'گیلاہر' میں اپنی

تمام اسناد کو کمپیوٹر پر منتقل کر رہے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ سگریٹ کے باعث کینسر اور دیگر بیماریوں سے مرنے والے افراد کے ورثاء پورے یورپ اور امریکہ میں سگریٹ ساز کمپنیوں پر قانونی دعوے داخل کرتی تھیں۔ کمپنی کا ریکارڈ کمپیوٹر میں منتقل ہونے سے وکلا کو اپنا کام نمٹانے میں سہولت رہتی اور وقت کے ساتھ ساتھ کمپنی کو کروڑوں ڈالر کی بچت ہو سکتی تھی۔ یوں میں 150 افراد کی ٹیم کا حصہ بنا جو کمپنی دستاویزات کو کمپیوٹر میں منتقل کرنے پر مامور تھی۔ اس کے لیے کمپنی کے ساتھ راز داری رکھنے کے ایک حلف پر بھی دستخط لیے گئے، کیونکہ ہماری رسائی کمپنی کی ہر طرح کی دستاویزات تک تھی، جن کے مطالعہ کے بعد یہ فیصلہ کرنا ہوتا تھا کہ اسے سافٹ وئر کے کس ہیڈ میں ڈالنا ہے۔

نوکری ملتے ہی میں نے نارتھ ہولٹ میں کام کرنے کی جگہ کے نزدیک ایک آسیریائی عراقی کے گھر میں ایک کمرہ کرایہ پر لیا، جاب سنٹر کو مطلع کیا اور یوں ریاستی وظیفہ حاصل کرنے والوں کے بجائے ٹیکس دینے والوں میں شامل ہو گیا۔ دفتر میں میرا کام صبح آٹھ سے شام چھ بجے تک جاری رہتا اور یہ بہت خوش کن کام تھا۔ وہاں دنیا بھر کے مختلف خطوں کے باشندے، مرد و عورت، ہر رنگ و نسل اور مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگ یک جا تھے۔ کام کے دوران میں انگلستان، امریکہ، نائیجیریا، گھانا، بھارت، صومالیہ، آئرلینڈ اور رومانیہ کے دوستوں سے متعارف ہوا۔ کام بہت زیادہ تھا، لیکن یہ سب بہت خوش گوار ماحول میں، ہنسی مذاق کے ساتھ چلتا رہتا۔ کام جوں جوں آگے بڑھتا رہتا، کوڈنگ ہوتی گئی اور عملے سے چھانٹی کا کام شروع ہوا۔ 1996 میں پورا پراجیکٹ ختم ہو گیا اور تمام عملے کو فارغ کر دیا گیا۔

☆☆☆☆

ستمبر 1996ء میں صدر نجیب اللہ کے قتل کا واقعہ بہت اذیت ناک تھا۔ ہم دوستوں نے پیسے اکٹھے کیے اور لندن کے ریجنٹ پارک کی بڑی مسجد میں اُس کی فاتحہ کرانی چاہی لیکن اُس کی اجازت نہ ملی۔ پھر 'ہیرو' کی مسجد میں فاتحہ کی ٹھانی، لیکن وہ بھی عین وقت پر مسجد کے ذمہ داروں کی جانب سے انکار کے باعث ممکن نہ ہو سکی۔ آخر کار لندن یونیورسٹی کے ایک ہال میں مقتول کے لیے ایک تعزیتی جلسہ کیا اور اُن کے بارے میں تقاریر ہوئیں۔ بہرحال فاتحہ کرنے کی معصوم خواہش بھی حسرت بنا دی گئی اور روایتی اسلامی طریقے سے ہم مقتول کا بعد از مرگ احترام نہ کر پائے۔

....

اس تمام عرصے میں میں ولی خان اور اے این پی سے خوش نہ تھا، لیکن ظاہر ہے تعلقات دونوں سے تھے۔ اس تمام عرصے میں جب بھی ولی خان لندن آتے میں، انھیں لینے ہیتھرو ایئرپورٹ جاتا۔ غنی خان کی وفات پر جرمنی سے لائق صاحب نے فون کیا اور بتایا کہ میں آرہا ہوں، دونوں اکٹھے ولی خان سے تعزیت کے لیے برمنگھم جائیں گے۔ ولی خان اپنی بیٹی کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے، ہم دونوں وہاں گئے۔ اس طرح ایک مرتبہ بیمار ہوکر وہ 'کرامویل ہسپتال' میں زیرِ علاج تھے تو میں چند بار اُن سے ملنے گیا۔ وہاں بیگم نسیم ولی اور اسفندیار بھی موجود ہوا کرتے تھے۔ بعد میں جب ولی خان قاضی فضل ربی کے گھر ٹھہرے تو تب بھی اُن سے ملنے وہاں گیا۔ ایک مرتبہ اسفندیار برمنگھم آیا، تو اُس سے بھی ملنے گیا اور سال 2000ء تک میں نے کوشش کی کہ اُن سے تعلقات بحال اور خوش گوار رہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں اپنے حالات سے خوش نہیں تھا، اور جس قدر جلاوطنی طول پکڑ رہی تھی، اتنا میرا غصہ بڑھ رہا تھا۔ خاص طور پر جو ہتک آمیز سلوک اعظم خان نے کیا تھا، وہ بھول نہیں سکتا تھا۔ اس سب کے باوجود میں نے جنگ لندن اور 'دی نیوز انٹرنیشنل' میں ولی خان کے معترضین کے جواب میں بہت کچھ لکھا۔

لندن میں پہلی ملازمت ختم ہونے کے بعد جلد ہی مجھے اپنی کمپنی 'بوہاک کنسلٹنسی' (Bowhawk Consultancy) نے اطلاع دی کہ ایسا ہی ایک اور کام، ایک اور ادارے میں شروع ہونے والا ہے۔ لیکن اُس وقت پاکستان سے میرے بھائی زیارت خان کا فون آیا کہ فوراً پاکستان پہنچو۔ ہم نے اعظم خان سے بات کی ہے کہ تم نے ہمارے بھائی کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ واپس آجائے، ہم اُسے سینٹ بھجوادیں گے۔ اُس وقت میرا بھائی مردان میں ڈپٹی کمشنر تھا۔ میں اس فون کے جواب میں واپس پاکستان آیا۔ مردان پہنچ کر اعظم خان کو فون کے بعد فون کرتا ہوں، لیکن خان صاحب ملنے سے گریز کررہے ہیں۔ حیدر ہوتی سے بات کی تو اُس نے کہا 'لگتا ہے بابا آپ سے کھو گیا ہے'۔ سینٹ تو دور کی بات اعظم خان نے ملنے سے بھی احتراز کیا۔

یہ وہی اعظم خان تھا، جو پختون زلمے کے کمانڈر کی حیثیت سے جلال آباد سے کابل آتا تو ہم اس کی خواہش پر اس کی میزبانی دختر انگور سے کرتے۔ بیرون سفارت خانوں سے تعلقات میری ذمہ داریوں میں شامل تھا، اس لیے وہ اپنے قومی دنوں میں تحفے تحائف میں اپنی مغربی روایات کے مطابق یہ بوتلیں بھی بھجواتے تھے۔

اعظم خان نے نہ صرف یہ کہ مجھے حق سے محروم کیا، بلکہ اُس کی مخالفت میں اور بھی تیزی آگئی۔ مرکز اور صوبے میں نواز شریف اور اے این پی کی مخلوط حکومت تھی۔ خان صاحب وزیر تھے۔ لیکن اس وقت کل اختیارات ہوتے ہوئے، میرے بڑے بھائی کو جو مردان میں ڈپٹی کمشنر تھے، کسی اُس سے بہتر جگہ تعینات کرنے کے بجائے 'افسر بہ کار خاص Officer on Special Duty' لگا دیا گیا جو بیوروکریسی کی اصطلاح میں کسی افسر کی سخت توہین اور اُسے کسی بھی کام کے اہل نہ سمجھنے کے مترادف ہوتا ہے۔ یہ وہی شخص تھا، جس نے خدائی خدمت گار گھرانے سے تعلق کی بنیاد پر ہمیشہ ولی باغ کو فائدہ پہنچایا تھا۔ ایک مرتبہ غنی خان نے مجھے کہا تھا کہ تمہارے ڈپٹی کمشنر سے گھرانے (ولی باغ) نے خوب خوب فائدے اٹھائے ہیں۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب میرا بھائی چارسدہ میں ڈپٹی کمشنر تھا۔ اس گھرانے کی طرف سے ایسے ہی تحفے ملتے ہیں۔ ان کی محسن کشی کی روایت نے مجھے اس خاندان سے دور کردیا اور میں نے اِن سے تمام توقعات منقطع کرلیں۔ اس کے باوجود میں نے اُن پر اپنا کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا اور 2000ء تک صبر کیا۔

میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ اپنے خاندان کو پالنا تھا، بچوں کی تعلیم کا مسئلہ تھا اور گھر کے دیگر اخراجات۔ اس لیے پھر اپنی مزدوری کرنے لندن روانہ ہوا۔ لیکن وہاں میرا کوئی اپنا کاروبار تو تھا نہیں۔ جو تسلسل وہاں بن گیا تھا، میرے پاکستان آنے سے ٹوٹ گیا تھا اور وہاں نئے سرے سے ملازمت کے حصول کے لیے جدوجہد کرنا پڑی۔ میں نے رہائش سے محروم افراد کے مرکز فون کیا اور کہا کہ میرے پاس رہنے کے لیے جگہ نہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ کرامویل روڈ پر سینٹ منگو ہاؤسنگ ایسوسی ایشن کا ایک ہاسٹل ہے، وہاں چلے جاؤ۔ وہاں گیا اور انھوں نے ایک آدمی کے ساتھ رہنے کے لیے کمرہ دیا۔ یہ جگہ ایک ہوٹل کے مانند تھی، صبح مکلّف ناشتہ، ظہرانہ اور عشائیہ بھی کافی پرتکلف۔ اس ہاسٹل میں بلیرڈ، ٹیبل ٹینس، ٹی وی روم اور دیگر تفریحی سامان بھی موجود تھا۔ واحد مسئلہ یہ تھا کہ یہاں کے مکینوں کی اکثریت نشے کے عادی افراد تھے اور اُن میں سے بعض تو بہت ہی گندے رہتے تھے۔

میں غیر قانونی ملازمت کر نہیں سکتا تھا اور قانونی ملازمت ڈھونڈی بھی تو سینٹ منگو کے کارندوں نے مشورہ دیا کہ یہ کام نہ کرو۔ تمھیں ملازمت سے اتنے پیسے بھی نہیں ملیں گے کہ ایک کمرہ کرائے پر لے سکو۔ مشورہ ناگوار لیکن درست تھا۔ مجبوراً انکم سپورٹ پر گزارہ کرنا پڑا۔ یہ جگہ

'کن زنگ ٹن پیلس' کے بالکل قریب تھی، جہاں شہزادی ڈیانہ رہتی تھی۔ اگست 1997ء میں جب شہزادی پیرس کے حادثے میں فوت ہوئیں تو اس محل کے سامنے چمن میں، جو ہائیڈ پارک کا ہی ایک حصہ تھا، لاکھوں لوگ پھولوں کے گلدستوں اور تعزیتی کارڈ کے ساتھ آتے اور رکھ کر چلے جاتے۔ یہ ایک قابل دید منظر تھا، جو ہم ہر صبح دیکھا کرتے۔ چند دن تک لوگوں کا سیلاب آتا اور یہی عمل دہرایا جاتا۔ آخر کار شہزادی کو ایک شاندار پریڈ کے بعد، لاکھوں لوگوں کی موجودگی میں دفن کر دیا گیا اور اُس کے بعد چمن میں لوگوں کا آنا بند ہوا۔

میں لندن میں اپنی عمر کے بہت ہی برے مرحلے میں گیا۔ وہاں تب مزہ آتا ہے کہ آپ لڑکپن یا جوانی میں چلے جائیں اور کچھ علم حاصل کریں، اگر علم حاصل نہیں کرنا تو پیسے کمائیں۔ لیکن اس مرحلے پر اگر خاندان ساتھ ہو تو ان کی فکر سے نجات ملے۔ لیکن مجھے تو وہ بھی ساتھ لے جانے کی اجازت نہ تھی۔ مجھے ایک مہاجر کی مکمل قانونی حیثیت نہیں دی گئی تھی۔ میں اس حوالے سے بھی بیچ میں لٹکا ہوا تھا۔ میری حیثیت اُس وقت ایک مجبور، لاچار اور جلاوطن کی سی تھی۔ غریب الوطنی اور غربت اکٹھے ہوں تو بہت بڑی مصیبت بن جاتے ہیں۔ پھر یہ احساس بھی کچوکے لگاتا ہو کہ ساری عمر عبث گزری اور اپنی ساری محنت کی کسی نے قدر نہ کی۔ میں فطری طور پر ایسا آدمی ہوں، جس نے ساری عمر اپنے لوگوں میں گزاری اور ان کے لیے سوچا۔ میں اُن کی جدائی برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ کیوں کہ وہ جدائی پھر بھی قابل برداشت ہوتی ہے، جس کی حد اور قیمت مقرر ہو۔ میں تو ماضی پر بھی افسوس کر رہا تھا، حال بھی برا تھا اور مستقبل بھی غیر یقینی۔ یوں محسوس ہوتا تھا، گویا کسی کی بددعا لگ گئی ہے یا پھر آزمائش سے گزارا جا رہا ہوں۔ میں لندن میں دن رات اسی کش مکش میں وقت گزارتا۔

چند مہینے کرامویل روڈ پر رہا، پھر سینٹ منگو ہاؤسنگ ایسوسی ایشن نے ہیرو روڈ پر ایک مشترکہ گھر میں الگ کمرہ دے دیا۔ وہاں ایک پنجابی کی الیکٹرانکس کی دکان پر سیلز مین مقرر ہوا جو 'ٹاٹن کورٹ روڈ (Tottenham Court Road)' پر واقع تھی۔ ملک صاحب کی دکان پر چند مہینے گزارے، لیکن انھیں میری مجبوری معلوم تھی کہ میں قانونی طور پر کام نہیں کرسکتا، اس لیے موصوف مجھے اتنی تنخواہ دیتے تھے، جو نہ ہونے کے برابر تھی۔ کچھ عرصے بعد میں ایک کشمیری دوست افضل طاہر کے ساتھ 'والتھم سٹو (Walthamstow)' میں ایک اسٹیٹ ایجنسی میں کام کرنے لگا، جو عموماً

پاکستانیوں کو گھر کرائے پر دیا کرتی تھی یا بیچا کرتی تھی۔ چوں کہ میں باقاعدگی سے بجلی، گیس اور کرایہ کے بل دیتا تھا، تو جلد ایسوسی ایشن والوں نے مجھے ہیرو روڈ پر ویسٹ بارن پارک انڈر گراؤنڈ سٹیشن کے قریب، جہاں سے ہائڈ پارک اور 'بیزواٹر (Bayswater)' چند منٹ کے فاصلہ پر تھے، دو کمروں کا ایک فلیٹ دے دیا۔ فلیٹ کو میں نے خوب آراستہ کیا اور سجایا۔ سامان خرید خرید کر اسے رہنے کے قابل بنایا۔ ملازمت بھی پہلے کے مقابلے میں بہتر مل گئی۔ سینٹ چارلس ہسپتال میں 'گرپ (GRIP)' نامی تنظیم کے ساتھ مغربی اور شمالی لندن کے ہسپتالوں میں پشتو، فارسی، اردو اور حتیٰ کہ پنجابی مریضوں کے لیے، جو انگریزی سے ناواقف ہو، ترجمانی میرے فرائض میں شامل تھی۔

اب مجھے تین سال کے لیے ویزہ ملا۔ ہسپتال والی نوکری چند ماہ رہی۔ میں اپنے حالات سے خوش نہیں تھا۔ میں جو کچھ کر رہا تھا وہ مالی لحاظ سے میری مشکلات حل کرنے کے لیے کافی نہ تھا اور نفسیاتی طور پر مجھے یہ سب کرتے ہوئے جھنجلاہٹ ہوتی تھی کہ میں کیا ہوں اور کیا کر رہا ہوں۔
میں نے واپس پاکستان آنے کا فیصلہ کیا۔ اپنا فلیٹ میں کرائے پر بھی اٹھا سکتا تھا، لیکن میں نے غلطی کی ایک بے اعتبار کشمیری دوست، افضل طاہر کے حوالے کر آیا۔ اُس نے فلیٹ میں اپنا دفتر بھی بنایا اور شیراز پراچہ کو بھی بمعہ اُس کے بیوی بچوں، اس فلیٹ میں اپنے ساتھ رکھا۔ اگرچہ میں نے دونوں کو اس بات کی اجازت دی، لیکن دونوں ہی ناشکرے اور ناسپاس نکلے۔ طاہر افضل اس فلیٹ میں رہا، غیر قانونی طور پر اس میں اپنا دفتر بنایا، اس کے باوجود کرائے اور بل کی ادائیگی نہیں کی۔ دو سال بعد ایسوسی ایشن نے حالات جاننے کے لیے فلیٹ کے معائنے کے لیے اپنا بندہ بھیجا، اور فلیٹ کی یہ درگت دیکھ کر انھوں نے میری غیر موجودگی کے باعث فلیٹ واپس لے لیا۔ یہ وہ وقت تھا، جب میں ایک مرتبہ پھر اجمل کے جال میں پھنس چکا تھا اور نیپ پاکستان کی صورت میں وہ ہمیں سبز باغ دکھاتا اور ہم اس خواب میں محو رہتے۔ میں اپنا فلیٹ بچانے واپس نہ جا سکا اور ایک مرتبہ پھر لُٹ گیا!

پشاور واپس آ کر سر پر چھت اور پیٹ بھر کھانے کی غرض سے نئے سرے سے تلاش روزگار کا سلسلہ شروع کیا۔ اپنی نئی سیکھی ہوئی مہارت کو بنیاد بنا کر میں نے لندن سے چھ مستعمل کمپیوٹر خریدے اور پشاور میں ایک ایسا تربیتی مرکز قائم کرنے کی سوچی، جہاں افغانستان کے نوجوانوں کو یہ نیا ہنر سکھا سکوں۔ اس سلسلے میں ابتدائی مشورہ میں نے اپنے دوست معراج الدین پٹھان سے

کیا۔اس کی وجہ یہ تھی اُس نے اپنے گاؤں 'ڈنڈ پٹان' واقع علاقہ 'آریوب، جاجی میں اپنی مدد آپ کے تحت ایک پرائمری سکول بنایا تھا۔ میری خواہش تھی کہ اسے ہائی سکول کا درجہ دلا کر اس کے لیے پختہ عمارت بنائی جائے۔ اس کے لیے میں نے لندن میں یوسف اسلام' سابق: کیٹ سٹیو (Cat Steven) ' کے قائم کردہ ادارے 'مسلم ایڈ' سے بات پکی کی۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ اپنے کارکن تفتیش کے لیے' آریوب' گاؤں بھجوائیں گے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ایک ٹیم وہاں گئی اور جائزے کے بعد اس کے لیے تیس لاکھ روپے کی منظوری دی۔ مگر یہ منصوبہ تکمیل پانا بھی خدا کو منظور نہ تھا۔

میں نے اپنے کمپیوٹر کسٹم سے چھڑائے۔ پشاور صدر میں قیوم سٹیڈیم سے متصل سپر مارکیٹ میں ایک پلازہ معراج کے بھائی غوث الدین کاکسی کی شراکت میں تھا۔ اُس میں ایک بڑی دکان خالی پڑی تھی۔ میں نے اس میں بجلی کا میٹر لگوایا، ٹیلی فون لیا، فرنیچر بنوایا اور کمپیوٹر نصب کیے۔ ارباب روڈ پشاور میں معراج کے گھر میں ایک این جی او کی اساس رکھی گئی جس کا نام 'اساس یعنی افغان سوشل اسسٹنس سروس (Afghan Social Assistance Service) ' تھا۔ مجھے اس کا چیف مقرر کیا گیا اور اس کے دوسرے عہدیداروں میں دیگر ساتھیوں کے نام شامل کیے گئے۔ گلزار، جو اُس وقت افغان کمشنریٹ میں صوبائی کمشنر تھا، اس نے عارضی طور پر کام شروع کرنے کی اجازت دی، لیکن عین وقت پر وزارت داخلہ کی طرف سے ایک سرکولر ملا کہ سیفران سے غیر رجسٹرڈ این جی اوز کو غیر قانونی قرار دے کر بند کر دیا جائے۔ یہ بھی کہا گیا کہ سیفران میں رجسٹریشن کریں۔ میں نے بھی رجسٹریشن کے لیے درخواست دے دی اور اس کے ساتھ طے شدہ پروسیجر کے مطابق اپنی شناختی اسناد نتھی کریں۔ رجسٹریشن تین مراحل پر مشتمل تھی، یعنی آئی ایس آئی، انٹیلی جنس بیورو اور سپیشل برانچ کی کلیرنس۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ یہ تینوں ہی ادارے میرے خلاف ہیں، لیکن مجھے مشورہ دیا گیا کہ اگر آئی ایس آئی کلیر کر دے تو پھر باقی دو اداروں کی کوئی حیثیت نہیں۔ پشاور ہیڈ کوارٹر میں افغان امور کے نگران میجر طارق تھے، جو ہزارہ سے تعلق رکھتے تھے اور جسٹس ریٹائرڈ اسحاق کے فرزند تھے۔ اس کا بھائی میرے بھتیجے کا کلاس فیلو تھا، تو میرے بھتیجے نے بات کی اور اس واسطے سے میں میجر طارق سے ملا۔ اُس نے ملاقات کے بعد مثبت رپورٹ لکھنے کا وعدہ کیا اور میں مطمئن ہو کر گھر آیا۔

کچھ مدت بعد میں افغانستان کے رشید وزیری کے ساتھ اسلام آباد گیا۔ وہاں

میاں افسر شاہ کاکاخیل کو لے کر سیفران پہنچا۔ وہاں پر میرا دوست میاں ایاز گل ایڈیشنل سیکرٹری تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی پشتو میں کہا تم اپنی این جی او میاں افسر شاہ کے نام پر رجسٹرڈ کرا لیتے، اپنے آپ کو کیوں آگے لائے۔ ہوا یوں تھا کہ اسلام آباد کے آبپارہ ہیڈ کوارٹر کے ایک بریگیڈیر نے میری درخواست پر مجھے ریاست دشمن اور پاکستان دشمن قرار دیا تھا۔ یہ بھی لکھا تھا کہ مجھے این جی او چلانے کا کوئی تجربہ نہیں، اس لیے رجسٹرڈ نہ کیا جائے۔

وزیری کا یہ سننا تھا کہ اُس کے منہ سے گالیوں کا ایک سیلاب نکلا جو درجہ بہ درجہ 'خاد' اور نجیب تک کو بہا لے گیا۔ میں نے اس اچانک غیض کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے یہ سب آپ کو آئی ایس آئی کا بندہ کہتے تھے، اب معلوم ہوا کہ آئی ایس آئی تو آپ کو ایک قانونی اور معمول کا کام بھی نہیں کرنے دیتی۔ میں نے کہا، وزیری! اچھا ہوا کہ تم اتفاق سے ساتھ تھے۔ مجھے یوں خوشی ہوئی کہ اس پروپیگنڈے میں وزیری صاحب خود بھی ماضی میں شریک رہے تھے۔

الغرض اساس کا منصوبہ بس اساس ڈالتے ہی ناکام ہو گیا۔ میں نے اپنے دفتر کو کمپیوٹر کا تربیتی ادارہ بنا دیا، جس سے اتنی آمدن ضرور ہو جاتی تھی کہ دفتر کے اخراجات، بل وغیرہ پورے ہو جاتے۔ کچھ نہ کچھ پیسے سکھانے والے استاد کے لیے بھی بچ رہتے تھے۔ اور لوگ سوچتے تھے کہ میں سونے کی کان پر بیٹھا ہوں!

پشاور یونیورسٹی مجھے ہمیشہ سے عزیز رہی ہے۔ جب میں کابل سے لوٹا تو یہاں اپنے پرانے رفقا سے تعلقات کو تازہ کیا۔ 'تولاندی، صوابی' کا ڈاکٹر فدا، جو مشہور کمیونسٹ مولوی شاد محمد کا نواسہ ہے، کیمسٹری سنٹر میں پروفیسر تھا، اُس کے ذریعے کچھ پرانے رابطے بحال ہوئے۔ خصوصاً ایریا سٹڈی سنٹر میں دیرینہ مہربان، ڈاکٹر محمد انور سے بات چیت ہوئی۔ قدیمی دوست ڈاکٹر عظمت حیات اور بعد میں بننے والے دوست ڈاکٹر سرفراز، یہاں علمی کاموں میں منہمک تھے۔ ڈاکٹر انور میرے تعلیمی کیریر سے آگاہ تھے، عظمت حیات کو میرا سیاسی کیریر معلوم تھا، جبکہ ڈاکٹر سرفراز میرے نظریات سے واقف تھا۔ اتفاق سے جس دشت کی سیاحی میں عمر گزری تھی، وہی اس سنٹر کا موضوع تحقیق تھا یعنی افغانستان، روس، وسطی ایشیا اور چین۔

ڈاکٹر عظمت حیات نے سنٹر کے ساتھ کام کرنے کی پیش کش کی۔ اس سے قبل میں اس سنٹر میں مختلف سیمینارز میں تقاریر کر چکا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ میرے تجربے سے فائدہ اٹھائیں۔ میں

نے حامی بھرلی، اگر چہ اس سارے معاملے میں میرے لیے مادی فائدے کی کوئی خاص صورت نہ تھی۔ڈاکٹر عظمت نے کہا کہ میرے اختیارات بہت محدود ہیں، زیادہ سے زیادہ میں آپ کو پانچ ہزار روپے مہینہ پر ریسرچ اسسٹنٹ رکھ سکتا ہوں۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا، میں مان گیا اور کام شروع کیا۔ کام میرے مزاج کا تھا، مجھے ایک دفتر دیا گیا اور ہفتے میں دو تین دن پڑھانا بھی میری ذمہ داریوں میں شامل تھا۔ اس کے بدلے جو رقم ملتی، وہ مجھے یہ فائدہ پہنچاتی کہ گھر سے یہاں تک آنے میں جو گیس کا خرچ آتا، وہ پورا ہو جاتا۔ لیکن خوشی یہ تھی کہ ایک مثبت کام میں مصروف ہوں اور وہی کچھ کر رہا ہوں جو دیگر پروفیسر کر رہے ہیں۔

جب میں 1999ء میں لندن سے واپس آیا تو کوشش کی کہ ولی خان سے مل لوں۔ میں ولی باغ گیا لیکن وہاں میرے ساتھ ایک اجنبی اور انجان کا سا سلوک کیا گیا۔ یوں لگا جیسے ایک بھکاری آیا ہے، جو خانوں کا وقت ضائع کر رہا ہے۔ مجھے کہا گیا کہ بابا (ولی خان) سو رہے ہیں اور بی بی مصروف ہیں اور گھر پر اُن کے سوا کوئی نہیں۔ میں بھی آخر یوسفزئی پختون تھا، دل کی گرہ اور سخت ہوگئی۔ اس پر بھی میں نے مخالفت سے گریز کیا۔

پھر میں نے جون 2000ء میں، انگریزی اخبار 'دی نیوز انٹرنیشنل' میں باچا خان کی وصیت کے بارے میں ایک مضمون لکھ ڈالا، جس کی رو سے باچا خان نے بار بار کہا تھا کہ جو پیسے افغان بینکوں میں ہیں اور وہ جائیداد جو اُن کی اپنی ہے، وہ پختون ٹرسٹ کے لیے وقف ہے۔ میں نے سوال اٹھایا، کہ وہ پیسے اور جائیداد کہاں ہے؟ باچا خان کی وصیت پر عمل کیوں نہیں کیا گیا؟ اس مضمون کا شائع ہونا تھا، کہ سارے تعلقات مکمل منقطع ہوگئے اور مخالفت کا پانی سر سے گزر گیا۔

یہاں میں ایک بات اجمل خٹک کے حوالے سے ضرور اضافہ کرنا چاہوں گا، جو افسوس کہ کابلیوں کے بقول 'پیش پائی بین' [پاؤں کے سامنے دیکھنے والا] رہا تھا۔ جب ہم کابل سے واپس آگئے تو موصوف جلد ہی پارٹی کے چھ سات سال کے لیے صدر اور قومی اسمبلی کے رکن بنے۔ اس تمام عرصے میں دو مرتبہ پارٹی نواز شریف کے ساتھ مرکزی حکومت میں رہی اُن کی پارٹی کے ساتھ صوبے میں تقریباً حاوی پوزیشن میں تھی اور اس دوران اجمل خٹک صدر کے ساتھ ساتھ سینٹر بھی رہے تھے۔ اجمل کے اسی دورِ اقتدار میں میں پھر لندن جلاوطنی پر مجبور ہوا۔ پہلی مرتبہ جلاوطنی پاکستان سے اجمل کے ساتھ کرنا پڑی تھی، دوسری مرتبہ پاکستان آنے کے بعد مالی حالات کے

سبب لندن جانا پڑا۔

ایک مرتبہ نواز شریف کے دورِ اقتدار میں موصوف لندن تشریف لائے، جہاں میں مہاجر کی حیثیت سے رہ رہا تھا۔ اجمل خٹک 'سرے' میں نواز لیگ کے نمائندے ڈاکٹر طوسی کے ہاں ٹھہرے تھے۔ اس قیام کے دوران انھوں نے ایک رات اردو کے مشہور ادیب عظیم بیگ چغتائی کے بیٹے اور افسانہ نگار عصمت چغتائی کے بھتیجے اور ہمارے مشترکہ دوست نجم بیگ چغتائی کے ساتھ گزاری۔ چغتائی نے میرے حوالے سے کہا کہ صوفی بھی ادھر ہی ہے اور پوری تفصیل سنائی۔ اجمل نے کہا وہ یہاں کیا کر رہا ہے؟ اُس نے کہا، ظاہر ہے غریب آدمی ہے، کابل تباہ ہو گیا، آپ لوگوں نے نظر انداز کیا، تو اب مجبوری میں کیا کر سکتا ہے، یہاں مختلف مزدوریاں کرتا پھر رہا ہے۔ اجمل نے یہ سن کر بجائے ہمدردی کا اظہار کرنے کے یہ کہہ کر اچنبھے میں ڈال دیا، کہ یہ یہاں کیا کر رہا ہے، اس کا بھائی تو پاکستان میں ڈپٹی کمشنر ہے۔ جواب میں نجم چغتائی نے کہا میرا بھائی بھی سندھ میں بہت بڑا زمیندار ہے، لیکن زمین اُس کی ملکیت ہے میری نہیں۔ صوفی کا بھائی ڈی سی ہوگا، خود صوفی نہیں۔

صحیح سے یاد نہیں کہ میں لندن میں تھا یا پشاور میں مگر اے این پی اور نواز لیگ کے مابین پیار و محبت کا رشتہ ختم ہو گیا۔ اے این پی حکومت سے باہر آگئی اور بظاہر کہنے لگی کہ نواز شریف نے ہمارے ساتھ صوبے کا نام بدلنے کا وعدہ پورا نہیں کیا۔ اجمل جب اقتدار کے گھوڑے سے اترا تو حیات آباد میں میرے گھر میرا پوچھنے آیا۔ چونکہ میں گھر پر نہیں تھا، اس لیے ملاقات نہ ہو سکی۔ آداب کا تقاضا تھا، کہ میں جواب میں کرٹسی کال کروں۔ یہ وہ وقت تھا، جب میرا دوست لطیف آفریدی بھی خیبر ایجنسی سے قومی اسمبلی کا رکن تھا۔ وہ اپنی طرز کا واحد آفریدی ہے، جس کے دل میں ایک آفریدی کا دل نہیں، یعنی ایماندار اور صاف و شفاف آدمی ہے۔ اپنی ذات میں وہ انوکھے انداز کا بندہ ہے، میرا وہاں آنا جانا رہتا تھا۔ میں نے لطیف سے اجمل کے آنے کا تذکرہ کیا اور کہا، اُن سے ملتا ہوں۔ اجمل خٹک بھی پارلیمنٹ لاجز میں مقیم تھا۔ میں اُن کے فلیٹ گیا، اجمل نے بتایا کہ ہم نواز لیگ سے الگ ہو گئے ہیں، لیکن اعظم اب بھی کوشش کر رہا ہے کہ نواز لیگ سے رابطہ نہ ٹوٹے۔ اُس نے اتحاد کے لیے جو مسودہ تیار کیا ہے، اس میں صوبے کے نام کی تبدیلی اور صوبائی خودمختاری کا تذکرہ تک نہیں کیا۔

اجمل نے کہا، میں نے اس مسودے کو رد کر دیا، اگر چہ اعظم ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے کہ